....اور ایک بُت شکن پیدا ہوا

(سوئم، چہارم)

سلطان محمود غزنوی کے جہاد اور جاسوسوں کی جذباتی اور واقعاتی کہانیاں

عنایت اللہ



....اور ایک بُت شکن پیدا ہوا

جلد دوئم

(تیسرا اور آخری حصہ)

سلطان محمود غزنوی کے جہاد اور جاسوسوں کی جذباتی اور واقعاتی کہانیاں

عنایت اللہ

جہانگیر بُک ڈپو

• لاہور • راولپنڈی • ملتان • فیصل آباد • حیدرآباد • کراچی

قانونی مشیر: چوہدری ریاض اختر (ایم اے، ایل ایل بی)

آپ کے مشورے اور شکایات کے لئے۔
E-mail:info@jbdpress.com
www.jbdpress.com

سرورق : JBD آرٹ سیکشن، لاہور
سٹاکسٹ: مکتبہ داستان، ۲۶ پٹیالہ گراؤنڈ، لاہور
قیمت: -/225 روپے

آفس: 257 ریواز گارڈن، لاہور۔فون: 042-7213318 فیکس: 042-7213319
سیلز ڈپو: اردو بازار، لاہور فون: 042-7220879، سیلز ڈپو: اردو بازار، کراچی۔فون: 021-2765086
سیلز ڈپو: اقبال روڈ نزد کمیٹی چوک، راولپنڈی۔فون: 051-5539609
سیلز ڈپو: نزد یونیفارم سنٹر جامع مسجد صدر، رسالہ روڈ حیدرآباد۔ فون: 0300-3012131
سیلز ڈپو: اندرون بوہڑ گیٹ، ملتان۔فون: 061-4781781
سیلز ڈپو: کوتوالی روڈ، نزد امین پور بازار، فیصل آباد۔فون: 041-2627568
نیاز جہانگیر پرنٹرز، غزنی سٹریٹ اردو بازار، لاہور نے پرنٹ کی۔فون: 042-7314319

فہرست

پیش لفظ

سلطان محمود غزنوی کے دور کی تاریخ ساز اور ولولہ انگیز کہانیوں کا تیسرا مجموعہ بعنوان ...."اور ایک بُت شکن پیدا ہُوا" پیش کیا جا رہا ہے۔ اس میں پانچ کہانیاں شامل کی گئی ہیں جو آپ کو اُس دَور میں لے جائیں گی جب ہندوستان کے میدانوں، وادیوں اور دریاؤں میں حق اور باطل کی تلواریں ٹکرا رہی تھیں اور بُت خانوں میں اذانیں گونج رہی تھیں۔ بُتوں کے بکھرے ہُوئے ٹکڑوں کو غزنی کے گھوڑے روند رہے تھے۔

میں اس سلسلے کی پہلی جلد میں اُس بے انصافی اور دھاندلی کا ذکر تفصیل سے کر چکا ہوں جو سلطان محمود غزنوی کے جہاد کی تاریخ کے ساتھ ہندو تاریخ نویسوں نے کی ہے۔ ایک دو مسلمان تاریخ نویسوں نے بھی ہندوؤں کا اثر قبول کر کے تاریخِ اسلام کے اس بُت شکن کو ڈاکو اور لٹیرا کہا اور یہ ثابت کرنے کی مذموم کوشش کی ہے کہ ہندوستان پر سلطان محمود غزنوی کے حملے جہاد نہیں تھا۔ حقیقت اُن کتابوں میں ملتی ہے جو غیر جانبدار تاریخ دانوں نے اُس دَور کے مورخوں کے حوالوں سے لکھی ہیں۔

یہودیوں اور نصرانیوں کی طرح ہندوؤں نے بھی غزنی سے آنے والے حق

کے طوفانوں اور بگولوں کو روکنے اور ان کی شدّت کو ختم کرنے کے لیے اپنی حسین وجمیل بیٹیوں کو استعمال کیا تھا مگر ہندوستان کا حسن اور عیّاری بت شکنوں کے عزم کو متزلزل نہ کر سکی۔

ہندو لڑکیوں کے حسن وجوانی اور عیّاری نے اور شکست خوردہ راجوں اور مہاراجوں کی در پردہ اسلام کُش سرگرمیوں نے ان کہانیوں کو جنم دیا ہے جو میں آپ کو سنا رہا ہوں۔

ہندوؤں اور یہودیوں کی اسلام کُش سرگرمیاں آج بھی نہ صرف جاری ہیں بلکہ پہلے سے زیادہ دلکش، طلسماتی اور تباہ کن ہو گئی ہیں۔ ہندوؤں نے سلطان محمود غزنوی کے جذبہ حرّیت کو مسخ کرنے کی پوری کوشش اس لیے کی ہے کہ آج کے مسلمان نوجوانوں میں غزنوی کا جذبہ پیدا نہ ہو۔

میں نے پاکستانی نوجوانوں میں غزنی کے بُت شکن کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے اُس دَور کی تاریخ کو چھان مارا اور یہ کہانیاں اخذ کی ہیں۔ ان کہانیوں میں آپ کو تفریح طبع کا خاصا سامان بھی ملے گا جو تفریح کے ساتھ ساتھ ایمان کو تر و تازہ کر دے گا۔

عنایت اللہ

مدیر "حکایت" لاہور

قتل، قنوج اور ضربِ کلیم

غزنی کا شہر آج روسیوں اور افغان وطن پرستوں کا میدانِ جنگ بنا ہوا ہے۔ افغانستان کی فوج کے افسر اور سپاہی فوج سے بھگوڑے ہو کر مجاہدین کے ساتھ مل رہے ہیں۔ روسی ٹینک افغانستان کے دیگر شہروں کی طرح غزنی میں بھی دندناتے پھرتے ہیں۔ فضا سے روسی ہیلی کاپٹر آگ برساتے ہیں۔ اگر افغانیوں نے غزنی کی عظمت کو یاد رکھا تو وہ روسیوں کے قدم اکھاڑ کر ہی دم لیں گے۔

غزنی کی عظمت صرف اس سے نہیں تھی کہ وہاں ایک بت شکن پیدا اور دفن ہوا تھا بلکہ اس شہر کی عظمت کے کچھ اور نشان بھی ہیں جن میں ایک مسجد ہے۔ محمود غزنوی نے اس مسجد کا نام عروسِ فلک رکھا تھا۔ اُس نے یہ مسجد متھرا کی فتح کی یادگار کے طور پر تعمیر کرائی تھی۔ غزنی والے اس فتح پر جتنا بھی ناز کرتے کم تھا۔ متھرا ہندوؤں کا ویسا ہی مقدّس شہر ہے جیسے ہمارے لیے مکّہ اور مدینہ ہے۔ یہ ہری کرشن مہاراج کی جائے پیدائش ہے اور یہاں بے شمار مندر اور بے حد قیمتی بُت تھے۔ محمود غزنوی جب متھرا کا بُت خانہ توڑ کر واپس گیا تو اُس نے غزنی میں سنگِ مرمر کی ایسی مسجد تعمیر کرنے کا حکم دیا جو حُسنِ تعمیر میں یکتا ہو۔

دُور دُور سے معمار بلائے گئے جنہوں نے محمود غزنوی کے تخیّل اور تصوّر سے زیادہ حسین جامع مسجد تعمیر کر دی۔ محمود نے اس کی چھت اور دیواروں میں جو بیل بوٹے کھدوائے، ان میں سونا اور چاندی پگھلا کر ڈالا۔ مسجد کے اندر بیش قیمت قالین بچھائے۔

میناروں کے کلسوں پر سونا چڑھایا۔ پھر اس کے قریب ایک یونیورسٹی کا سنگِ بنیاد رکھا جس میں کتابوں کے انبار لگا دیئے۔ کتابیں مختلف زبانوں کی تھیں یونیورسٹی کا عجائب گھر بھی بنایا جس میں نادر اشیاء رکھیں۔ یہ مسجد اور یونیورسٹی علم و فن کا مرکز بن گئی۔ محمود نے یونیورسٹی کے علما، اساتذہ اور طلبا کے لیے کثیر رقم الگ کر دی۔

امرا نے جب اپنے سلطان کا ذوق دیکھا تو انہوں نے اپنے لیے نہایت خوبصورت مکان اور دلکش مسجدیں تعمیر کرنی شروع کر دیں۔ تھوڑے ہی عرصے میں غزنی خوبصورت مکانوں، باغوں، مصنوعی چشموں اور حسین مسجدوں کا شہر بن گیا۔ آج غزنی اُن تعمیرات کے کھنڈروں کا شہر بن گیا ہے۔

جن فتوحات کی یاد میں محمود غزنوی نے ساڑھے نو سو سال پہلے یہ جامع مسجد اور یونیورسٹی تعمیر کی تھی، وہ فتوحات اُسے آسانی سے حاصل نہیں ہوئی تھیں۔ اس مسجد اور یونیورسٹی کی بنیادوں میں غزنی کے اُن ہزاروں مجاہدین کا خون شامل تھا جن کی لاشیں غزنی واپس نہیں لائی جا سکی تھیں بلند شہر، متھرا، مہابن اور قنوج کے علاقے میں گنگا اور جمنا کے کنارے اُن شہیدوں کی قبروں کے نشان تو مٹ ہی گئے ہیں، ساڑھے نو سو برسوں میں اُن کی ہڈیاں بھی وہاں نہیں رہیں۔ انہوں نے جس طرح متھرا اور اس کے بعد قنوج فتح کیا تھا، اس کے پیچھے ایک ولولہ انگیز اور جذبات کو ہلا دینے والی داستان ہے۔

۱۰۱۸ء کے آخر میں محمود غزنوی بلند شہر سے متھرا تک بگولے کی طرح پھر گیا تھا نقشے پر دیکھیں تو اُس کی پیش قدمی اور فتوحات کی شکل بگولے کی سی بنتی ہے۔ اُسے اس ایک ہی حملے میں کئی بار دریائے گنگا اور جمنا عبور کرنے پڑے۔ جنگ کے مبصر حیرت کا اظہار کرتے ہیں کہ اپنے وطن سے تین ماہ کی مسافت جتنی دور آ کر اتنی لڑائیاں لڑنا اور ہر لڑائی میں کامیابی حاصل کرنا معمولی دماغ اور جنگی فہم و فراست کے جرنیل کے بس کی بات نہیں تھی۔

متھرا بہت بڑا شکار تھا جسے وہ مار چکا تھا۔ ہندوستان کے اتنے بڑے بت خانے میں اذانیں گونج رہی تھیں۔ سلطان نے فوج کو متھرا میں آرام اور تنظیم میں ردّ و بدل کے لیے روک لیا۔ اُسے اب قنوج کی طرف پیش قدمی کرنی تھی۔ قنوج کے متعلق اُسے بتایا گیا

تھا کہ اس کی فتح آسان نہیں ہوگی۔ مہاراجہ قنوج کو دوسرے مہاراجوں کی نگاہ میں احترام حاصل تھا۔ وہ دانشمند تھا۔ یہی وجہ تھی کہ محمود غزنوی نے قنوج پر حملے سے پہلے فوج کو آرام دینے اور دستوں کو ازسرِنو منظم کرنے کی ضرورت محسوس کی تھی۔ اُس نے قنوج اور گردونواح میں اپنے جاسوس بھیج دیئے تھے۔ اُسے جو معلومات دی گئی تھیں، ان کے مطابق، قنوج کے راستے میں دو اور ریاستیں تھیں جن کے حکمران مہاراجے نہیں رائے تھے۔ ان میں ایک رائے چندا تھا اور دوسرا چاندل بھور۔ چھوٹے چھوٹے اور رائے بھی تھے اور یہ سب مہاراجہ قنوج راجیا پال کے اتحادی تھے۔

جاسوسوں نے جن مقامی باشندوں کو مُخبر (ایجنٹ) بنایا تھا، ان کی زبانی پتہ چلا تھا کہ لاہور کا مہاراجہ بھیم پال نِڈر بھی اس خطے میں کہیں موجود ہے اور وہ یہاں کے مہاراجوں اور رائیوں کو محمود غزنوی کے خلاف متحد کرتا پھر رہا ہے۔ وہ خود محمود غزنوی کے سامنے نہیں آسکتا تھا کیونکہ وہ سلطان کا باجگزار تھا اور اُس نے سلطان کے ساتھ جنگ نہ کرنے اور غزنی کی فوج کو ہر طرح کی مدد دینے کا معاہدہ کر رکھا تھا۔ سلطان محمود نے اُسے ڈھونڈنے اور اگر ممکن ہو سکے تو پکڑ لانے کے لیے آدمی بھیج رکھے تھے مگر اُس کا کہیں سراغ نہیں مل رہا تھا۔

قنوج متھرا سے ڈیڑھ سو میل دور دریائے گنگا کے دائیں کنارے پر واقع ہے اور متھرا دریائے جمنا کے دائیں کنارے پر۔ اس طرح محمود غزنوی کو دو دریا عبور کرنے تھے مگر راستے میں جو راجے اور رائے قلعوں میں بیٹھے تھے، انہیں نہ تیغ کرنا ضروری تھا، ورنہ قنوج کو محاصرے میں لینے کی صورت میں یہ سب سلطان پر عقب سے حملہ کر دیتے۔ سلطان پیشقدمی جلدی کرنا بہتر سمجھتا تھا تاکہ قنوج کا دفاع زیادہ مضبوط نہ ہونے پائے۔

راستے میں جمنا کے بائیں کنارے پر مُنج نام کا ایک مضبوط قلعہ اور چھوٹی سی ریاست تھی۔ اسے مجھاون بھی کہتے ہیں۔ اُس زمانے میں یہ "برہمنوں کا قلعہ" کے نام سے مشہور تھا۔ قنوج اور مُنج کا درمیانی فاصلہ صرف ستائیس میل تھا۔ منج ہندو راجپوتوں کا گڑھ تھا۔ یہ لوگ غیر متمدن اور جنگ و جدل کے شیدائی تھے۔ ان کی عورتیں بھی بہادر اور

ہر قربانی دینے والی تھیں۔ مہاراجہ قنوج کو منج کے راجپوتوں پر اعتماد تھا۔ اُس نے ان کے ساتھ دوستی اور جنگی تعاون کا معاہدہ کر رکھا تھا۔

ایک روز منج کے لوگ دریائے جمنا میں نہا رہے تھے۔ مردوں سے دُور عورتیں بھی دریا میں اُتری ہوئی تھیں۔ ہندوؤں کے لیے صبح دریا میں نہانا مذہبی فریضہ ہے۔ منج کا قلعہ دریا کے عین کنارے پر واقع تھا۔ اچانک عورتوں کی چیخ و پکار بلند ہوئی اور عورتیں کنارے کی طرف بھاگیں۔ مرد دوڑے آئے۔ وہ سمجھے کہ دریا سے شاید مگرمچھ یا کوئی اور آفت نکلی ہے مگر وہاں کچھ اور ہی نظر آیا۔ دریا میں لاشیں بہتی آ رہی تھیں اور پانی کا رنگ بھی بدلا ہوا تھا۔ پہلے چند ایک لاشیں نظر آئیں پھر دریا جیسے لاشوں کا دریا بن گیا ہو۔ دریا پر جو پنڈت اور دیگر مذہب پرست لوگ تھے، وہ ہاتھ جوڑ کر دوزانو بیٹھ گئے اور بھجن الاپنے لگے۔ اُن کے جسم کانپ رہے تھے اور اُن کے بھجن بھی کانپ رہے تھے۔

قلعے کی دیواروں پر کھڑے سنتریوں نے دیکھا تو اُن کی بھی حالت غیر ہونے لگی۔ یہ راجپوت کسی سے ڈرنے والے نہیں تھے لیکن وہ زندہ لوگوں سے نہیں ڈرتے تھے۔ اتنی زیادہ لاشیں کسی غیبی آفت کا پتہ دیتی تھیں۔ دریا سے جو پنڈت بھاگ آئے تھے، انہوں نے مندر کے گھڑیال اور سنکھ بجانے شروع کر دیئے۔ سارے شہر میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ رائے چند کو اطلاع ملی تو وہ دوڑتا قلعے کی دیوار پر جا چڑھا۔ اُس کے ساتھ اُس کے فوجی افسر اور درباری تھے۔

"جانتے ہو یہ کیا ہے؟"۔ اُس نے سب سے مخاطب ہو کر کہا ۔۔۔ "یہ متھرا اور مہابن کی لاشیں ہیں۔ کیا تم نے یہ خبر نہیں سُنی تھی کہ غزنی کے مسلمانوں نے متھرا پر قبضہ کر کے وہاں کے تمام مندر اجاڑ ڈالے ہیں؟" ۔۔۔ قلعے کی دیوار سے اُسے وہ لوگ شہر کی جانب دوڑتے نظر آ رہے تھے جو لاشوں کو دیکھ کر دریا سے بھاگے آ رہے تھے۔ رائے چند نے کہا ۔۔۔ "دیکھو اِن بزدلوں کو۔ لاشوں سے ڈر کر بھاگے آ رہے ہیں۔ انہیں معلوم نہیں کہ یوں بزدلی دکھائی تو ہم سب کی لاشیں اسی طرح دریا میں بہیں گی

اور ہماری عورتیں مسلمانوں کے قبضے میں ہونگی۔"

مندر کی گھنٹیوں، گھڑیال اور سنکھوں کی آوازیں اور زیادہ بلند ہو گئی تھیں اور اب لوگ گلیوں میں بھی "ہرے رام، ہرے کشن" کا بلند ورد کرنے لگے تھے۔ عورتیں بھی گلیوں میں نکل آئی تھیں۔ شہر کی یہ آوازیں بڑی ڈراؤنی تھیں۔ رائے چندا کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ آخر وہ پھٹ کر بولا۔ "بند کرو یہ سنکھ اور گھڑیال۔ شہر میں یہ کیا ماتم ہو رہا ہے۔ راجپوت کس کی لاش پر رو رہے ہیں۔ پنڈتوں کو یہاں لے آؤ۔"

رائے چندا کے محافظ اور سپاہی دوڑ پڑے اور کچھ دیر بعد شہر پر سناٹا طاری ہو گیا۔ رائے چندا نیچے چلا گیا اور اپنے عام کمرے میں جا بیٹھا۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ دو پنڈت آگئے اور ان کے ساتھ ہی ایک اور آدمی کو اندر لایا گیا جس کے کپڑے بھیگے ہوئے تھے اور اس کی سانسیں اکھڑی ہوئی تھیں۔ رائے چندا کو بتایا گیا کہ یہ آدمی دریا سے زندہ نکالا گیا ہے۔ لکڑی کے ایک شہتیر کے سہارے تیرتا آ رہا تھا۔ رائے چندا نے اسے کہا کہ وہ سب کو بتائے کہ جن لاشوں کے ساتھ وہ تیرتا آیا ہے وہ کن لوگوں کی ہیں اور کہاں سے آئی ہیں۔

"یہ مہابن کی فوج کی لاشیں ہیں" ــــ اس نے کہا ــــ "اور میں مہابن کی فوج کا آدمی ہوں۔ ہمیں بتایا گیا کہ غزنی کی مسلمان فوج قلعوں پہ قلعے فتح کرتی آ رہی ہے اور اس کا رخ متھرا کی طرف ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ مہابن کا جنگل کتنا گھنا اور کتنی دور دور تک پھیلا ہوا ہے۔ ہمارے مہاراجہ گول چند نے تمام فوج اس جنگل میں پھیلا دی۔ تیر اندازوں کو درختوں پر چڑھا دیا۔ ہاتھیوں کو ایک طرف کھڑا کر دیا کہ حکم ملتے ہی مسلمانوں کو کچلنے کے لیے دوڑا دیئے جائیں گے۔ مسلمانوں کی فوج کو اسی جنگل سے گزرنا تھا۔ پھر میں آپ کو بتا نہیں سکتا کہ کیا ہوا۔ جنگل کے اندر مسلمانوں کی بہت تھوڑی سی فوج آئی۔ ہماری فوج نعرے لگانے لگی ــــ ایک کو بھی نہ جانے دو..... ان کی لاشیں متھرا کے مندر کے سامنے جلائیں گے۔ جنگل کی تین طرفوں سے جیسے طوفان آگیا ہو۔ پیچھے سے، دائیں اور بائیں سے مسلمان ہم پر ٹوٹ پڑے۔ جن ہاتھیوں کو مسلمانوں پر چھوڑنا تھا، وہ چنگھاڑتے ادھر ادھر دوڑ پڑے۔ درختوں پر ہمارے جو تیر انداز تھے وہ تیر کھا کھا کر گرنے لگے۔

اُن کے تیروں سے مسلمان بھی مرے لیکن وہ خود بھی زندہ نہ رہے۔ درختوں سے اُن کی لاشیں گر رہی تھیں ......

"ہماری فوج بھاگ اُٹھی۔ ہمارے پیچھے مسلمان جنگل کو صاف کرتے آرہے تھے۔ ایسے لگتا تھا جیسے درخت جڑوں سے اُکھڑ رہے ہوں۔ آگے جمنا تھا۔ ہماری فوج جمنا میں کود گئی۔ زخمی بھی دریا میں اُتر گئے۔ مسلمان تیرانداز دریا کے کنارے سے ہم پر تیر برسانے لگے۔ وہ گھوڑے کنارے کے ساتھ ساتھ دوڑاتے اور ہم پر تیر چلاتے تھے۔ دریا میں چیخوں اور واویلے کے سوا کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔ تیروں سے بچنے کے لیے جو ڈبکی لگاتے تھے وہ ڈوب جاتے تھے۔ تیراندازوں نے کسی کو دوسرے کنارے پر بھی نہ جانے دیا۔ میں ایک لکڑی کے تختے پر تیرتا آیا ہوں۔ بے شمار آدمی بہت دُور آکر بھی دریا سے نہ نکلے کہ مسلمان مار ڈالیں گے۔ یہاں آکر میں نے باہر آنے کی جرأت کی۔ مجھے معلوم نہیں کہ مہابن میں ہمارے بعد کیا ہُوا ہے"۔

"وہ میں بتاتا ہوں" ــــ رائے چندا نے گرج کر کہا ــــ "مجھے اطلاع مل چکی ہے۔ تمہارے راجہ کُول چند نے اپنی عورتوں اور بچّوں کے ساتھ خودکُشی کرلی ہے۔ اُس کے تمام ہاتھی مسلمانوں کے پاس ہیں، اور غزنی کے سلطان محمود نے متھرا کا بڑا مندر اور تمام چھوٹے مندر صاف کردیئے ہیں۔ وہاں کے لوگ اب سنکھ اور گھڑیال نہیں اذانیں سُنتے ہیں"۔

"ہرے رام۔ ہرے رام" ــــ دونوں پنڈتوں نے کہا اور بڑا پنڈت بولا ــــ "اِن ملیچھ مسلمانوں پر ایسی آفت پڑے گی کہ ان کی بوٹیاں چیلیں، گدھ اور کُتّے کھائیں گے۔ کرشن واسدیو کا قہر ان کے بچّوں کو بھی بھسم کردے گا۔ مہاراج! ہر ہر مہادیو بہت بڑی قربانی مانگتے ہیں۔ اگر آپ قہر سے بچنا چاہتے ہیں تو ایک کنواری کی جان کی قربانی دینی پڑے گی۔ میں آپ کو حساب کرکے بتاؤں گا کہ اور کیا کچھ کرنا پڑے گا۔ آکاش پر ستاروں کی گردش کے راستے بدلے بدلے سے ہیں۔ یہ میں آپ کو ابھی بتا دیتا ہوں۔ یہ نچھتر چندرماں کا ہے۔ مگھا، پوربا، پھالگنی، ہست، چترا، ستری نچھتر ہیں۔ چندرماں جل برجوں سے گزر رہا ہے۔ یہ سمے راج پاٹھ کے لیے بہت بُرا

ہے۔ سورگ کے دروازے کھل گئے ہیں۔ ملش مکھیوں کی طرح مریں گے۔ آپ دیکھ رہے ہیں۔ اس میں ہری کشن واسدیو کا کرودھ شامل ہو گیا ہے۔ یہ ہمیں پُن اور پراپکھا کا ہے.... ہم آپ کی جنم پتری پھر دیکھیں گے۔ اگر بلیدان میں دیر ہوئی تو ہندو دیویاں مسلمانوں کے بچے" پیدا کریں گی۔ اپنی دیویوں کی کوکھ کو ملیچھوں کے بیج سے بچانے کے لیے اور انہیں پوتّر رکھنے کے لیے ہمیں مہادیو کے چرنوں میں ایک سے زیادہ کنواریوں کا بلیدان دینا ہوگا۔"

رائے چندرا کے چہرے کا رنگ بدلتا جا رہا تھا۔ اُس کی گھنی مونچھیں کانپنے لگی تھیں۔ وہ پنڈتوں کو قہر کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پنڈت ابھی بول رہا تھا کہ رائے چندرا پھٹ پڑا۔

"آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جو کچھ ہو گا مندر میں ہو گا"___ رائے چندرا نے گرج کر کہا___"دو تین کنواریاں آپ کے حوالے کر دی جائیں گی اور آپ انہیں دس پندرہ روز اپنے پاس رکھیں گے پھر ان کی گردنیں کاٹ دیں گے۔ آپ یہ کیوں نہیں کہتے کہ بچہ بچہ باہر نکلے اور غزنی کے لٹیروں سے انتقام لے؟"

"چھی چھی چھی مہاراج!" پنڈت نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ کر کہا___"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ دھرم کی یوں ہتیا نہ کریں۔ یہ برہمنوں کا قلعہ ہے اور برہمن بھگوان کے بہت قریب ہوتے ہیں۔ جو ہم جانتے ہیں وہ آپ نہیں جانتے۔ آپ آکاش کے تاروں کے راستے نہیں روک سکتے۔ خون کا بلیدان...."

"بلیدان۔ بلیدان"___ رائے چندرا نے گرج کر کہا___"خون کی قربانی صرف دو تین کنواریاں نہیں دیں گی۔ راجپوتوں کا بچہ بچہ اپنے خون کی قربانی دے گا۔ راجپوتوں کی ہر ایک کنواری خون کی قربانی دے گی... اور یاد رکھو پنڈت جی مہاراج! اس قلعے کا نام برہمنوں کا قلعہ ہے لیکن یہ قلعہ راجپوتوں کا ہے۔ راجپوت ایک ہی بات سمجھتے ہیں.... دشمن کی موت یا اپنی موت.... راجپوت اپنی فتح پر اپنے مذہب کو بھی قربان کر دیا کرتا ہے۔"

"مہاراج!"___ پنڈت نے کہا___"اپنی رعایا پر رحم کریں۔ میں جو کہتا ہوں

سن لیں۔ مذہب کی قربانی کی بات نہ کریں۔"

"ہمیں مذہب کی زنجیریں نہ ڈالو"۔۔۔ رائے چندا نے کہا ۔۔۔ "راجدھانی کی بے عزّتی ہو رہی ہو، لوگ بھوک کے مر رہے ہوں، دنیا فنا ہو رہی ہو، آپ جیسے مذہبی پیشوا اپنا ہی راگ الاپتے رہتے ہیں۔ آپ کو میدان میں جاکر لڑنا نہیں پڑتا۔ مندر میں بیٹھے آپ کی پیٹ پوجا ہوتی رہتی ہے۔ آپ کو مُٹھی چاپی کے لیے کنواریاں بھی ملتی رہتی ہیں۔"

"مہاراج!۔۔۔ پنڈت نے غصّے سے کہا۔۔۔ "متھرا کی تباہی کی خبر سُن کر اور دریا میں اتنی زیادہ لاشیں بہتی دیکھ کر آپ کا دماغ چل گیا ہے۔ آپ میری نہیں، اپنے دھرم کی بے عزّتی کر رہے ہیں۔"

"کونسے دھرم کی بات کر رہے ہیں آپ؟"۔۔۔ رائے چندا نے طنزیہ کہا۔۔۔ "کیا آپ نے سُنا نہیں کہ بلند شہر کے دس ہزار ہندو اپنے راجہ ہردت سمیت دھرم پر لات مار کر مسلمان ہو گئے ہیں؟ کیا آپ جانتے ہیں انہوں نے اپنا دھرم کیوں چھوڑا ہے؟"

"اپنی جانیں بچانے کے لیے"۔ پنڈت نے کہا۔۔۔ "وہ بزدل تھے۔ مسلمانوں کی تلواروں سے اور قید سے ڈر گئے۔"

"نہیں"۔۔۔ رائے چندا نے کہا۔۔۔ "انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ دیوتاؤں کے بُت اور دیویوں کی مُورتیاں نہ اپنے آپ کو بچا سکیں نہ کسی راجے کی پرجا کو۔"

وہاں رائے چندا کی جوان بہن شیلا کماری اور نوجوان بیٹی رادھا بھی موجود تھیں اور رادھا کی ماں بھی وہیں تھی۔ شیلا کماری نے پنڈت سے کہا۔"کیا عورت مندر میں پنڈتوں کے ہاتھوں قربان ہونے کے لیے پیدا ہوتی ہے؟"

"اب کسی لڑکی کی جان کی قربانی نہیں دی جائے گی"۔۔۔ رائے چندا کی رانی لکشمی نے کہا۔۔۔ "اگر آپ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں نے جو تباہی مچائی ہے وہ دیوتاؤں کا قہر ہے تو ہم اس قہر کا مقابلہ کریں گے۔"

دونوں پنڈت غصّے میں کچھ بڑبڑاتے چلے گئے۔

رائے چندا کی بہن شیلا نے اُسے کہا۔ "بھیا! کیا آپ نے کبھی سوچا ہے کہ غزنی کے سلطان محمود کو کسی طریقے سے قتل کر دیا جائے تو اس کے آئے دن کے حملے ختم ہو سکتے ہیں؟"

"ہمیں بہت کچھ سوچنا ہے میری بہن!"۔۔۔ رائے چندا نے کہا۔ "ہمارے امتحان کا وقت آ رہا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ محمود غزنوی کو جنگ میں قتل کرنا آسان نہیں، اور اُسے دھوکے سے قتل کرنا بھی مشکل ہے۔ پھر بھی میں سوچوں گا۔ سب سے پہلے ہمیں مہاراج قنوج کے پاس چلنا ہے۔ غزنی کا یہ سلطان متھرا میں نہیں بیٹھا رہے گا نہ وہاں سے ہی واپس جائے گا۔"

اُس نے حکم دیا کہ قنوج کو روانگی کا انتظام کیا جائے۔

فاصلہ صرف ستائیس میل تھا۔ رائے چندا اپنی رانی لکشمی، بہن شیلا اور بیٹی رادھا کے ساتھ اُسی وقت روانہ ہو گیا۔ اُس کے ساتھ فوجی مشیر اور افسر بھی تھے اور وزیر بھی ساتھ تھا۔ یہ قافلہ شام تک قنوج پہنچ گیا۔

اُسی رات رائے چندا نے مہاراجہ قنوج راجیا پال سے صورتِ حال کے متعلق بات چیت کر لی۔ راجیا پال نے اُسے کہا۔ "ہم اکھٹے کھلے میدان میں نہیں لڑ سکتے۔ میرے پاس مہابن اور متھرا سے جو آدمی آئے ہیں، انہوں نے بتایا ہے کہ کھلے میدان میں غزنی والوں کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہمیں قلعہ بند ہو کے لڑنا پڑے گا۔ مجھے نظر یہ آ رہا ہے کہ محمود آپ کا محاصرہ کرے گا۔ اُس کی دراصل نظر قنوج پر ہے۔ اگر اس نے آپ کا محاصرہ کیا تو میں باہر سے محاصرے پر حملے کر کے اُسے کمزور کرنے کی کوشش کروں گا، اور اگر وہ سیدھا قنوج پر آیا تو میں آپ سے توقع رکھوں گا کہ آپ اُس کے عقب پر حملے کرتے رہیں گے۔"

مُنج کا رائے چندا بہت بھڑکا ہوا تھا۔ تقریباً تمام مورخوں نے لکھا ہے کہ مُنج کے راجپوت صحیح معنوں میں غیرت مند اور دلیر تھے۔ میدانِ جنگ میں ان پر قابو پانا آسان نہیں ہوتا تھا۔ ان کی عورتوں کے متعلق لکھا گیا ہے کہ بہت حسین اور غیر معمولی طور پر

جرأت مند تھیں اور یہ قوم برہمنوں سے بہت مختلف تھی۔ رائے چندا کا پنڈتوں اور مذہب کو دھتکار دینا اُس کی حماقت نہیں بلکہ جرأت اور بے خوفی کی دلیل تھی۔

رائے چندا کی بہن اور بیٹی کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ دونوں بہت ہی خوبصورت تھیں۔ اُن کے حسن کے چرچے دُور دُور تک ہوتے تھے۔ قنوج کے مہاراجہ راجیا پال کا بیٹا لچھمن پال رائے چندا کی بہن شیلا کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا مگر رائے چندا نے شیلا کی شادی لاہور کے مہاراجہ بھیم پال ندڑ کے بھائی ترلوچن پال کے ساتھ کرنے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ اگر محمود غزنوی حملہ نہ کر دیتا تو یہ شادی ہو چکی ہوتی۔

رات کو جس وقت مہاراجہ راجیا پال اور رائے چندا متھرا کی تباہی اور محمود غزنوی کے متوقع حملے کی باتیں کر رہے تھے اور اُن کے مشیر اور وزیر مقابلے کے منصوبے بنا رہے تھے، اُس وقت راجیا پال کا بیٹا لچھمن پال محل کے باغ کے اندھیرے کونے میں کھڑا کسی کا انتظار کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد دو عورتیں اس اندھیرے کونے کی طرف اس طرح جا رہی تھیں جیسے سائے چل رہے ہوں۔ ذرا آگے جا کر سائے رُک گئے۔ ایک عورت نے دوسری سے کہا۔ "آپ آگے چلی جائیں۔ راجکمار مل جائیں گے۔"

دوسری نے اُس کے ہاتھ میں سونے کا ایک سکہ دیتے ہوئے کہا۔ "کسی کو پتہ نہ چلے کہ میں یہاں آئی اور راجکمار لچھمن سے ملی تھی۔"

وہ رائے چندا کی بہن شیلا تھی۔ لچھمن پال نے اپنی خاص ملازمہ کو بھیج کر شیلا کو ایک تاریک گوشے میں بلایا تھا۔

شیلا اپنی ماں اور بھتیجی رادھا کو بتلائے بغیر چلی آئی تھی۔ یہ سب رائے چندا کے ساتھ قنوج آئی ہوئی تھیں۔

اُسے دیکھ کر لچھمن پال آگے بڑھا اور بولا۔ "مجھے اُمید نہیں تھی کہ تم آجاؤ گی۔ میں یہاں سے تمہیں پیغام بھیجتا رہا ہوں اور تم ہر بار یہی جواب دیتی رہی ہو کہ تمہیں میری محبت قبول نہیں۔ مجھ میں کیا کمی ہے؟ کیا میں تمہارے قابل نہیں؟

میں جانتا ہوں تمہاری شادی مہاراجہ بھیم پال کے چھوٹے بھائی سے ہو رہی ہے۔ کیا تم یہ فیصلہ بدل نہیں سکتیں؟ کیا تمہیں وہی راجکمار پسند ہے؟"

"تم خوبصورت جوان ہو لچھمن!" ــــ شیلا نے کہا ــــ "میرا اپنا کوئی فیصلہ نہیں لیکن اب میں سمجھنے لگی ہوں کہ تم میرے قابل نہیں۔ اُدھر غزنی کے مسلمان ہم پر طوفان کی طرح آرہے ہیں، متھرا اور مہابن کی تباہی کو میں نے جمنا میں بہتی ہوئی ہزاروں لاشوں کی صورت میں دیکھا ہے۔ متھرا کے مندروں میں مسلمان اذانیں دے رہے ہیں، وہ ہری کرشن واسدیو کا بت اٹھالے گئے ہیں، بلند شہر کے دس ہزار ہندو مسلمان ہو چکے ہیں اور تم مجھے حاصل کرنے کی فکر میں ہو۔ کیا تم میں غیرت نہیں؟ اب مسلمان قنوج اور منج کو فتح کرنے آرہے ہیں۔"

"مجھ میں سب کچھ ہے" ــــ لچھمن پال نے کہا ــــ "مگر تمہاری محبت نے مجھے پاگل کر رکھا ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم شادی کا فیصلہ بدل سکتی ہو اور میرے ساتھ شادی کر سکتی ہو۔"

"میں کسی کو نہیں چاہتی" ــــ شیلا نے کہا ــــ "نہ مہاراجہ بھیم پال کے بھائی کو نہ تمہیں۔ میں اُسی کو چاہنے لگوں گی جس کے ساتھ میری شادی ہو جائے گی .... لچھمن پال! میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ تمہیں میرے ساتھ محبت نہیں تم میرا حسن اور میرا جسم چاہتے ہو۔ چند برسوں بعد جب میرے چہرے پر نوجوانی کے آثار مدھم پڑنے لگیں گے تو تم ایک اور نوجوان لڑکی لے آؤ گے۔ تمہارے باپ نے اس عمر میں میری عمر کی چمپا رانی سے شادی کی تھی۔ کہاں ہے چمپا رانی؟ متھرا کے قلعے میں غزنی کے ایک جاسوس کے ساتھ بھاگتے ہوئے ماری گئی۔ تم اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلو گے۔ مجھے تم سے محبت نہیں۔"

"پھر میرے بلانے پر کیوں آگئی ہو؟" لچھمن پال نے پوچھا۔

"ایک شرط لے کر آئی ہوں" ــــ شیلا نے کہا ــــ "اگر پوری کردو تو تمہاری بیوی بن جاؤں گی۔ اگر میرا بھائی نہیں مانے گا تو وعدہ کرتی ہوں کہ تمہارے پاس آجاؤں گی۔" ر

"فوراً بتاؤ"۔ چھمن پال نے خوش ہو کر کہا۔"جو کہو گی کر دکھاؤں گا"۔

"غزنی کے سلطان کو متھرا میں قتل کرنا ہے"۔ شیلا نے کہا۔

"متھرا میں کیوں؟" چھمن پال نے کہا۔"میں اُسے میدان میں قتل کروں گا۔ اُس کا سر کاٹ کر تمہارے قدموں میں لا رکھوں گا"۔

"چھمن!"۔ شیلا نے سنجیدگی سے کہا۔"تم مُنج کی ایک راجپوت لڑکی کے ساتھ باتیں کر رہے ہو۔ مجھے بھیّا نے بتایا ہے کہ متھرا کے مندر میں تمام راجوں مہاراجوں نے واسدیو کے قدموں میں بیٹھ کر قسمیں کھائی تھیں کہ محمود کا سر اس بُت کے قدموں میں رکھیں گے اور اس کے خون سے کرشن مہاراج کے پاؤں دھوئیں گے۔ کہاں ہیں وہ راجے اور مہاراجے؟ سب بھاگ گئے اور بلند شہر کے رائے ہردت نے اپنی دس ہزار فوج کی تلواریں محمود کے قدموں میں رکھ کر اُس کا مذہب قبول کر لیا۔ ہمارے ہری کرشن واسدیو کے قدموں تلے سے وہ چبوترا نکل گیا ہے جس پر اُسے پنڈتوں نے کھڑا کیا تھا"۔

"یہ مسلمان لٹیرے ہیں"۔ چھمن پال نے کہا۔"انہیں سونا مندروں سے ملتا ہے، اس لیے مندر اُجاڑ جاتے ہیں"۔

"چھمن! ہوش میں آؤ"۔ شیلا نے کہا۔"بھارت ماتا کی عزّت کے محافظ صرف راجپوت ہیں اور میں ایک راجپوت کی بیٹی ہوں۔ میرے بھائی نے مجھے جس استاد کے حوالے کیا تھا وہ بہت دانشمند بزرگ ہے۔ میں نے پہلے پہل جب غزنی کے حملوں کے متعلّق سنا تھا تو اپنے استاد سے کہا تھا کہ لوگ کہتے ہیں کہ مسلمان لٹیرے ہیں اور لوٹنے آتے ہیں۔ میں نے اب متھرا کی تباہی کی خبر سنی تو بھی اس سے پوچھا تھا کہ مسلمان صرف لوٹنے آئے ہیں یا ہمارے علاقوں پر قبضہ کر لیں گے؟ .... اُس نے مجھے بتایا ہے کہ محمود غزنوی لٹیرا نہیں۔ وہ ہمارے مذہب کو ختم کرنے اور اپنا مذہب پھیلانے آیا ہے۔ استاد نے کہا ہے کہ لٹیرے کا کوئی مذہب نہیں ہوتا اگر محمود کو مذہب کی بجائے دولت سے دلچسپی ہوتی تو راجہ ہردت اپنی فوج کے ساتھ اُس کا مذہب قبول نہ کرتا ....

"اور میں نے استاد سے پوچھا تھا کہ مسلمان عورتیں کیسی ہوتی ہیں؟ کیا وہ ہندو راجپوتوں کی عورتوں کی طرح دلیر ہوتی ہیں؟ استاد نے بتایا ہے کہ وطن سے اتنی دور آکر لڑنے اور فتح پانے والے سپاہیوں کی مائیں یقیناً دلیر ہوتی ہیں۔ مسلمان عورتیں غیر مسلموں کے خلاف جنگ میں اپنے بیٹوں کو بھیج کر فخر کرتی ہیں..... لچھمن! تم جنہیں لٹیرا کہہ رہے ہو وہ کسی معمولی قوم کے لوگ نہیں۔ میں ان کا مقابلہ کرنا چاہتی ہوں۔ میں اپنی قوم کو بتانا چاہتی ہوں کہ ہندو راجپوت عورت مسلمان عورت سے زیادہ دلیر ہوتی ہے۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ تم نہیں مانو گے تو میں فوج کے کسی سپاہی کو ساتھ لے لوں گی اور محمود غزنوی کو قتل کروں گی۔ اگر میں زندہ رہی تو اپنا آپ ہمیشہ کے لیے اس سپاہی کے حوالے کر دوں گی..... کہو، تم محمود کو قتل کرو گے؟"

"تمہاری خاطر تمہاری شرط پوری کروں گا۔"

"میری خاطر نہیں"۔۔۔ شیلا نے کہا۔۔۔ "اپنے دھرم اور اپنے دیس کی خاطر..... اگر پیٹھ دکھا جاؤ گے تو میں، میری بھتیجی رادھا اور تمہاری بہنیں مسلمانوں کے خیموں میں ہوں گی اور وہ مسلمان بچوں کو جنم دیں گی۔"

"میں محمود کو قتل کروں گا۔"

"متھرا میں"۔۔۔ شیلا نے کہا۔۔۔ "وہ مرگیا تو اس کی فوج بیکار ہو جائے گی۔ وہ متھرا سے آگے نہ آئے۔ تم برہمن ہو۔ برہمن کو اپنے مذہب کا زیادہ خیال ہوتا ہے۔ میری رگوں میں راجپوت کا خون ہے۔ میں تمہیں صاف بتا دیتی ہوں کہ میرے دل میں تمہاری وہ محبت نہیں جو تم اپنے دل میں بٹھائے ہوئے ہو، لیکن میں وعدہ کرتی ہوں کہ محمود کو قتل کر دو تو ساری عمر تمہاری غلام رہوں گی۔"

"اور اگر میں مارا گیا؟"

"تو تمہاری چتا پر کھڑی ہو کر زندہ جل جاؤں گی۔"

لچھمن اور شیلا دربان کے روکنے کے باوجود اس کمرے میں داخل ہو گئے جس میں قنوج کا راجپال اور منج کا راجے چند اپنے مشیروں، وزیروں اور فوج کے اعلیٰ افسروں کے ساتھ بیٹھے

محمود غزنوی کو ہندوستان سے نکالنے کے منصوبے تیار کر رہے تھے۔ راجیاپال نے دونوں کو دیکھ کر کہا کہ وہ چلے جائیں۔

" ہم اُسی کام کے لیے آئے ہیں جس پر آپ غور کر رہے ہیں"۔ پچھمن پال نے کہا ــــ "بدتمیزی کی معافی چاہتا ہوں۔ آپ نے جو کچھ بھی سوچا ہے اسے ذرا الگ رکھ دیں.... کیا آپ نے یہ سوچا ہے کہ غزنی کے سلطان کو متھرا میں قتل کیا جاسکتا ہے؟ اُس کے قتل سے اس کی ساری فوج آپ کی قیدی ہوگی"۔

سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ راجیاپال کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

" ہم نے ابھی یہ نہیں سوچا"۔ رائے چندا نے کہا ــــ" اس کام کے لیے بہت دلیر اور بڑے ہی عقلمند آدمیوں کی ضرورت ہے"۔

"اور ایسے آدمیوں کی ضرورت ہے جو محمود غزنوی کو اپنا ذاتی دشمن سمجھیں"۔ــــ پچھمن پال نے کہا "کرائے کے قاتل یہ کام نہیں کرسکیں گے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کرائے کے قاتل وہاں جاکر مسلمانوں سے انعام واکرام لے لیں اور انہی کے ہو کے رہ جائیں۔ یہ کام کوئی راجکمار کرسکتا ہے"۔

" ایسا راجکمار کون ہوسکتا ہے"؟ راجیاپال نے پوچھا۔

" وہ آپ کے سامنے کھڑا ہے"۔ پچھمن پال نے کہا ــ"وہ میں ہوں.... پچھمن پال"۔

رائے چندا نے مہاراجہ راجیاپال کے کندھے پر ہاتھ مار کر پچھمن پال سے کہا۔"راجکمار تم نے اپنے باپ کا سر فخر سے اونچا کر دیا ہے۔ اگر میرا کوئی بیٹا ہوتا تو میں اُسے تمہارے ساتھ بھیجتا"۔

" ہاں پچھمن!"ــــ اس کے باپ راجیاپال نے کہا ــــ"اگر تم یہ کام کرسکو تو غزنی کا سانپ بھی مر جائے گا اور ہماری فوج کی لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی"۔

" کیا آپ اس کام کو آسان سمجھتے ہیں؟" ــــ ایک بوڑھے فوجی مشیر نے کہا۔" کیا آپ اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ یہ لڑکا متھرا جائے گا اور غزنی کے سلطان کے دل میں خنجر اتار کر اسی طرح واپس آجائے گا جس طرح یہ اب کھڑا ہے؟"

" میں بھارت ماتا پر اپنی جان قربان کرنے کا عہد کر چکا ہوں"۔ــــ پچھمن پال نے کہا۔

" اور غزنی کا سلطان یہ عہد کر کے آیا ہے کہ یہاں کسی مندر کو اور کسی مہاراجے کی راجدھانی

کو سلامت نہیں رہنے دے گا"۔ بوڑھے مشیر نے کہا۔ "ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ محمود غزنوی کے بازو بڑے لمبے ہیں۔ ہماری کوئی بات اور کوئی حرکت اُس سے پوشیدہ نہیں۔ آپ نے دیکھ لیا ہے کہ جس محافظ کو ہم اپنا سب سے زیادہ قابلِ اعتماد سمجھتے رہے ہیں اور جو راج محل کے اُن رازوں سے بھی واقف تھا جن سے راجکمار بھی واقف نہیں ہوتے، وہ غزنی کا جاسوس تھا"۔

" اس کے باوجود میں اُسے قتل کرنے جاؤں گا"۔ لچھمن پال نے کہا۔ "مجھے ایسے کام کا کوئی تجربہ نہیں۔ مجھے بتا دیں کہ ایسے کام کس طرح کیے جاتے ہیں"۔

اس کے باپ مہاراجہ راجیاپال نے اس بوڑھے فوجی اور اپنے وزیر سے کہا کہ وہ لچھمن کو محمود غزنوی کے قتل کے لیے تیار کریں۔ اس نے کہا۔ "میں اپنے بیٹے کو اپنے دھرم اور دھرتی پر قربان کرتا ہوں"۔

"سب سے پہلے ذہن سے یہ خیال نکال دو کہ تمہارا مقابلہ ڈاکوؤں اور لیٹروں کے ساتھ ہے"۔ دوسرے دن وہ تجربہ کار بوڑھے لچھمن پال کو بتا رہے تھے۔ "محمود غزنوی صحیح معنوں میں جنگجو ہے اور اس کے سامنے جنگ کا ایک مقصد ہے۔ وہ اپنے ساتھ اپنا مذہب لایا ہے۔ اسے میدان میں شکست دینا آسان نہیں۔ اس کی عقل تک ہمارے مہاراجے نہیں پہنچ سکتے.... اور اُس تک اس طرح نہیں پہنچ سکتے کہ اُسے جا ملو اور قتل کر دو۔ صرف ایک بات یاد رکھو۔ مذہب کا کوئی کتنا ہی پابند کیوں نہ ہو، وہ ہوتا انسان ہے اور انسان کی سب سے بڑی کمزوری عورت ہے اور عورت کی سب سے بڑی کمزوری مرد ہے۔ تم ایک بہروپ میں متھرا جاؤ گے....

"بہروپ یہ ہوگا کہ تم قنوج کے جنگلوں میں بسنے والے ایک قبیلے کے سردار ہو۔ قبیلہ جنگجو ہے اور اُس کی تعداد پندرہ ہزار سے زیادہ ہے۔ تم کہو گے کہ مہاراجہ قنوج نے اس قبیلے کو غزنی کی فوج کے خلاف لڑنے کے لیے تیار کر لیا ہے، مگر تم جو اس قبیلے کے سردار ہو، مسلمانوں کے خلاف نہیں لڑنا چاہتے۔ اس کی بجائے تم راجہ ہردت کی طرح اپنے تمام قبیلے سمیت مسلمان ہونا چاہتے ہو۔ یاد رکھو راجکمار! تمہیں سلطان محمود تک کوئی

نہیں جانے دے گا۔ تم کہو گے کہ ایک دو راز کی باتیں ہیں جو تم صرف سلطان کو بتانا چاہتے ہو۔ اس کے باوجود تمہیں سلطان سے نہ ملنے دیں تو کہنا سلطان خفیہ طریقے سے قتل ہو جائے گا۔ مجھے اُمید ہے کہ وہ ملاقات کی اجازت دے دیں گے۔"

"آپ نے عورت کا ذکر کیا تھا" ۔ چھمن پال نے کہا ۔ "اس سے آپ کا مطلب کیا ہے ؟"

"تمہارے ساتھ کم از کم دو نہایت خوبصورت اور جوان عورتیں ہونی چاہئیں" ۔۔۔ استاد نے کہا ۔ "انہیں بیویاں ظاہر کرو گے" ۔۔۔ اُس نے رازداری سے کہا ۔۔۔ "اگر یہ عورتیں عقل مند ہوں تو سلطان کی فوج کے سالاروں کو ایک دوسرے کا دشمن بنا سکتی ہیں ۔ مجھے یہ بھی توقع ہے کہ سلطان بھی ان عورتوں پر فریفتہ ہو جائے گا ۔ اگر وہ انہیں اپنے ساتھ رکھنے کو کہے تو ہاں جانا ۔ ان کے پاس زہر ہونا چاہیے جو وہ اُسے شربت یا شراب میں پلا سکتی ہیں ۔ ہم تمہیں ایسی دو جوان لڑکیاں دے دیں گے ۔ تمہیں جنگلی قبیلے کے سرداروں جیسا لباس پہنائیں گے ۔"

فوجی مشیر اور وزیر نے جو جاسوسی اور جنگ کا تجربہ رکھتا تھا، چھمن پال کو عملی تربیت دینی شروع کر دی کہ وہ محمود غزنوی کو کس طرح قتل کرے گا اور وہاں سے کس طرح نکلے گا ۔

"ایک عورت میں خود ہوں گی اور دوسری میری بھتیجی رادھا ہو گی" ۔۔۔ رائے چندا کی بہن شیلا چھمن پال سے کہہ رہی تھی ۔ چھمن پال اُسے رات کو ملا تھا اور اُسے بتایا تھا کہ اُس کے استادوں نے اُسے کس طرح تیار کیا ہے اور کہا ہے کہ دو جوان اور خوبصورت عورتوں کا ہونا لازمی ہے ۔ شیلا نے رادھا کو بھی بلا لیا اور اُسے بتایا کہ وہ کیا فیصلہ کر چکی ہے اور چھمن پال کس کام کے لیے جا رہا ہے ۔ رادھا نے فوراً رضامندی کا اظہار کر دیا ۔ تینوں رائے چندا کے پاس چلے گئے ..... وہ کچھ ہچکچایا ۔

"یہاں لڑکیوں کو مندروں میں قربان کر دیا جاتا ہے" ۔۔۔ رادھا نے کہا ۔ "آپ

خود کہتے ہیں کہ انسانی قربانی سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ ہم دونوں جو قربانی دینے جا رہی ہیں، اس سے آپ کو بہت کچھ حاصل ہو گا۔ اگر کھیمن پال کے ساتھ کوئی اور عورتیں گئیں تو وہ اسے دھوکہ دے سکتی ہیں۔"

شیلا اور رادھا کا حسن اور ان کے جسموں کی دلکشی سارے علاقے میں مشہور تھی۔ ان کی بہادری پر بھی کسی کو شک نہیں تھا۔ ان میں عقل بھی تھی اور وہ محمود غزنوی کے قتل کو اپنا ذاتی فرض سمجھتی تھیں۔ دونوں نے اپنے باپ اور کھیمن پال کو مجبور کیا کہ وہ اُس کے ساتھ چلی جائیں۔

ان سب کے لیے ایسے جنگلی قبیلے کا لباس تیار کیا گیا جس کا کوئی وجود نہیں تھا۔ ان کے ساتھ دو قابلِ اعتماد اور دلیر فوجیوں کو ان کے نوکروں اور محافظوں کے لباس میں تیار کیا گیا۔ شیلا اور رادھا کو ایسا لباس پہنایا گیا جس میں اُن کی ٹانگیں گھٹنوں کے اوپر تک اور کندھے اور سینے اور پیٹھ کا کچھ حصہ اور بازو ننگے تھے۔ اُن کے بال کھول دیئے گئے۔ اس لباس میں اُن کا جسمانی حسن اور دلکشی ایسی نکھری کہ دیکھنے والے اُن سے نظریں نہیں ہٹا سکتے تھے۔ کھیمن پال بھی جنگلی لباس میں نیم عریاں تھا۔ اُس کا گورا جسم تنومند اور بہت خوبصورت لگتا تھا۔

انہیں محمود غزنوی کو دینے کے لیے جو تحفے دیئے گئے ان میں دو انسانی کھوپڑیاں، دو چیتوں کی کھالیں، اس علاقے کے دو زندہ ہرن اور سونے کا ایک چھوٹا سا بُت تھا جس کا اوپر کا دھڑ انسان کا اور باقی دھڑ گھوڑے کا تھا۔ اس کے متعلق انہیں سلطان محمود کو یہ بتانا تھا کہ وہ اس بُت کی پوجا کیا کرتے ہیں مگر اب مسلمان ہونا چاہتے ہیں۔

رات کو یہ قافلہ گھوڑوں پر سوار ہو کر قنوج سے نکلا۔ انہیں مہابن کے جنگل کے قریب جا کر دریائے جمنا پار کرنا تھا جو قنوج سے تقریباً ایک سو پچیس میل دور تھا۔ اُن کے کھانے پینے کا سامان دو خچروں پر لدا ہوا تھا۔ انہیں مہابن کے جنگل میں سے گذر کر متھرا تک پہنچنا تھا۔

سلطان محمود غزنوی ابھی متھرا میں تھا۔ یہ جگہ اُسے بہت ہی اچھی لگی تھی۔ متھرا مندروں کا شہر تھا۔ مسلمان سپاہی مندروں کو آگ لگا رہے تھے۔ بڑے مندر کے صحن میں جو ہندوؤں کے کرشن مہاراج کی جائے پیدائش تھا، فوجی نماز باجماعت پڑھتے تھے۔ وہاں کے ہندو ایسے گئے گذرے بھی نہیں تھے کہ اپنے مذہب اور دیوتاؤں کی توہین برداشت کر لیتے۔ انہوں نے غزنی کے چند ایک فوجیوں کو دھوکہ دے کر قتل کر دیا تھا اور تخریبی کارروائیاں بھی کی تھیں۔ سلطان محمود نے حکم دے دیا تھا کہ شہر کو کھنڈر بنا دیا جائے اور ان انسانی سانپوں کو زندہ رہنے کے قابل نہ رہنے دیا جائے۔ چنانچہ شہر جل رہا تھا اور محمود غزنوی اپنی فوج کو قنوج کی طرف پیشقدمی کے لیے تیار کر رہا تھا۔ اس کے سامنے فوج کا خطیب اور بڑے دستوں (ڈویژنوں) کے امام جو غزنی سے ہمیشہ فوج کے ساتھ آیا کرتے تھے، بیٹھے تھے اور ان کے ساتھ اُس کے سالار، نائب سالار اور کماندار بھی تھے۔

"ہم قنوج کی طرف پیشقدمی کرنے والے ہیں" سلطان محمود غزنوی نے کہا ــــــ "آپ کو اس علاقے کا نقشہ دکھانے اور اپنا منصوبہ بتانے سے پہلے کچھ اہم باتیں کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ میں اتنی بڑی فوج کو اکٹھا کر کے خطاب نہیں کر سکتا۔ آپ سب اپنے سپاہیوں تک میرا پیغام لفظ بہ لفظ پہنچا دیں۔ خطیب اور امام نماز کے بعد سب کو میرا پیغام سنائیں۔ انہیں بتائیں کہ یہ جنگ میری نہیں، ان کی ذاتی نہیں، یہ خدا اور رسولؐ کی جنگ ہے۔ ہم یہاں کفر کے اُس فتنے کو ختم کرنے آئے ہیں جس کے متعلق خدا کا حکم ہے کہ اُس وقت تک لڑو جب تک کفر کا فتنہ ختم نہیں ہو جاتا۔ اگر میں ہندوستان میں بار بار نہ آتا تو یہ ہندو قوم غزنی کو فتح کر کے خانہ کعبہ کی طرف بڑھ رہی ہوتی۔ اُدھر یہودیوں اور عیسائیوں کا فتنہ ہے۔ ہم ایک طرف توجہ دے سکتے ہیں۔ میں نے ہندوستان کے بت خانے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر کے اسے دارالاسلام بنانے کا تہیہ کر رکھا ہے....

مجھے اپنی سلطنت کی توسیع کا کوئی لالچ نہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں نے لاہور کے مہاراجوں کو کتنی بار شکست دی ہے مگر اس خطے کو اپنی سلطنت میں شامل نہیں کیا....

"ساری فوج سے کہہ دو کہ ہم وطن سے دور صرف خدائے ذوالجلال کے بھروسے

پر آتے ہیں اور خدا صرف اس لیے ہماری مدد کر رہا ہے کہ ہم اُس کا عظیم پیغام اور ایمان ساتھ لاتے ہیں۔ اگر مجھے دولت اور زر و جواہرات کا لالچ ہوتا تو میں بار بار یہاں نہ آتا۔ ایک ہی بار لوٹ مار کر کے غزنی میں تخت پر بیٹھ کر عیش کرتا مگر میں ہر بار یہاں خودکشی کرنے آتا ہوں۔ ہر بار توقع ہوتی ہے کہ زندہ واپس نہیں جا سکوں گا لیکن خدا مجھے ہر بار نئی زندگی عطا کرتا ہے۔ یہ ثبوت ہے کہ خدا مجھ سے ہی اس عظیم مقصد کی تکمیل کرانا چاہتا ہے جس کے لیے ہم ہندوستان میں آتے ہیں۔ اب مجھے پتہ چلا ہے کہ قنوج میں مجھے قتل کرنے کے منصوبے بن رہے ہیں۔ میں کسی بھی وقت، کسی بھی جگہ، اس کمرے میں بیٹھے بیٹھے قتل ہو سکتا ہوں لیکن مجھے اپنے اللہ پر بھروسہ ہے میرے اندر سے آواز آ رہی ہے کہ میں قتل نہیں ہوں گا۔ یہ آواز خدا کی ہے....

”ساری فوج کو ایک بار پھر بتا دو کہ جہاد نماز سے افضل ہے۔ اسلام کا یہ نظریہ یاد رکھو کہ تم نماز پڑھ رہے ہو اور تمہارے سامنے سانپ آ جائے تو نماز چھوڑ دو اور سانپ کو مارو۔ میں آپ کو نماز چھوڑنے کا مشورہ نہیں دے رہا۔ میں کہہ رہا ہوں کہ کوئی مسلمان یہ سمجھتا ہے کہ وہ صرف نماز سے خدا کی خوشنودی حاصل کر لے گا تو وہ خوش فہمی میں مبتلا ہے۔ جب تک آپ اس سانپ کو نہیں ماریں گے جس کا نام ہندو ہے، آپ خدا کی خوشنودی حاصل نہیں کر سکیں گے۔ میں آپ کو آج بتا دیتا ہوں کہ اس ملک میں اگر ہندوؤں کو بالادستی حاصل رہی تو وہ مسلمانوں کے لیے زندگی جہنم بنائے رکھیں گے۔ یہ ملک مسلمانوں کی قتل گاہ بنا رہے گا۔ اپنے سپاہیوں کو بتائیں کہ تمہیں اپنے ان ساتھیوں کے خون کا خراج ادا کرنا ہے جو یہاں شہید ہوتے ہیں اور ان کی لاشیں اپنے وطن واپس نہیں جا سکیں گی....

”میں اپنی فوج کو خبردار کرنا چاہتا ہوں کہ ہندوستان کا یہ خطہ جہاں ہم بیٹھے ہیں بڑا ہی دلفریب ہے۔ یہاں کے لوگ بھی حسین اور دلفریب ہیں۔ میں خود اس علاقے سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ گنگا اور جمنا نے مل کر اس خطے کو جو حسن اور دلکشی بخشی ہے، یہ انسانوں کو مسحور کر لیتی ہے۔ تم نے یہاں کی عورتیں دیکھی ہیں۔ میں ان کے حسن میں خطرے دیکھ رہا ہوں کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارا کوئی عسکری اس جادو کا شکار ہو جائے۔ اپنے

اور عورت کا سحر طاری کرنے والے کو کبھی فتح نصیب نہیں ہوتی۔ ہر فوجی کو، خواہ وہ سالار ہے یا سپاہی، خبردار کر دو کہ کسی نے خدا کے احکام کی خلاف ورزی کی تو میں اُسے فوراً خدا کے پاس پہنچادوں گا تاکہ وہ دوزخ کی آگ میں جلے۔ میرے پاس ایسے آدمی کے لیے سزائے موت سے کم کوئی سزا نہیں۔"

سلطان محمود نے خطیب اور اماموں کو رخصت کر دیا اور سالاروں اور دیگر کمانڈروں کے سامنے متھرا سے قنوج تک کا نقشہ پھیلا کر بتانے لگا کہ پیشقدمی کا راستہ کون سا ہوگا۔ اُسے جاسوسوں نے مکمل معلومات دے دی تھیں۔ جاسوسوں کے علاوہ اُس کے اپنے کماندار بھیس بدل کر قنوج تک ہو آئے تھے۔

"راستے میں مُنج کا قلعہ آئے گا" سلطان محمود نے کہا۔ "یہ راجپوتوں کا شہر ہے اور یہ راجپوت بہت دلیر ہیں۔ لڑنے میں ہندوستان کی کوئی قوم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی ہمیں سب سے پہلے انہیں ختم کرنا ہے، ورنہ یہ ہمیں اُس وقت پریشان کریں گے جب ہم قنوج کو محاصرے میں لے لیں گے .... جاسوسوں نے تصدیق کر دی ہے کہ لاہور کا مہاراجہ بھیم پال نڈر اسی علاقے میں کہیں موجود ہے اور وہ یہاں کے چھوٹے بڑے راجوں مہاراجوں کو میرے خلاف متحد کرتا پھر رہا ہے۔ اُس کے بھائی بھی اُس کے ساتھ ہیں۔ بھیم پال کو زندہ پکڑنا ہے۔ کچھ اس قسم کی اطلاع بھی ملی ہے کہ اُس کی فوج بھی اِدھر آ رہی ہے ہمیں ہوشیار اور چوکنا رہنا پڑے گا۔"

سلطان محمود نے ساتویں روز متھرا سے کوچ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اُس نے کمک کے لیے کچھ دستے متھرا میں رہنے دیئے اور جنگ میں نام پیدا کرنے والے دستوں کو اپنے ساتھ چلنے کے لیے تیار رہنے کا حکم دیا۔

یہ طلوعِ آفتاب کا وقت تھا۔ سورج اُبھرتا آ رہا تھا۔ مہاراجہ راجیا پال کا بیٹا لچھمن پال ایک خیالی جنگلی قبیلے کے سردار کے بھیس میں، شیلا، رادھا اور دو مددگار فوجیوں کے ساتھ دہابن کے جنگل کے سامنے والے کنارے تک پہنچ چکا تھا۔ وہ تیسری رات یہاں پہنچے اور رات یہاں ہی گذاری تھی۔ دسمبر جنوری کے دن تھے۔ سردی سخت تھی، اور

ان کی خوش قسمتی تھی کہ وہ رات کو یہاں پہنچے تھے اور دیکھ نہیں سکتے تھے کہ یہ دریا کا ایسا کنارہ ہے جو ایک جگہ سے اتنا اندر کو آگیا ہے کہ جھیل بنا ہُوا ہے اور یہ جھیل مگر مچھوں کا مسکن ہے۔ اگر سردی اتنی زیادہ نہ ہوتی تو مگرمچھ انہیں زندہ نہ رہنے دیتے۔

یہاں قریب کہیں سے انہیں دریائے جمنا پار کرنا تھا۔ لچھمن پال اور شیلا جاگ اُٹھے۔ رادھا اور اُن کے دو ساتھی جو تجربہ کار اور دلیر فوجی تھے، ابھی گہری نیند سوئے ہُوئے تھے۔ لچھمن پال نے شیلا سے کہا کہ وہ اکیلا کچھ دُور آگے جائے گا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ دریا پر کشتی ران مل جاتے ہیں جو اُجرت پر دریا پار کرا دیتے ہیں۔ وہ چلا تو شیلا بھی کچھ دُور تک اُس کے ساتھ چل پڑی۔ یہ علاقہ بھی جنگل تھا۔ جھاڑیاں بھی تھیں۔ رات کو وہ یہ علاقہ نہیں دیکھ سکے تھے۔ اب سورج طلوع ہو چکا تھا۔ انہیں سوائے درختوں، جھاڑیوں اور کہیں کہیں ٹیلوں ٹیکریوں کے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ دونوں چپ چاپ جا رہے تھے۔

"تم اتنے خاموش کیوں ہو لچھمن؟" — شیلا نے رُک کر پوچھا — "ایسی خاموشی خوف کی علامت ہوتی ہے۔"

"خوف نہیں شیلا!" — لچھمن بھی رُک گیا اور شیلا کو سر سے پاؤں تک دیکھ کر بولا — "میں کچھ سوچ رہا ہوں.... تم بہت ہی خوبصورت ہو اور تمہیں احساس نہیں کہ اس جنگلی لباس میں تم کتنی زیادہ خوبصورت لگ رہی ہو۔ میرے استاد نے ایک بار مجھے کہا تھا کہ انسان اپنے قدرتی رنگ میں رہے تو اُس کی صحت اور اُس کے چہرے کی رونق بڑھاپے میں بھی ماند نہیں پڑتی۔ جی میں آتی ہے ہم اسی حلیے اور اسی بھیس میں خون خرابے کی دُنیا سے دُور اسی جنگل میں رہیں.... میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ تمہارے بال اس قدر ریشمی اور اتنے دلکش ہیں۔ میں تمہاری کس کس چیز کی تعریف کروں۔"

شیلا پر جیسے کچھ اثر ہی نہ ہُوا ہو۔ وہ اُسے چپ چاپ دیکھتی رہی۔ لچھمن پر جیسے نشہ طاری ہو گیا ہو۔ وہ شیلا کی طرف بڑھا اور بازو یوں پھیلا دیئے جیسے حُسن کے اِس شاہکار کو بازوؤں میں سمیٹ لینا چاہتا ہو مگر شیلا پیچھے ہٹ گئی۔

"ہوش میں آؤ لچھمن!" — شیلا نے دھیمی مگر پُرعزم آواز میں کہا — "جاگو۔ یاد کرو ہم اِدھر کیوں آئے ہیں۔ اپنی مردانگی اور جرأت پر عورت کے حسن اور جسم کو سوار نہ کرو۔ ہم موت سے

کھیلنے آئے ہیں۔"

"میں ہوش میں ہوں راجکماری!" کھمن نے کہا۔"جانتا ہوں کہ ہم موت سے کھیلنے آئے ہیں مگر ڈرتا ہوں کہ تمہارے جل پریوں جیسے اس جسم کے ساتھ مسلمان کھیلیں گے۔"

وہ اچانک بے تاب ہو گیا اور بولا۔"تم یہیں رہو۔ میں اکیلا متھرا جاؤں گا۔ غزنی کے سلطان کے سامنے جا کر اُسے کوئی دھوکہ دیئے بغیر قتل کر دوں گا۔ تم اور رادھا واپس چلی جاؤ۔ میں تمہارے لیے مر جاؤں گا ..... لیکن ایک بار شیلا! صرف ایک بار ..... ذرا سی دیر کے لیے میرے بازوؤں میں آجاؤ۔ میں ڈر رہا ہوں۔ اپنی موت سے نہیں، میں اُس وقت سے ڈر رہا ہوں جب وہ مجھے پکڑ کر قتل کر دیں گے اور تمہیں اور رادھا کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔"

"کھمن!" شیلا نے گرج کر کہا۔"چلے جاؤ۔ یہاں سے چلے جاؤ۔ میں اپنا آپ تم سے بچا نہیں رہی۔ میں تم سے دور نہیں ہٹ رہی۔ میں ہمیشہ کے لیے تمہاری ہوں مگر اب نہیں۔ اگر ایک بار میرے ننگے بازو تمہارے عریاں کندھوں سے چھو گئے تو تم بھول جاؤ گے کہ ہم یہاں کیوں آئے تھے۔ میرے چہرے میں غزنی کے سلطان کو دیکھو۔ میری آنکھوں میں اپنی عزت کو دیکھو .... جاؤ، چلے جاؤ۔ کوئی کشتی دیکھو۔ ہمیں جمنا پار جانا ہے۔"

لکھمن پال گٹھے ہوئے جسم کا جنگجو جوان تھا۔ اُس کا سراپا بتا رہا تھا کہ تلوار کا دھنی ہے۔ اُس نے شیلا کو نظر بھر کر دیکھا اور یہ کہہ کر چلا گیا۔"میں تمہیں مایوس نہیں کروں گا۔ میں بھارت ماتا کو مایوس نہیں کروں گا ..... میں کشتی کا بندوبست کر کے ابھی آیا۔"۔۔۔ اور وہ دوڑ پڑا۔ شیلا اُسے جاتا دیکھتی رہی۔ جنگل کی جھاڑیوں نے کھمن کو اُس کی نظروں سے اوجھل کر دیا تو بھی وہ اُدھر ہی دیکھتی رہی۔

اپنے قریب شیلا کو کسی کے چلنے کی آواز سنائی دی۔ اُس نے اطمینان سے گھوم کر دیکھا۔ اس غیر آباد جنگل میں کون ہو سکتا تھا۔ غزنی کی فوج وہاں سے بیس پچیس میل دور متھرا میں تھی۔ یہاں کوئی اور انسان نہیں ہو سکتا تھا، مگر وہ ایک انسان تھا جو آنکھیں پھاڑے ہوئے اُسے دیکھتا آہستہ آہستہ اُس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر سیاہ داڑھی تھی۔

اُس کا لباس اس خطے کے لوگوں جیسا تھا۔ وہ سرتاپا ہندوستانی تھا۔ اُس کا چہرہ بھرا بھرا اور پرُشباب تھا۔ وہ شیلا کے قریب آکر رکا۔

"شیلا؟" — اُس آدمی نے پوچھا — "مجھے دھوکہ تو نہیں ہو رہا؟ تم مُنج کے راۓ چندا کی بہن نہیں ہو؟..... تم جنگل کی بیٹی نہیں ہو۔ میں تمہیں کل سے چھپ چھپ کر دیکھتا آرہا ہوں۔ یہ چھمن ہے نا جو ابھی تمہارے پاس کھڑا تھا؟ مہاراجہ قنوج کا راجکمار؟"

"اور تم کون ہو؟" — شیلا نے سرگوشی میں پوچھا۔

اُس آدمی نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا تو داڑھی اُس کے ہاتھ میں آگئی۔ شیلا کے سامنے ایک جوان چہرہ آگیا جو چھمن پال کی طرح خوبرو تھا اور شباب سے دمک رہا تھا۔ عمر چھمن جیسی تھی۔

"اوہ!" شیلا نے مسکرا کر کہا — "ترلوچن پال! تم یہیں ہو ابھی؟..... تمہیں یہیں ہونا چاہیئے۔"

"مگر تمہیں یہاں نہیں ہونا چاہیئے"۔ — ترلوچن پال نے کہا — "میں چند روز پہلے تمہارے بھائی سے ملنے گیا تھا تو تمہارے ساتھ بھی ملاقات ہوئی تھی۔ اس سے پہلے میں نے تمہیں اُس وقت دیکھا تھا جب تم اپنے بھائی کے ساتھ لاہور آئی تھیں۔ اگر میں چند روز پہلے تمہیں مُنج میں نہ دیکھتا تو میں اس حلیئے میں تمہیں نہ پہچان سکتا۔ تمہارے گورے چٹے کندھوں پر بکھرے ہوئے یہ چمکیلے بھورے بال دیکھ کر اِس بیابان میں تمہیں کوئی کسی بڑی خوبصورت لڑکی کی بھٹکتی ہوئی رُوح سمجھے گا اور کوئی تمہیں جنگل کی شہزادی کہے گا۔ میں کل سے چھُپ چھپ کر تمہیں دیکھتا آرہا ہوں۔ تم جانتی ہو میں یہاں کیا کر رہا ہوں۔ میں غزنی کی فوج کی اگلی پیشقدمی دیکھ رہا ہوں۔ مہاراج بھیم پال یہاں سے تھوڑی ہی دور ہیں.... تمہارے ساتھ راجکماری رادھا ہے.... لیکن یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟ تم لوگ کہیں بھاگے جا رہے ہو؟"

وہ لاہور کے مہاراجہ بھیم پال نڈر کا چھوٹا بھائی ترلوچن پال تھا۔ شیلا کی شادی اسی کے ساتھ ہو رہی تھی۔ سلطان محمود غزنوی کو صحیح اطلاع ملی تھی کہ بھیم پال نڈر بھی یہیں کہیں موجود ہے اور اُس کے بھائی بھی اس کے ساتھ ہیں اور وہ یہاں راجوں

مہاراجوں کو سلطان کے خلاف متحد کرتا پھر رہا ہے۔ اس سلسلے میں اُس کا چھوٹا بھائی ترلوچن پال بہروپ میں مُنج بھی گیا تھا اور قنوج بھی۔ اس سلسلے میں گھومتے پھرتے اُسے شیلا کا یہ عجیب و غریب قافلہ نظر آ گیا۔ وہ چھپ کر اُن کا تعاقب کرتا رہا۔ آخر صبح لچھمن اور شیلا کو یہاں دیکھا۔ لچھمن چلا گیا اور شیلا اکیلی رہ گئی۔

ترلوچن پال سے چھپانے کی ضرورت نہیں تھی کہ یہ قافلہ کہاں جا رہا ہے۔ شیلا نے اُسے بتایا کہ وہ سلطان محمود کو قتل کرنے جا رہے ہیں۔

"کیا تمہارا بھائی رائے چندا اپنی بہن اور بیٹی سے لڑنا چاہتا ہے؟" ترلوچن نے کہا — "راجپوتوں کی غیرت کو کیا ہو گیا ہے؟ کیا وہ مسلمانوں سے ڈر گیا ہے؟ ہم اُسے یقین دلا چکے ہیں کہ اگر محمود نے اُسے شکست دے دی تو ہم اس کی شکست کا انتقام لیں گے۔ ہم ابھی اپنی فوج سامنے نہیں لائے۔ ہم نے یہ سوچا ہے کہ سلطان محمود یہاں لڑ لڑ کر اور قلعے فتح کر کر کے تھک جائے اور اس کی فوج کمزور ہو جائے تو ہم اس پر حملہ کر کے اسے ختم کر دیں گے۔ بے شک ہم سلطان کے باجگزار ہیں لیکن ہم موقع کی تلاش میں ہیں۔ اسے قتل کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر اسے قتل کرنا ہی ہے تو لچھمن پال جائے۔ اس کے ساتھ دو آدمی ہیں۔ تم اور رادھا یہیں سے واپس چلو۔"

شیلا نے اُسے بتایا کہ وہ اپنی مرضی سے آئی ہیں۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ وہ اور رادھا کس طرح سلطان محمود اور اس کے سالاروں کو دھوکہ دیں گی۔ ترلوچن پال نے اُسے کہا کہ مسلمان اتنی جلدی دھوکے میں نہیں آئیں گے البتہ وہ خود ہی دھوکے میں آ کر غزنی پہنچا دی جائیں گی اور انہیں رقاصہ بنا دیا جائے گا یا سالاروں کی داشتائیں بنی رہیں گی۔ شیلا نے اُسے راجپوتی غیرت یاد دلائی۔ اپنا عزم بتایا اگر ترلوچن پال کی غیرت گوارا نہیں کر رہی تھی کہ جس لڑکی کے ساتھ اُس کی شادی ہو رہی ہے وہ اتنے بڑے خطرے میں جائے۔

"پھر میری جگہ تم جاؤ" — شیلا نے اُسے غصّے سے کہا — "تم بزدلوں اور چوروں کی طرح جنگلوں میں بھیس بدل کر مارے مارے پھر رہے ہو۔ تم غزنی کے باجگزار ہو تو یہ

بھی تمہاری بزدلی کا ثبوت ہے۔ تم مسلمانوں سے ڈرتے ہو۔ سلطان نے تمہارے پاؤں میں بیڑیاں نہیں ڈال رکھیں۔ اپنی فوج کو یہاں لاؤ اور سلطان کو للکار کر کہو کہ تم اُسے باج نہیں دو گے۔ یہاں متھرا کے مندر تباہ ہو گئے۔ تم وہاں مسلمانوں کی اذانیں سن رہے ہو مگر تمہاری غیرت سو رہی ہے اور تم دوسروں کو بھڑکاتے پھر رہے ہو۔ میری غیرت مجھے گھر سے نکال لائی ہے۔"

"تم میری ہونے والی بیوی ہو"۔۔۔ ترلوچن پال نے غصّے سے کہا۔۔۔ "میری منگیتر ہو۔ میں تمہیں آگے نہیں جانے دوں گا۔"

"میں کسی کی ہونے والی بیوی نہیں"۔۔۔ شیلا نے کہا۔۔۔ "میں اُس کی بیوی بنوں گی جو سلطان محمود کو قتل کرے گا، اور وہ چھمن پال ہو گا۔ وہ مارا گیا تو محمود میرے ہاتھوں قتل ہو گا۔ رادھا کے ہاتھوں قتل ہو گا۔ اس مسلمان کی جان اب میری مٹھی میں ہے"۔۔۔ اُس نے مٹھی بند کر کے اور دانت پیس کر کہا۔۔۔ "میرے یہ ہاتھ مہندی سے نہیں محمود کے خون سے لال ہوں گے۔ منج کی کوئی راجپوت لڑکی کسی مسلمان کے ہاتھ نہیں آئے گی۔ یہ تمہارے باپ دادا تھے جنہوں نے غزنی والوں سے شکست پہ شکست کھائی اور تم خزانہ باج میں لٹا رہے ہو۔ یہ میرے بھائی کا فیصلہ تھا کہ میری شادی تمہارے ساتھ ہو گی۔ میرا فیصلہ سن لو ترلوچن! مجھے تم جیسے بزدلوں سے نفرت ہے۔ عورت راجپوت کی ہو یا راج مزدور کی، وہ بھڑک اٹھے تو دریاؤں کو آگ لگا دیتی ہے۔۔۔۔ میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔ میرا ساتھ چھمن سے ہے۔ یہاں نہیں تو آکاش پر ہماری شادی ہو گی اور تم اِن جنگلوں میں بھٹکتے پھرو گے۔"

"تم یہ سمجھتی ہو کہ میں تمہیں اُٹھا کر نہیں لے جا سکتا؟"۔۔۔ ترلوچن پال قہر سے اُس کی طرف لپکا۔

شیلا پیچھے کو دوڑی۔ ترلوچن اُس کی طرف دوڑا۔ شیلا ایک ٹیکری کی اوٹ میں چلی گئی۔ ترلوچن پال اُس طرف گیا تو اُسے شیلا ایک درخت کے ساتھ کھڑی نظر آئی۔ وہاں درخت زیادہ تھے اور دریا باہر کو آیا ہوا تھا۔ یہ جھیل سی بنی ہوئی تھی۔ ترلوچن پال نے شیلا کو ایک بار پھر کہا کہ وہ اُس کے پاس آ جائے۔ شیلا نے للکار کر کہا۔۔۔ "ہمت ہے تو مجھے پکڑ لو۔ میں تمہارے پاس اس لیے نہیں آؤں گی کہ تم مرد ہو اور میں عورت ہوں۔ سلطان محمود سے

پہلے میں تمہیں قتل کروں گی ۔"

وہ اُلٹے پاؤں پیچھے ہٹنے لگی ۔ ترلوچن پال وہیں کھڑا اسے کہہ رہا تھا "تم کسی کو قتل نہیں کرسکو گی ۔ میں تمہیں بھاگنے نہیں دوں گا ۔"

وہ اور پیچھے ہٹ گئی ۔ ترلوچن پال نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا ۔۔ "آگے کو بھاگ آؤ شیلا! پیچھے نہ جانا ۔"

"میں تمہارے ہاتھ نہیں آؤں گی " ۔ شیلا نے کہا ۔

وہ سمجھ نہ سکی کہ ترلوچن اُسے کتنے بڑے خطرے سے خبردار کر رہا ہے ۔ ترلوچن پال ایک بار پھر چلایا مگر بے سُود ۔ ایک مگرمچھ جو قریب ہی کہیں چھپا ہُوا تھا ، شیلا کے بالکل پیچھے پہنچ چکا تھا ۔ اُدھر مگرمچھ آگے بڑھا ۔ اِدھر سے شیلا نے بے خبری میں ایک اور قدم پیچھے ہٹایا تو مگرمچھ نے اُسے کمر سے دانتوں کے شکنجے میں جکڑ لیا ۔ شیلا کی چیخیں اس قدر بلند اور ہولناک تھیں کہ رادھا جو اُس سے دُور سوئی ہوئی تھی جاگ اُٹھی ۔ اُس نے دیکھا کہ لچھمن پال بھی نہیں ، شیلا بھی نہیں ۔ اُس نے دونوں فوجیوں کو جگایا اور اُن کے ساتھ اُدھر کو دوڑی جدھر سے چیخیں سنائی دی تھیں ۔

ترلوچن پال ایک جھاڑی کے پیچھے ہو گیا ۔ لچھمن پال کے دونوں فوجی وہاں پہنچے تو ایک سیٹی سنائی دی جو ترلوچن نے منہ میں انگلی رکھ کر بجائی تھی ۔ کہیں سے دو تیر آئے ، لچھمن پال کے دونوں ساتھی ایک ایک تیر سے اوندھے ہو گئے ۔ یہ ترلوچن پال کے اُن دو محافظوں کے تیر تھے جو کہیں چھپے ہوئے تھے ۔ رادھا نے نہ دیکھا ۔ اُسے پانی کے کنارے ایک مگرمچھ نظر آیا جس کے منہ میں شیلا چیخ چلا رہی تھی اور مگرمچھ اپنے گز گز لمبے جبڑے اچھال اچھال کر اُسے نگل رہا تھا ۔ رادھا کو چکر آنے لگا ۔ اُس نے دیکھا کہ شیلا کا صرف ایک بازو مگرمچھ کے منہ سے باہر رہ گیا تھا اور اُس کے ریشم جیسے بال بھی نظر آ رہے تھے ۔ رادھا کی آنکھوں کے آگے اندھیرا آ گیا اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی ۔

ترلوچن پال رادھا کی طرف بڑھا تو اُسے اپنے ایک محافظ کی آواز سنائی ۔۔ "راجکمار! مسلمان فوجی آ رہے ہیں ۔"

ترلوچن پال وہاں سے پیچھے ہٹا اور غائب ہو گیا ۔ تھوڑی دیر بعد غزنی کے چار گھوڑسوار

وہاں آگئے جہاں سے ترلوچن پال بھاگا تھا۔ انہیں دُور گھوڑے دوڑنے کی آواز آئی۔ یہ ترلوچن پال اور اُس کے ساتھیوں کے گھوڑے تھے جنہیں وہ دور کہیں چھوڑ آئے تھے۔ اگر ترلوچن پال کے محافظ غزنی کے فوجیوں کو نہ دیکھ لیتے تو انہیں بہت بڑا شکار مل جاتا۔ ترلوچن پکڑا جاتا تو اس سے معلوم کیا جاسکتا تھا کہ بھیم پال نڈر کہاں ہے۔

لچھمن پال کشتی کی تلاش میں نکل گیا تھا۔

غزنی کے ان فوجیوں میں ایک نائب سالار تھا اور باقی تین اُس کے دستوں کے کماندار تھے۔ وہ متھرا سے آئے تھے اور انہوں نے گھوڑوں پر دریا پار کیا تھا چونکہ کچھ روز بعد پیش قدمی ہونے والی تھی اس لیے نائب سالار دریا اور اس سے آگے کا جائزہ لے رہا تھا اور اس علاقے میں متھرا کے دفاع کے لیے دو تین چوکیاں بھی قائم کرنی تھیں۔ وہ جب دریا کی بنائی ہوئی جھیل کے قریب آئے تو انہیں ایک لڑکی بے ہوش پڑی نظر آئی۔ ذرا پرے انہیں ایک مگرمچھ دکھائی دیا جو آدھا پانی میں تھا۔ اُس کے منہ سے لٹکتا ہُوا ایک بازو نظر آرہا تھا اور منہ سے لمبے لمبے بال بھی لٹک رہے تھے۔ نائب سالار نے ایک اور مگرمچھ دیکھا جو بے ہوش رادھا کی طرف آرہا تھا۔

نائب سالار نے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ اُس کے کمانداروں نے بھی گھوڑے دوڑائے۔ دونوں مگرمچھ پانی میں غائب ہو گئے۔ نائب سالار نے کمانداروں سے کہا کہ یہ کوئی بہت خوبصورت جنگلی لڑکی معلوم ہوتی ہے۔ اسے اُٹھا لے چلو۔ رادھا کو ایک گھوڑے پر ڈال لیا گیا۔ وہاں سے ہٹ کر وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگے کہ شاید اس کے ساتھ کے کوئی لوگ کہیں ٹھہرے ہوئے ہوں۔ انہیں دو لاشیں دکھائی دیں۔ دونوں میں ایک ایک تیر اُترا ہُوا تھا۔ انہیں ایک جگہ پانچ گھوڑے، دو خچر اور دو ہرن کھڑے نظر آئے۔ زمین پر بستر بچھے ہوئے تھے۔ سامان کی تلاشی لی گئی۔ اس میں سے ہتھیار اور سونے کے بے شمار سکّے برآمد ہوئے۔ کچھ ایسی چیزیں بھی برآمد ہوئیں جو شک پیدا کرتی تھیں۔

نائب سالار پرانا تجربہ کار آدمی تھا۔ اُس نے رادھا کو جو ابھی تک بے ہوش تھی، غور سے دیکھا اور کہا کہ یہ لڑکی جنگلی نہیں ہو سکتی۔ اُس نے رادھا کو گھوڑے سے اُتروا کر منہ

میں پانی ٹپکایا اور منہ پر پانی کے چھینٹے مارے تو اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ فوراً ہی وہ اُٹھ بیٹھی اور یہ دیکھے بغیر کہ اُس کے پاس کون کھڑا ہے، اُس نے اُٹھ کر چلّانا شروع کر دیا۔

"شیلا! لچھمن پال!"۔۔۔ وہ دوڑ پڑی ۔۔۔"راجکمار! کہاں ہو!"

نائب سالار نے اُسے پکڑ لیا اور پوچھا کہ وہ کونسے راجکمار کو بلا رہی ہے۔ رادھا اس قدر حواس باختہ تھی کہ اُس کے منہ سے نکل گیا "قنوج کا راجکمار لچھمن پال! تم نے اُسے دیکھا ہے؟"۔۔۔ وہ چونک پڑی اور اُس نے لب ولہجہ بدل کر اداکاری شروع کر دی ۔۔۔"میں قنوج کے قریب کے ایک جنگل کے قبیلے کی لڑکی ہوں۔ ہم غزنی کے سلطان کے پاس مسلمان ہونے کے لیے جا رہے ہیں"۔

"قبیلے کا نام کیا ہے؟"۔۔۔ نائب سالار نے پوچھا ۔۔۔"اور وہ جنگل قنوج سے کتنی دُور ہے؟"

لڑکی گھبرا گئی۔ اُسے کسی نے یہ نہیں بتایا تھا کہ ہر قبیلے کا نام بھی ہوتا ہے۔ اُس نے جنگل کے متعلق بتایا تو نائب سالار نے کہا ۔۔۔"دیکھو لڑکی! میں غزنی کا رہنے والا ہوں اور تمہاری زبان بول رہا ہوں۔ اس سے سمجھ لو کہ میں تمہارے علاقے سے واقف ہوں۔ میں قنوج کے اردگرد کا علاقہ دیکھ آیا ہوں۔ وہاں کوئی ایسا جنگل نہیں ہے جس میں اتنا خوبصورت قبیلہ رہتا ہو جتنی خوبصورت تم ہو"۔

لڑکی کا راجپوتی خون جوش میں آ گیا۔ اُس نے نائب سالار اور کمانداروں کو للکارنا شروع کر دیا ۔۔۔"خبردار میرے قریب نہ آنا۔ میں زندہ تمہارے ہاتھ نہیں آؤں گی"۔

نائب سالار نے اُسے بازو سے پکڑ کر کہا ۔۔۔"تم خوش قسمت ہو کہ میرے ہاتھ آئی ہو۔ تم اتنی زیادہ خوبصورت ہو اور تم نے لباس ایسا عریاں پہن رکھا ہے کہ اس جنگل میں جس کسی کے ہاتھ آجاؤ وہ تمہیں اپنی بیٹی اور بہن نہیں کہے گا۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میری نیّت میں فتور نہیں آئے گا، اور اگر تم مجھے جھانسے دیتی رہو گی تو میں تمہیں ان تینوں کے حوالے کر کے خود چلا جاؤں گا۔ انہیں اچھی طرح دیکھ لو۔ اگر اپنے آپ کو بچانا چاہتی ہو تو بتا دو کہ تم لوگ کون ہو اور راجکمار لچھمن پال کہاں ہے اور یہاں کیوں آیا ہے"۔

رادھا اپنے قافلے کے سامان کی طرف دوڑی۔ سب اُسے دیکھتے رہے۔ اُس نے

سامان سے چھوٹی سی ایک ڈبیہ نکالی۔ وہ اُٹھ کر تیزی سے ڈبیہ کھولنے اور دوسری طرف دوڑنے لگی۔ اُسے پکڑ لیا گیا۔ اُس کے ہاتھ سے ڈبیہ چھین کر نائب سالار نے اُس سے پُوچھا۔۔ "یہ زہر ہے نا؟.... سُنو لڑکی! تمہارا تڑپنا اور بھاگنا بیکار ہے۔ تم ہماری قیدی ہو۔ تمہیں سب کچھ بتانا پڑے گا"۔۔ نائب سالار کے حکم سے اُسے ایک گھوڑے پر بٹھا دیا گیا جس کی لگام ایک کماندار کے ہاتھ میں تھی۔

لچھمن پال مایوس واپس آرہا تھا۔ اُسے الگ تھلگ کوئی کشتی نہ ملی۔ وہاں بڑی کشتیاں تھیں جو بہت سے مسافروں کو پار لے جاتی تھیں۔ وہ گھوڑوں اور خچروں کو بھی پار لے جانا چاہتا تھا۔ ان کے لیے کشتی نہیں مل رہی تھی۔ وہ جھیل سے ذرا ہٹ کر گزرا تو اُسے خشکی پر ایک مگرمچھ نظر آیا جو ایک انسان کو اُگل رہا تھا۔ مگرمچھ شکار کو کھانے کا یہ طریقہ اختیار کرتا ہے کہ پہلے اسے نگل کر جان سے مار دیتا ہے پھر اسے خشکی پر اُگل کر اس کے گلنے سڑنے کا انتظار کرتا ہے۔ جب لاش یا کسی جانور کا مُردار گل کر نرم ہو جاتا ہے تو اُسے نگل لیتا ہے۔

شیلا کو نگلنے کے بعد مگرمچھ خشکی پر آکر اُسے اگل رہا تھا۔ لچھمن پال نے دیکھا کہ لاش کے لمبے لمبے بال تھے اور لباس ؟.... اُس کا جسم کانپنے لگا۔ وہ یقین نہیں کرنا چاہتا تھا کہ یہ شیلا کی لاش ہے۔ اُس نے ٹیکری پر چڑھ کر دیکھا تو اُسے لاش کا چہرہ صاف نظر آنے لگا۔ اتنے میں ایک اور مگرمچھ دوڑتا آیا اور لاش کو منہ میں لینے لگا۔ لاش کا مالک مگرمچھ اُس پر ٹوٹ پڑا۔ پھر ان میں لڑائی شروع ہوگئی۔ آخر ایک نے شیلا کی ایک ٹانگ منہ میں لے لی اور دوسری ٹانگ دوسرے نے منہ میں جکڑ لی۔ انہوں نے زور لگایا تو لاش سیدھی کھڑی ہوگئی۔ اُس کا چہرہ لچھمن پال کی طرف تھا۔ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اُس میں تو اب اُدھر دیکھنے کی بھی ہمت نہیں رہی تھی۔ دونو مگرمچھوں نے لاش کی ٹانگوں کو اپنی اپنی طرف کھینچا تو لاش کے دو حصّے ہو گئے۔

لچھمن پال آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر ٹیکری کی دوسری طرف اُترا تو اُسے اپنے دو ساتھیوں کی لاشیں نظر آئیں۔ وہ انہیں دیکھ ہی رہا تھا کہ اُسے رادھا کی چیخ نما آواز سنائی دی ۔۔۔ "لچھمن پال!"۔۔ اُس نے اُدھر دیکھا تو سُن ہو کے رہ گیا۔ رادھا غزنی کے فوجیوں کے قبضے

میں تھی۔ پچھمن نے بھاگ اُٹھنے کے لیے اِدھر اُدھر دیکھا تو اُسے نائب سالار کی آواز سنائی دی ۔
"گھوڑے سے تیز نہیں بھاگ سکو گے لڑکے! اِدھر آؤ۔ زندہ رہو گے۔"
اُسے ایک گھوڑے پر بٹھا کر نائب سالار نے کمانداروں سے کہا کہ واپس چلو۔ وہ پچھمن پال کو اپنے ساتھ لے کر سب سے پیچھے رہا۔ اُس نے کہا ۔ "اس لڑکی نے سب کچھ بتا دیا ہے اس لیے ہم اسے پوری عزّت کے ساتھ متھرا لے جا رہے ہیں۔ تم اس کے ساتھ رہنا اور دیکھنا کوئی مرد اس کے جسم کو ہاتھ نہیں لگائے گا لیکن اس کی عزّت تمہارے ہاتھ میں ہے۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم کتنا کچھ سچ بولو گے۔ اگر تم نے جھوٹ بولا تو تم شاید تصوّر میں نہیں لا سکو گے کہ اس کے ساتھ کیا سلوک ہو گا۔ دیکھو یہ لڑکی کتنی خوبصورت ہے ۔ اگر میں نہ ہوتا تو یہ تین فوجی اس لڑکی کو اس طرح عزت سے متھرا نہ لے جاتے۔ بولو راجکمار! مجھے بتاؤ کہ قنوج کا راجکمار اس عجیب سے حلیے میں یہاں کیوں آیا ہے؟"
"اگر آپ ہم دونوں کو چھوڑ دیں تو میں آپ کو اتنا معاوضہ دوں گا جتنا آپ کہیں گے" ــــ پچھمن پال نے کہا ــــ "آپ چاروں میرے ساتھ قنوج چلیں میں آپ کے گھوڑے سونے سے لاد دوں گا۔"
"اگر ہمیں انعام کا خیال ہوتا تو یہ اتنی حسین لڑکی بہت بڑا انعام ہے جو ہم نے لے لیا ہے" ــــ نائب سالار نے کہا ــــ "اور تمہارے سامان سے سونے کے بے شمار سکّے بھی ملے ہیں جو ہم چاروں آپس میں بانٹ سکتے ہیں۔ تم مجھے قنوج لے جانا چاہتے ہو ہم وہاں سے آ رہے ہیں۔ وہاں سے ہم خود اپنے گھوڑے سونے سے لاد لیں گے۔ میں تو تمہیں انعام دینا چاہتا ہوں۔ سچ بولو اور انعام میں اپنی جان اور یہ لڑکی لے جاؤ۔"
وہ چلتے گئے اور انہوں نے گھوڑوں پر دریا پار کیا۔ وہ جنگلوں میں سے گزرے۔ ویرانوں میں سے گزرے۔ سورج غروب ہو گیا تو تاریکی میں چلتے رہے۔ راستے میں ذرا آرام کے لیے رُکے۔ کسی نے بھی رادھا کے ساتھ بات نہ کی۔ رات خاصی گزر چکی تھی جب یہ قافلہ متھرا کے قریب پہنچ گیا۔

لچھمن پال کے ساتھ تمام راہ نائب سالار نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ اُس نے لچھمن سے ایک ہی بار کہا تھا کہ وہ سچ سچ بتا دے کہ یہاں کیوں آیا ہے۔ لچھمن پال نے انعام پیش کرنے کے سوا کوئی جواب نہیں دیا تھا لیکن جب یہ ٹولہ متھرا میں داخل ہونے لگا تو لچھمن پال نے لپک کر نائب سالار کے بازو پر ہاتھ رکھ دیا۔

"میں سچ بولوں گا" ــ اُس نے کہا۔ "یہیں سُن لیں .... میں آپ کے سلطان کو قتل کرنے آیا تھا" ــ اور اُس نے اپنا تمام تر منصوبہ سنا دیا، مگر یہ نہ بتا سکا کہ شبلا گر مچھ کے پیٹ میں کیسے پہنچی اور اس کے دو ساتھیوں کو تیروں سے کس نے ہلاک کیا ہے۔ اُس نے کہا ــ "میں نے آپ کی سزا سے ڈر کر اعتراف نہیں کیا۔ میں آپ چاروں کے اخلاق سے متاثر ہو کر مجبور ہو گیا ہوں کہ آپ کے سامنے سچ بولوں۔ آپ نے میرا اتنا بڑا انعام ٹھکرا دیا۔ ہم نے سارا دن اجاڑ بیابان میں سفر کیا ہے۔ رات کے اندھیرے میں بھی سفر کیا ہے۔ مجھے یہ خطرہ پریشان کرتا رہا کہ آپ اس لڑکی کو خراب کریں گے مگر آپ کو جیسے احساس ہی نہیں تھا کہ آپ کے قبضے میں اتنی حسین لڑکی ہے جو غزنی نے بھی پیدا نہ کی ہو گی۔ آپ نے تمام راستے ہمارے ساتھ کوئی بات نہیں کی۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ آپ کی فتح کا راز کیا ہے۔ اب مجھے سچ بولنے کا انعام دیں .... انعام صرف اتنا ہے کہ مجھے بے شک جلادؔ کے حوالے کر دیں لیکن اس لڑکی کو اس کے ماں باپ کو واپس کر دیں۔ اس کی دلیری اور جرأت دیکھیں۔ اگر آپ واقعی جنگجو ہیں تو ایک جنگجو باپ کی غیرت مند بیٹی کو اس کی دلیری کا خراج دیں۔ یہ کنواری لڑکی ہے۔"

"اس کا فیصلہ سلطان محمود کریں گے" ــ نائب سالار نے کہا۔ "میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ یہ لڑکی کنواری رہے گی اور مجھے اُمید ہے کہ تمہیں جلادؔ کے حوالے نہیں کیا جائے گا۔"

"تم نے کوئی جرم نہیں کیا۔ ہم تمہیں جلادؔ کے حوالے نہیں کریں گے" ــ سلطان محمود نے لچھمن پال کی زبانی وہی کہانی جو اُس نے نائب سالار کو سنائی تھی، سن کر اُسے کہا۔ "ہم تم جیسے بیٹوں اور اس لڑکی جیسی بیٹیوں کی دل سے قدر کرتے ہیں۔ سزائے موت تو بہت بڑی بات ہے، ہم تمہیں طعنہ بھی نہیں دینگے کہ تم اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ہم غیرت مند

دشمن کی عزّت کیا کرتے ہیں۔ مجھے قتل کرنے کی تمہیں ضرور کوشش کرنی چاہیئے تھی۔ کامیابی اور ناکامی تمہارے کرشن واسدیو اور ہر ہر مہادیو کے اختیار میں نہیں، ہمارے خدا کے اختیار میں ہے۔ یہ ہے خدا کا وہ پیغام جو میں ہندوستان میں لایا ہوں۔"

محمود غزنوی نے اپنے ترجمان سے کہا ـــ "اس شہزادے سے کہو کہ لڑکی کے باپ سے کہے کہ میں نے مُنج کے راجپوتوں کی غیرت اور جرأت کی بہت باتیں سُنی ہیں لیکن غیرت والوں کی بیٹیاں یوں ننگی ہو کر اپنے دشمن کے لیے حسین دھوکہ بن کے اُس کے پاس نہیں جایا کرتیں .... اور اس شہزادے سے کہو کہ اپنے باپ سے کہہ دے کہ ہم آرہے ہیں اور وہ ہمیں قتل کرنے کے لیے سامنے آئے .... اور اس شہزادے سے کہو کہ ہم اسے یرغمال کے طور پر رکھ سکتے تھے مگر ہم اوچھے نہیں۔ ہم اپنی شرطیں میدانِ جنگ میں منوایا کرتے ہیں۔"

ترجمان نے لچھمن پال کو بتایا کہ سلطان کیا کہہ رہے ہیں۔

"اور ہم اس شہزادے سے کوئی فوجی راز بھی نہیں لیں گے"۔ سلطان محمود نے کہا ـــ "اسے کہو کہ ہم قنوج کے اندر اور باہر سے واقف ہیں۔ ہماری آنکھیں قنوج کے قلعے کے اندر ہیں۔"

لچھمن پال سلطان محمود کے چہرے پر نظریں گاڑھے ہوتے تھا۔ وہ حیرت کے عالم میں تھا۔ رادھا بھی حیران تھی کہ سلطان محمود اُن کی قسمت کا کیا فیصلہ کر رہا ہے۔

"تم دونوں اپنے اپنے باپ سے کہنا کہ لڑے بغیر قلعے ہمارے حوالے کر دیں"۔ سلطان محمود نے کہا اور ترجمان نے اس کا ہندوستانی زبان میں ترجمہ کیا ـــ "اگر ہم نے قلعے لڑ کر لیے تو تم دونوں کے باپوں کا انجام بہت بُرا ہو گا۔"

سلطان محمود غزنوی نے حکم دیا ـــ "ان دونوں کو ان کے شہروں کے قریب چھوڑ آؤ۔ انہیں عزّت سے لے جاؤ۔ ان کے گھوڑے اور ان کے خنجر انہیں دے دو۔"

لچھمن پال اور رادھا کچھ دیر محمود غزنوی کے چہرے پر ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے۔ انہیں جب وہاں سے چلنے کو کہا گیا تو لچھمن پال نے سلطان کے پاس جا کر اُس کا ہاتھ پکڑا اور چوم لیا۔ رادھا سلطان کو حیرت سے دیکھتی رہی۔

دونوں کو فوج کے دس بارہ سپاہیوں کے ساتھ رخصت کر دیا گیا۔ ان کا ایک کماندار

بھی ساتھ گیا۔ بڑی لمبی مسافت کے بعد وہ رادھا کو منج کے قلعے سے کچھ دور اور لچھمن پال کو قنوج کے قریب چھوڑ کر واپس آ گئے۔

لچھمن پال مایوسی اور شکست خوردگی کے عالم میں اپنے باپ مہاراجہ راجیا پال کے سامنے جا کھڑا ہوا اور اُسے بتایا کہ اُس پر کیا گذری ہے۔

"میں آپ کو صاف بتا دیتا ہوں کہ غزنی کے سلطان سے آپ شکست کھائیں گے" — لچھمن پال نے اپنے باپ سے کہا۔ "آپ اسے شکست نہیں دے سکتے پتا مہاراج! میں نے غزنی کے اس سلطان کی آنکھوں میں جادو کا اثر دیکھا ہے۔ اس کی فوج کے حاکم کسی اور ہی مٹی کے بنے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اُن کی فتح کا راز کچھ اور ہے۔ کون رادھا جیسی نوجوان اور خوبصورت لڑکی کو اور اپنے دشمن کے بیٹے کو اس طرح رہا کرتا ہے"؟

لچھمن پال نے اپنے باپ کو سارا واقعہ سنایا۔ مورخوں نے لکھا ہے کہ قنوج کے مہاراجہ راجیا پال پر ایسا تاثر طاری ہو گیا کہ اس نے خفیہ طور پر اپنا تمام خزانہ قنوج سے دُور پہاڑی علاقے میں منتقل کرنے کا حکم دے دیا۔ اُسی رات خزانہ ایسے طریقے سے قلعے سے نکلنے لگا کہ کسی کو ذرا سا بھی شک نہیں ہوتا تھا۔

رادھا جب اپنے باپ رائے چند کو بتا رہی تھی کہ اُسے اور لچھمن پال کو سلطان نے کس طرح رہا کیا ہے تو اُسے یقین نہ آیا۔ اُس نے کہا کہ راجپوت اپنی بے عزتی کا انتقام لیں گے۔

سلطان محمود غزنوی نے کچھ دستے متھرا میں رہنے دیئے اور باقی فوج کو کوچ کا حکم دے دیا۔ اُس نے متھرا کے قریب سے دریائے جمنا پار کیا اور دریا کے ساتھ ساتھ منج کا رُخ کر لیا جہاں راجپوت زندگی اور موت کا آخری معرکہ لڑنے کے لیے تیار تھے۔ سلطان کو جاسوسوں نے بتایا تھا کہ غزنی کی فوج کا صحیح مقابلہ منج میں ہوگا۔ وہاں عورتیں اور بچے بھی لڑنے اور مرنے کے لیے تیار تھے۔

خدا جو دل میں اُتر گیا

قنوج کے گرد و نواح میں جنگل تھا جو کہیں کہیں بہت گھنا ہو جاتا تھا۔ کہیں کہیں پہاڑیاں اور چٹانیں بھی تھیں۔

قنوج دریائے گنگا کے کنارے پر واقع تھا۔ قلعہ اس طرح تعمیر کیا گیا تھا کہ اس کی ایک طرف دریا تھا جس کا پانی (مورخوں کے الفاظ میں) قلعے کی ایک دیوار کو دھوتا رہتا تھا۔ یہ اپنے زمانے کا مشہور قلعہ تھا۔ مضبوط بھی تھا اور دور دور تک احترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔

۱۰۱۸ء میں سلطان محمود غزنوی متھرا سے کوچ کر کے منج کی طرف پیشقدمی کر رہا تھا۔ قنوج وہاں سے ایک سو پچیس میل دور تھا۔ قنوج سے چار پانچ میل دور جنگل میں جہاں آبادی کا دور دور تک نام و نشان نہ تھا، دو آدمی گڈریوں کے لباس میں ایک چٹان پر بیٹھے ہوئے تھے۔ سورج غروب ہونے کو تھا۔ ایک نے دوسرے سے کہا کہ رات یہیں گذار لیتے ہیں۔

"آج تیسرا دن ہے ہم قنوج کے قریب سے ہو آئے ہیں" ــــ ایک نے کہا ــــ "ہمیں قنوج کی یا کسی اور ہندو مہاراجے کی فوج نظر نہیں آئی۔ کیا قنوج کی فوج اُس وقت باہر آئے گی جب ہماری فوج قریب آجائے گی؟"

"ہمیں اپنی فوج کے آنے تک اسی علاقے میں رہنا ہے طلال بھائی!" ــــ دوسرے نے کہا ــــ "یا ہم اُس وقت واپس جائیں گے جب ہمیں قنوج کی فوج نظر آجائے گی۔ سلطان کو بتایا گیا ہے کہ وہ جب منج کا محاصرہ کرے گا تو قنوج کی فوج عقب سے حملہ کرے گی۔ سلطان کو یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ہماری فوج کا مقابلہ منج اور قنوج کے

درمیان ہوگا۔ ہمیں معلوم کرنا ہے کہ قنوج کی وہ فوج کہاں ہے جسے ہماری فوج پر عقب سے حملہ کرنا ہے... معلوم ہوتا ہے تم تنگ آگئے ہو"۔

"نہیں صالح!"۔۔۔ طلال نے کہا۔۔۔ "میں اتنی جلدی تنگ آنے والا نہیں۔ میرا خیال ہے مہاراجہ قنوج باہر آکر لڑنے کی جرأت نہیں کرے گا"۔

"یہی تو ہمیں معلوم کرنا ہے کہ وہ ایسی جرأت کرے گا یا نہیں"۔۔۔ صالح نے کہا۔۔۔ "ہم دونوں غزنی کی فوج کی دو آنکھیں ہیں، ہمیں سلطان محمود کو بتانا ہے کہ جنگل صاف ہے یا یہاں کوئی خطرہ ہے"۔

"آؤ پھر یہیں سو جائیں"۔۔۔ طلال نے کہا۔۔۔ "سردی تو بہت ہے لیکن رات گذر جائے گی"۔

طلال ابراہیم اور صالح بروک ہندوستانی مسلمان تھے۔ صالح بروک اُن عربوں کی نسل سے تھا جو محمد بن قاسم کے ساتھ ہندوستان میں آئے اور یہیں آباد ہو گئے تھے اور طلال ابراہیم کے آباؤاجداد کا مذہب کچھ اور تھا۔ وہ محمد بن قاسم کے دورِ حکومت میں مسلمان ہوئے تھے۔ اب ہندوستان میں محمود غزنوی کی جنگی مہمات اور بُت شکنی کا سلسلہ شروع ہوا تو غزنی کی فوج کو انٹیلی جنس کے لئے ہندوستان کے مسلمان باشندوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یہ عام قسم کی فوجی بھرتی نہیں تھی کہ ہر اُس جوان کو بھرتی کرلیا جاتا جو تیغ زنی اور گھوڑسواری کی سوجھ بوجھ رکھتا تھا۔ جاسوسی کے لیے ایسے افراد کی ضرورت تھی جو دماغی لحاظ سے غیر معمولی طور پر تیز اور ذہین تھے اور جو اداکاری کی مہارت رکھتے تھے اور جو کئی کئی روز تک ہر قسم کے موسمی حالات میں جنگلوں، پہاڑوں، صحراؤں اور میدانوں میں تندرست رہنے کی اہلیت رکھتے تھے۔ سب سے بڑی خوبی یہ دیکھی جاتی تھی کہ اِن کا کردار پختہ ہو اور لالچ کتنا ہی دلکش کیوں نہ ہو، اُسے قبول نہ کریں۔ ان میں بندروں کی پھُرتی، گھوڑے کی طاقت، عقاب کی نظر اور چیتے کی جھپٹ کا ہونا بھی لازمی تھا۔ بنیادی ضرورت ایمان کی تھی۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں جذبہ موجود تھا۔ ہندوستان بے شمار راجوں مہاراجوں میں بٹا ہُوا تھا۔ وہ سب ہندو تھے، اور وہ مسلمانوں پر بھروسہ نہیں کرتے تھے۔

جب سے سلطان محمود غزنوی کے حملے شروع ہوتے تھے، ہندوؤں نے ہر مسلمان کو غزنی کا جاسوس سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے باوجود یہاں کے مسلمان غزنی کی فوج کی مدد اور راہنمائی کرتے تھے اور کئی ایک باقاعدہ مشرف (انٹیلی جنس ایجنٹ) بن گئے تھے مگر ان میں کوئی ایسا بھی نکل آتا تھا جو اپنے نفس کے دھوکے میں یا ہندوستان کے بچھائے ہوئے دلکش جال میں آجاتا تھا۔

طلال ابراہیم اور صالح بروک سلطان محمود کی انٹیلی جنس کے مشرف تھے۔ سلطان محمود کو متھرا میں بتایا گیا تھا کہ اُس نے جس آسانی سے متھرا فتح کر لیا ہے، اتنی آسانی سے قنوج کا قلعہ سر نہیں کر سکے گا اور جب دریائے جمنا کے کنارے پر واقع مُنج نام کے قلعے کا محاصرہ کرے گا تو قنوج کی فوج اُس پر عقب سے حملہ کرے گی اور اُسے دریائے گنگا اور جمنا کے درمیانی علاقے میں لڑنا پڑے گا جس میں اُس کی شکست کا امکان زیادہ ہے۔ ایک خطرہ یہ بھی تھا کہ لاہور کا مہاراجہ بھیم پال نڈر اس علاقے کے سرلائے، راجے اور مہاراجے کو سلطان محمود کے خلاف اتحاد پر قائل کر رہا تھا۔ خطرہ یہ تھا کہ وہ اپنی فوج بھی لے آیا ہوگا۔

سلطان محمود کی فوج مسلسل لڑ لڑ کر تھک چکی تھی۔ فوج کی نفری زخمی اور شہید بھی ہوئی تھی اور یہ فوج اپنے مستقر غزنی سے تین ماہ کی مسافت جتنی دور تھی۔ وہ بہت بڑے خطرے میں آگیا تھا۔ جاسوسوں کی رپورٹوں کے مطابق اسے دریائے گنگا اور جمنا کے درمیان ہندوؤں کی کثیر تعداد اور تازہ دم فوج کے خلاف لڑنا تھا۔ اُس نے متھرا سے کوچ کیا تو طلال ابراہیم اور صالح بروک کو چند روز پہلے قنوج کے گرد و نواح میں بھیج دیا گیا تھا کہ وہ ہندوؤں کی فوجوں، خصوصاً قنوج کی فوج کی نقل و حرکت دیکھ کر فوراً اطلاع دیں۔

دونوں کو اس علاقے میں غریب اور خانہ بدوش گڈریوں کے بھیس میں گھومتے پھرتے تین دن ہو گئے تھے۔ انہوں نے بلند درختوں اور پہاڑیوں پر بھی چڑھ کر دیکھا تھا۔ انہیں کسی فوج کا نام و نشان نظر نہیں آرہا تھا۔ انہوں نے دریائے گنگا کو بھی دیکھا تھا۔ انہیں فوج کی کوئی کشتی نظر نہیں آئی تھی۔ ان دونوں میں طلال ابراہیم

کچھ اکتایا سا لگ رہا تھا۔ عربی نسل کا صالح بروک پہلے روز کی طرح تروتازہ تھا۔ وہ اپنے فرض سے کوتاہی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ نومبر کا مہینہ تھا اور اس علاقے میں سردی خاصی زیادہ ہو گئی تھی۔ وہ چٹان پر ایسی جگہ لیٹ گئے جہاں سرد ہواؤں سے بچنے کے لیے اوٹ موجود تھی۔

رات کا پہلا پہر گذر چکا تھا جب صالح بروک کی آنکھ کھُل گئی۔ وہ کچھ آوازوں سے جاگ اُٹھا تھا۔ وہ جس چٹان پر سوتے ہوتے تھے اس کے نیچے اُن کے قریب ہی سے کچھ لوگ گذر رہے تھے۔ گھوڑوں کے ٹاپو بھی سنائی دے رہے تھے۔ صالح کو روشنی بھی نظر آئی۔ وہ کروٹ بدل کر پیٹ کے بَل ہو گیا اور چند گز آہستہ آہستہ رینگ کر آگے ہو گیا جہاں سے اُسے اپنے نیچے ایک عجیب قافلہ گذرتا دکھائی دیا۔ سب سے آگے دو آدمی مشعلیں اٹھائے چلے جا رہے تھے۔ اُن کے درمیان ایک تنومند آدمی تھا۔ اُس کے لباس سے پتہ چلتا تھا کہ پنڈت ہے۔ اس کے پیچھے پانچ خچریں جا رہی تھیں جو ایک دوسری کے پیچھے بندھی ہوئی تھیں۔ اگلی خچر کی لگام پنڈت کے ہاتھ میں تھی۔ سب سے آخری خچر کے ساتھ ایک لمبی رسّی بندھی ہوئی تھی خچروں کے پیچھے سات آٹھ آدمی تھے۔ ہر ایک نے یہ رسّی پکڑ رکھی تھی اور ایک ہاتھ اپنے سے اگلے آدمی کے کندھے پر رکھا ہوا تھا۔ عجوبہ یہ تھا کہ پنڈت کے سوا ہر آدمی کی آنکھوں پر سیاہ پٹی بندھی ہوئی تھی اور وہ اندھوں کی طرح آہستہ آہستہ چلے جا رہے تھے۔ مشعلوں والے آدمیوں کی بھی آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔

پنڈت تھوڑے تھوڑے وقفے سے کہتا جا رہا تھا ــــ "چلے چلو میں دیکھ رہا ہوں۔ راستہ صاف ہے" ــــ یہ عجیب و غریب قافلہ آہستہ آہستہ جا رہا تھا خچروں پر لکڑی کے بکس لدے ہوتے تھے۔ صالح بروک رینگ کر اپنے ساتھی طلال ابراہیم تک آیا۔ اُسے جگایا اور اُس کے کان میں سرگوشی کی کہ رینگ کر اُس کے ساتھ آئے۔ اب دونوں نے اندھوں کا یہ قافلہ دیکھا۔ انہیں کچھ پلّے نہ پڑا کہ یہ کیا ہے۔

چالیس پچاس گز آگے جا کر قافلہ رُک گیا۔ وہاں ایک اور چٹان دیوار کی طرح سیدھی کھڑی تھی۔ طلال اور صالح چٹان کے اوپر اوپر دبے پاؤں چلتے وہاں تک چلے

گئے جہاں قافلہ رُکا تھا۔ دونوں وہاں چٹان پر ایک درخت کی اوٹ میں لیٹ گئے۔ قافلہ اس چٹان اور ساتھ والی عمودی چٹان کے درمیان رُکا ہُوا تھا۔ مشعلوں کے شعلے بہت بڑے تھے۔ طلال اور صالح کو وہاں دوسری چٹان میں ایک خلا نظر آیا جو نیچے سے اوپر تک چلا گیا تھا۔ خلا یا شگاف اتنا فراخ تھا کہ ایک خچر اس میں سے آسانی سے گذر سکتی تھی۔

پنڈت نے ایک مشعل بردار کے ہاتھ سے مشعل لے لی اور بولا "سب یہیں کھڑے رہو۔ میں واپس آکر تمہیں آگے لے جاؤں گا"۔ پنڈت شگاف میں چلا گیا اور بائیں کو چٹان کی اوٹ میں ہو گیا۔ کچھ دیر بعد نظر آیا۔ مشعل کی روشنی میں اس شگاف میں سے پیچھے چٹان کی دیوار نظر آئی۔ پنڈت وہاں کہیں غائب ہو گیا۔ مشعل کی روشنی بھی کہیں گم ہو گئی۔ تھوڑے سے وقت بعد اُس کی مشعل پھر نظر آئی۔ وہ شگاف سے باہر آگیا۔

"کوئی آدمی اپنی آنکھوں کی پٹی میں سے دیکھنے کی کوشش نہ کرے"۔ پنڈت نے کہا ۔۔۔ "کسی نے پٹی ہٹانے کی کوشش کی تو اس کی سزا موت ہو گی"۔

ان آدمیوں کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی رہیں۔ پنڈت ان کے ہاتھ پکڑ پکڑ کر ان سے خچروں سے بکس اُتروانے لگا۔

ایک مشعل اُس نے اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ دوسرے مشعل برداروں کو اُس نے اپنی ضرورت کے مطابق کھڑا کر دیا تھا۔ یہ اندھے بکس اُٹھا کر چلتے تھے، بعض گر بھی پڑتے تھے اور غائب ہوتے جا رہے تھے۔ کرتے کرتے خچروں سے بکس اُتر کر چٹان کے اندر چلے گئے۔ خچریں باہر کھڑی رہیں اور تمام آدمی اندر چلے گئے۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ یہ مال و دولت تھا جو یہاں چھپایا جا رہا تھا، مگر ان آدمیوں کی آنکھوں پر پٹیاں کیوں بندھی ہوئی تھیں؟

"یہ آدمی ڈاکوؤں کا سردار ہے" ۔۔۔ طلال ابراہیم نے کہا ۔۔۔ "اور یہ باقی آدمی بیگار میں پکڑے ہوئے ہیں"۔

"شاید اس کا گروہ مزید لوٹ مار کے لیے چلا گیا ہو گا"۔

"صالح!"۔۔۔ طلال نے کہا۔۔۔ "اگر یہ لوگ یہاں پہرہ نہ بٹھائیں تو اس مال سے ہم کچھ حصہ جو ہم اٹھا سکتے ہیں، اُٹھا کر لے جا سکتے ہیں۔ کیا ارادہ ہے؟"

"ہوش میں آؤ طلال!"۔۔۔ صالح بروک نے کہا۔۔۔ "ان خزانوں سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں۔ ہمیں وہ فرض ادا کرنا ہے جس کے لیئے ہمیں یہاں بھیجا گیا ہے۔"

"میں فرض کو نہیں بھول رہا"۔۔۔ طلال نے کہا۔۔۔ "رات تو ہمیں یہیں گذارنی ہے۔ ہم کوئی کام نہیں کر رہے۔ جو کام ہوگا صبح ہوگا۔ رات کو یہ کام کرتے ہیں کہ یہ لوگ اگر چلے جائیں تو ہم غار کے اندر چلے جائیں گے۔ اندر کوئی نہیں ہوگا۔ کوئی ہوتا تو وہ بھی بکس اندر لے جانے کے لیے باہر آتا۔"

"ہم اندر نہیں جائیں گے"۔۔۔ صالح نے کہا۔۔۔ "ٹوٹے ہوئے خزانوں کو دل سے اتار دو۔ خزانے اور عورت کی کشش نے بادشاہوں کے تختے اُلٹے ہیں۔ دل سے طمع نکال دو۔"

"تم پتھر ہو"۔۔۔ طلال نے جھنجلا کر کہا۔۔۔ "تم پاگل ہو۔"

صالح بروک کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ مشعلیں باہر آگئیں اور اس کے ساتھ ہی وہ آدمی جو پنڈت لگتا تھا اور باقی سب آدمی اُس کے پیچھے پیچھے باہر آگئے۔ پنڈت ان کے ہاتھ پکڑ پکڑ کر خچروں تک لایا۔ اُس نے انہیں خچروں پر سوار کرا دیا۔ خچریں تھوڑی تھیں اور آدمی زیادہ۔ ایک ایک خچر پر پنڈت نے دو دو آدمی سوار کرا دیئے اور ان کے لگام ایک دوسری خچر کے پیچھے باندھ کر خود اگلی خچر کی لگام پکڑ لی اور پیدل چل پڑا۔

وہ جب دُور نکل گئے تو طلال نے ایک بار پھر صالح سے کہا کہ چلو دیکھتے ہیں یہ کیا ہے مگر صالح نے اُسے سختی سے منع کر دیا اور اُسے یہ بھی کہنا پڑا کہ طلال نے اگر یہ ضد جاری رکھی تو صالح اُسے قتل کر دے گا۔ طلال ابراہیم ہنس پڑا اور دونوں پھر سو گئے۔ رات تھوڑی ہی رہ گئی تھی۔

ابھی صبح دُھندلی تھی جب یہ پنڈت مہاراجہ قنوج راجیا پال کی خواب گاہ کے دروازے پر جا کھڑا ہوا۔ یہ مہاراجہ کے جاگنے کا وقت نہیں تھا مگر خواب گاہ کی خادمہ

جو باہر کھڑی تھی، پنڈت کو دیکھتے ہی اندر چلی گئی اور باہر آ کر پنڈت سے کہا کہ اندر چلا جائے۔ وہ دروازے میں داخل ہوا تو شکنتلا رانی اندر سے نکلی۔ شکنتلا تئیس سال سے کم عمر کی چھوٹی رانی تھی۔ بڑی رانی لکشمی کی عمر چالیس سال سے خاصی اوپر ہو گئی تھی۔ شکنتلا بہت خوبصورت اور بڑے ہی دلکش جسم کی عورت تھی۔ وہ خواب گاہ سے نکلی تو یوں چل رہی تھی جیسے خواب میں چل رہی ہو۔ آنکھیں نیم وا تھیں اور قدم بے خیالی میں اُٹھ رہے تھے۔ اس کے جسم سے جہاں مدہوش کر دینے والے عطر کی خوشبو آ رہی تھی وہاں شراب کی بُو بھی تھی۔

مہاراجہ راجیا پال نے پنڈت سے کہا کہ دروازہ بند کر کے اُس کے قریب بیٹھ جائے۔

"رات خزانے کی آخری کھیپ وہاں پہنچا دی گئی ہے"۔ پنڈت نے کہا۔

"کیا اُن تمام آدمیوں کو قید میں ڈال دیا گیا ہے جنہوں نے بکس غار میں رکھے تھے؟"۔۔۔ مہاراجہ قنوج نے پوچھا۔

"انہیں قید میں ڈالنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کی آنکھوں پر سیاہ پٹیاں بندھی ہوئی تھیں"۔۔۔ پنڈت نے کہا۔۔۔"پھر بھی آپ کے حکم کی تعمیل کی گئی ہے۔ ان سب کو قید میں ڈال دیا گیا ہے اور میں نے قید خانے والوں سے کہہ دیا ہے کہ ان سب کو نہایت اچھی خوراک دی جائے اور انہیں ہر طرح سے آرام اور عزّت سے رکھا جائے"۔

"پنڈت جی مہاراج!"۔۔۔ مہاراجہ راجیا پال نے کہا۔۔۔"اب صرف آپ ہیں جو خزانے کے راز سے واقف ہیں۔ آپ کو یہ احساس تو ہو گا کہ میں نے آپ کی کتنی عزت افزائی کی ہے۔ اپنی فوج کے سیناپتی تک کو اس راز میں شریک نہیں کیا اور آپ یہ بھی سوچیں کہ شکنتلا رانی سے مجھے کتنا پیار ہے مگر میں نے اسے بھی نہیں بتایا کہ میں تمام تر خزانہ قلعے سے کہیں اور منتقل کر چکا ہوں"۔

"مہاراج کو مجھ پر کسی قسم کا شک نہیں کرنا چاہیئے"۔۔۔ پنڈت نے کہا۔۔۔"بس آپ کا خزانہ اُس روز سے اس غار میں لے جا رہا ہوں جس روز سے یہاں اطلاع پہنچی ہے کہ غزنی کے سلطان محمود نے متھرا پر بھی قبضہ کر لیا ہے اور اب اُس کا رُخ قنوج کی طرف ہے۔ آپ خود جا کر وہ جگہ دیکھ آئے ہیں جو میں نے اس پہاڑی

کے اندر بنوائی ہے۔ راج محل میں بھی کسی کو پتہ نہیں چل سکا کہ ایک رات آپ میرے ساتھ وہاں گئے تھے .... آج میں نے آپ کے زرودولت کی آخری کھیپ بھی اُس جگہ پہنچا دی ہے۔"

"اُس کی حفاظت کا انتظام مکمل ہو گیا ہے؟"

"اتنا مکمل کہ اب آپ بھی وہاں اکیلے جائیں تو شاید وہاں سے زندہ نہیں نکل سکیں گے"۔ پنڈت نے کہا۔"وہاں پہرے پر کوئی ایک بھی انسان نہیں۔ سانپ پہرہ دے رہے ہیں۔"

"مجھے ایک بات اور کہنی ہے"۔ مہاراجہ نے کہا۔"اگر یہ راز فاش ہو گیا تو وہ دن آپ کی زندگی کا آخری دن ہوگا، اور اگر اس سے پہلے میری موت آگئی تو آپ کو میرے ساتھ مرنا ہوگا۔"

پنڈت کے ہونٹوں پر طنز آلود مسکراہٹ آگئی۔ بولا۔"زروجواہرات کا نشہ اتنا بُرا ہوتا ہے کہ انسان درندہ بن جاتا ہے۔ اپنے بیوی بچوں کو اور اپنے مذہبی پیشواؤں کو بھی اپنا دشمن سمجھنے لگتا ہے۔ جو دولت میرے پاس ہے، اس کے سامنے ہیروں اور سونے کی چمک کوئی معنی نہیں رکھتی۔ میرے بھجن، میری پرارتھنا اور ہری کرشن کے چرنوں میں راتوں کو جاگنا وہ دولت ہے کہ آپ جیسے مہاراجے اور ان کی فوجیں مجھے چیونٹیوں کی طرح دکھائی دیتی ہیں۔"

"اسی لیے تو میں نے آپ کو اپنا رازدان بنایا ہے"۔ مہاراجہ راجیا پال نے کہا۔

تمام مؤرخین نے جن میں محمد قاسم فرشتہ اور البیرونی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، لکھا ہے کہ محمود غزنوی کو بتایا گیا تھا کہ اُس کا مقابلہ قنوج میں ہوگا۔ قنوج کے حکمران خاندان کے متعلق سلطان محمود نے ایسی باتیں سنی تھیں کہ اُس پر عجیب سی قسم کی سنجیدگی طاری ہو گئی تھی۔ غزنی سے اُسے کمک ملنے کی توقع نہیں تھی۔ وہ ایسی چالیں سوچتا رہتا تھا جن سے قنوج کی فوج کو شکست دے سکے۔ متھرا میں اُس نے اپنی فوج

کو بہت آرام دے لیا تھا مگر سالاروں اور نائب سالاروں کو اُس نے چین سے بیٹھنے نہیں دیا تھا۔ اپنی فوج کا مورال بلند کرنے کے لیے اُس نے اماموں کے ذریعے تمام فوج کو پیغام بھی دیا تھا۔

یہ اُس کے جذبے کا جنون اور عزم کی پختگی تھی کہ وہ یکے بعد دیگرے اتنے قلعے سر کرکے اور اتنے معرکے لڑ کر بھی آگے بڑھنے کا فیصلہ کر چکا تھا، مگر قنوج کے متعلق اُسے جو رپورٹ ملی تھی وہ صحیح نہیں تھی۔ مہاراجہ قنوج راجیاپال نے اپنا خزانہ قنوج سے کسی پہاڑی علاقے میں منتقل کرنا شروع کر دیا تھا۔ مورخین نے لکھا ہے کہ محمود غزنوی کی پے بہ پے فتوحات اور اس کی برق رفتار یلغار کو دیکھ کر راجیاپال حوصلہ چھوڑ بیٹھا تھا۔ قنوج کے بڑے مندر کا پنڈت اُسے لڑنے کے لیے تیار کر رہا تھا مگر اُس کے پاس نہ لڑنے کی ایک وجہ اور بھی تھی جو اُس نے پنڈت کو نومبر ۱۰۱۸ء کی اس صبح اپنی خواب گاہ میں بتائی۔

"مہاراج کا خزانہ محفوظ ہو گیا ہے"۔۔۔ پنڈت اسے کہہ رہا تھا۔۔۔"اب آپ سلطان محمود کا مقابلہ جم کر کریں، ورنہ قنوج کا مندر بھی مسجد بن جائے گا۔ یہ نہ بھولیں کہ جنہیں مسلمان بُت کہتے ہیں وہ ہمارے بھگوان ہیں۔ ان کی جو توہین ہو چکی ہے وہ آپ نے دیکھ لی ہے۔ میں آپ کو خبردار کرتا ہوں کہ آپ دیوی دیوتاؤں کے قہر سے بچ نہیں سکیں گے"۔

مہاراجہ نے پنڈت کو طنزیہ نگاہوں سے دیکھا اور دھیمی سی آواز میں بولا۔۔۔

"جنہیں آپ دیوی دیوتا کہتے ہیں یہ دراصل بُت ہی ہیں۔ اگر ان میں قہر برسانے کی طاقت ہے تو اپنی بے عزتی کی سزا مسلمانوں کی فوج کو کیوں نہیں دیتے؟ وہ متھرا میں اذانیں دینے والوں پر بجلی بن کر کیوں نہیں گرتے؟"

"مسلمانوں کی فوج دراصل دیوتاؤں کا قہر ہے جو اس دیس کے اُن مہاراجوں پر پڑ رہا ہے جو اپنے مذہب کی توہین کرا رہے ہیں"۔۔۔ پنڈت نے کہا۔۔۔"مگر آپ مذہب کی بجائے اپنے خزانوں کی حفاظت کر رہے ہیں"۔

"وہ اس لیے کہ غزنی کا سلطان خزانے لوٹ کر غزنی لے جانے کے لیے آتا ہے"۔۔۔

مہاراجہ راجیا پال نے کہا۔"وہ قنوج کا خزانہ نہیں لے جا سکے گا۔ وہ مجھے قید نہیں کر سکے گا۔ وہ یہاں پاگلوں کی طرح ہمارا خزانہ ڈھونڈتا رہے گا۔ اُسے کچھ بھی نہیں ملے گا۔ اُسے میں بھی نہیں ملوں گا۔ میں وہاں ہوں گا جہاں اُس کی پوری فوج مجھے نہیں ڈھونڈ سکے گی۔"

"اُسے مندر مل جائیں گے"۔ پنڈت نے کہا۔ "وہ مندروں کو اجاڑے گا اور ہم کھڑے دیکھتے رہیں گے۔ مہاراج! زروجواہرات کے پیار نے آپ کو بزدل بنا دیا ہے۔ آپ غزنی کے سلطان کو دھوکہ دینے کی سوچ رہے ہیں مگر یہ بزدلی ہے۔ آپ اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ اپنی فوج کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ آپ نہیں سمجھتے کہ جب آپ یہاں سے چوری چھپے بھاگ کر کہیں چلے جائیں گے تو آپ کی فوج اور رعایا کے دل میں آپ کے خلاف نفرت پیدا ہو جائے گی.... میں بھگوان کے نام پر آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اپنا فیصلہ بدل دیں۔ قنوج کا بچہ بچہ لڑنے مرنے کے لیے تیار ہے۔ انہیں مسلمانوں کے خلاف آگ کے بگولے بنانا میرا کام ہے۔"

"مجھے سوچنے دیں"۔ مہاراجہ راجیا پال نے کہا۔ "مجھے سوچنے دیں"۔
وہ پریشان ہو گیا اور بے چینی کے عالم میں کہنے لگا۔"میں نے کچھ سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے۔ آپ چلے جائیں۔ میں آپ کو ہر ایک بات نہیں بتا سکتا۔"

پنڈت کے جانے کے بعد مہاراجہ قنوج راجیا پال نے اپنی فوج کے سینئر کمانڈروں کو بلایا اور انہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔"یہ بظاہر بزدلی ہے کہ میں غزنی والوں کا مقابلہ نہیں کروں گا، لیکن میں نے سوچا ہے کہ میں غائب ہو جاؤں گا۔ یہ محمود کے لیے بہت بڑی چوٹ ہوگی۔ وہ قنوج میں پاگلوں کی طرح سر پٹختا پھرے گا۔ وہ ابھی یہاں سے جائے گا نہیں۔ اس کا مقابلہ ابھی کسی نے بھی نہیں کیا۔ اُسے ہر جگہ آسان فتح حاصل ہوئی ہے۔ میں نے سوچا ہے کہ لڑ لڑ کر اور پیش قدمی کرتے کرتے اُس کی طاقت بہت کم ہو جائے گی۔ میں اس عرصے میں دوسرے مہاراجوں

کو ساتھ ملا کر بڑی زبردست فوج بنالوں گا۔ پھر یہی قنوج سلطان محمود اور اس کی فوج کا قبرستان بن جائے گا۔"

وہ سلطان محمود غزنوی کا مقابلہ نہ کرنے اور غائب ہو جانے کے حق میں جواز پیش کرتا رہا مگر اس کے فوجی کمانڈروں کے چہرے بتا رہے تھے کہ وہ اپنے مہاراجہ کے فیصلے کو پسند نہیں کر رہے۔ ان میں سے کوئی بھی نہ بولا۔ سب بُت بنے سنتے رہے۔

"کیا آپ سب کو میرا فیصلہ منظور ہے؟"۔۔۔ اُس نے سب سے پوچھا۔

"ہم آپ کے حکم کی تعمیل کریں گے"۔۔۔ اُس کے سیناپتی (کمانڈر انچیف) نے کہا۔۔۔ "مگر ہم میں سے کوئی بھی اپنی زبان سے یہ نہیں کہے گا کہ وہ نہیں لڑے گا۔ مہاراج! یہاں سوال آپ کے یہاں رہنے یا غائب ہو جانے کا نہیں۔ یہاں مسئلہ مذہب کا ہے۔ اس جنگ کا تعلق براہِ راست مذہب سے ہے۔ اگر ہندو راجے یوں میدان چھوڑ کر بھاگنے لگے تو سارا ہندوستان مسلمان ہو جائے گا۔"

مہاراجہ راجیا پال نے ایک کاغذ کھول کر اپنے سیناپتی کو دے کر کہا۔۔۔ "یہ سب کو پڑھ کر سناؤ۔"

یہ لاہور کے مہاراجہ بھیم پال نڈر کا خط تھا جو اُس نے مُنج کے رائے چندا کو لکھا تھا۔ رائے چندا نے یہ خط قنوج کے مہاراجہ راجیا پال کو بھیج دیا تھا۔ بہت سے مؤرخوں نے اس خط کا ذکر کیا ہے۔ ان کے مطابق مہاراجہ بھیم پال نڈر نے رائے چندا کو لکھا تھا:

"سلطان محمود ہندوستان کے حکمرانوں کی طرح نہیں۔ وہ سیاہ فام آدمیوں کا سردار نہیں۔ اُس کا نام سن کر ہی فوجیں اُس کے آگے بھاگ اٹھتی ہیں۔ اُس کے گھوڑے کی لگام آپ کے گھوڑے کی لگام سے زیادہ مضبوط ہے۔ وہ تلوار کے ایک ہی وار سے مطمئن نہیں ہُوا کرتا اور وہ سلسلۂ کوہ میں سے صرف ایک پہاڑی نہیں لیا کرتا۔ اگر آپ اُس سے محفوظ رہنا چاہتے ہیں تو میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ کہیں چھپ جائیں۔"

رائے چندا نے یہ خط اس پیغام کے ساتھ مہاراجہ راجیا پال کو بھیج دیا تھا کہ وہ لڑ کر مرنے کو ترجیح دے گا۔ اُس نے یہ خط مہاراجہ راجیا پال کو اس لیے بھیجا تھا کہ وہ اپنی قسمت کا خود فیصلہ کر لے۔

"میں جانتا ہوں غزنی کا سلطان محمود قنوج کو کھنڈر بنا دے گا" مہاراجہ راجیاپال نے کہا۔ "لیکن یہی کھنڈر اُس کی قبر بنیں گے اور ان کھنڈروں سے نیا قنوج ابھرے گا جو ہندو مت کا محافظ ہوگا.... میں آپ سب کو یہ بتانا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ فوج کو پتہ نہ چلے کہ میں نے کیا فیصلہ کیا ہے۔"

تمام کمانڈر سر جھکائے ہوئے باہر نکل گئے۔

آدھی رات سے کچھ دیر پہلے پنڈت عبادت میں مصروف تھا۔ یہ وقت اُس کی عبادت کا نہیں تھا لیکن مہاراجہ قنوج کے فیصلے نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ اسے اب یہی نظر آرہا تھا کہ سلطان محمود آئے گا اور اس مندر کو اجاڑ کر اُس کے دیوتاؤں کے بُت توڑ دے گا۔ پنڈت اُس وقت سے ڈر رہا تھا اور دیوتاؤں سے کہہ رہا تھا کہ وہ مسلمانوں کو قنوج سے دور ہی فنا کر دیں۔ وہ رو رہا بھی تھا اور بڑی دردناک آواز میں بھجن گا رہا تھا۔ اُس کا دروازہ کھلا مگر وہ عبادت میں اتنا محو تھا کہ اُسے پتہ نہ چل سکا کہ اُس کے قریب کوئی آ کے بیٹھ گیا ہے۔ وہ اُس وقت چونکا جب اُس کے کندھے پر کسی نے ہاتھ رکھا۔ اُس نے دیکھا۔ اُس کے قریب مہاراجہ قنوج کی چھوٹی رانی شکنتلا بیٹھی تھی۔

"آپ؟"۔۔۔ پنڈت نے حیران ہو کے پوچھا۔ "اِس وقت؟".... وہ سنبھل گیا اور بولا۔۔۔ "پہلے دیوی کے چرنوں میں ماتھا رگڑیں۔"

رانی شکنتلا نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہ ہو۔ وہ اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے تھی۔ پنڈت نے اپنے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑتی محسوس کی۔ ایک اس لیے کہ وہ شکنتلا رانی تھی اور دوسرے اس لیے کہ شکنتلا کے حُسن میں جادو کا اثر تھا۔ پنڈت کا دل اس سوال سے بڑی زور زور سے دھڑکنے لگا کہ رانی اس وقت مندر میں کیوں آئی ہے؟ وہ عبادت کے لیے نہیں آئی تھی۔ اُس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ کسی خاص مقصد کے لیے آئی ہے۔

"آپ کے چہرے پر گھبراہٹ کیوں آگئی ہے؟"۔۔۔ رانی شکنتلا نے کہا۔ "کیا مجھ

جیسی خوبصورت عورت پہلے نہیں دیکھی؟ .... کیا میں اُن کنواریوں کے مقابلے میں کچھ نہیں جنہیں آپ منتخب کر کے اپنے پاس رکھا کرتے ہیں اور لوگوں کو یہ بتایا کرتے ہیں کہ یہ کنواریاں اب پاک ہو گئی ہیں؟"

"آپ اپنا مطلب بیان کر دیں تو زیادہ بہتر ہو گا" ــــ پنڈت نے کہا ــ "آپ دیکھ رہی ہیں کہ میں عبادت میں مصروف ہوں۔"

"مہاراج!" ــــ شکنتلا نے کہا ــ "اگر ہم ایک دوسرے کو دھوکہ نہ دیں تو دونوں کے لیے بہتر ہو گا۔ آپ کس کی عبادت کر رہے ہیں؟ ان دیوتاؤں کی جو دو دن کے مہمان ہیں؟ ہری کشن واسدیو نے مسلمانوں کا کیا بگاڑ لیا ہے؟ کنواریوں کی قربانی کہاں گئی؟ اُن معصوموں کا خون کس کھاتے میں گیا؟"

"کیا آپ مجھے مہاراج کی طرح مذہب سے گمراہ کرنے آئی ہیں؟"

"نہیں" ــــ رانی شکنتلا نے کہا ــ "میں آپ کو مہاراجہ بنانے آئی ہوں .... مجھے صرف یہ بتا دیں کہ خزانہ کہاں ہے۔ مجھے وہاں لے چلیں۔ ہم دونوں، میں اور آپ خزانہ لے کے کہیں چلے جائیں گے۔ ہو سکتا ہے میں آپ کو قنوج کی گدّی پر ہی بٹھا دوں۔"

"کیسا خزانہ؟" ــــ پنڈت نے کہا ــ "میں خزانے کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔"

"میں جانتی ہوں آپ اپنا عہد پورا کر رہے ہیں" ــــ رانی شکنتلا نے کہا ــــ "لیکن آپ کو مجھے اس راز میں شریک کرنا پڑے گا۔ مجھے مذہب سے اور دیوی دیوتاؤں کے قہر سے نہ ڈرانا۔ مذہب کو میں ایک فریب کے سوا کچھ نہیں سمجھتی۔ میں صرف خزانہ حاصل کرنے نہیں آئی۔ آپ کو بھی ساتھ لے جانے آئی ہوں۔"

"مذہب کوئی ساتھی ہو، مذہب کو فریب سمجھنے والے اس دنیا میں کبھی سُکھی نہیں رہے" ــــ پنڈت نے کہا ــ "غزنی کا سلطان کیوں فتح پہ فتح حاصل کرتا جا رہا ہے؟ صرف اس لیے کہ اُسے اپنے مذہب سے اتنا پیار ہے کہ وہ سارے ہندوستان کو مسلمان بنا دینا چاہتا ہے۔ اس کے دل میں ہمارے مذہب کے خلاف نفرت بھری ہوئی ہے۔"

"ہمارا مذہب نفرت کے قابل نہیں تو اور کیا ہے ؟" ــــ رانی شکنتلا نے کہا ــــ "مہاراج! میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔ آپ بیس پچیس راتوں سے خزانہ کہیں لے جاکر چھپا رہے ہیں۔ آپ سمجھتے ہیں کہ اس راز سے آپ اور مہاراجہ کے سوا کوئی واقف نہیں۔ آپ نہیں جانتے کہ مجھ سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں۔ اگر آپ نے میری راہنمائی نہ کی تو آپ کو بہت بڑا نقصان ہوگا۔"

"کیا آپ اپنے خاوند کو دھوکہ دینا چاہتی ہیں ؟"

"مہاراجہ کسی ایک عورت کا خاوند نہیں ہوتا" ــــ شکنتلا رانی نے کہا ــــ "آج رات وہ کسی اور کا خاوند ہے، اس لیے آپ کے پاس آنے کا موقع مل گیا ہے۔ مہاراجہ اُس وقت تک میرا خاوند ہے جس وقت تک میرا حسن و جوانی قائم ہے .... مہاراج! انسان جب تخت پر بیٹھ کر سر پر سونے کا تاج سجا لیتا ہے تو اُس کے اندر انسانی جذبات مر جاتے ہیں۔ وہ محبت اور خلوص سے خالی ہو جاتا ہے۔ مہاراجہ کو صرف خزانے سے محبت ہے۔ اسے ایسا کوئی غم نہیں کہ غزنی کے فوجی مجھے اور مجھ جیسی تمام جوان اور خوبصورت عورتوں کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ وہ اپنے خزانے کو بچانا چاہتا ہے۔ اُسے آپ کا اور آپ کے دیوتاؤں کا کوئی خیال نہیں۔ آپ اپنا خیال کریں اور آپ میری طرف دیکھیں۔"

"میں اس کے باوجود آپ کو خزانے کا راز نہیں دوں گا" ــــ پنڈت نے کہا۔

"پھر آپ اغوا ہو جائیں گے" ــــ شکنتلا رانی نے کہا ــــ "آپ میری آنکھ کے اشارے پر قتل ہو جائیں گے، لیکن میں آپ کو قتل نہیں کراؤں گی۔ آپ کی دونوں آنکھیں نکلوا کر اور آپ کے جسم کی کھال کہیں کہیں سے کاٹ کر آپ کو جنگل میں چھوڑ دوں گی۔ اُس موت کو تصوّر میں لائیں جو آپ کو بڑی آہستہ آہستہ اس دنیا سے اٹھائے گی۔ اُس اذیّت کا تصور کریں جو آپ کو آہستہ آہستہ تڑپا تڑپا کر پیاسا مارے گی۔ آپ کے زخموں پر مکھیاں بیٹھیں گی اور چیونٹیاں چڑھیں گی۔ ہو سکتا ہے گدھ آپ کو زندہ ہی نوچنے لگیں۔"

پنڈت اس طرح چپ چاپ سن رہا تھا جیسے اُس کی زبان گنگ اور اُس

کہ جسم کی طاقت سلب ہوگئی ہو۔ شکنتلا رانی کی آنکھوں کی چمک جس میں حسن کا سحر تھا، اب ایک چڑیل کی آنکھیں بن گئی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ، دھیمے دھیمے بول رہی تھی "اور اگر میں نے آپ پر رحم کیا تو میں دوسرا طریقہ اختیار کروں گی"۔ شکنتلا رانی نے کہا ۔۔ "میں مہاراجہ سے کہوں گی کہ آپ نے مندر میں بلا کر مجھ پر دست درازی کی ہے۔ میں گواہ بھی لے آؤں گی۔ میں اپنے جسم پر اپنے ہی ناخنوں سے خراشیں ڈال کر کہوں گی کہ یہ آپ کے ناخنوں کی خراشیں ہیں۔ مہاراجہ آپ کی نہیں سنیں گے۔ وہ جانتے ہیں کہ ان مندروں میں کیا ہوتا ہے۔ انہیں معلوم ہے کہ ہر پنڈت اور ہر سادھو عورتوں کا شکاری ہے .... پھر آپ کو جلاد کے حوالے کر دیا جائے گا۔ یہ موت آپ کے لیے آسان ہوگی"۔

پنڈت کے جسم نے جھرجھری لی اور وہ بولا ۔۔ "میں تمہیں خزانے تک لے جاؤں گا .... کب چلو گی؟"

"ابھی" ۔۔ شکنتلا رانی نے کہا ۔۔ "لیکن یاد رکھیں کہ مہاراجہ تک یہ اطلاع پہنچی تو آپ کا انجام وہی ہوگا جو میں آپ کو بتا چکی ہوں۔ میں دس آدمی اور دس عورتیں مہاراجہ کے سامنے کھڑی کر کے ان سے کہلواؤں گی کہ آپ نے خزانے کا لالچ دے کر مجھے اپنے ساتھ بھاگ چلنے کو کہا تھا اور میں آپ کو موقع پر گرفتار کرانے کے لیے خزانے تک ساتھ چلی گئی تھی"۔

"خزانہ اٹھوانے کے لیے بہت سے آدمیوں کی ضرورت ہے"۔۔ پنڈت نے کہا ۔۔ "یہ انتظام خفیہ طریقے سے کیسے ہوگا؟"

"میں آج رات صرف جگہ دیکھنا چاہتی ہوں"۔۔ شکنتلا رانی نے کہا ۔۔ "سارا انتظام میرا ہوگا اور خفیہ ہوگا اور آپ کو میں اپنے ساتھ رکھوں گی۔ آپ کے ساتھ دھوکہ نہیں ہوگا"۔

پنڈت اٹھ کھڑا ہوا۔

طلال ابراہیم اور صالح بردک نے رات چٹان پر گزاری تھی۔ صبح ہوئی تو طلال نے کہا کہ وہ اس شگاف کے اندر جانا چاہتا ہے۔ صالح نے اسے کہا کہ سب سے پہلے

انہیں وہ کام کرنا چاہیے جس کے لیے وہ ادھر آتے ہیں مگر طلال کی ضد کام کر گئی پنڈت ان آدمیوں کو جن کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں جس شگاف میں لے گیا تھا، دن کی روشنی میں ڈراؤنا دکھائی دے رہا تھا۔ وہاں سے چٹان نے عجیب سی شکل اختیار کر لی تھی۔ عمودی اور خاصی اونچی دیوار سی تھی۔ اس میں شگاف ایسے تھا جیسے کنوئیں کی دیوار ایک طرف سے گرا دی گئی ہو۔ اس میں سے پیچھے کی چٹان جو کنوئیں کی تھی نظر آرہی تھی۔

طلال اور صالح اس کے اندر چلے گئے۔ یہ ایک وسیع کنواں تھا جو قدرت نے زمین پر بنایا تھا۔ چٹان میں پتھر بھی تھے مٹی بھی۔ اوپر کے درخت جھک کر اس پر سایہ کیے ہوئے تھے۔ دیواروں میں بھی درخت تھے جو اوپر جانے کی بجائے زمین کے ساتھ متوازی ہو گئے تھے۔ ان کے سائے نے اندھیرا سا کر رکھا تھا۔ اس کنواں نما جگہ میں پانی کھڑا تھا جو پانی کم اور دلدل زیادہ تھی۔ اس کے کناروں اور چٹان کے درمیان چلنے کے لیے تھوڑا سا خشک راستہ تھا۔ طلال اور صالح اس راستے پر چلتے چلتے آگے گئے تو سامنے والی چٹان کے دامن میں مٹی کی ایک ٹیکری تھی۔ پنڈت کے آدمی یہیں کہیں غائب ہوتے تھے۔

دونوں ٹیکری پر چڑھے تو انہیں چٹان میں ایک دہانہ نظر آیا جو جھکے ہوئے ایک درخت اور جھاڑی نما درختوں میں چھپا ہوا تھا۔ وہ دہانے میں چلے گئے۔ اندر کمرے کی طرح کا غار تھا جس میں آسانی سے کھڑا ہوا جا سکتا تھا۔ یہ گول سا کمرہ تھا۔ اندر اندھیرا اتنا تھا کہ کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ دونوں نے بہت ٹٹولا مگر وہاں مٹی اور پتھروں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ ایک جگہ ایک اور غار کا منہ کھلا ہوا تھا جو دراصل سرنگ تھی۔ یہ اس قدر اندھیری تھی کہ کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ اندر کیا ہے۔

"اگر تم اکیلے یہاں رہنا چاہو تو رہ سکتے ہو"۔۔۔ صالح بروک نے طلال ابراہیم سے کہا۔۔۔ "میں جا رہا ہوں"۔

طلال بے دلی سے باہر کو چل پڑا۔ وہ بار بار پیچھے دیکھتا تھا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ اپنے فرض کو بھول چکا ہے۔ جنگل کا یہ گوشہ کچھ پُراسرار اور خوفناک سا تھا۔ صالح بروک طلال کو اپنے ساتھ لے گیا اور دونوں پانچ چھ میل دور ایک چٹان پر چڑھ گئے جہاں سے

انہیں قنوج کا قلعہ اور شہر نظر آرہا تھا۔ وہاں انہیں کوئی فوجی نقل وحرکت نظر نہیں آرہی تھی۔

"سلطان منج کے قریب پہنچ چکا ہوگا"۔۔۔ صالح نے کہا۔۔۔"اور ہمیں کچھ نظر نہیں آرہا"۔

"ہم دو آدمی پیدل کتنے علاقے کو دیکھ سکتے ہیں؟"۔۔۔ طلال نے کہا۔۔۔"ہو سکتا ہے قنوج کی فوج رات کو کسی اور راستے سے منج کے قریب چلی گئی ہو"۔

"ہر جگہ ہمارے آدمی موجود ہیں"۔۔۔ صالح نے کہا۔۔۔"میں یقین سے کہتا ہوں کہ قنوج سے فوج باہر نہیں نکلی"۔

وہ سارا دن گھومتے پھرتے رہے اور رات اسی جگہ چلے گئے جہاں گزشتہ رات سوئے تھے۔ صالح نے طلال سے کہا تھا کہ وہ ساری رات وہاں گزاریں گے۔ آدھی رات تک سوئیں گے۔ پھر قنوج کے قریب چلے جائیں گے کیونکہ فوج کی نقل وحرکت کی توقع رات کو ہی کی جاسکتی تھی۔

دونوں اسی جگہ چٹان کے اوپر لیٹ گئے۔ وہ اتنے تھکے ہوئے تھے کہ لیٹتے ہی سو گئے۔

آدھی رات سے ذرا پہلے صالح بردک کی آنکھ کھل گئی۔ اسے گھوڑوں کے قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اس نے طلال ابراہیم کو جگایا۔ گھوڑے قریب آرہے تھے۔ ذرا دیر بعد روشنی نظر آنے لگی۔

"ہمارا کام ہوتا نظر آرہا ہے"۔۔۔ صالح نے کہا۔۔۔"یہ آوازیں دو یا تین گھوڑوں کی ہیں۔ فوج آرہی ہوگی"۔

دونوں پیٹ کے بل رینگ کر آگے ہو گئے جہاں سے وہ کسی کو نظر آئے بغیر نیچے دیکھ سکتے تھے۔ انہیں دو گھوڑے آتے دکھائی دیئے۔ ایک سوار کے ہاتھ میں جلتی ہوئی مشعل تھی۔ وہ قریب آئے تو طلال نے کہا۔۔۔"یہ کل رات والا آدمی معلوم ہوتا ہے، اور دوسری عورت ہے"۔

"لعنت بھیجو"۔۔۔ صالح نے کہا۔۔۔"ان کا فوج کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہو سکتا"۔

وہ سوار کنوؤاں نما چٹان کے شگاف میں آرُ کے اور اِدھر اُدھر دیکھ کر گھوڑے اندر لے گئے ــــ ایک تو پنڈت تھا اور دوسری شکنتلا رانی تھی ــــ وہ اندر جا کر غار کے دہانے کے سامنے والی ٹیکری کے قریب رکے اور گھوڑوں سے اُتر کر ٹیکری پر جا چڑھے اور غائب ہو گئے۔

"میں تمہیں کہہ رہا ہوں کہ چل کے دیکھتے ہیں یہ ہے کیا" ــ طلال نے صالح سے کہا ــ "یہ ایک مرد اور ایک عورت ہے۔ تم نے عورت دیکھی ہے۔ یہ کوئی معمولی سی قسم کی عورت نہیں۔ شہزادی معلوم ہوتی ہے"

صالح بروک کو نہ پنڈت کے ساتھ دلچسپی تھی نہ عورت کے ساتھ لیکن طلال ابراہیم اتنی تیزی سے چٹان سے اُتر گیا کہ صالح اُسے روک نہ سکا۔ وہ بھی اُس کے پیچھے پیچھے چلا گیا۔ دونوں نے کپڑوں کے اندر ایک ایک تلوار اور ایک ایک خنجر چھپا رکھا تھا۔ دونوں نے تلواریں نکال لیں اور اندھیرے میں دلدل کے کنارے کنارے غار کے دہانے تک پہنچ گئے۔ اندر سے روشنی آ رہی تھی۔ پنڈت اور شکنتلا رانی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ اُن کے سوا یہاں کوئی اور انسان موجود ہے۔ ان کی باتیں باہر سنائی دے رہی تھیں۔

"رانی!" ــــ پنڈت کہہ رہا تھا ــ "خزانہ یہاں ہے۔ میں تمہیں ایک بار پھر کہتا ہوں کہ واپس چلی جاؤ"

"یہاں تو کچھ بھی نہیں" ــــ رانی نے کہا ــ "کیا خزانہ اس فرش کے نیچے ہے؟"

"اور اب میں تمہیں قتل کر سکتا ہوں" ــــ پنڈت نے کہا ــ "تم نے مجھے دھمکیاں دی تھیں اور مجھے بھیانک انجام سے ڈرایا تھا۔ اب بتاؤ تمہیں مجھ سے کون بچا سکتا ہے۔ تمہاری لاش ایسی جگہ چھپاؤں گا کہ کسی کو ڈھونڈے سے بھی نہیں ملے گی"

"ہوش میں آؤ پنڈت!" ــــ رانی شکنتلا نے کہا ــ "کیا اس تنہائی میں آپ مجھ جیسی عورت کو یوں ٹھکرا سکیں گے؟ ...."

"پنڈت جی مہاراج! میں پھر کہتی ہوں کہ اپنے آپ کو فریب نہ دو"

"مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ رانی!" ــــ پنڈت کی آواز سنائی دی ــ "کسی کو

مدد کے لیے بلانا چاہتی ہو تو پورے زور سے چیخو۔"

"نہیں مہاراج!" شکنتلا کی التجا سنائی دی "خنجر نہ نکالو۔ ایک بار پھر میری بات سُن لو۔"

ایسی آوازیں آئیں جیسے پنڈت نے شکنتلا کو پکڑ لیا ہو۔ وہ اس طرح بول رہی تھی جیسے اپنے آپ کو اس سے بچانے کے لیے اس وسیع غار میں بھاگ رہی ہو۔

پنڈت اُسے پکڑنے کو دوڑ رہا تھا۔ مشعل کا ڈنڈا زمین میں گڑا ہوا تھا۔ کمرہ نما غار روشن تھا۔ پنڈت رانی کے پیچھے دوڑتے دوڑتے رک گیا اور غار کے دہانے کی طرف دیکھنے لگا۔ شکنتلا رانی نے بھی اُدھر دیکھا اور رُک گئی — غار کے دہانے میں دو آدمی جو لباس سے خانہ بدوش گڈریئے لگتے تھے، ہاتھوں میں تلواریں لیے کھڑے تھے۔ پنڈت اور شکنتلا پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا ہو۔ طلال اور صالح بھی خاموشی سے کھڑے رہے۔

"تم یہاں کیا لینے آئے ہو؟" پنڈت نے سنبھلتے ہوئے بڑے رعب سے کہا — "چلے جاؤ۔ یہاں ہمارے بہت سے آدمی ہیں۔ تمہاری بوٹی بھی نہیں ملے گی۔"

"خنجر پھینک دو" — طلال ابراہیم نے دھیمی سی آواز میں کہا — "اور دونوں آگے آؤ، اور ہمیں بتاؤ کہ یہاں کیا ہے اور یہاں کیا کر رہے ہو۔"

پنڈت کھسیانی سی ہنسی ہنس کر بولا — "ہم مسافر ہیں۔ قنوج جا رہے ہیں۔ یہ میری بیوی ہے۔ باہر ہمارے گھوڑے کھڑے ہیں۔ یہاں رات گزارنے کے لیے رک گئے ہیں۔"

صالح بروک خاموش کھڑا تھا۔ طلال نے آگے بڑھ کر پنڈت کے ہاتھ سے خنجر لے لیا اور اپنی تلوار کی نوک پنڈت کی شہ رگ پر رکھ کر پوچھا — "سچ بتاؤ یہاں کیا ہے۔ ہم خود بھی ڈھونڈ سکتے ہیں لیکن اس صورت میں تم زندہ نہیں رہو گے اور یہ عورت ہمارے قبضے میں ہو گی" — اُس نے شکنتلا کی طرف دیکھ کر کہا — "اپنا انجام سوچ لو۔"

"یہاں خزانہ ہے" — شکنتلا رانی نے کہا — "میں تمہیں منہ مانگا حصہ دوں گی۔ لے کر چلے جانا۔"

"ہاں!"۔۔ پنڈت نے کہا۔ "یہ ٹھیک کہتی ہے۔ یہاں خزانہ ہے۔"
"کہاں سے آیا ہے خزانہ؟" ۔۔ طلال نے پوچھا ۔ "اور تم دونوں کون ہو؟" ۔۔۔
"میں قنوج کے بڑے مندر کا پنڈت ہوں اور یہ مہاراجہ قنوج کی رانی ہے"۔۔۔
پنڈت نے کہا۔ "اگر تم انعام وصول کرنا چاہتے ہو تو میں دے دوں گا مگر تمہیں یہاں سے جانا پڑے گا۔
"یہ فیصلہ ہم خود کریں گے کہ ہم چلے جائیں گے یا یہیں رہیں گے"۔۔ طلال نے کہا۔۔ "تم یہ بتاؤ کہ خزانہ کہاں ہے؟"
"آؤ"۔۔ شکنتلا رانی نے مسکرا کر طلال کا بازو پکڑا اور اُسے غار کے دہانے کی طرف لے جاتے ہوئے بولی۔۔ "میں تمہیں بتاتی ہوں کہ خزانہ کہاں ہے"۔
طلال اُس کے ساتھ چل پڑا۔ صالح بروک نے اُسے روکا مگر طلال نے اُس کی ایک نہ سنی اور شکنتلا رانی کے ساتھ باہر نکل گیا۔ صالح فیصلہ نہ کر سکا کہ وہ کیا کرے۔ وہ پنڈت کو اکیلے چھوڑنے میں خطرہ محسوس کر رہا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ اس کے کچھ آدمی قریب ہوں اور یہ انہیں بلا لے۔ وہ طلال کو شکنتلا جیسی حسین عورت کے ساتھ بھی نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ وہ شش و پنج میں پڑا ہوا پنڈت کے سامنے کھڑا رہا۔ اسے یہ احساس پریشان کر رہا تھا کہ اُس کا ساتھی اگر زندہ واپس آگیا تو اُس پر اس عورت کا جادو سوار ہو چکا ہوگا۔
شکنتلا اور طلال کچھ دیر بعد واپس آئے۔ طلال کا چہرہ اور اُس کی چال ڈھال بتا رہی تھی کہ وہ بالکل بدل گیا ہے اور اپنے فرض کو وہ دل سے اتار چکا ہے۔ اس نے آتے ہی پنڈت سے کہا کہ وہ بتا دے کہ خزانہ کہاں ہے۔
صالح بروک نے گرج کر کہا۔۔ "طلال! باہر نکلو یہاں سے!"
طلال نے صالح کی طرف دیکھا پھر پنڈت اور شکنتلا رانی سے کہا۔ "تم دونوں وہاں دیوار کے ساتھ بیٹھ جاؤ"۔۔ اور وہ صالح کو ان سے دور لے گیا۔ کہنے لگا ۔۔۔
"میری بات غور سے سنو صالح بروک! میں اپنے فرض سے کوتاہی نہیں کر رہا ہیں تمہیں دھوکہ نہیں دے رہا۔ یہاں سے ہم دونوں کو کچھ وصول ہو جائے تو کیا بُرا ہے؟"
"طلال!"۔۔۔ صالح نے کہا۔ "تمہارے جسم سے مجھے اس ناپاک عورت کی بدبو

آرہی ہے۔ عورت میں صرف یہ طاقت ہوتی ہے کہ وہ عورت ہے اور مرد کا مرد ہونا اس کی کمزوری ہے۔ میں جانتا تھا وہ تمہیں باہر کیوں لے گئی تھی۔ تم کہتے ہو کہ تم مجھے دھوکہ نہیں دو گے؟ .... ہمارے درمیان ایک عورت اور سونے کے چند ایک ٹکڑے آ گئے تو ہم دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جائیں گے۔ سلطان محمود غزنوی کی فتح اور شکست کا انحصار ہم دونوں پر ہے۔"

"غور سے سنو صالح بھائی!" ___ طلال نے کہا ___ "ہم ہندوستان کے رہنے والے ہیں۔ غزنی والے ہمیں کیا دیتے ہیں؟ کیا اپنی جان کو خطرے میں ڈالنے کا اتنا سا ہی معاوضہ ہونا چاہیے جو ہمیں غزنی کی فوج سے ملتا ہے؟"

"ہم نے جو فرض اپنے ذمے لیا ہے اس کا معاوضہ خدا دے گا" ___ صالح بروک نے کہا ___ "تم اپنے آپ کو غزنی کی فوج کا ملازم نہ سمجھو۔ ہم اسلام کے مجاہدین ہیں۔"

"اتنا خزانہ نہ چھوڑو صالح۔"

"اپنا حلف یاد کرو" ___ صالح نے کہا ___ "ہم نے قرآن مجید ہاتھ میں لے کر حلف اٹھایا تھا کہ جان پر کھیل کر فرض ادا کریں گے اور دھوکہ نہیں دیں گے اور ہمارے قدموں میں خزانے رکھ دیئے گئے تو بھی قبول نہیں کریں گے اور ایمان کے پکے رہیں گے .... طلال! موت کا کوئی بھروسہ نہیں کب آ جائے۔ یہ خزانے دنیا میں دھرے رہ جائیں گے۔"

"مجھے آزما لینا" ___ طلال نے کہا ___ "تم یہیں رہو۔ مجھے یہاں سے کچھ وصول کر لینے دو۔"

طلال نے پنڈت سے کہا ___ "اٹھو اور مجھے خزانے تک لے چلو۔"

"ہاں مہاراج!" ___ شکنتلا رانی نے بھی پنڈت سے کہا ___ "اب ہم زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتے۔"

پنڈت نے اٹھ کر غار کی دیوار پر ایک جگہ انگلی رکھی اور طلال اور صالح سے کہا ___ "دونوں تلواریں برچھیوں کی طرح یہاں مارو۔"

صالح کھڑا رہا۔ طلال نے آگے بڑھ کر اس جگہ تلوار ماری تو تلوار نصف سے

زیادہ اندر چلی گئی ۔ اُس نے صالح کو بلایا۔ صالح نے کہا۔ "مجھے تمہارے خزانے کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں"۔ اُس نے تلوار اُس کی طرف پھینک کر کہا۔ "یہ لو۔ اپنے ہاتھ سے کرو جو کرنا ہے"۔

پنڈت نے تلوار اُٹھالی اور طلال کی تلوار کے قریب دیوار میں اتار دی اور بولا ۔۔۔ "اب تلواروں کو دائیں طرف دباؤ"۔

دونوں نے تلواریں ایک طرف دبائیں تو مٹی کا ایک گولہ اور بہت بڑا تودہ سا جو گول سِل کی شکل کا تھا، آہستہ آہستہ دیوار سے الگ ہونے لگا۔ اس سے پہلے بالکل پتہ نہیں چلتا تھا کہ یہ سِل نما تودہ یہاں ہے۔ زور لگانے سے یہ باہر کو گر پڑا اور ایک سرنگ کا دہانہ نظر آنے لگا۔

"رانی! اس سرنگ میں داخل ہو جاؤ"۔۔۔ پنڈت نے شکنتلا سے کہا اور طلال کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "تم بھی اندر چلے جاؤ۔ میں مشعل لے کر تمہارے پیچھے آؤں گا"۔۔۔ اُس نے صالح سے پوچھا۔ "اور تم؟"

صالح نے سر ہلا کر کہا "نہیں"۔۔۔ اور پنڈت کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

شکنتلا رانی جھک کر تیزی سے سرنگ میں داخل ہو گئی۔ اُس کے پیچھے طلال بھی اندر چلا گیا۔ پنڈت نے انہیں کہا کہ وہ اندھیرے سے نہ گھبرائیں۔ آگے بڑھتے جائیں۔ صالح کا خیال تھا کہ پنڈت مشعل اٹھا کر اُن کے پیچھے جائے گا مگر پنڈت نے مشعل کی طرف دیکھا تک نہیں۔ ذرا ہی دیر بعد سرنگ کے اندر بڑی زور کی سرسراہٹ پھر دو بار دھمک سنائی دی اور اس کے فوراً بعد شکنتلا رانی کی گھٹی گھٹی چیخیں سنائی دینے لگیں۔ پنڈت نے صالح کی طرف دیکھا اور اُس کی مسکراہٹ اور زیادہ پھیل گئی۔ اندر سے طلال کی آواز آئی ۔۔۔ "صالح! نکالو یہاں سے مجھے"۔

صالح دوڑ کر آگے بڑھا تو پنڈت نے راستے میں آکر اُسے روک لیا۔ بولا ۔۔۔ "تم نے کہا تھا کہ تمہیں خزانے کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں۔ تم یہیں رہو۔ تم جیسے آدمی کو زندہ رہنا چاہیے"۔

سرنگ کے دور اندر سے شکنتلا رانی اور طلال ابراہیم کی چیخ وپکار سنائی دے رہی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کنوئیں میں چیخ چلا رہے ہوں۔ صالح بروک حیرت زدہ تھا کہ یہ کیا ہے۔ وہ چپ چاپ پنڈت کو دیکھے جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اُس نے پنڈت سے پوچھا کہ وہ دونوں کیوں چلا رہے ہیں۔ پنڈت نے فرش میں گڑی ہوئی مشعل اُٹھائی اور صالح سے کہا کہ وہ اُس کے پیچھے رہے۔ وہ خود مشعل آگے کر کے سرنگ میں چلا گیا۔ صالح اُس کے پیچھے گیا۔ پندرہ بیس قدم آگے جا کر پنڈت رک گیا اور صالح سے کہا کہ وہ اُس کے پہلو میں آجائے اور اس سے آگے ذرا سا بھی نہ بڑھے۔ پنڈت نے مشعل نیچے کر دی۔

صالح بروک نے آگے ہو کر دیکھا۔ وہاں ایک کنوآں تھا جو دراصل بڑا گہرا گڑھا تھا۔ اس میں سے شکنتلا رانی اور طلال کے کراہنے کی آوازیں آرہی تھیں جو دبتی جا رہی تھیں۔

"چلو۔ اب یہاں سے نکل چلو"۔۔۔ پنڈت نے صالح سے کہا۔

وہ سرنگ سے نکلے تو پنڈت فرش پر بیٹھ گیا اور بولا ۔۔۔"میرے سامنے بیٹھ جاؤ۔ آؤ دوستوں کی طرح باتیں کریں"۔

"پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ یہ سب کیا ہے؟"۔۔۔ صالح نے پوچھا ۔۔۔"تم نے تو انہیں خزانہ نکالنے کے لیے اندر بھیجا تھا؟"

"پہلے تم بتاؤ کہ تم کون ہو"۔۔۔ پنڈت نے صالح بروک سے پوچھا ۔۔۔"اگر تم نہیں بتانا چاہتے تو میں بتا دیتا ہوں کہ تم کون ہو۔ تم مسلمان ہو اور تم ہندوستان کے مسلمان ہو اور تم غزنی کی فوج کے جاسوس ہو.... کیا میں نے غلط کہا ہے؟"

"آپ نے ٹھیک کہا ہے"۔۔۔ صالح نے کہا ۔۔۔"اب آپ میرے سوال کا جواب دیں"۔

"جس گہرے گڑھے میں یہ دونوں گرے ہیں ان میں ہندوستان کے سب سے زیادہ زہریلے سانپ ہیں جو اِن دونوں کو ختم کر چکے ہیں"۔۔۔ پنڈت نے کہا ۔۔۔"یہ گڑھا میں نے کھدوایا تھا اور اس میں سانپ بھی میں نے ہی چھوڑے تھے۔ اس گڑھے کے اوپر میں نے سرکنڈے رکھوا کر اوپر مٹی ڈلوا دی تھی۔ اگر یہ دونوں مشعل لے کر جاتے تو بھی گڑھے میں گرتے کیونکہ مٹی انہیں پتہ نہ چلنے دیتی کہ نیچے سرکنڈے اور ان کے نیچے

زہریلی موت ہے۔"

"خزانہ کہاں ہے؟"

"اسی جگہ ہے"۔۔۔ پنڈت نے کہا۔۔۔ "اگر اسی سرنگ سے خزانے تک پہنچنا ہو تو گڑھے پر لکڑی کا تختہ رکھ کر اس پر چل کے آگے جانا ہوگا۔ ایک راستہ محفوظ بھی ہے۔"

"مجھے راستہ نہ بتاؤ"۔۔۔ صالح نے کہا۔۔۔ "ورنہ میں اپنے راستے سے بھٹک جاؤں گا۔"

"غور سے سنو میرے دوست!"۔۔۔ پنڈت نے کہا۔ "میں تمہیں بڑے کام کی ایک بات بتانا چاہتا ہوں اور یہ بات اس لیے بتا رہا ہوں کہ تم میں طمع نہیں۔ کہتے ہیں کہ جہاں خزانہ دفن ہوتا ہے وہاں سانپ ضرور ہوتا ہے جو خزانے کی رکھوالی کرتا ہے .... یہ بالکل غلط ہے۔ کہنے والوں نے یوں کہا تھا کہ خزانہ زہریلے سانپ کی طرح زہریلا ہوتا ہے۔ جس نے خزانہ حاصل کر لیا وہ سانپ بن جاتا ہے۔ وہ اس ڈر سے کہ کوئی اُس سے خزانہ چھین نہ لے وہ ہر کسی کو ڈستا پھرتا ہے۔ میرے دوست! تم ابھی جوان ہو۔ تم نے دنیا نہیں دیکھی۔ میرا تجربہ ہے کہ جس کے دل میں زر و جواہرات کا پیار پیدا ہوا وہ انسان نہیں رہا۔ اس گڑھے میں جو سانپ ہیں وہ انسان کے گناہ ہیں۔ ان میں ایک کا نام حرص ہے۔ دوسرے کو ہوس کہتے ہیں۔ تیسرے کو ریاکاری کہہ لو۔ ہر سانپ ایک گناہ ہے۔ یہ سارے سانپ انسان کے اِرد گرد اور پاؤں کے نیچے رینگتے رہتے ہیں۔ انسان مذہب سے منحرف ہو کر جب یہ سوچ لیتا ہے کہ اُسے سونا اور ہیرے مِل گئے تو وہ دنیا کو زیر کر لے گا تو وہ عقل کا اندھا ہو جاتا ہے۔ ذرا سا اشارہ ملنے پر وہ دوڑ پڑتا اور اُس گڑھے میں جا گرتا ہے جہاں اُس کے گناہ اُسے ڈس لیتے ہیں۔ یہ خزانہ میں بھی نکال سکتا تھا۔ میرے سوا اس کا راز کسی کو معلوم نہیں جس کا یہ خزانہ ہے اُسے بھی معلوم نہیں، لیکن جب سے یہ راز میرے سینے میں آیا ہے، میں رات رات بھر عبادت میں مصروف رہتا ہوں کہ میں گمراہ نہ ہو جاؤں۔"

"اگر تمہارا مذہب سچا ہوتا تو کبھی گمراہ نہ ہوتے"۔۔۔ صالح نے کہا۔۔۔ "مجھے دیکھو۔ تم نے بتا دیا ہے کہ سانپوں والے کنوئیں پر تختہ رکھ کر خزانے تک جا سکتے ہیں مگر مجھے اس خزانے

کا ذرا سا بھی خیال نہیں آرہا۔ میری نظر اپنے فرض پر ہے اور میری ایک بات غور سے سُن لو پنڈت! میں اپنا فرض تم سے پورا کراؤں گا۔ مَیں نے قرآن پر ہاتھ رکھ کر اور خدا کو حاضر ناظر جان کر قسم کھا رکھی ہے کہ اپنے فرض پر خزانے اور اپنی جان قربان کر دوں گا۔ تمہاری جان میری مٹھی میں ہے۔ اگر تم نے مجھے ان سوالوں کے جواب نہ دیئے جو میں پوچھوں گا تو میں تمہیں سانپوں کے کنوئیں میں پھینک دوں گا"۔

"کیا تم اپنے آپ کو اس قدر بہادر اور عقل مند سمجھتے ہو؟"۔۔۔ پنڈت نے کہا۔

صالح ہنس پڑا مگر اُس کی ہنسی فوراً بجھ گئی۔ پنڈت نے بجلی کی سی پھُرتی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اُس نے ایک ہاتھ میں مشعل لے لی تھی اور اُس کے دوسرے ہاتھ میں تلوار تھی۔ مشعل کا ڈنڈا تلوار سے زیادہ لمبا تھا۔ پنڈت اتنی تیزی سے اٹھا تھا کہ صالح کو ہلنے کی بھی مہلت نہیں ملی تھی۔

"تمہارے پاس تلوار ہے"۔۔۔ پنڈت نے اُسے للکارا۔۔۔"آؤ۔ تم اپنا فرض ادا کرو۔ میں اپنا فرض ادا کرتا ہوں"۔

صالح بروک تلوار سونت کر اُس کی طرف بڑھا اور اُس نے جب وار کیا تو پنڈت نے جلتی ہوئی مشعل اتنی آگے کر دی کہ صالح کا چہرہ جھلسنے لگا اور اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ پنڈت نے چلّا کر کہا۔۔۔"بچو میرے وار سے"۔۔۔ صالح اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔ پنڈت نے کہا۔۔۔"میں تمہیں لڑنے کا پورا موقع دوں گا۔ اپنا فرض ادا کر لو"۔

صالح بروک نے پینترا بدل کر حملہ کیا مگر پنڈت اس کے ہر وار سے پہلے مشعل آگے کر دیتا تھا۔ صالح نے مشعل پر وار کرنے شروع کر دیئے مگر پنڈت نے ہر وار سے مشعل بچالی۔ وہ ابھی حملہ نہیں کر رہا تھا۔ صالح وار پہ وار کیے جا رہا تھا۔ اُس کے دو تین وار غار کی دیوار پر پڑے۔ اچانک پنڈت نے اُس پر تابڑ توڑ وار شروع کر دیئے۔ صالح نے ہر وار تلوار پر روکا مگر مشعل اُسے پیچھے ہٹا رہی تھی۔ پنڈت نے ایک وار ایسا کیا کہ صالح کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ گئی۔ وہ تلوار اُٹھانے لگا تو پنڈت کا ایک اور وار بچانے کے لیے بیٹھ گیا۔ پنڈت نے مشعل اُس کے چہرے کے قریب کی تو صالح پیچھے ہٹا۔ وہ بیٹھے بیٹھے پیچھے ہٹ رہا تھا۔ وہ دیکھ نہ سکا کہ وہ اُس سرنگ

میں چلا گیا ہے جو سانپوں والے کنوئیں تک جاتی ہے۔

"دیکھو تم کہاں ہو"۔۔۔ پنڈت نے کہا "تمہارے پیچھے بھی موت ہے آگے بھی موت ہے۔ کہو، زندگی چاہتے ہو یا موت!"

"میں خزانے کے لیے نہیں مر رہا"۔۔۔ صالح بروک نے کہا "دشمن سے لڑتے ہوئے مر رہا ہوں۔ مجھے یہی موت چاہیئے۔ آگے آؤ پنڈت۔ نہتہ لڑوں گا"۔

پنڈت نے ہنس کر کہا۔۔۔ "باہر آجاؤ۔ تم نہیں مرو گے"۔۔۔ اور پنڈت سرنگ سے باہر نکل گیا۔

صالح بروک شکست خوردہ سا ہو کے سرنگ سے باہر آیا۔ پنڈت نے مشعل کا ڈنڈا زمین میں گاڑ دیا اور تلوار پھینک کر بیٹھ گیا۔ اُسے جیسے خطرہ نہیں تھا کہ صالح اس پر حملہ کر دے گا۔

"بیٹھ جاؤ"۔۔۔ اُس نے صالح سے کہا۔

"تم نے مجھے قتل کیوں نہیں کیا؟"۔۔۔ صالح نے باوقار لہجے میں پوچھا۔۔۔ "مجھے دھکیلتے ہوئے سانپوں کے کنوئیں میں کیوں نہ گرنے دیا؟"

"کیونکہ میرے دل نے تمہیں پسند کیا ہے"۔۔۔ پنڈت نے کہا۔۔۔ "تم میری طرح فرض شناس ہو اور تمہارے دل میں اپنے مذہب کا احترام ہے، زر و جواہرات کا لالچ نہیں۔ مجھے جنگ و جدل سے نفرت ہے۔ میں مذہب کا پرستار ہوں لیکن سپاہی ہوں۔ تم نے دیکھ لیا ہے.... تم نے جس طرح خزانے کو ٹھکرایا ہے اس کا میں تمہیں انعام دینا چاہتا ہوں"۔

"اگر تم مجھے انعام دینا چاہتے ہو تو وہ چیز دو جو میں مانگوں"۔۔۔ صالح نے کہا۔۔۔ "مجھے اس خزانے میں سے ذرا سا بھی انعام نہیں چاہیئے"۔ جو تم نے یہاں چھپا رکھا ہے"۔

"بولو کیا مانگتے ہو"۔۔۔ پنڈت نے کہا۔

"قنوج کی فوج سلطان محمود سے کہاں لڑے گی؟"۔۔۔ صالح نے پوچھا۔۔۔ "قلعے میں محصور ہو کر یا باہر آ کر؟"

"سنو میرے مسلمان دوست!" — پنڈت نے کہا۔ "ہم ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ مجھے تمہیں ایسی کوئی بات نہیں بتانی چاہئیے جو میرے ملک کے نقصان کا اور سلطان محمود کی فتح کا باعث بنے لیکن میں صرف اس لیے تمہیں کام کی ایک بات بتا دیتا ہوں کہ تم ایمان اور اخلاق کے پکے ہو اور تمہیں اپنے فرض کے ساتھ پیار ہے۔ میں تمہیں بہت بڑا انعام دے رہا ہوں۔ یہیں سے واپس چلے جاؤ اور اپنے سلطان سے کہنا کہ قنوج کا رخ نہ کرے۔ ہمارا مہاراجہ عہد کر چکا ہے کہ وہ سلطان کو قنوج میں زندہ جلائے گا اور وہ گنگا اور جمنا کے درمیان کا یہ علاقہ غزنی کی فوج کا قبرستان بنا دے گا۔"

"کیا تمہارے مہاراجہ کے پاس اتنی طاقتور فوج ہے؟" صالح بروک نے پوچھا۔

"جب کوئی فوج اپنے دشمن کو فنا کرنے کا تہیہ کر لیتی ہے تو وہ اپنی طاقت اور تعداد کو نہیں دیکھا کرتی۔" پنڈت نے کہا۔ "قنوج کی فوج کا ہر ایک سپاہی غزنی کے سلطان سے ہر اس مندر کی توہین کا انتقام لینے کے لیے تیار ہو چکا ہے جو اس نے یہاں آکر اجاڑا ہے.... لیکن میرے دوست! مہاراجہ قنوج اکیلا نہیں۔ لاہور کے مہاراجہ بھیم پال نڈر کی فوج بھی پہنچ گئی ہے۔"

"کہاں ہے؟"

"یہ نہیں بتاؤں گا۔" پنڈت نے کہا۔ "میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ اپنے سلطان کو جا کر خبردار کر دو۔ وہ خوش ہو کر تمہیں انعام دے گا۔ اسے بتاؤ کہ اس جنگل میں اس کے لیے جال بچھایا جا چکا ہے۔ وہ اس جال سے نہیں نکل سکے گا۔ اس کی فوج کا وہی انجام ہو گا جو مہابن کی فوج کا اس کی فوج کے ہاتھوں ہوا تھا۔ مہابن کی فوج جمنا میں ڈوب گئی تھی۔ اب غزنی کی فوج کو اس دریا میں ڈوبنا ہے۔ بھیم پال نڈر کی فوج کے علاوہ یہاں ایک فوج اور بھی ہے۔ یہ متھرا، بلند شہر، مہابن وغیرہ کی شکست خوردہ فوجوں کے بھاگے ہوئے سپاہی ہیں جو قنوج میں آئے تو ان کی ایک فوج بنائی گئی۔ یہ لوگ انتقام کی آگ میں جل رہے ہیں۔ تمہارے سلطان کو قنوج کے محاصرے کا موقع ہی نہیں ملے گا.... اور میرے دوست! حقیقت یہ ہے کہ غزنی کے سلطان محمود کا مقابلہ کہیں بھی نہیں ہوا اگر

اب اُس کی اپنی فوج مقابلے کے قابل نہیں رہی۔ ہمارے مہاراجوں نے اُسے موقع دیا ہے کہ وہ قنوج کے جال تک آجائے۔ وہ آرہا ہے۔ جاؤ اور اُسے روک دو۔ اُسے کہو کہ انسانوں کا ناحق خون بہانے اور پردیسی سپاہیوں کو یہاں لاکر مروانے سے باز آجاؤ اور یہاں زندہ جلنے کی بجائے غزنی جاکر بادشاہوں کی طرح مرو۔"

وہ باہر نکل آئے۔ باہر دو گھوڑے کھڑے تھے۔ پنڈت نے صالح بروک سے کہا کہ ایک گھوڑا شکنتلا رانی کا ہے جو اندر مری پڑی ہے اس لیے یہ گھوڑا صالح لے جائے۔

اگلے روز پنڈت مہاراجہ قنوج راجیاپال کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے مہاراجہ کو بتایا کہ اُس کی چہیتی رانی شکنتلا کو غزانہ کھا گیا ہے۔ اُس نے پوری تفصیل سے اُس کی ہلاکی کی موت کا واقعہ سنایا۔ مہاراجہ پر جیسے اس کا کچھ اثر نہ ہوا ہو۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی اور اُس نے پنڈت کو خراجِ تحسین پیش کیا۔

"میں نے ایک اور کارنامہ کر دکھایا ہے"۔۔۔ پنڈت نے مہاراجہ سے کہا۔ "رانی کے ساتھ غزنی کے ایک جاسوس کو بھی سانپوں کے کنوئیں میں پھینک دیا ہے اور ایک اور جاسوس کو دھوکہ دے کر زندہ رکھا اور یہ بتا کر واپس جانے دیا ہے کہ اپنے سلطان سے کہہ دے کہ قنوج کا رُخ نہ کرے"۔۔۔ پنڈت نے صالح بروک کو جو کچھ بتایا تھا وہ مہاراجہ راجیاپال کو سنا دیا اور کہا۔۔۔ "میں نے آپ کی عزّت کی خاطر، آپ کو فتح دلانے کی خاطر اور اس مندر کی عزّت کی خاطر جھوٹ بولا ہے۔ میرے جھوٹ کو سچ ثابت کر دیں۔ غزنی کو ذہن سے اُتار دیں۔ وہاں تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ میں نے سلطان محمود پر دہشت طاری کرنے کا انتظام کر دیا ہے۔ آپ اپنی کچھ فوج باہر بھیج دیں۔ لڑیں، مہاراج! لڑیں۔"

"مہاراج"!۔۔۔ مہاراجہ راجیاپال نے کہا۔۔۔ "آپ نے سلطان محمود کو اس کے ایک جاسوس کے ذریعے۔ غلط اطلاع دے کر بہت بڑی غلطی کی ہے"۔۔۔ اُس نے وہی خط جو بھیم پال نندر نے رائے چندا کو لکھا اور رائے چندا نے راجیاپال کو بھیج دیا تھا، پنڈت کے ہاتھ میں دے دیا۔ پنڈت خط پڑھ چکا تو مہاراجہ راجیاپال نے کہا۔۔۔ "یہ اُس

بھیم پال کا خط ہے جو اپنے آپ کو نڈر کہلاتا ہے۔ وہ انہی علاقوں میں ہے۔ اُس کا بیٹا ترلوچن پال بھی یہیں ہے مگر وہ ہمیں فوجی مدد دینے کی بجائے غزنی کے سلطان کے خلاف اُکسا رہے ہیں اور ڈرا بھی رہے ہیں۔"

"اس خط سے نہ ڈریں مہاراج!"۔۔۔ پنڈت نے کہا۔

"اس خط میں جو کچھ لکھا ہے وہ بالکل صحیح ہے"۔ مہاراجہ قنوج نے کہا۔"تم نے محمود کو جھوٹی اطلاع بھجوادی ہے کہ گنگا اور جمنا کے درمیان اُس کے لیے جال بچھایا جا چکا ہے۔ اب دیکھنا وہ اپنی فوج کو یہاں کس ترتیب سے لائے گا۔ وہ کوچ کی ترتیب میں نہیں آئے گا۔ اُس کی فوج کے بازو پھیلے ہوئے ہوں گے۔ اُس کی پوری فوج آگے نہیں آئے گی۔ آپ نہیں جانتے پنڈت جی مہاراج! سلطان محمود وہ چیتا ہے جس کی موجودگی کا آپ کو اُس وقت پتہ چلتا ہے جب آپ کی گردن اُس کے دانتوں میں آچکی ہوتی ہے اور اُس کے پنجے آپ کے جسم میں اُتر چکے ہوتے ہیں۔ کسی کو پتہ نہیں چلتا کہ اُس نے درخت پر سے حملہ کیا ہے یا گھاس میں سے۔"

مہاراجہ کی بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ اُسے بتایا گیا کہ قاصد آیا ہے۔ مہاراجہ نے اُسے فوراً بلا لیا۔ قاصد نے اطلاع دی کہ سلطان محمود مُنج کو محاصرے میں لے رہا ہے۔

"کیا ایسا امکان ہے کہ ہم پیچھے سے محاصرے پر حملہ کریں تو مسلمانوں کو نقصان پہنچا سکتے ہیں؟"۔۔۔ مہاراجہ نے پوچھا۔

"نہیں"۔۔۔ قاصد نے کہا۔"مسلمانوں کی فوج کا ایک حصہ مُنج کو محاصرے میں لے رہا ہے اور اُس کے بہت سے گھوڑسوار دستے قنوج اور مُنج کے درمیانی علاقے میں اس حالت میں خیمہ زن ہو گئے ہیں کہ انھوں نے خیمے نہیں گاڑے وہ پڑاؤ کیے ہوئے ہیں لیکن تیاری کی حالت میں ہیں۔ ہر سوار رات کو اپنے گھوڑے کو اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ ہمارے آدمیوں نے جنگلی لوگوں کے بھیس میں دیکھا ہے کہ مسلمان فوج کے آدمی دُور دُور تک گشت کرتے رہتے ہیں۔ ہم نے اونچے درختوں اور اونچی چٹانوں پر بھی غزنی کے فوجی دیکھے ہیں۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اگر اپنی فوج مُنج کی مدد کے لیے بھیجیں تو غزنی والے

اسے راستے میں ہی روک لیں گے"۔ مہاراجہ قنوج نے کہا۔

"مجھے بتایا گیا ہے کہ میں آپ سے کہہ دوں کہ منج کی طرف اپنی فوج کو نہ بھیجنے کی کوشش نہ کریں"۔ قاصد نے کہا۔

"سن لیا آپ نے پنڈت جی مہاراج!" ۔۔۔ مہاراجہ نے کہا اور اپنی فوج کے کمانڈروں کو بلا لیا۔ وہ آئے تو مہاراجہ نے انہیں صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ قنوج کو بچانا چاہتے ہیں تو دیکھیں کہ منج کے راجپوت لڑتے ہیں یا ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ اگر وہ محاصرے میں جم جائیں اور باہر آ کر لڑنے کی کوشش کریں تو انہیں مدد دو۔ اگر نہیں تو قنوج کو بچانے کی کوشش کرو"۔

نومبر ۱۰۱۸ء میں سلطان محمود غزنوی نے منج کے قلعے کو محاصرے میں لے لیا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ منج کے راجپوت اپنی آن پر جان دینے والے جنگجو ہیں اور انہیں تہہ تیغ کرنا آسان نہیں ہو گا۔ اس نے جو محاصرہ کیا وہ سہ طرفہ تھا۔ قلعے کے پیچھے دریائے جمنا تھا۔ سلطان کو یہ بھی بتایا گیا تھا کہ محاصرے پر قنوج کی فوج حملہ کرے گی۔ چنانچہ اس نے اپنی فوج کے بہت سے سوار دستے قنوج اور منج کے درمیان پھیلا دیئے تھے۔

اس نے جب سہ طرفی محاصرہ مکمل کر لیا تو صابح بروک وہ غلط اطلاع لے کر پہنچ گیا جو اسے قنوج کے پنڈت نے دی تھی۔ سلطان محمود کو بتایا گیا کہ ایک جاسوس یہ اطلاع لایا ہے۔ سلطان نے اسی وقت متھرا کو ایک قاصد اس پیغام کے ساتھ دوڑا دیا کہ جو فوج وہ متھرا چھوڑ آیا ہے اس کے آدھے دستے فوراً منج آ جائیں اور تمام ہاتھی ساتھ بھیجے جائیں۔ اس وقت تک اس کے پاس کم و بیش ساڑھے تین سو جنگی ہاتھی تھے۔

جب یہ کمک آ گئی تو سلطان محمود نے اسے ان دستوں سے بھی آگے قنوج کی طرف بھیج دیا جو قنوج اور منج کے درمیان تیاری کی حالت میں موجود تھے۔ ہندوستان پر محمود غزنوی کے سترہ حملوں میں منج کے محاصرے کا ذکر نہیں ملتا۔ تفصیلات میں جائیں تو تھوڑا سا ذکر آ جاتا ہے لیکن منج کے محاصرے اور معرکے میں سلطان محمود کو اس قدر زور صرف کرنا پڑا تھا جو متھرا، بلند شہر، مہابن اور آسنی کی فتوحات کو ملا کر بھی صرف نہیں

ہُوا تھا۔ منج کے راجپوتوں کا یہ عالم تھا کہ فوجی اور شہری میں کوئی فرق نہیں رہا تھا۔ نو عمر لڑکے بھی اپنے شہر کو بچانے کے لیے نکل آئے تھے۔

مشہور مورخ عُطبی نے منج کے راجپوتوں کے متعلق لکھا ہے۔"وہ بے مہار اور خود سر اونٹوں کی طرح اور ہار نہ ماننے والے شیطانوں کی طرح لڑے۔"

سلطان محمود محاصرے کی کمان خود کر رہا تھا۔ وہ جدھر سے اپنے جیش دروازے توڑنے کے لیے یا دیوار میں کہیں سُرنگ لگانے کے لیے آگے بھیجتا تھا، اُن پر تیروں اور برچھیوں کی بوچھاڑیں آنے لگتی تھیں۔ غزنی کے تیراندازوں نے آگے بڑھ کر قلعے کی دیواروں سے تیر اور برچھیاں برسانے والوں پر اتنی ہی تعداد اور شدت سے تیر چلائے لیکن راجپوت تیر کھا کر زخمی ہوتے اور گرتے تھے اور اُن کی جگہ فوراً دوسرے آدمیوں سے پُر ہو جاتی تھی۔ قلعے کی دیواروں سے یہ للکار بار بار سنائی دیتی تھی "محمود! واپس چلے جاؤ... مسلمانو! تم اپنے قبرستان میں آئے ہو"۔ اور اس للکار کے ساتھ گالی گلوچ بھی سنائی دے رہی تھی۔

"یہ قلعہ آسانی سے نہیں ٹوٹے گا"۔ سلطان محمود نے کہا "ہمیں کوئی اور بندوبست کرنا پڑے گا"۔

محاصرے کا پہلا دن گذر گیا اور سلطان محمود کی فوج کو خاصا جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ قلعے کے اندر کا یہ عالم تھا کہ عورتیں اور بچے بھی تیر کمانوں، برچھیوں اور تلواروں سے مسلّح تھے۔ شہری رائے چندا کے محل کے سامنے جمع ہو گئے تھے۔ وہ نعرے لگا رہے تھے کہ انہیں باہر جا کر مسلمان فوج پر حملے کی اجازت دی جائے۔ رائے چندا ایسا اناڑی نہیں تھا۔ وہ شہریوں کو نہ قلعے کی دیواروں پر جانے دے رہا تھا نہ انہیں باہر نکلنے کی اجازت دے رہا تھا۔

"لڑائی اس جوش سے نہیں لڑی جاتی جس میں عقل نہ ہو"۔ رائے چندا نے اپنے ہزار ہا شہریوں سے کہا۔ "منج کو آخر تم ہی بچاؤ گے۔ تم نہیں جانتے کہ غزنی کی فوج چوروں اور ڈاکوؤں کا گروہ نہیں۔ یہ ایسی فوج ہے جس کے آگے قلعے کانپ کانپ کر گرتے جاتے ہیں۔ تمہاری فوج قلعے کو بچا رہی ہے۔ اگر دشمن اندر آگیا تو منج کی آبرو تمہارے ہاتھ میں

ہوگی۔ ہم مُنج اپنے دشمن کو اس طرح نہیں دیں گے جس طرح اُن بزدلوں نے متھرا اُسے دے دیا اور ہری کشن واسدیو کا ہتیا چار کرایا ہے۔"

ہجوم گرجنے لگا "ہم انتقام لیں گے ..... ہمیں باہر جانے دو۔"

رائے چندا نے ہجوم میں سے بہت سے جوان آدمی الگ کر لیے اور یہ بتا کر کہ انہیں جان کی بازی لگانی ہے، اپنے ساتھ رکھ لیا۔

رائے چندا کے محل کی عورتیں بھی مسلح ہو گئی تھیں اور وہ شہر کی عورتوں کو لڑنے مرنے کے لیے منظم کر رہی تھیں۔ صرف ایک عورت تھی جو خاک و خون کے اس ہنگامے سے لاتعلق تھی۔ وہ رائے چندا کی بیٹی رادھا تھی۔ پہلے سُنایا جا چکا ہے کہ رادھا اور رائے چندا کی بہن شیلا مہاراجہ قنوج کے بیٹے لچھمن پال کے ساتھ سلطان محمود کو متھرا میں قتل کرنے کے لیے گئی تھیں۔ یہ دونوں لڑکیاں اپنے غیر معمولی حُسن و جوانی کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے گئی تھیں۔ وہ ایک خیالی جنگلی قبیلے کے لباس میں تھیں جس میں وہ نیم عُریاں تھیں۔ اس طرح ان کے حُسن کی دلکشی اور زیادہ طلسماتی اور خطرناک ہو گئی تھی مگر راستے میں ایک مگرمچھ نے شیلا کو نگل لیا۔ رادھا نے شیلا کو مگرمچھ کے منہ میں اس طرح دیکھا کہ شیلا کا ایک بازو، چہرے کا کچھ حصہ اور ریشم کے تاروں جیسے بال نظر آ رہے تھے۔

پھر یوں ہوا کہ متھرا میں مقیم غزنی کی فوج کا ایک نائب سالار دو کمانداروں کے ساتھ اس علاقے میں گشت پر آنکلا۔ اُس نے لچھمن پال اور رادھا کو پکڑ لیا اور دونوں کو متھرا لے گیا۔ رادھا جیسی نوجوان، دلکش اور نیم عُریاں لڑکی کیسے توقع رکھ سکتی تھی کہ نائب سالار اور دو کماندار اُسے بیٹی کا درجہ دیں گے۔ پھر وہ متھرا تک اس تلخ سوچ میں پہنچی تھی کہ وہاں وہ نہ جانے کیسے وحشی آدمیوں کے ہاتھوں میں کھلونا بنے گی اور نہ جانے اس کا انجام کیسا بھیانک ہوگا۔ اُسے غزنی کے مسلمانوں کے متعلق بچپن سے یہی کچھ بتایا جاتا رہا تھا کہ مسلمان عورت کے لیے وحشی اور مردوں کے لیے آدم خور ہوتے ہیں۔

رادھا نے کبھی مسلمان نہیں دیکھا تھا۔ اس خطے میں ایک بھی مسلمان نہیں تھا۔ اُسے جب پتہ چلا کہ سلطان محمود مندروں کے بُت توڑ کر پھینک دیتا اور مندر اجاڑ دیتا ہے تو رادھا کو یقین آگیا تھا کہ مسلمان واقعی جنگلوں اور غاروں میں رہنے والی کوئی قوم ہے

جس کے ہاں مذہب کا وجود ہی نہیں۔ وہ صرف ہندو مت کو مذہب سمجھتی تھی اور وہ غیرت اور آبرو کو اپنی جان سے زیادہ قیمتی جانتی تھی لیکن اپنے دشمن کو زیر کرنے کے لیے وہ اپنی آبرو کو ایک جائز ذریعہ سمجھتی تھی، اگر وہ جب مسلمانوں کے ہاتھ آئی تو کسی نے اسے اتنا بھی نہ کہا کہ تم بہت خوبصورت لڑکی ہو۔ نائب سالار اور کمانداروں نے منھر اتک کے ایک دن اور آدھی رات تک کے سفر میں اُسے ایک قیدی سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں دی۔ اُس کے ساتھی، قنوج کے راجکمار لچھمن پال نے نائب سالار کو سونے کے وہ تمام سکے پیش کیے تھے جو اُس کے پاس تھے لیکن نائب سالار نے ان کی طرف دیکھا تک نہیں تھا۔

اور جب رادھا اور راجکمار کو سلطان محمود کے سامنے لے گئے تھے تو سلطان کا چہرہ دیکھ کر رادھا کے دل میں نفرت کا طوفان اُٹھ آیا تھا۔ اُسے کسی اور سلوک کی توقع تھی لیکن سلطان نے اُسے کہا تھا۔ ”ہم اس لڑکی جیسی بیٹیوں کی دل سے قدر کرتے ہیں ہم غیرت مند دشمن کی عزت کیا کرتے ہیں“ ــــ اور رادھا کو سلطان کے یہ الفاظ آج جب اس نے مُنج کے قلعے کو محاصرے میں لے لیا تھا، بہت یاد آرہے تھے۔ ”تجھے قتل کرنے کی تمہیں ضرور کوشش کرنی چاہیئے تھی۔ کامیابی اور ناکامی تمہارے دیوتا کرشن واسدیو اور ہر ہر مہادیو کے اختیار میں نہیں، ہمارے خدا کے اختیار میں ہے۔ یہ ہے خدا کا وہ پیغام جو میں ہندوستان میں لایا ہوں۔“

اس کے بعد سلطان محمود نے حکم دیا تھا ــــ ”ان دونوں (رادھا اور لچھمن) کو ان کے شہروں کے قریب چھوڑ آؤ۔ انہیں عزت سے لے جاؤ۔ ان کے گھوڑے اور ان کے خچر انہیں دے دو۔“

سلطان کے حکم کی تعمیل کی گئی اور ان دونوں کو شاہی مہمانوں کی طرح اُن کے شہروں کے مضافات میں چھوڑ آئے تھے۔

رادھا نے اپنے باپ رائے چندا کو کسی اور جذبے سے بتایا تھا کہ وہ سلطان محمود غزنوی کو قتل نہیں کر سکی اور پکڑی گئی تھی اور مسلمانوں نے اور اُن کے سلطان نے اُسے بیٹی کا درجہ دے کر عزت سے واپس کر دیا ہے۔ اُس نے باپ کو وہ تمام باتیں

تباہی تھیں جو سلطان محمود نے اُسے اور چھپن پال سے کہی تھیں مگر اُس کا باپ اُس کے تاثر کو نہیں سمجھ سکا تھا۔ اُس نے کہا تھا۔"ہم اپنی بے عزتی کا انتقام لیں گے۔"

رادھا راجکماری تھی، معمولی لڑکی نہیں تھی مگر وہ ایسے محسوس کرنے لگی جیسے آسمان سے گِر کر زمین پر آپڑی ہو۔ وہ بہت شوخ اور بڑی ہی دلیر لڑکی تھی مگر اُس پر خاموشی طاری ہوگئی اور وہ کھوئی کھوئی رہنے لگی۔ راج محل میں، راج دربار میں اور فوجی حلقوں میں اب مُنج کے دفاع اور سلطان محمود کو شکست دینے کی تیاریاں ہونے لگی تھیں۔ غزنی کی فوج کسی بھی روز متوقع تھی۔ رائے چندا لڑائی کے سوا اور کوئی بات ہی نہیں کرتا تھا۔ مندروں میں بھی مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلائی جا رہی تھی اور لوگوں کو بڑی خونریز جنگ کے لیے تیار کیا جا رہا تھا۔ عورتوں میں جوش و خروش پیدا ہو گیا تھا۔ رائے چندا کی داشتاؤں نے بھی لڑنے کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ صرف رادھا تھی جو اِن سرگرمیوں سے الگ تھلگ چُپ چاپ لیٹی رہتی یا قلعے کی دیوار پر جا کر متھرا کی طرف دیکھنے لگتی تھی۔

ایک روز وہ دیوار پر کھڑی اُفق پر نظریں گاڑے ہوئے تھی کہ اُس نے اپنے آپ سے کہا۔"وہ اُدھر سے آئیں گے۔ معلوم نہیں کب آئیں گے؟"

"کون آئیں گے؟" — اُس کے قریب سے کسی نے پوچھا۔

"مسلمان" — اُس نے کہا۔"غزنی والے" — اور وہ چونک کر چپ ہو گئی۔

اُس نے دیکھا۔ اُس کے پاس ایک رِشی کھڑا تھا۔ وہ تو اپنے آپ کو تنہا سمجھ رہی تھی۔ رِشی کے رُتبے اور درجے سے واقف تھی۔ وہ بڑے مندر کے پنڈت کے درجے کا آدمی تھا۔ اپنے مذہب کا عالم ہونے کے علاوہ علیل روحوں کا علاج اپنے کسی خاص عمل سے کرتا تھا۔ آسیب اور بدروحوں سے نجات دلاتا تھا۔ پنڈت بھی اُسے جُھک کر اور ہاتھ جوڑ کر سلام کرتے تھے مگر اُسے اپنے پاس کھڑے دیکھ کر رادھا کو غصہ آگیا۔

"کیا راجکماری مسلمانوں کا انتظار کر رہی ہے؟" — رِشی نے پوچھا۔

"میری تنہائی میں آپ نے کیوں آدخل دیا ہے؟" — رادھا نے غصے کو دباتے

ہوئے پوچھا۔

"اس لیے کہ ہماری راجکماری کی روح پر ایسا آسیب سوار ہو گیا ہے جو ہمارے سوا کوئی نہیں نکال سکتا"۔۔ رشی نے کہا۔۔ "مجھے مہاراج (رائے چند) نے کہا ہے کہ جب سے آپ متھرا سے آئی ہیں، آپ کی حالت بگڑ رہی ہے۔ میں جانتا ہوں راجکماری! مسلمان بھیڑیئے ہیں۔ مانس کھانے کو یہاں آجاتے ہیں۔ آپ کتنا ہی پردہ کیوں نہ ڈالیں، میں جانتا ہوں کہ انہوں نے آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ وہ سونے، ہیروں اور عورتوں کے بھوکے ہیں۔ انہی کی تلاش میں آتے ہیں"

"یہ جھوٹ ہے"۔۔ رادھا نے بھڑک کر کہا۔ "انہوں نے میرے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا جو آپ بتا رہے ہیں۔ وہ عورتوں کے شکاری نہیں۔ میں نے غزنی کے سلطان کے دربار میں ایک بھی عورت نہیں دیکھی۔ عورتیں میرے باپ جیسے مہاراجوں کے درباروں میں ہوتی ہیں۔ ان کے پیچھے جوان اور خوبصورت لڑکیاں کھڑی مورچھل ہلاتی رہتی ہیں۔ ان کی خدمت گار جوان لڑکیاں ہوتی ہیں انہیں لڑکے سلاتی اور لڑکیاں جگاتی ہیں مسلمان بھیڑیئے نہیں، انسان ہیں۔ انہوں نے ہمارا دیا ہوا سونا بھی ٹھکرا دیا تھا"

رشی دانشمند آدمی تھا۔ اُس نے رادھا کو روکنے ٹوکنے کی بجائے اُس کے ساتھ پیار سے ایسی باتیں کیں کہ اُس کا غصہ ٹھنڈا کر دیا اور اُس کے دل پر قبضہ کر لیا۔ اُس کی باتوں کا اثر تھا کہ وہ رشی کے ساتھ چل پڑی۔

رشی ہر روز رادھا کے پاس جانے لگا۔ بہت دیر اُس کے پاس بیٹھا اس کے ساتھ باتیں کرتا رہتا۔ اُس نے محسوس کر لیا کہ رادھا پر واقعی مسلمانوں کا آسیب سوار ہو گیا ہے اور اُس کے ساتھ ایک دہشت ہے جو اُس کے ذہن کو گرفت میں لیے ہوتے ہے۔ رادھا نے رشی کو یہ دہشت تفصیل سے بتائی۔ وہ ہر رات خواب میں ایک مگرمچھ دیکھتی تھی جس کے منہ میں شیلا ہوتی تھی اور مگرمچھ کے منہ سے خون ٹپک رہا ہوتا تھا۔ رادھا ڈر کر جاگ اٹھتی تھی اور اس کا جسم سردی کے باوجود پسینے میں نہا

جاتا تھا۔

رِشی اُس کی یہ دہشت باتوں سے ہی دور کر سکتا تھا۔ وہ اس کوشش میں مصروف رہا مگر رادھا کی جسمانی حالت روز بروز خراب ہوتی جارہی تھی۔ اس کا باپ راجے چندا جنگ کی تیاری کی وجہ سے ذاتی طور پر اس کی طرف توجہ نہیں دے سکتا تھا۔ اُس نے راجکماری کے علاج کا حکم دے دیا تھا۔ رشی کے علاوہ نامی گرامی وید اُس کا علاج کر رہے تھے مگر اُس کی حالت بگڑتی جارہی تھی۔ اُس نے دوائیاں کھانے سے انکار کر دیا اور رِشی کو اُس نے ہمراز بنالیا۔

"رِشی جی!" ــــ ایک روز رادھا نے اُسے کہا۔ "مسلمانوں کے سلطان نے مجھے کہا تھا کہ کامیابی اور ناکامی تمہارے دیوتا کرشن واسدیو اور ہر ہر مہادیو کے اختیار میں نہیں، ہمارے خدا کے اختیار میں ہے.... میں نے اُس کا ہر ایک لفظ سچا دیکھا ہے۔ کیا وہ مگر مچھ مسلمانوں کا خدا ہے جس نے راستے میں آ کر شیلا کو کھالیا تھا اور ہمارے دو آدمی معلوم نہیں کس کے تیروں سے مر گئے اور ہم پکڑے گئے؟ .... میں نے ہری کشن کی جنم بھومی کو اُجڑا ہوا دیکھا ہے۔ بُت ٹوٹے ہوئے دیکھے ہیں۔ یہی ہیں نا ہمارے دیوتا اور ہمارے بھگوان؟ اگر ان میں کوئی طاقت ہوتی تو مسلمان فنا ہو چکے ہوتے۔"

رِشی نے اُسے ہندو مت کی کرامات کا قائل کرنے کے لیے بہت کچھ کہا اور اپنے مذہب کی وہ روایتیں سنائیں جنہیں انسانی عقل تسلیم نہیں کر سکتی۔ ان کے مقابلے میں اُس نے مسلمانوں کو جھوٹا اور لٹیرا کہا اور اسلام کو بے بنیاد مذہب قرار دینے کی پوری کوشش کر ڈالی۔

"مگر میں نے جو دیکھا ہے اسے میں کس طرح جھٹلا سکتی ہوں؟" ــــ رادھا نے کہا۔ "لچھمن پال میرے ساتھ تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ اُسے مسلمانوں کی فتح کا راز معلوم ہو گیا ہے۔ اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ اُس نے ان میں عورت اور شراب نہیں دیکھی.... ہم وہاں سے صبح کے وقت چلے تھے۔ مجھے اور لچھمن کو انہوں نے بہت سویرے جگا دیا تھا۔ باہر ابھی دھند لکا گہرا تھا۔ کسی انسان کی بڑی ہی سُریلی آواز ابھری جس کا اثر میرے دل پر ہونے لگا۔ میں نے اپنے پہرہ دار سے پوچھا کہ یہ کونسی غزنی کی زبان

میں گا رہا ہے؟ اُس نے بتایا کہ یہ اذان ہے۔ یہ ہمارے خدا کے الفاظ ہیں۔ میں ایک بھی لفظ نہ سمجھ سکی مگر اس آواز نے مجھ پر جادو کا سا اثر کیا۔ کچھ دیر بعد میں نے دیکھا کہ متھرا میں مسلمانوں کی جتنی فوج تھی ایک میدان میں صفوں میں کھڑی ہو گئی۔ ایک آدمی ان کے آگے کھڑا ہو گیا اور وہ کبھی جھکتے کبھی ماتھے زمین سے لگا لیتے۔ پہرہ دار نے مجھے بتایا کہ یہ ان کی عبادت ہے۔ رشی جی! عبادت کا یہ طریقہ مجھے بہت اچھا لگا۔ میں نے پہرہ دار سے پوچھا کہ یہ کس کی عبادت کر رہے ہیں؟ ان کے سامنے کوئی بُت نہیں، کوئی مُورتی نہیں .... پہرہ دار نے کہا کہ ہم جس کی عبادت کرتے ہیں وہ ہمارے دلوں میں ہے اور وہ ہر جگہ موجود ہے۔ وہ خدا ہے۔ اُس نے ہمیں فتح دی ہے۔ ہم جب اُس کی عبادت سے منہ پھیر لیں گے اور اُس کے احکام نہیں مانیں گے تو ہم ہر میدان میں شکست کھائیں گے"۔

رشی سُن سُن کر بے چین ہوتا جا رہا تھا اور رادھا بولے جا رہی تھی — "میں نے پہرہ دار سے پوچھا کہ تمہارا سلطان تو عبادت نہیں کرتا ہو گا۔ وہ تو سلطان ہے۔ پہرہ دار نے کہا کہ سلطان عبادت میں موجود ہے۔ وہ سپاہیوں میں کہیں پیچھے ہو گا۔ وہ سپاہیوں کی طرح خدا کے آگے جھکتا اور سجدہ کرتا ہے۔ عبادت کے وقت وہ سلطان نہیں ہوتا ..." "رشی جی! ہمارے پتا جی مہاراج کبھی مندر میں جاتے ہیں تو مندر سے سب کو نکال دیا جاتا ہے .... سچا کون ہے رشی جی؟ کیا ہمارا خدا نہیں ہوتا؟"

رشی نے بتانا شروع کیا کہ ہندو مت میں خدا کا تصوّر کیا ہے لیکن رادھا نے اُسے روک دیا اور بولی "کیا مگر مچھ خدا ہے؟ .... نہیں ... مگر مچھ مجھے ہر رات ڈراتا ہے۔ میرے دل میں خدا اُتر آیا ہے"۔

"مہاراج!" — رشی نے راجے چندا سے کہا — "راجکماری پاگل ہو چکی ہے۔ معلوم ہوتا ہے متھرا میں مسلمانوں نے اسے کوئی ایسی چیز پلا دی ہے جس کا اثر ابھی تک نہیں اُترا۔ یہ بیماری میرے علم اور میرے عمل سے باہر ہے۔ وہ اپنے مذہب سے منحرف ہو چکی ہے۔ اب تو وہ کچھ نہ کچھ بولتی ہی رہتی ہے۔ بعض اوقات بولتے بولتے چپ ہو جاتی

ہے اور بڑی زور سے چیخ مار کر اپنے چہرے کو ہاتھوں سے یا کپڑے سے ڈھانپ لیتی ہے۔ اکثر یہی رٹ لگائے رکھتی ہے۔ 'میرے دل میں خدا اُتر آیا ہے' ۔۔۔ یہ مسلمانوں کا اثر ہے۔"

"اسے اسی حال میں رہنے دو" ۔۔۔ رائے چندا نے کہا۔"میں سلطان محمود کا سر کاٹ کر اس کے سامنے رکھوں گا تو اس کے دل سے مسلمانوں کا خدا نکل جائے گا۔ مجھے ابھی کوئی فرصت نہیں رشی جی! غزنی کی فوج بہت قریب آگئی ہے۔"

اگلے ہی روز غزنی کی فوج نے منج کو محاصرے میں لینا شروع کر دیا اور پھر راجکماری رادھا کی کسی کو ہوش اور فکر ہی نہ رہی مگر رادھا کے کان میں جب یہ خبر پڑی کہ اس کا قلعہ محاصرے میں آگیا ہے تو اس نے اٹھ کر بازو پھیلا دیئے اور بلند آواز سے بولی ۔۔۔ "وہ آگئے ہیں۔ سلطان آگیا ہے۔ دروازے کھول دو۔ میری عزت اور غیرت کے رکھوالے آگئے ہیں۔"

اس وقت ایک وید اور دو خدمت گار عورتیں وہاں موجود تھیں۔ سب نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیئے۔ رادھا باہر کو دوڑی تو اُسے پکڑ لیا گیا۔ رائے چندا وہاں موجود نہیں تھا۔ اُس کی ماں کو بلایا گیا۔ وہ بھی محاصرے کی وجہ سے گھرائی ہوئی تھی۔ اُس نے اپنی بیٹی کی یہ حالت دیکھی تو وید سے کہا کہ اسے کوئی ایسی دوائی دے دو جو اسے بے ہوش کر دے، پھر جوں ہی ہوش میں آئے اسے پھر بے ہوش کر دیا جائے۔

رادھا کو جکڑ لیا گیا اور وید نے اُس کے منہ میں دوائی ڈال دی۔ تھوڑی دیر بعد رادھا کا جسم بے حِس ہو گیا۔ کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا۔

محاصرے کا پہلا دن گزر گیا۔ سلطان محمودؒ نے رات کو بھی آرام نہ کیا۔ وہ قلعے کے پیچھے چلا گیا جدھر دریا تھا۔ پانی قلعے کی دیوار کے ساتھ لگ کر بہتا تھا۔ سلطان نے اپنے سالاروں سے کہا کہ ہر پیادہ دستے سے دو دو چار چار جانباز قسم کے سپاہی منتخب کریں اور ان کا ایک الگ جیش بنا کر اسے محفوظہ (ریزرو) میں بھیج دیا جائے۔

دوسرے دن غزنی کی فوج نے ایک بار پھر قلعے کے بڑے دروازے پر ہلہ بولا مگر اوپر سے راجپوتوں نے تیر اور برچھیاں پھینک کر غزنی والوں کو بہت نقصان پہنچایا مگر

سلطان محمود نے ہلّے جاری رکھے۔ قلعہ ڈیڑھ میل لمبا تھا۔ سات روز تک غزنی کی فوج نے پورا زور صرف کر دیا مگر ذرا سی بھی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ آٹھویں روز کی شام گہری ہو چکی تھی۔ سلطان نے اس جانباز جیش کو ساتھ لیا جو اُس نے تیار کروایا تھا۔ اس کی نفری تین سو سے کچھ زیادہ تھی۔

"غزنی اور اسلام کی آبرو تم سے جان کی قربانی مانگ رہی ہے" — سلطان محمود نے رات کی تاریکی میں اس جَیش کے جوانوں سے کہا — "اگر تم میں سے کوئی بھی قربانی دینے کے لیے تیار نہیں تو اُسے اجازت ہے کہ اپنے دستے میں واپس چلا جائے۔ مجھے تم میں سے کسی کا چہرہ نظر نہیں آرہا۔ مجھے بالکل پتہ نہیں چلے گا کہ کون چلا گیا ہے۔ میرے مجاہدو! خُدا کے سوا آج کی رات تمہیں کوئی نہیں پہچانتا روزِ محشر بھی تمہیں صرف خُدا پہچانے گا" — سلطان خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے پوچھا — "کیا میں یہ سمجھوں کہ تم سب میرے ساتھ ہو؟"

کئی آوازیں سنائی دیں — "ہم سب آپ کے ساتھ ہیں ..... ہم جانیں قربان کرنے کے لیے آپ کے ساتھ آئے ہیں ..... ہم سلطان کے حکم کے منتظر ہیں۔"

"آج رات تم خدا کے حکم سے لڑو گے" — سُلطان محمود نے کہا — "آج تمہیں اس کفرستان میں خدا کا نام بلند کرنا ہے ..... اس قلعے کی ایک دیوار دریا میں ہے۔ تمہیں نقب لگانے اور سرنگ کھودنے والے اوزار دیئے جا رہے ہیں۔ تم میں سے پچاس آدمی دریا میں اتر کر دیوار کو نیچے سے توڑیں گے۔ پانی زیادہ گہرا نہیں۔ اس موسم میں پانی گہرا نہیں ہوا کرتا، ٹھنڈا ہوتا ہے، اور جو تیرنا نہیں جانتا وہ دریا میں نہ اُترے۔ خطرہ یہ ہے کہ دشمن نے تمہیں دیکھ لیا تو اُوپر سے تیروں اور برچھیوں کا مینہ برسا دے گا۔ تمہیں اچھی طرح اندازہ ہو گا کہ قلعے کی دیوار کتنی چوڑی ہو گی۔ اگر تم نے دیوار کی نصف چوڑائی میں سُرنگ لگا لی تو باقی کام پانی کر لیگا۔"

سلطان محمود نے پچاس جانباز الگ کر لیے۔ لڑائی کا زور تھم گیا تھا۔ اندھیرے کی وجہ سے فضا تیروں سے خالی ہو گئی تھی۔ قلعے کی دیواروں پر اور برجوں میں کچھ سرگرمی تھی۔ سلطان محمود قلعے سے تقریباً پون میل دُور تھا۔ اُس نے جانبازوں کو خدا حافظ کہا

اور انہیں ہدایات دے کر دریا کے کنارے کنارے قلعے کی طرف روانہ کر دیا۔

راجپوتوں کو دریا کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ غزنی کے پچاس جانباز بہت بڑا خطرہ بن کر دریا کی طرف سے سرنگ لگانے جا رہے تھے۔ وہ اونچی گھاس اور درختوں کی اوٹ میں چلتے چلتے دیوار سے کچھ دُور سے ہی دریا میں اُتر گئے۔ ان کے پاس اوزاروں کے علاوہ ہتھیار بھی تھے۔ دریا کا پانی بہت ٹھنڈا تھا اور کنارے کے ساتھ ساتھ کمر تک گہرا تھا۔ ذرا پرے زیادہ گہرا ہو جاتا تھا۔ جانباز ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑے پانی میں چلتے جا رہے تھے۔

وہ دیوار کے قریب پہنچ گئے۔ یہ دیوار عمودی نہیں، کچھ ڈھلانی تھی۔ اس سے راجپوتوں کو یہ فائدہ حاصل تھا کہ وہ نیچے دیکھ سکتے تھے کہ کیا ہو رہا ہے مگر اندھیرے میں انہیں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ پچاس جانبازوں نے پانی میں کھڑے ہو کر اوزاروں سے دیوار کے پتھر نکالنے کی کوشش شروع کر دی۔ یہ کام خاموشی سے نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اوزاروں کی آواز اوپر دیوار تک جاتی تھی۔ سلطان محمود نے اس آواز کو دبانے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ وہ اس طرح کہ دریا کی دیوار کے ساتھ والی دیوار کی طرف اس کے حکم سے دف اور نقارے پیٹے جانے لگے۔ نفریاں بجنے لگیں اور سپاہیوں نے نعرے لگانے اور غل غپاڑہ بپا کرنا شروع کر دیا۔ دیوار کے اوپر راجپوت اس طرف اکٹھے ہو گئے۔ یہ غل غپاڑہ حملے کا ہی ہو سکتا تھا۔

جانباز اطمینان سے پتھر نکالتے رہے۔ انہوں نے اتنے پتھر نکال لیے کہ آگے دیوار کی مٹی آ گئی۔ اس کی کھدائی مشکل نہیں تھی۔ مشکل یہ پیدا ہو رہی تھی کہ دریا بھی سرنگ میں داخل ہو گیا تھا۔ سرنگ فراخ اور بلند تھی۔ پچاس آدمی کھدائی کر رہے تھے اس لیے کام تیزی سے ہو رہا تھا۔ آگے پھر پتھر آ گئے۔ جانبازوں کے پاس بڑے مضبوط اور موزوں اوزار تھے۔ ان سے پتھر نکلتے آ رہے تھے۔ سرنگ کم و بیش پندرہ قدم لمبی ہو گئی تھی۔ آخر وہ پتھر دیوار سے ہٹا جس کے ہٹنے سے قلعے کے اندر کی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ جانبازوں نے تیزی سے بہت سے پتھر نکال دیئے اور وہاں اتنا بڑا

دہانہ بن گیا جس میں سے ایک آدمی کھڑا ہو کر گزر سکتا تھا۔ دریا کا پانی قلعے کے اندر جانے لگا۔

قلعے میں کسی نے پانی دیکھ لیا اور اُس نے شور مچا دیا۔ جانباز اپنا کام کر چکے تھے۔ وہ پیچھے کو چل پڑے مگر راجپوت بھی جانباز تھے۔ وہ مشعلیں اٹھائے دوڑے آئے۔ بہت سے برچھیوں اور تلواروں کے ساتھ آئے۔ غزنی کے جانباز تیزی سے باہر نکل آئے۔ راجپوت ان کے پیچھے آئے۔ دریا میں خونریز معرکہ لڑا گیا۔ اندر سے کئی مشعلیں سرنگ کے راستے باہر آ گئی تھیں۔ ان کی روشنی میں دوست اور دشمن کا پتہ چل رہا تھا سلطان محمود کی نظر انہی جانبازوں پر تھی۔ اُس نے ان کی خبر لینے کے لیے دو تین آدمی آگے بھیج دیئے تھے۔ ان آدمیوں نے آ کر اطلاع دی کہ دریا میں لڑائی ہو رہی ہے سلطان نے آگے بڑھ کر دیکھا۔ دریا میں بیشمار مشعلیں نظر آ رہی تھیں جیسے دریا میں تیر رہی ہوں۔ اس نے کم و بیش تین سو سپاہیوں کو دریا میں اتار دیا اور مشعل بردار بھی ساتھ بھیج دیئے۔

"معلوم ہوتا ہے میرے جانبازوں نے دیوار میں نقب لگالی ہے" — سلطان محمود نے اپنے سالار سے کہا — "اندر سے اسی راستے دشمن باہر آیا ہو گا۔ جاؤ دیکھو اور مجھے بتاؤ"

دریا کا پانی قلعے کے اندر جا رہا تھا اور سرنگ میں سے راجپوت باہر آ رہے تھے۔ لاشیں اور زخمی دریا میں بہتے جا رہے تھے۔ مشعلوں کے شعلے دریا پر ناچ رہے تھے۔ سلطان محمود نے بہت سوچا کہ وہ اس سرنگ سے اپنا ایک دستہ قلعے میں داخل کر سکتا ہے یا نہیں۔ اُسے سرنگ کھودنے والے ایک زخمی نے جو دریا سے نکل آیا تھا، بتایا کہ سرنگ سے اندر جانے کی کوشش نہ کی جائے ورنہ بہت نقصان ہو گا۔ سلطان نے حکم دے دیا کہ دریا سے اپنے آدمی واپس بلا لیے جائیں۔

وقائع نگاروں نے محاصرے کا جو روز بروز کا آنکھوں دیکھا حال لکھا ہے، وہ بہت طویل ہے۔ مختصر یہ کہ غزنی کے مجاہدین نے خون کی بے دریغ قربانی دے کر دیواروں میں دو جگہ نقب لگائی مگر منج کے راجپوتوں نے بہادری کے ایسے مظاہرے کیے کہ سلطان محمود غزنوی عش عش کر اُٹھا۔ بجائے اس کے کہ غزنی کے دستے ٹوٹی ہوئی دیواروں سے

اندر جاتے، اندر سے راجپوت باہر آتے اور غزنی کی فوج پر حملے کرتے تھے۔ ان میں سے جو زندہ رہتے وہ پھر اندر چلے جاتے تھے۔ انہوں نے یہاں تک کیا کہ دروازہ کھول کر لڑتے ہوئے سیلاب کی طرح آتے اور اس انداز سے لڑے کہ پھر واپس چلے جائیں۔

"یہ لوگ جتنے بہادر ہیں اتنے ہی احمق ہیں"۔ سلطان محمود نے اپنے سالاروں سے کہا —"انہیں موقع دو کہ اسی طرح ہلّے بولتے رہیں۔ یہ اپنی طاقت تیزی سے ضائع کر رہے ہیں"۔

اس دوران رادھا کو مسلسل بے ہوشی میں رکھا گیا۔ وہ ہوش میں آتی تھی تو نحیف آواز میں کہتی تھی —"خدا میرے دل میں اُتر آیا ہے"— اُسے وید بے ہوشی کی دوائی پلا دیتا تھا۔

مؤرخوں کے مطابق محاصرے کے پچیسویں روز سلطان محمود نے حکم دیا کہ قلعے کی دیواروں کے شگافوں پر شدید ہلّہ بول کر اندر جانے کی کوشش کی جائے اور جونہی راجپوت باہر آنے کے لیے کوئی دروازہ کھولیں، حملہ کر کے دروازے کو کھلا رہنے دیا جائے۔

پچیسویں روز کی لڑائی فیصلہ کُن تھی۔ راجپوت اپنی طاقت کم کر چکے تھے۔ جب غزنی کی فوج نے شگافوں پر اور ایک دروازے پر ہلّہ بولا تو راجپوت گھبرا گئے۔ مسلمان قلعے میں داخل ہو گئے مگر نفری تھوڑی تھی۔ راجپوتوں نے لڑنے کی بجائے مرنے کو ترجیح دی۔ ان میں سے بعض نے اپنے کنبوں (عورتوں اور بچوں) کو اپنے گھروں میں بند کر کے گھروں کو آگ لگا دی اور بال بچوں سمیت زندہ جل گئے۔ جس راجپوت کو کہیں کوئی ہندو عورت نظر آئی، اُسے قتل کر دیا۔ منج کے کئی سپاہیوں نے قلعے کی اتنی اونچی دیواروں کے اوپر سے چھلانگیں لگا دیں اور مر گئے۔

جب سلطان محمود قلعے میں داخل ہُوا اُس وقت منج جل رہا تھا اور اس آگ میں راجپوت جل رہے تھے۔ یہ اجتماعی خودکُشی تھی۔ صرف محل محفوظ تھا۔ وہاں گئے تو جگہ جگہ عورتوں اور بچوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ انہیں راجپوتوں نے خود قتل کیا تھا۔ داشتاؤں اور ناچنے گانے والیوں کے سینوں میں بھی خنجر اور تلواریں اُتری ہوئی تھیں۔ مرد بھی مرے پڑے تھے۔ راجے چندا اور رانی کی لاشیں خواب گاہ میں پلنگوں پر پڑی تھیں۔

غزنی کے آدمی محل کے ہر کمرے میں گئے۔ صرف ایک کمرہ باہر سے بند تھا۔ کھول کر اندر گئے تو پلنگ پر رادھا پڑی تھی۔ اُسے بھی مُردہ سمجھا گیا مگر اُس نے آنکھیں کھولیں اور راو گھٹی آواز میں بولی "خدا میرے دل میں اُتر آیا ہے"۔ قریب جاکر دیکھا تو پتہ چلا کہ وہ زخمی نہیں بیمار ہے۔ اُس نے مری ہوئی آواز میں پوچھا "تم مسلمان سپاہی ہو؟ ... تمہارا سلطان کہاں ہے؟ اُسے بلاؤ۔ میں اُسے بتانا چاہتی ہوں کہ میں اُس کے خدا کا نام لے کر مر رہی ہوں۔ میں اُس کے ہاتھ چوم کر مروں گی"۔

سب اُسے حیرت سے دیکھنے لگے۔ ایک لڑکی کے لیے سلطان محمود کو نہیں بُلایا جاسکتا تھا۔ رادھا نے مایوسی سے سب کو دیکھا اور اُس کا سر ڈھلک گیا۔ وہ مر چکی تھی۔

مُنج کے بعد سلطان محمود کو قنوج کی طرف پیشقدمی کرنی تھی مگر اُسے ایسی اطلاعیں مل رہی تھیں جو دھوکہ معلوم ہوتی تھیں۔ صابح بروک نے اُسے بتایا تھا کہ اُس کا اصل مقابلہ قنوج کے گردونواح میں ہوگا مگر بعد کی اطلاعیں یہ تھیں کہ قنوج تک کے علاقے میں کسی فوج کا نام ونشان نہیں۔ مُنج میں سلطان بہت نقصان اُٹھا چکا تھا۔ وہ فوری طور پر پیشقدمی کے قابل نہیں تھا۔ ایک روز اُسے سالاروں نے مشورہ دیا کہ پیشقدمی کا حکم دے دیا جائے کہیں ایسا نہ ہو کہ بھیم پال نڈر اپنی فوج لے کر آجائے۔

سلطان محمود نے پیشقدمی کا حکم دے دیا۔ اُس نے فوج کو یوں تقسیم کیا کہ ایک حصہ دریائے جمنا کے کنارے اور دوسرا دریائے گنگا کے کنارے جا رہا تھا۔ ہراول بڑا مضبوط تھا۔ اس کے پیچھے سلطان محمود تھا اور یہی فوج کا بڑا حصہ تھا۔ ایک حصہ بہت پیچھے آرہا تھا جس کی حیثیت محفوظہ کی تھی۔ ترتیب کُوچ کی نہیں جنگ کی تھی۔

سلطان محمود ۲ دسمبر ۱۰۱۸ء (۸ شعبان ۴۰۹ھ) قنوج پہنچا۔ اُس نے قلعے کا محاصرہ کر لیا مگر مزاحمت بڑی کمزور تھی۔ سلطان اسے دھوکہ سمجھا۔ اُس نے اپنے عقب کی حفاظت کا بندوبست کر لیا اور اُس نے دیکھ بھال کے لیے دور دور تک سوار بھیج دیئے۔ اُسے ہر لمحہ توقع تھی کہ عقب سے حملہ ہوگا مگر محاصرے کے دوسرے ہی دن قنوج والوں نے قلعے پر سفید جھنڈا لہرا دیا۔

سلطان محمود نے سب سے پہلے ایک سوار دستے کو اندر بھیجا۔ اس کے پیچھے دو اور دستے گئے اور جب دیکھا کہ اندر امن وامان ہے تو وہ خود اندر گیا۔ قنوج کی فوج کے کمانڈروں سے اُسے پتہ چلا کہ مہاراجہ راجیا پال اپنے خاندان سمیت محاصرے سے پہلے ہی کہیں بھاگ گیا تھا۔ سلطان محمود نے ہندو کمانڈروں سے پوچھا کہ خزانہ کہاں ہے۔ تلاش کے باوجود وہاں کچھ بھی نہ ملا۔ سلطان نے محل کو زمین سے ملا دیا اور مندروں میں جا کر تمام بُت توڑ کر باہر پھینک دینے کا حکم دے دیا۔

صالح بروک نے بڑے مندر کے پنڈت کو پکڑوایا۔ پنڈت سے خزانے کے متعلق پوچھا گیا۔ اُس نے کہا۔ "آپ کے اس آدمی کو معلوم ہے خزانہ کہاں ہے مگر اب وہاں کچھ نہیں ہوگا۔ مہاراجہ سب کچھ ساتھ لے گیا ہے"۔

محمد قاسم فرشتہ لکھتا ہے "سلطان محمود کی یہ فتح معمولی نہیں تھی کہ ہندوستان کے وسط میں افغانیں گونج اٹھیں"۔

بلاساغون کی سمن تاشس

۱۰۱۹ء (۴۱۰ ہجری) سلطان محمود غزنوی ہندوستان میں متھرا سے قنوج تک کو تہہ تیغ کر کے غزنی میں داخل ہوا۔ اُس کی سلطنت میں پہلے ہی اطلاع پہنچ چکی تھی کہ سلطان کئی ایک راجوں مہاراجوں سے ہتھیار ڈلوا کر واپس آرہا ہے۔ لوگ اپنے فاتح سلطان کے راستے میں جمع ہو گئے تھے۔ وہ نعرے لگا رہے تھے۔ فوج نعرے لگا رہی تھی۔ عورتیں دور کھڑی اپنی فوج کی بلائیں لے رہی تھیں۔ لوگ جب اُن پچپن ہزار ہندو قیدیوں کو اور تین سو پچاس ہاتھیوں کو دیکھتے تھے جو سلطان محمود ہندوستان سے لایا تھا تو وہ خوشی سے ناچنے لگتے تھے۔ غزنی کا بچّہ بچّہ سلطان محمود کے راستے میں آن کھڑا ہوا تھا۔ داد و تحسین اور نعروں کا شور زمین و آسماں کو ہلا رہا تھا۔

متعصّب مؤرخین اور بعد کے تاریخ نویسوں نے لکھا ہے کہ غزنی پہنچ کر سلطان محمود نے حکم دیا کہ وہ جو مال و دولت ہندوستان سے لایا ہے، وہ محل کے باہر کھول کر رکھا جائے۔ جب زر و جواہرات اور درہموں کے انبار اُس کے سامنے رکھے گئے تو غرور اور تکبّر سے اُس کی گردن تن گئی۔

یہاں تک تو حقیقت ہے کہ اُس نے تمام تر مالِ غنیمت اپنے محل کے باہر رکھوا کر دیکھا تھا لیکن اُس دَور کے مبصّروں نے جن میں الزمخشاری اور ابو عبداللہ یاقوت خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، لکھا ہے کہ سلطان محمود نے جب اپنی سلطنت کے عوام کا اس قدر پُرجوش خیر مقدم اور اُن کی بے تابیاں دیکھیں تو اُس نے حکم دیا کہ وہ تمام زر و جواہرات اور خزانے اِن لوگوں کے سامنے رکھ دو جو ہم ہندوستان سے لائے ہیں اور انہیں بتاؤ

کہ یہ مال تمہارا ہے، یہ تمہارے خزانے کا مال ہے جو تم پر خرچ کیا جائے گا۔
اور اُس نے یہ بے بہا خزانہ قوم کی بہبود اور ذہنی ترقی کے لیے وقف کر دیا۔
اُس نے سنگِ مرمر کی ایک جامع مسجد اور اس کے ساتھ ایک یونیورسٹی کی تعمیر کا حکم دیا۔ مسجد کا نام عروسِ فلک رکھا گیا۔ یہ تھی ہی دلہن۔ اس کی تعمیر کے لیے دور دور سے معمار بلائے گئے۔ دیواروں اور چھت میں جو بیل بوٹے کھدوائے گئے اِن میں سونا اور چاندی پگھلا کر ڈالی گئی۔ میناروں کے کلسوں پر سونا چڑھایا گیا۔ مسجد کے اندر نہایت دلکش اور قیمتی قالین بچھائے گئے۔ یونیورسٹی کو سلطان محمود نے اپنی نگرانی میں مثالی دارالعلوم بنایا۔ اس میں اس نے مختلف زبانوں کی کتابیں جمع کر دیں۔ مکمل ہو کر جامع مسجد اور یونیورسٹی علم و فن کا ایسا مرکز بن گئی جس کی مثال کم از کم عالمِ اسلام میں نہیں ملتی تھی۔ دور دور سے علماء اور اساتذہ بلائے گئے جن کے لیے اُس نے کثیر رقم وقف کر دی۔ طلباء کے لیے بھی بے اندازہ رقم الگ کر دی گئی جو انہیں وظیفوں کی صورت میں ملتی تھی۔
محمد قاسم فرشتہ اور البرونی لکھتے ہیں کہ جامع مسجد اور یونیورسٹی متھرا اور قنوج کی فتح کی یادگار کے طور پر تعمیر کی گئی تھیں۔ تاریخ نویسوں نے سومنات کو زیادہ اہمیت دی ہے لیکن سلطان محمود کی نگاہ میں متھرا زیادہ اہم تھا کیونکہ متھرا ہندوؤں کے ہری کرشن کی جائے پیدائش ہے اور ہندوؤں کے ہاں متھرا کو وہی درجہ حاصل ہے جو مسلمانوں کے ہاں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کو حاصل ہے۔
سلطان محمود جو مالِ غنیمت لایا تھا اس میں سونے اور چاندی کے تیس لاکھ درہم تھے۔ ہیرے جواہرات اور سونے کے ٹکڑوں کا کوئی حساب نہ تھا۔ پچپن ہزار ہندو قیدی اور ساڑھے تین سو ہاتھی تھے۔ گھوڑوں اور تلواروں کا بھی کوئی شمار نہ تھا۔ مشہور مؤرخ محمد قاسم فرشتہ نے لکھا ہے کہ سلطان محمود ہندوستان سے تین عجیب چیزیں لایا تھا۔ ان میں ایک ہاتھی تھا، ایک فاختہ اور ایک پتھر۔
یہ ہاتھی اُسے متھرا سے قنوج کی طرف پیشقدمی کے دوران اس طرح ملا تھا کہ جمنا کے دائیں کنارے پر اسائی نام کی ایک ریاست تھی جس کا حکمران چندر رائے تھا۔ سلطان کو اُس کے جاسوسوں نے بتایا تھا کہ چندر رائے کے پاس ایک ہاتھی اتنی

بڑی جسامت کا ہے جو ہندوستان میں کبھی نہیں دیکھا گیا۔ اس ہاتھی کی خوبی صرف یہی نہیں تھی کہ اس کی جسامت غیر معمولی تھی بلکہ وہ اس لیے بھی ملک بھر میں مشہور تھا کہ میدانِ جنگ میں دشمن کی صفوں میں دہشت اور تباہی پھیلا دیتا تھا اور دوسرے ہاتھیوں کی طرح تیر یا برچھی کھا کر پیچھے کو نہیں بھاگتا تھا۔ نڈر ہاتھی تھا۔

سلطان محمود نے اسائی کو اسی ہاتھی کے لیے محاصرے میں لے لیا تھا۔ یہ چھوٹی سی ریاست تھی۔ سلطان محمود نے چندر رائے کو پیغام بھیجا کہ وہ اپنا ہاتھی دے دے تو بڑی آسان شرائط پر محاصرہ اٹھا لیا جائے گا۔ چندر رائے نے جواب بھیجا کہ یہ ہاتھی مجھے اپنی راجدھانی اسائی سے زیادہ عزیز ہے۔ میں جب تک زندہ ہوں اس ہاتھی سے دستبردار نہیں ہوں گا۔ پھر یوں ہوا کہ دونوں فوجوں کا تصادم ہوا۔ اس دوران یہی ہاتھی شاہانہ چال چلتا سلطان محمود کے پاس آ گیا۔ اس کے ہودے میں اس کے جنگجو سواروں کی لاشیں پڑی تھیں جن کے جسموں میں تیر اترے ہوئے تھے۔ ہاتھی کی راہنمائی کرنے والا کوئی نہ تھا۔

سلطان محمود کے حکم سے ہاتھی کو پکڑ لیا گیا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ ہاتھی اپنے آپ آ گیا۔ سلطان محمود نے بے ساختہ کہا— "یہ ہاتھی مجھے چندر رائے نے نہیں خدا نے دیا ہے"— چنانچہ سلطان نے اس کا نام خداداد رکھ دیا۔

فرشتہ کے مطابق سلطان محمود ہندوستان سے ایک پرندہ لایا تھا جو فاختہ سے ملتا جلتا تھا۔ اسے قدرت نے یہ خوبی عطا کی تھی کہ اس کا پنجرہ جس مکان یا محل میں رکھا ہوتا وہاں کوئی کسی کو زہر نہیں دے سکتا تھا۔ مکان یا محل کے کسی بھی کمرے میں کتنا ہی چھپا کر کسی کو زہر دیا جاتا تو یہ پرندہ پنجرے میں بری طرح پھڑپھڑاتا تھا جیسے پنجرہ توڑنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس دوران اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے تھے۔ لوگ فوراً چوکنے ہو کر ہر جگہ جا کر دیکھتے کہ کون کسے زہر دے رہا ہے۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ سلطان محمود نے یہ پرندہ تحفے کے طور پر خلیفہ بغداد القادر باللہ کو بھیج دیا تھا۔

فرشتہ نے ہی متعدد مؤرخوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ سلطان محمود ہندوستان

سے ایک پتھر لایا تھا جس میں یہ خوبی تھی کہ اسے پانی میں ڈبو کر اس سے ٹپکتے قطرے زخم پر ڈالنے سے زخم بہت جلدی ٹھیک ہو جاتا تھا۔

سلطان محمود نے اپنا چھوٹا سا قافلہ شیخ ابوالحسن خرقانی کے آستانے سے کوئی ایک میل دور روک لیا اور وہ گھوڑے سے اُترا۔ اُس نے معمولی سے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اس قدر معمولی کہ اُسے نہ جاننے والوں کو شک تک نہ ہو سکتا تھا کہ وہ سلطان محمود ہے جس نے سارے ہندوستان پر لرزہ طاری کر رکھا ہے۔ اُس نے اپنے محافظوں کو وہیں رُکے رہنے کو کہا اور خود پیدل چل پڑا۔ اپنے پیر و مرشد کے سامنے وہ شاہانہ شان و شوکت سے کبھی نہیں گیا تھا۔ شیخ ابوالحسن خرقانی کے ہاں جا کر اُس نے اُن کے ہاتھ چومے اور سر جھکا کر بیٹھ گیا۔

"وہ وقت یاد کرو جب تم ہندوستان سے شکست کھا کر آئے تھے" شیخ خرقانی نے کہا ——"تم دل برداشتہ تھے۔ تمہاری فوج کٹ گئی تھی۔ تمہاری ہمّت ٹوٹ گئی تھی اور یہاں تمہارے دشمن تمہیں لاش سمجھ کر تمہارے اوپر گدھوں کی طرح منڈلانے لگے تھے۔ مجھے ڈر تھا کہ تم ہتھیار ڈال کر بیٹھ جاؤ گے۔ فتح اور شکست خدا کے اختیار میں ہے۔ ہارتے وہ ہیں جو شکست کو تسلیم کر لیتے ہیں اور شکست کو وہی تسلیم کرتا ہے جس کا ایمان کمزور ہوتا ہے....

"تم شہیدوں کے خون کی قیمت ادا نہیں کر سکتے محمود! اِن کی قدر کر سکتے ہو اور یہ تمہارا فرض ہے۔ یاد رکھو۔ تم اگر انہیں بھول گئے جو نعرے لگاتے اور سینے تانے تمہارے ساتھ گئے تھے مگر واپس نہیں آ سکے تو اِس کی سزا اس دنیا میں پاؤ گے۔ وہ تمہارے حکم سے نہیں خدا کے حکم سے لڑے تھے"

"میں نے اُن کی یاد میں ایک جامع مسجد اور ایک دارالعلوم کی تعمیر کا حکم دے دیا ہے"—سلطان محمود نے کہا— "اور اُن کی یادگار کے طور پر مینار بھی تعمیر کروا رہا ہوں۔ شہیدوں کے بچوں کو دارالعلوم میں مفت تعلیم اور وظیفہ ملا کرے گا"

"اور غور سے سنو محمود!"—شیخ ابوالحسن خرقانی نے کہا—"غزنی کے لوگوں نے تمہارا

استقبال اس طرح کیا ہے جیسے تم آسمان سے اترے ہو۔ میں سن چکا ہوں کہ عورتوں نے تمہاری راہ میں اور تمہارے اوپر پھول پھینکے تھے۔ شاعروں نے تمہاری مدح میں شعر کہے اور گویّوں نے گیت گائے ہیں۔ دربار میں لوگوں نے تمہارے ہاتھ چومے اور تمہیں ساری دنیا کا فاتح کہا ہے..... تم شاید نہیں سمجھ سکے کہ جنہیں تم نے پھول سمجھا ہے وہ کانٹے تھے جو تمہاری راہ میں بکھیرے گئے تھے، اور وہ مدح سرائی جو شاعروں اور گویّوں نے کی، وہ شہد میں ملا ہوا زہر ہے جو تمہیں پلایا گیا۔ اگر آج تمہارا تختہ الٹ جائے تو یہی لوگ نعرے لگائیں گے کہ محمود اسی قابل تھا۔ اس میں سلطان بننے کی اہلیت نہیں تھی۔ وہ پھر اس کے گن گائیں گے جو تمہارے تخت پر بیٹھا ہوگا.....

"خوشامدی درباری تخت و تاج کی دیمک ہوتے ہیں۔ وہ دشمن سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ تم نے غزنی کے اکابرین اور امراء اور رتبوں والوں کو جب ضیافت دی تھی تو تم بھول گئے تھے کہ تمہاری سلطنت میں اس رات لاکھوں انسان روکھی سوکھی کھا کر سو گئے تھے اور کچھ ایسے بھی تھے جن کے پیٹ میں اس شام ایک نوالہ بھی نہیں گیا تھا۔ خوشامدیوں نے تمہیں یہ تاثر دیا تھا کہ رعایا خوشحال ہے اور وہ تمہارے گیت گا رہی ہے.... محمود! اپنے آپ کو اپنی روح کے آئینے میں اور اپنی رعایا کو اپنی آنکھوں سے دیکھو۔ اس آئینے میں نہ دیکھو جو تمہیں درباری ٹولہ دکھایا کرتا ہے۔ تم تنہا اپنی ذات میں کچھ بھی نہیں۔ تم قوم کا عکس ہو۔ اپنے آپ کو اس عکس میں گم کر دو۔ سلطانی اور عیّاری ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ خوشامدی اور عہدوں کے بھوکے لوگ سلطان سے عیّاری کرتے ہیں اور سلطان قوم سے عیّاری کرتا ہے۔ یوں سمجھو کہ گناہ اور نیکی کندھے سے کندھا ملا کر چلتے ہیں، اور جو سلطان اپنی آنکھوں پر خوشامدیوں کی پٹی باندھ لیتا ہے اور کانوں میں مدح سراؤں کا سیسہ پگھلا کر ڈال لیتا ہے وہ خدا کے نزدیک سب سے بڑا گنہگار ہے.....

"آج تمہیں خدا نے جو طاقت اور جو جاہ و حشمت عطا کی ہے، یہ تم سے چھن بھی سکتی ہے۔ خوشامدیوں کے نعروں کی نسبت رعایا کی آہیں عرش تک جلدی پہنچتی ہیں۔ ہندوستان کی فتوحات نے تمہاری رعایا میں اضافہ کر دیا ہے، تمہاری ذمہ داریاں

بڑھ گئی ہیں .... کہیں ایسا نہ ہو کہ سونے چاندی کے انبار تمہیں اندھا کر دیں۔ جو کچھ ہے اللہ کا ہے۔ اللہ کی امانت ہے۔ خزانہ تمہاری ملکیت نہیں۔ مالِ غنیمت تمہاری ملکیت نہیں۔ محل کی سازشوں سے نکلو اور نظر دشمن پر رکھو۔ تمہیں فتح مبارک ہو۔ میں تصوروں میں وہ اذانیں سُن رہا ہوں جو بُت خانوں میں گونج رہی ہیں۔ تمہیں پھر وہاں جانا ہے۔ سانپ کا سر ابھی کچلا نہیں گیا۔ میں آنے والے وقت کو دیکھ رہا ہوں۔ اگر ہندومت کا سر کچلا نہ گیا تو یہ مذہب مسلمانوں کو ڈستا ہی رہے گا .... جاؤ محمود! اگلی جنگ کی تیاری کرو۔"

"پیرو مرشد!" سلطان نے سر اٹھا کر کہا۔ "میری روح کو اسی روشنی کی ضرورت تھی جو آپ نے عطا کر دی ہے۔ میرے دل میں کوئی وہم اور کوئی شک نہیں۔ میں نے اس حقیقت کو قبول کر لیا ہے کہ میری عمر کفر کے خلاف لڑتے گزرے گی۔ مجھے پریشانی صرف یہ ہے کہ میری اپنی قوم کے حکمران میرے دشمن ہیں۔ ہم خانہ جنگی میں بہت خون بہا چکے ہیں۔"

"ایک فرق دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کرو۔" شیخ ابوالحسن خرقانی نے کہا۔ "ایک دشمن تمہاری سلطنت کے ہیں۔ وہ تم سے تخت و تاج چھیننا چاہتے ہیں اور ایک دشمن وہ ہیں جو اسلام کو کمزور کر رہے ہیں۔ انہیں غدار کہتے ہیں۔ اپنے ذاتی دشمن اور اپنے مذہب کے دشمن میں تمیز کرو۔ کسی کو اس لیے قید میں نہ ڈال دو کہ وہ تمہارے جاہ و حشمت کا منکر ہے۔ اگر تمہارا اپنا بیٹا، اپنی بیٹی اور اگر تمہارا سگا بھائی بھی اسلام کو نقصان پہنچا رہا ہے تو اُسے جینے کے حق سے محروم کر دو۔ کاشغر کا حکمران قادر خان اور اس کے پڑوسی ابومنصور ارسلان خان اور طوغان خان تمہاری سلطنت پر قبضہ کرنے کی سوچ رہے ہیں۔ وہ خانہ جنگی کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ وہ عالمِ اسلام کے اتحاد کو پارہ پارہ کر رہے ہیں۔ انہیں عیسائی مدد اور ہوا دے رہے ہیں۔ اگر یہ سر اٹھائیں تو انہیں کچل دو لیکن کچلنے سے پہلے انہیں موقع دو کہ وہ سمجھ سکیں کہ وہ غلط راستے پر چل رہے ہیں۔"

سلطنت غزنی کے مسلمان دشمنوں کا مختصر سا پس منظر یہ ہے کہ ایلک خان ترکستانی اردگرد کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے حکمرانوں کو اپنے ساتھ ملا کر سلطان محمود غزنوی کی بڑھتی ہوئی طاقت کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ آپ اس سلسلے میں تفصیل سے پڑھ چکے ہیں کہ کئی بار سلطان محمود کو ان کے خلاف لڑنا پڑا۔ ایلک خان مر چکا تھا۔ اب اُس کا بھائی ابومنصور ارسلان خان الاَصم تختِ نشین تھا۔ اسے الاَصم اس لیے کہا جاتا تھا کہ کانوں سے بہرہ تھا۔ کاشغر کا حکمران قادر خان تھا اور اس کے پڑوس میں توغان خان کی ریاست تھی۔ یہ دراصل ریاستیں نہیں امارتیں تھیں جو خلافتِ بغداد کے تحت تھیں مگر خلافت کی اہمیت ختم ہو چکی تھی خلیفہ القادر باللہ عباسی تھا جو خود اقتدار پرست تھا۔ وہ ایک ریاست کا حکمران بھی تھا۔ وہ سلطان محمود کے خلاف خانہ جنگی کو درپردہ ہوا دیتا رہتا تھا۔

سلطان محمود متھرا سے قنوج تک فتح کر کے واپس آیا تو ایک رات قادر خان ابومنصور ارسلان خان کے محل میں بیٹھا تھا۔ قادر خان کی ایک جوان بیٹی اختشی بھی اُس کے ساتھ آئی ہوئی تھی۔ رات کو جب قادر خان اور ابومنصور خاص کمرے میں بیٹھے رازونیاز کی باتیں کر رہے تھے، قادر خان کی بیٹی اختشی اور ابومنصور کی جوان بیٹی سمن تاش باغ میں ٹہل رہی تھیں۔ رات خاموش تھی۔ صرف ایک آواز تھی جو اس سکوت میں تیر رہی تھی۔ یہ تاروں کا ایک ساز تھا جس کے ساتھ کوئی دھیمے دھیمے گنگنا رہا تھا۔ ساز و آواز میں سوز تھا اور ایسا تاثر کہ جذبات پر وجد طاری ہوا جا رہا تھا۔

وہ نابینا موسیقار تھا۔ ابومنصور کے دربار کا مغنّی تھا۔ سمن تاش نے اُسے باغ کے کسی گوشے میں بٹھا رکھا تھا اور وہ خود اختشی کے ساتھ ٹہل رہی تھی۔ نابینا مغنّی کی عمر تیس برس سے ذرا ہی زیادہ تھی۔ ڈیڑھ ایک سال سے ابومنصور کے دربار میں تھا۔ سمن تاش کو موسیقی سے دلی لگاؤ تھا۔ ایک روز یہ نابینا محل کے باغ کے قریب آ گیا اور اس نے تاروں کو چھیڑ دیا۔ سمن تاش کے کانوں میں آواز پڑی تو اُس نے اُسے اندر بلا لیا۔ ابومنصور نے اُس سے ایک ہی نغمہ سُنا تو اُس نے مغنّی کو ہمیشہ کے

لیے اپنے پاس رکھ لیا۔ ابومنصور کو اپنی بیٹی سمن تاش سے بہت پیار تھا۔ سمن تاش نابینا مغنّی کو اپنے کمرے میں بھی بُلالیا کرتی تھی۔

"سمن!"___ اخشی نے جذباتی سی آواز میں کہا"___ کتنی پیاری آواز ہے۔ خمار سا طاری ہونے لگا ہے۔"

"یہ موسیقار نابینا ہے"___ سمن تاش نے کہا___"آنکھوں کے نور سے محروم پیدا ہُوا تھا مگر خُدا نے قدرت کی ساری نغمگی اس کی آواز میں سمودی ہے۔ ابّا اجازت نہیں دیں گے۔ میں اس مغنّی کو سلطان محمود کے دربار میں لے جانا چاہتی ہوں۔"

"وہ کیوں؟"___ اخشی نے رک کر پُوچھا"سلطان محمود کے دربار میں کیوں؟ تمہارا اُس کے ساتھ کیا تعلق ہے؟"

"جو ایک مسلمان کا ایک مسلمان کے ساتھ ہوتا ہے"___ سمن تاش نے کہا___"میں اس نابینا موسیقار کے ساز اور اس کی آواز سے سلطان محمود کی عقیدت کا اظہار کرنا چاہتی ہوں۔ تم نے سنا نہیں وہ ہندوستان میں کتنے بُت خانے توڑ آیا اور کتنے مہاراجوں سے ہتھیار ڈلوا آیا ہے؟"

"اس کی تمہیں کیا خوشی ہے؟"___ اخشی نے پوچھا"سلطان محمود ہمارے اور تمہارے خاندان کا دشمن ہے۔ وہ جو ہاتھی، گھوڑے، جنگی قیدی اور اسلحہ لایا ہے، وہ سب ہمارے خلاف استعمال ہوگا۔ تم شاید اپنے خاندان کی تاریخ سے واقف نہیں ہو۔"

"میں اپنے خاندان کی تاریخ سے واقف ہوں، اسی لیے سلطان محمود کی معتقد ہوں"
سمن تاش نے کہا___"وہ ہمارا دشمن نہیں بلکہ ہم دونوں کے خاندان اُس کے دشمن ہیں۔ وہ اسلام کا علمبردار ہے۔ بُت شکن ہے۔ تم شاید نہیں جانتیں کہ اُس نے ہندوستان میں کتنے مہاراجوں کو شکست دی ہے لیکن وہاں حکومت کرنے کے لیے تخت پر نہیں جا بیٹھا۔"

"اس کی وجہ یہ ہے سمن! کہ وہ زروجواہرات اور مال و دولت کی خاطر ہندوستان جاتا ہے۔" اخشی نے بڑے پیار سے کہا___"اب کے وہ درہموں کے، جواہرات اور ہیروں کے ہاتھی لاد کر لایا ہے۔ اُس نے بے بہا مالِ غنیمت اپنی فوج میں تقسیم کیا ہے۔ اب

وہ ہمیں اپنا غلام بنانے کی تیاری کر رہا ہے۔"

"مَیں تو اُس کی لونڈی بننے کو تیار ہوں"۔ سمن تاش نے کہا۔

"تم میں خاندانی غیرت نہیں رہی" — اختی نے کہا۔ "تم ایلک خان کی بھتیجی ہو جو سلطان محمود کے خلاف لڑتا رہا ہے۔ تمہیں ابّا نے کچھ بتایا نہیں؟"

"چچا ایلک خان سلطان محمود کے خلاف لڑتا رہا ہے اور ہر میدان میں شکست کھا کر بھاگتا رہا ہے" — سمن تاش نے کہا۔ "مجھے میرے ابّا کیا بتا سکتے ہیں؟.... وہ بہرے ہیں۔ ان کے کانوں میں حق کی آواز نہیں پہنچتی۔ وہ اُسی کو سچ سمجھتے ہیں جو اُن کے کانوں میں ڈالا جاتا ہے۔"

"کیا تم اپنے باپ کو احمق سمجھتی ہو سمن؟" — اختی نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے خدا نے تمہیں عقل اور غیرت کی جگہ بھی حسن ہی دے دیا ہے۔ کم از کم غزنی اور خراسان میں تم جیسی خوبصورت لڑکی کوئی نہیں ہو گی لیکن تم عقل سے عاری ہو۔"

"مگر میرے اتالیق عقل سے عاری نہیں" سمن تاش نے کہا۔ "تم نے میرے سفید ریش، عمر رسیدہ اتالیق کو دیکھا ہے۔ وہ علم اور تجربے کا سمندر ہیں۔ وہ مجھے میرے خاندان کی تاریخ سنا چکے ہیں۔ انہوں نے میرے ابّا کے متعلق کہا تھا کہ ان میں تدبّر نہیں۔ مَیں نے کہا تھا کہ ان کی مجبوری ہے کہ وہ بہرے ہیں سن نہیں سکتے۔ اتالیق نے کہا کہ جو کوئی تخت پر بیٹھ کر سر پر تاج رکھ لیتا ہے وہ بہرہ ہو جاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ سن رہا ہے مگر سچ اور حق بات سے لیے اُس کے کان بند ہو جاتے ہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ دیکھ سکتا ہے مگر اُسے حقیقت نظر نہیں آتی۔ وہ سمجھتا ہے کہ اُس کا دماغ سوچ رہا ہے مگر دماغ پر کسی اور کا آسیب سوار ہوتا ہے....

"اختی! میرے اتالیق نے کہا تھا کہ تمہارے باپ کا بڑا بھائی ایلک خان بہرہ نہیں تھا۔ خدا نے اُسے عقل و دانش سے نوازا تھا مگر اُس نے اپنے دماغ پر غزنی کو فتح کرنے اور سلطان محمود کو قید یا قتل کرنے کا بھوت سوار کر لیا۔ اُس کے جو کان سن سکتے تھے وہ بند ہو گئے۔ آنکھیں جو دیکھ سکتی تھیں اندھی ہو گئیں اور عقل پر سلطانی کی ہوس کا پردہ پڑ گیا۔ ایسے حکمران کو جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔ تمہارے چچا ایلک خان نے بھی اپنی

رعایا سے جھوٹ بولے۔ اپنے دوستوں سے جھوٹ بولے مسجدوں میں جھوٹ بولے۔ قرآن ہاتھ میں لے کر جھوٹ بولے۔ اپنی فوج کو اور اپنی رعایا سے کہا کہ سلطان محمود لیٹرا ہے اور وہ اپنی سلطنت کو وسیع کر رہا ہے۔ ایلک خان نے جھوٹی غیرت کی قسمیں کھائیں اور اپنی فوج کو بھڑکا کر بھائی کو بھائی سے لڑا دیا۔ اسلام کی عسکری قوّت کمزور ہو گئی اور کفّار کے ہاتھ مضبوط ہو گئے....

"میرے اتالیق نے مجھے بتایا کہ سلطان محمود اگر سلطنت کی وسعت کی خواہش رکھتا تو اُس کے پاس اتنی فوج ہے کہ وہ اِن چھوٹے چھوٹے حکمرانوں اور ترکستان کے خوانین کو اپنا مطیع بنا چکا ہوتا لیکن اُس کی نظر کچھ اور دیکھ رہی ہے۔ اُس کا جنون کچھ اور ہے۔ محمد بن قاسم نے ہندوستان میں جو اسلام پھیلایا تھا اُس پر ہندومت کے سائے پڑ گئے ہیں۔ سلطان محمود کو خواب میں بشارت ہوئی تھی کہ ہندوستان میں اسلام کی ٹمٹاتی ہوئی شمع کو روشن کرے۔ اُس کے پیر و مُرشد شیخ ابوالحسن خرقانی ہیں جو غیب دان تو نہیں لیکن علم و فضل اور ایمان کی روشنی انہیں وہ سب کچھ دکھا دیتی ہے جو بے سمجھ اور کم عقل انسانوں کو نظر نہیں آتا۔ شیخ خرقانی نے سلطان محمود سے کہا ہے کہ کفر کا اور اپنی قوم میں غدّاروں کا خاتمہ کرو....

"میرے اتالیق نے کہا کہ جب بھائی بھائی سے لڑتا ہے تو ان کے خون کے قطروں سے زمین کانپ کانپ جاتی ہے۔ آسمان آنسو بہاتا اور فرشتے روتے ہیں"۔

"سمن تاش!"۔۔۔ انُشی نے سامنے آکر اپنے ہاتھوں میں اُس کے گال تھام لیے اور بولی ۔۔۔"تم نے پہلے کبھی ایسی باتیں نہیں کی تھیں۔ اس عمر میں ایسی سنجیدہ باتیں تمہیں اچھی نہیں لگ رہیں، اور تمہارا اتالیق تمہیں کتنی غلط باتیں بتا رہا ہے۔ وہ تمہیں اسی عمر میں درویش بنا رہا ہے۔ ایسی خوبصورت رات، ایسا وجد آفریں نغمہ، تم کتنی بدذوق ہوتی جا رہی ہو سمن!"

"رُوح کو جب روشنی مل جائے انُشی!"۔۔۔ سمن تاش نے کہا۔۔۔"میں بدذوق نہیں۔ یہ نابینا موسیقار میرے ذوق کی بدولت درباری رتبہ حاصل کیے ہوئے ہے۔ میں نے رُوح کی جس روشنی کی بات کی ہے وہ مجھے اپنے اتالیق اور اس موسیقار

کے نغموں سے مل رہے ہیں۔ محسوس کرتی ہوں کہ اس کے ساز کے تار کچھ کہہ رہے ہیں۔ ان کے ترنّم میں مجھے ایک پیغام سنائی دیتا ہے۔"

"کیا ہے وہ پیغام؟"

"معلوم نہیں"۔۔۔ سمن تاش نے کہا۔۔۔ "میں ابھی سمجھی نہیں۔"

نابینا موسیقار تاروں پر آہستہ آہستہ مضراب چلا رہا تھا اور وہ خوابناک آواز میں گنگنا رہا تھا۔ لگتا ہے اُس کی آواز، ساز کی آواز، لگتا ہے ساز کی آواز اُس کی آواز لگتی تھی۔ دونوں لڑکیاں ٹہلتے ٹہلتے اُس کے قریب آگئیں۔ موسیقار پر بے خودی طاری تھی اور وہ جیسے کسی اور کی موجودگی سے بے خبر تھا۔

"کیا تم اپنے ابّا حضور کو قائل کر سکتی ہو کہ سلطان محمود اپنی سلطنت کی توسیع نہیں چاہتا"۔۔۔ اختی نے پوچھا۔۔۔ "اور کیا تمہارے ابّا مان جائیں گے کہ سلطان محمود کی جنگیں اسلام کی خاطر ہیں؟"

"نہیں منوانے کی مجھے کیا ضرورت ہے؟"۔۔۔ سمن تاش نے کہا۔۔۔ "وہ سلطان محمود کے خلاف ہو سکتے ہیں، اُس کے خلاف لڑیں گے نہیں۔ ان کے دل میں دشمنی موجود ہے۔ وہ سلطان کے خلاف لڑیں گے بھی نہیں اور اُس کی مدد بھی نہیں کریں گے۔"

"میں تمہیں راز کی ایک بات بتاؤں؟"۔۔۔ اختی نے کہا۔۔۔ "تمہارے ابّا حضور سلطان محمود کے خلاف لڑنے کی تیاری کر رہے ہیں"۔

"وہ ایسی جرأت نہیں کریں گے۔"

"وہ ایسی جرأت کا اظہار کر چکے ہیں"۔۔۔ قادر خان کی بیٹی اختی نے کہا۔۔۔ "میرے ابّا اسی مقصد کے لیے یہاں آئے ہیں۔ وہ تمہارے ابّا کے ساتھ اسی سلسلے میں بات کر رہے ہیں۔"

"میں انہیں روکوں گی"۔۔۔ سمن تاش نے تڑپ کر کہا۔

"ہوش میں آؤ سمن!"۔۔۔ اختی نے قدرے غصیلی آواز میں کہا۔۔۔ "ترکستان کی بیٹیاں اتنی بے غیرت نہیں ہوا کرتیں۔ تم ذہنی طور پر غزنی والوں کی غلام بن گئی ہو۔"

نابینا موسیقار کے ساز کے تار اتنی زور سے جھنجھنائے جیسے اُس کا ہاتھ کانپ گیا ہو اور مضراب بے قابو ہو گیا ہو۔ تار خاموش ہو گئے۔ مغنّی کی آواز رات کے سکوت میں تحلیل ہو گئی۔

"سلطان محمود بہت بڑی طاقت بن گیا ہے" — اخشی کہہ رہی تھی — "اب وہ تمام تر ترکستان پر اسی طرح حملہ اور قبضہ کرے گا جس طرح اُس نے خوارزم پر کیا تھا۔ کیا تم بھول گئی ہو کہ اب خوارزم شاہ کون ہے؟ .... التنطاش!... اور اُس کا نائب سلطان محمود کا مشہور سالار ارسلان جاذب ہے۔ یہ دونوں غزنی کے قصاب ہیں۔ انہوں نے ہر اُس آدمی کو قتل کرا دیا ہے جن کے متعلق انہیں شک تھا کہ غزنی کے وفادار نہیں"۔

"ہم دونوں کے والد کیا کرنا چاہتے ہیں؟"

"خراسان پر حملہ" — اخشی نے کہا — "پیشتر اس کے کہ سلطان محمود کو اطلاع ملے، خراسان ہمارے قبضے میں ہو گا"۔

"اور جب سلطان محمود جوابی حملہ کرے گا تو اس کا مقابلہ کون کرے گا؟"

"میرے ابّا قادر خان، تمہارے ابّا ابو منصور اور بخارا کے امیر البتگین کا بھائی توغان خان" — اخشی نے جواب دیا — "ترکستان کے تمام امراء کو ایک محاذ پر اکٹھا کیا جا رہا ہے"۔

سمن تاش ہنسنے لگی اور ہنستی ہی چلی گئی۔ اس کی ہنسی میں بچپن کا انداز تھا لیکن اس ہنسی میں طنز تھی۔ اُس نے کہا — "کیا چوہے اور چھپکلیاں مل کر ایک شیر کا مقابلہ کر سکتی ہیں؟"

"اگر شیر زندہ ہی نہ رہا تو؟" — اخشی نے کہا۔

"زندہ نہ رہا تو؟" — سمن تاش نے حیران سا ہو کے کہا۔

"اُسے خراسان پر حملے سے پہلے قتل کر دیا جائے گا" — اخشی نے کہا اور چونک کر بولی — "تمہارا موسیقار سو گیا ہے یا چلا گیا ہے؟"

رات کی خاموشی میں ساز کی دھیمی دھیمی، لرزتی کانپتی آواز اُبھرنے لگی اور اس کے ساتھ نابینا مغنّی کی آواز کی دبی دبی میٹھی میٹھی گونج سنائی دینے لگی۔

"یہ خاموش کیوں ہو گیا تھا؟" — انختی نے پوچھا "یہ ہماری باتیں سُننے کے لیے چُپ ہو گیا تھا"

"ایک اندھے موسیقار سے اتنا خوف ؟" — سمن تاش نے کہا — "اُسے موسیقی کے سوا کسی اور چیز کے ساتھ ذرّہ بھر دلچسپی نہیں"۔

انختی سمن تاش کو بازو سے پکڑ کر پرے لے گئی اور بولی "تمہیں کچھ بھی معلوم نہیں۔ سلطان محمود کے جاسوس اور مخبر ہر جگہ موجود ہیں میرے ابا اپنے ہاں غزنی کے دو جاسوسوں کو پکڑ کر جلاّد کے حوالے کر چکے ہیں۔ جاسوس تمہارے ہاں بھی موجود ہیں"۔

"آنکھوں سے محروم، موسیقی میں ڈوبا ہُوا انسان جاسوس نہیں ہو سکتا" سمن تاش نے کہا — "تم مجھے بتاؤ کہ سلطان محمود کو کب اور کس طرح قتل کیا جائے گا"۔

"اس کا فیصلہ آج ہو جائے گا" — انختی نے کہا "سمن تاش! تمہارا اتالیق بھی غزنی کا جاسوس معلوم ہوتا ہے، ورنہ ترکستان کے اتنے بڑے دشمن کو وہ اسلام کا علمبردار نہ کہتا۔ اگر تم اپنے ابا کی زندگی چاہتی ہو تو اتالیق کی باتوں کو سچ ماننا چھوڑ دو۔ یہ خرانٹ بوڑھا تمہیں گمراہ کر رہا ہے"۔

سمن تاش کی زبان جیسے گنگ ہو گئی ہو۔ انختی بولتی رہی اور وہ سنتی رہی۔

"انختی!" سمن تاش اکتاتے ہُوتے اور کچھ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی — "ہمیں چلنا چاہئیے ..... تم چلو۔ میں موسیقار کو اس کے ٹھکانے پر چھوڑنے جا رہی ہوں"۔

"کسی ملازم کو اس کے ساتھ بھیج دو" — انختی نے کہا "تم خود کیوں جاؤ گی؟"

سمن تاش نے کوئی جواب نہ دیا اور وہ موسیقار کی طرف چل پڑی۔

نابینا موسیقار کو محل کے قریب ہی مکان دیا گیا تھا۔ سمن تاش اُس کا ہاتھ پکڑے اُسے اُس کے کمرے میں لے گئی۔ راستے میں وہ کچھ بھی نہ بولی۔ موسیقار کے کمرے سے نکلنے لگی تو موسیقار نے اُسے رُک جانے کو کہا۔

"آپ شہزادی ہیں، میں آپ کا خادم ہوں" موسیقار نے بڑے اداس لہجے میں کہا "— ایک بات کہوں تو بُرا نہ ماننا شہزادی! .... مجھے یہاں سے چلے جانا چاہئیے"۔

"کیوں؟"

"خان قادر خان کی شہزادی نے مجھے جاسوس کہا تھا" موسیقار نے کہا ۔۔۔ "کہتی تھی کہ میں آپ دونوں کی باتیں سننے کے لیے خاموش ہوگیا تھا ... بہمن شہزادی! مجھے بادشاہوں اور سلطانوں کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں۔ میرے لیے دنیا کبھی ختم نہ ہونے والی تاریکی اور آوازیں ہیں۔ اسے میں اپنے نغموں سے روشن رکھتا ہوں۔"

"نہیں" سمن تاش نے کہا ۔۔ "اُس نے تمہیں جاسوس نہیں بلکہ یہ کہا تھا کہ دھیمے سُروں میں بجتے بجتے تمہارے ساز کے تار بڑی زور سے جھنجھناتے تھے اور تم خاموش ہوگئے تھے۔ اُسے شک ہوا تھا کہ تم ہماری باتیں سننے کے لیے چپ ہوگئے تھے۔"

"قادر خان کی شہزادی کے مُنہ سے سلطان محمود کے قتل کی بات نکلی تو میرا ہاتھ کانپ گیا اور مضراب بے قابو ہو کر تاروں کو جالگا" نابینا مغنّی نے کہا ۔۔ "اور میری زبان کانپ کر خاموش ہوگئی۔"

"اگر سلطان محمود قتل ہو جائے تو کیا قیامت آجائے گی؟" سمن تاش نے پوچھا۔

"سلطان ہو یا سپاہی کسی کو قتل نہیں ہونا چاہیئے" مغنّی نے کہا ۔۔ "اور میں جانتا ہوں کہ آپ سلطان محمود کو پسند کرتی ہیں۔ اگر وہ قتل ہو جاتے تو مجھ پر وہی قیامت آتے گی جو آپ پر ٹوٹے گی۔ آپ کی طرح میں بھی سلطان محمود کو اسلام کا علمبردار اور پاسبان سمجھتا ہوں۔"

"لیکن یہاں کسی کے ساتھ اُس کے حق میں کوئی بات نہ کرنا" ۔۔ سمن تاش نے کہا۔

"اُسے کون قتل کرے گا؟" ۔۔ موسیقار نے پوچھا ۔۔ "اُسے کب قتل کیا جائے گا؟"

"میں ابھی ان سوالوں کے جواب نہیں دے سکتی" سمن تاش نے کہا ۔۔ "تم اب آرام کرو۔"

"ذرا رُک جاؤ شہزادی!" موسیقار نے کہا ۔۔ "میں آرام نہیں کر سکوں گا۔ میں سو نہیں سکوں گا۔"

"تم کر بھی کیا سکتے ہو" — سمن تاش نے کہا "تم خانہ جنگی نہیں روک سکتے۔ تم غزنی کے سلطان کو قاتلوں سے نہیں بچا سکتے۔"

"اگر آپ مجھے کچھ بتا سکیں تو میں غزنی جا کر سلطان محمود کو قبل از وقت خبردار کر سکتا ہوں۔"

سمن تاش نے ہنس کر کہا "تم بہت جذباتی ہو۔ تم غزنی کیسے جاؤ گے؟"

"گرتا پڑتا چلا جاؤں گا" — مغنی نے کہا "یہاں میرے کچھ شاگرد بھی ہیں۔ جسے کہوں گا وہ چلا جائے گا۔"

"کیا تم اس معاملے میں سنجیدہ ہو؟" — سمن تاش نے کہا "جو کہہ رہے ہو وہ کر کے دکھا سکتے ہو؟"

"آپ راز کی بات بتا دیں۔ باقی کام میں کسی سے کرا لوں گا" — موسیقار نے کہا — "شہزادی سمن! ابھی نے سلطان محمود کے متعلق اپنی رائے آپ کی رائے سن کر دی ہے۔"

"کسی کو پتہ نہ چلے کہ ہمارے درمیان یہ باتیں ہوئی ہیں" — سمن تاش نے کہا۔

"ماں!" — سمن تاش نے اپنی ماں سے جا کر کہا — "کیا ابا حضور اپنے خاندان کی روایت کو مرنے نہیں دیں گے؟"

"کیسی روایت بیٹی؟"

"کیا آپ کو معلوم نہیں کہ کاشغر کا خان کیوں آیا ہے؟" — سمن تاش نے کہا — "خراسان پر حملے کی تیاری ہو رہی ہے۔ قادر خان ہمارے ابا کو چچا ایلک خان کے راستے پر لے جا رہا ہے۔ ہمارے خاندان کے ابھی پہلے زخم نہیں ملے.... کیا آپ انہیں روک سکتی ہیں؟"

اتنے میں کمرے کا دروازہ کھلا اور سمن تاش کا باپ ابو منصور ارسلان خان کمرے میں داخل ہوا۔ وہ بہت اونچی آواز میں سنتا تھا۔ اپنی بیوی اور بیٹی کو دیکھ کر رک گیا اور انہیں بڑی غور سے دیکھنے لگا۔ سمن تاش کی ماں نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔

"تم دونوں کے چہرے بتا رہے ہیں کہ کوئی خاص بات ہوئی ہے"۔ ابو منصور نے کہا۔

سمن تاش کی ماں نے ابو منصور کے کان کے ساتھ منہ لگا کر بلند آواز سے کہا "آپ ہمارے چہرے دیکھ رہے ہیں۔ اگر آپ ہماری آنکھوں میں جھانکیں تو آپ کو اسلام کے سپاہیوں کی خونچکاں لاشیں تڑپتی نظر آئیں گی۔ آپ کو اسلام کا پرچم خاک و خون میں پڑا دکھائی دے گا..... میری آنکھوں میں دیکھیں۔ آپ کو ایک ہی مذہب کے بیٹے، ایک ہی خدا اور ایک رسولؐ کا کلمہ پڑھنے والے ایک دوسرے کا خون بہاتے نظر آئیں گے"۔

"خاموش ہو جاؤ"۔ ابو منصور نے گرج کر کہا "تمہیں میرے فیصلوں میں دخل دینے کی جرأت کیسے ہوئی ہے!"

"جیسے اُس وقت جرأت ہُوا کرتی تھی جب میں جوان تھی"۔ سمن تاش کی ماں نے کہا "میرے جسم میں دلکشی تھی اور چہرے کا حسن تر و تازہ تھا۔ آج میری جگہ پانچ جوان لڑکیوں نے لے لی ہے۔ خدا نے آپ کے کان بند کر رکھے ہیں اور عقل پر پانچ لڑکیاں قابض ہو گئی ہیں۔ آپ سوچ نہیں سکتے، سمجھ نہیں سکتے کہ ان میں دو لڑکیاں جو تحفے کے طور پر آئی ہُوئی ہیں وہ کس نے کس نیّت سے بھیجی ہیں"۔

"لیکن جو اختیار تمہیں حاصل ہے وہ میں نے کسی اور کو نہیں دیا"۔ ابو منصُور نے کہا "تم نہیں جانتیں کہ ہم نے سُلطان محمود پر یہ ظاہر نہ کیا کہ ہم زندہ ہیں اور ہم میں طاقت ہے تو وہ ہمیں خوارزم کی طرح نگل جائے گا۔ جانتی ہو وہ کتنا طاقتور ہو گیا ہے؟"

"آپ کو یہ کس نے بتایا ہے کہ وہ آپ کو نگلنے کے لیے طاقتور ہُوا ہے؟" سمن تاش نے اُس کے دوسرے کان کے ساتھ منہ لگا کر بلند آواز سے کہا "یہ وہم ترکستانیوں کو ہو گا۔ وہ آپ کو استعمال کر رہے ہیں"۔

"قادر خان پر مجھے بھروسہ ہے"۔ ابو منصُور نے کہا "میں اُس کی بات رد نہیں کر سکتا"۔

"کیونکہ وہ اپنی جوان بیٹی کو ساتھ لایا ہے"۔ اس کی بیوی نے کہا "اور یہ لڑکی جس طرح آپ کے ساتھ لگی بیٹھی تھی اور جس ناز و انداز سے آپ کے ساتھ باتیں کر رہی تھی وہ میں دیکھ رہی تھی۔ کیا آپ ایک لڑکی کی خاطر اپنی فوج کو غزنی والوں سے ذبح کرا دیں گے؟"

"خانہ جنگی سے آپ نے پہلے کیا حاصل کیا ہے؟" سمن تاش نے کہا۔ "آپکا بھائی ایلک خان ایک ڈرے ہوئے اور مفرور حکمران کی زندگی بسر کرتا رہا"۔ اُس کی بیوی نے کہا۔ "اُسے شکست دے کر بھی سلطان محمود نے اُس کی ریاست پر قبضہ نہیں کیا تھا"۔

ابو منصور کے ایک کان کے ساتھ اُس کی بیوی نے منہ لگا رکھا تھا اور دوسرے کان کے ساتھ اُس کی بیٹی سمن تاش نے وہ اسے چلا چلا کر سمجھا رہی تھیں کہ وہ دوسروں کے کہنے میں نہ آئے۔ وہ بولنے لگتا تھا تو بیوی یا بیٹی اُسے ٹوک دیتی تھی۔

"خدا کے لیے میری سنو" — اُس نے گرج کر کہا۔ "میں مجبور ہو گیا ہوں۔ ایک طرف سلطان محمود ہے اور دوسری طرف قادر خان اور تو غان خان۔ اگر میں ان کا ساتھ نہیں دیتا تو مجھے ان دونوں سے خطرہ ہے اور اگر میں ان کا ساتھ دیتا ہوں، تو سلطان محمود سے دشمنی مول لیتا ہوں"۔

"تو سلطان محمود سے دوستی کر لیں" — اُس کی بیوی نے کہا۔

"میں خاندانی دشمنی کو دوستی میں نہیں بدل سکتا"۔ ابو منصور نے بھڑک کر کہا — "میں سلطان محمود سے اپنے خاندان کی بے عزتی کا انتقام لوں گا.... اور اب میں کس طرح پیچھے ہٹ سکتا ہوں۔ ہم نے فیصلہ کر لیا ہے۔ منصوبہ طے ہو چکا ہے"۔

"جس میں سلطان محمود کا قتل بھی شامل ہے"۔ سمن تاش نے طنزیہ کہا۔

ماں بیٹی نے ایک دوسری کی طرف دیکھا اور سمن تاش نے دھیمی سی آواز میں ماں سے کہا کہ اپنا رویہ بدل لو اور ان سے معلوم کرو کہ ان کا منصوبہ کیا ہے۔ ابو منصور غصے سے پھنکار رہا تھا۔

"اگر آپ نے منصوبہ بھی تیار کر لیا ہے تو ہم آپ سے یہی کہیں گی کہ آپ پیچھے نہ ہٹیں" — سمن تاش کی ماں نے کہا — "ہم آپ کی حوصلہ افزائی کریں گی .... آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے؟ ہمیں بھی بتا دیں تاکہ ہم بھی منصوبے کی کامیابی کے لیے کچھ کریں"۔

ابو منصور ارسلان کی باچھیں کھل گئیں اور اُس نے خراسان پر اپنی، قادر خان اور تو غان خان کی متحدہ فوج کے حملے اور سلطان محمود کے قتل کا منصوبہ پوری تفصیل سے سنا

دیا۔

اگلی صبح قادر خان رخصت ہو رہا تھا۔ سمن تاش نے نابینا موسیقار کو اپنے کمرے میں بلا رکھا تھا۔

"تم نے کہا تھا کہ میں تمہیں راز کی بات بتادوں تو تم غزنی تک پہنچا سکتے ہو" ۔۔۔ سمن تاش نے کہا ۔۔۔ "مجھے یہ بتاؤ کہ میں تم پر اعتبار کس طرح کر سکتی ہوں اور دوسرے یہ کہ غزنی پیغام لے کر کون جائے گا"

"میرے پاس ایسا کوئی طریقہ نہیں جس سے میں آپ کو یقین دلا سکوں کہ میں قابلِ اعتبار آدمی ہوں" ۔۔۔ نابینا مغنّی نے کہا ۔۔۔ "اگر آپ کا ایمان وہی ہے جو میرا ہے تو آپ کو مجھ پر اعتبار کرنا چاہئے ..... آپ مجھ سے یہ نہ پوچھیں کہ غزنی کون جائے گا۔ ایک گھوڑے کا انتظام کریں اور گھوڑے کی باگ میرے ہاتھ میں دے دیں۔ میں آپ کی نظروں سے اوجھل ہو جاؤں گا۔ میں بہت دن غائب رہوں گا پھر آپ کے پاس آجاؤں گا۔"

سمن تاش نے قرآن پاک اٹھایا اور چوم کر موسیقار کے ہاتھوں پر رکھ دیا۔ موسیقار نے بھی قرآن کو چوما۔

"یہ قرآنِ پاک ہے" ۔۔۔ سمن تاش نے کہا ۔۔۔ "قسم کھاؤ کہ تم مجھے دھوکہ نہیں دو گے"۔

"نہیں شہزادی!" ۔۔۔ موسیقار نے کہا ۔۔۔ "میں قسم نہیں کھاؤں گا۔ قسم کھا لینے سے کسی کی روح کا آئینہ شفاف نہیں ہو جایا کرتا۔ سب سے زیادہ اور بڑی قسمیں بے ایمان اور بددیانت آدمی کھایا کرتے ہیں۔ یہ قرآنِ پاک میرے ساتھ رہے گا۔ مجھے اس کی مدد کی ضرورت ہے۔ واپس آؤں گا تو آپ کو لوٹا دوں گا .... آدمی کب بھیجا جائے؟"

"ابھی" ۔۔۔ سمن تاش نے کہا ۔۔۔ "تمہارا آدمی ابھی روانہ ہو سکتا ہے؟"

"ہو سکتا ہے" ۔۔۔ نابینا مغنّی نے کہا ۔۔۔ "آپ گھوڑا لائیں اور بتائیں کہ پیغام کیا ہے"۔

"تمہارے آدمی کو سلطان محمود کے پاس جانا ہے" ۔۔۔ سمن تاش نے کہا ۔۔۔ "اسے کہنا کہ قادر خان، توغان خان اور ابو منصور مل کر خراسان پر حملہ کرنے والے ہیں اور آپ کے قتل کا منصوبہ بھی تیار ہے۔ سلطان سے کہنا کہ آپ کو یقین نہیں آئے گا کہ ایک بیٹی اپنے

باپ کے خلاف محاذ میں شامل ہو سکتی ہے لیکن مجھے آپ پہلے اسلام کی بیٹی سمجھیں، اس کے بعد مجھے اپنی بیٹی سمجھیں اور اس کے بعد میں اس باپ کی بیٹی ہوں جسے اپنے مذہب کی بجائے اپنا تخت و تاج پیارا ہے۔ سلطان سے کہنا کہ میں جانتی ہوں کہ یہ تینوں مل کر آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ آپ انہیں ایک ہلے میں صاف کر دیں گے لیکن جو کشت و خون ہو گا، اسے تصور میں لائیں۔ غزنی، خراسان، خوارزم، بلخ اور بخارا کی وہ مائیں جن کے جوان بیٹے آپس میں لڑ کر مارے گئے تھے، آج بھی اُسی طرح روتی ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کی لاشیں دیکھ کر روئی تھیں۔ ان کی آہوں اور فریادوں سے زمین و آسمان کانپ رہے ہیں....

"غزنی کے سلطان سے کہنا کہ میرا باپ قادر خان اور توغان خان سے خائف ہے۔ آپ میرے باپ کو صلح اور دوستی کا پیغام بھیج کر اس کے دل سے یہ خوف نکال سکتے ہیں۔ مجھے اپنی بیٹی سمجھتے ہوئے نوجواں کو کٹ مرنے سے بچائیں۔ مجھے اپنے یتیم ہو جانے کا کوئی غم نہیں ہوگا۔ میری ماں کو بیوہ ہو جانے کا رنج نہیں ہوگا۔ غم اور رنج ہوگا تو یہ کہ جنہیں کفر کے خلاف جہاد میں شریک ہونا تھا وہ خانہ جنگی میں کٹ مرے اور کفر کے ہاتھ مضبوط ہوئے.... کیا تم یہ ساری باتیں یاد رکھ سکو گے؟ جس طرح میں بتا رہی ہوں اسی طرح اُس آدمی کو بتا سکو گے جو غزنی جا رہا ہے؟"

"اُسی طرح بتاؤں گا" — نابینا موسیقار نے کہا — "اور وہ سلطان محمود کو اسی طرح سنائے گا۔"

"نہیں" — سمن تاش نے کہا — "تم موسیقی میں ڈوبے ہوئے انسان میرے جذبات کی ترجمانی نہیں کر سکو گے۔ تم اپنی دنیا میں گم رہنے والے انسان اس دنیا کو نہیں جانتے جس میں انسان اپنی بادشاہی کی خاطر بے گناہ انسانوں کا خون بہا دیتا اور رعایا پر مذہب کا جنون طاری کیے رکھتا ہے۔"

"سمن شہزادی!" — نابینا موسیقار نے کہا — "الفاظ کے بھنور سے باہر آؤ۔ مجھے بتاؤ کہ سلطان تک اور کیا پیغام پہنچانا ہے۔ میں سب کچھ سمجھتا ہوں اور میں سب کچھ سمجھا سکتا ہوں۔"

"تو چلے جاؤ" سمن تاش نے کہا "سلطان محمود سے کہنا کہ میرے باپ کو دوستی کا پیغام بھیجو اور اسے یقین دلاؤ کہ غزنی کی فوج اسے قادر خان اور توغان خان سے بچائے رکھے گی۔"

ایک گھوڑا شہر میں سے گزر رہا تھا۔ اس کی باگیں پکڑے ہوئے ایک نابینا دوسرے ہاتھ میں لاٹھی اٹھائے چلا جا رہا تھا۔ اُس کے گھوڑے کے ساتھ ساز بندھا ہوا تھا اور اُس نے اپنے کندھے سے کمان اور ترکش بھی لٹکا رکھا تھا۔ اُسے بہت کم لوگ جانتے تھے اور جو اُسے نابینا مغنّی کے نام سے جانتے تھے وہ اسے دیکھ کر ہنس پڑتے تھے کہ اندھا ترکش اور کمان لیے جا رہا ہے۔

گھوڑا شہر کے دروازے سے نکل گیا۔ وہ نابینا موسیقار تھا۔ وہ گھوڑے کے آگے آگے پیدل چل رہا تھا۔ شہر سے کچھ دور جا کر گھوڑے پر سوار ہو گیا اور اُس نے لاٹھی پھینک دی اور ذرا آگے جا کر اُس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ گھوڑا دوڑ پڑا لیکن اُس نے گھوڑے کو سرپٹ نہ دوڑنے دیا۔ سوار اندھا تھا مگر وہ خود اعتمادی سے سواری کر رہا تھا اور گھوڑا صحیح راستے پر جا رہا تھا۔

پندرہ سولہ میل بعد وہ جنگل شروع ہو گیا جو امراء وزراء کی شکار گاہ تھی۔ وہاں اونچی نیچی ٹیکریاں اور کھڈ نالے بھی تھے۔ اس علاقے کے ہرن مشہور تھے۔ نابینا موسیقار کا گھوڑا چلا جا رہا تھا کہ ایک ہرن سامنے سے دوڑتا گزرا۔ ہرن کی رفتار کم ہوتی جا رہی تھی کیونکہ اُس کے پہلو میں دو تیر اُترے ہُوئے تھے۔ نابینا موسیقار نے اس کے پیچھے گھوڑا ڈال دیا۔ ہرن کے تعاقب میں کچھ گھوڑے دوڑے آ رہے تھے لیکن وہ دور تھے۔ نابینا موسیقار کا گھوڑا ہرن کے قریب پہنچ رہا تھا۔ موسیقار نے کندھے سے کمان اُتاری اور ترکش سے تیر نکال کر ہرن پر تیر چلایا۔ تیر ہرن کی پچھلی ٹانگ میں اتر گیا اور ہرن کی رفتار بالکل ختم ہو گئی۔ وہ رکا اور بیٹھ گیا۔

موسیقار نے اس کے قریب جا گھوڑا روکا اور اُدھر دیکھنے لگا جدھر سے ہرن کے تعاقب میں گھوڑے دوڑے آ رہے تھے۔ وہ بہت سے سوار تھے۔ نابینا موسیقار

ہرن کو دیکھ رہا تھا۔ گھوڑے اُس کے قریب آ رُکے۔ تب اُس نے سواروں کو دیکھا۔

"میں نے آپ کے ہرن کو گرا لیا ہے" — نابینا موسیقار نے سواروں سے کہا اور وہ گھبرا گیا۔ اُس نے سواروں کو پہچان لیا تھا۔

سوار بھی اُسے دیکھ کر حیران ہوئے۔ ان میں ایک قادر خان تھا اور اُس کے ساتھ دوسرے گھوڑے پر اُس کی بیٹی اخشی سوار تھی۔ باقی سب قادر خان کے مشیر اور محافظ تھے۔ قادر خان اُسی روز ابو منصور سے رخصت ہُوا تھا اور راستے میں اس نے شکار کھیلنا شروع کر دیا تھا۔ اس ہرن کو ایک تیر اُس کا اور دوسرا اخشی کا لگا تھا۔ تیسرا تیر نابینا موسیقار نے چلا کر ہرن کو گرا دیا۔

"کیا تم نابینا مغنی نہیں ہو جس نے ہمیں ابو منصور ارسلان کے ہاں نغمے سنائے تھے؟" — قادر خان نے پوچھا۔

اُس کا ساز گھوڑے کے ساتھ بندھا ہُوا تھا۔ اخشی نے اپنا گھوڑا موسیقار کے گھوڑے کے قریب کر کے اُس کی زین کے ساتھ ساز والا بندھا ہُوا تھیلا کھول لیا۔ موسیقار بُت بن گیا۔ تھیلے میں سے ساز نکالا گیا۔ اس میں کوئی شک نہ رہا کہ یہ وہی نابینا موسیقار ہے۔

"مجھے پہلے ہی شک تھا کہ یہ جاسوس ہے" — قادر خان کی بیٹی اخشی نے کہا — "کیا کوئی اندھا تیر سے ہرن کو نشانہ بنا سکتا ہے؟"

قادر خان نے تلوار نکال کر کہا۔ "سچ بتا دو تمہاری اصلیت کیا ہے؟"

قادر خان کے محافظ ابھی اس کا گھیراؤ کرنے کے لیے ہلے ہی تھے کہ موسیقار نے گھوڑے کی لگام کو جھٹکا دیا اور ایڑ لگائی۔ گھوڑا شاہی اصطبل کا تھا۔ اشارہ ملتے ہی سرپٹ دوڑ پڑا۔ قادر خان نے حکم دیا۔ "پکڑ لاؤ اسے" — محافظوں نے اُس کے پیچھے گھوڑے ڈال دیئے۔ مگر موسیقار بہت فاصلہ لے گیا تھا اور وہ ایک ٹیکری کی اوٹ میں چلا گیا تھا۔ محافظ اُس پر تیر نہیں چلا سکتے تھے۔ وہ اُس کے تعاقب میں رہے۔

موسیقار بڑا اچھا سوار تھا۔ اُس نے گھوڑے کو سُست نہ ہونے دیا۔ گھوڑا کھڈ پھلانگتا جا رہا تھا۔ بہت دُور جا کر موسیقار نے پیچھے دیکھا۔ اس کے تعاقب میں آنے

والے بہت دُور تھے۔ انہوں نے مایوس ہو کر تعاقب ترک کر دیا اور واپس چلے گئے۔

ابو منصور کو اطلاع ملی کہ قادر خان جو رخصت ہو گیا تھا، واپس آگیا ہے۔ ابو منصور دوڑا باہر آیا۔ قادر خان نے اُسے بتایا کہ اس کے دربار کا نابینا مغنّی نابینا نہیں اور وہ بھاگ گیا ہے۔

"وہ سلطان محمود کا جاسوس ہے"۔ قادر خان نے کہا۔ "ہماری رات کی باتیں سن گیا ہوگا"۔

"رات کو وہ اس کمرے کے قریب بھی نہیں تھا جس میں ہم باتیں کر رہے تھے" ــــ ابو منصور نے کہا۔ "ہم معلوم کریں گے وہ رات کہاں تھا"۔

"مجھے آپ کی بیٹی پر شک ہے"۔ــ قادر خان کی بیٹی اختشی نے کہا۔ "وہ سلطان محمود کی شیدائی ہے اور یہ موسیقار اُس کا منظورِ نظر تھا۔ مجھے آپ کی بیٹی کے بوڑھے اتالیق پر بھی شک ہے کہ وہ غدّار ہے"۔

ابو منصور سوچ میں پڑ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ سمن تاش سلطان محمود کے خلاف لڑائی کے سخت خلاف ہے۔ اس کے اتالیق کے متعلق اُسے معلوم نہیں تھا۔ قادر خان اور اختشی ابو منصور کے پیچھے پڑ گئے کہ وہ اتالیق اور اپنی بیٹی کے خلاف کچھ کرے مگر ابو منصور اپنی بیٹی کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ پھر بھی دونوں کو بلا لیا گیا۔ جب سمن تاش سے یہ کہا گیا کہ نابینا موسیقار نابینا نہیں تھا تو وہ بہت حیران ہوئی۔ وہ مان نہیں رہی تھی۔

"سنو بوڑھے!"۔ قادر خان نے اتالیق سے کہا ــــ "تم جس کا نمک کھاتے ہو اُسی کے خلاف غداری کرتے ہو۔ اگر بتا دو کہ وہ موسیقار یہاں سے کیا خبر لے گیا ہے تو ہم تمہیں بخش دیں گے ورنہ بہت بڑی موت مرو گے"۔

"خبردار!" ــــ سمن تاش اپنے اتالیق کے سامنے کھڑی ہو گئی اور قادر خان سے کہا ــــ "اگر میرے اتالیق کی کسی نے توہین کی تو کوئی نہیں بتا سکتا کہ یہاں کیا ہوگا۔ ہم کاشغر کے غلام نہیں"۔

"ایک طرف ہو جاؤ سمن!" ــــ اتالیق نے قادر خان سے کہا ــــ "ایک ذرا سے

خطےؓ کی بادشاہی تمہیں خدا نہیں بنا سکتی۔ میں سلطان محمود کا حامی نہیں حق کا حامی ہوں۔ میں موسیقار کو اندھا سمجھتا رہا۔ میں تم سب کو اندھا سمجھتا ہوں۔ اگر وہ اندھا غزنی کا جاسوس تھا تو وہ آنکھوں کا اندھا تھا۔ روح کا اندھا نہیں تھا۔ اُس کے اندر ایمان کی روشنی تھی۔ مجھے کچھ خبر نہیں کہ وہ کیا خبر لے گیا ہے لیکن میں یہ کہنے سے بالکل نہیں ڈروں گا کہ وہ اگر جاسوس تھا تو پکاؓ مسلمان تھا۔"

قادر خان نے ابومنصور کے کان کے ساتھ منہ لگا کر بلند آواز سے کہا۔۔۔"اس بُوڑھے کو قید خانے میں ڈال دیں۔ یہ ہماری جڑیں کاٹ رہا ہے۔"

ابومنصور نے اتالیق کی طرف دیکھا۔ اُسے شاید یاد آ گیا ہو گا کہ یہ بزرگ صورت انسان جو عمر کی آخری منزل کے قریب پہنچ چکا تھا، اُس کے باپ کا بھی اتالیق تھا، اُس کا اتالیق بھی یہی تھا اور اب اس کی بیٹی بھی اس سے تعلیم و تربیت حاصل کر رہی تھی۔

"آپ اس کا حکم مانیں گے یا اپنے خدا کا؟"۔۔۔ بزرگ اتالیق نے کہا۔۔۔"اگر آپ کو دنیا عزیز ہے تو میں آپ کو بتا دیتا ہوں کہ شکست آپ کے مقدر میں لکھ دی گئی ہے۔"

"اگر آپ رعایا کی بغاوت برداشت کر سکتے ہیں تو اتالیق کو قید میں ڈال دیں"۔۔۔ سمن تاش نے اپنے باپ کے کان کے ساتھ منہ لگا کر کہا اور وہ باہر نکل گئی۔

"قادر خان!"۔۔۔ ابومنصور نے کہا۔"میں نے آپ کے ساتھ دوستی کا اور فوجیں اکٹھی استعمال کرنے کا معاہدہ کیا ہے آپ کی اطاعت قبول نہیں کی۔ مجھے اتنا کمزور نہ سمجھیں کہ میں آپ کے حکم کا پابند ہو جاؤں۔"

"معلوم ہوتا ہے آپ سلطان محمود سے ڈرتے ہیں"۔۔۔ قادر خان نے کہا۔"کیا آپ کو یقین نہیں آیا کہ میں اور توغان خان آپ کے ساتھ ہیں؟"

"سلطان محمود کا نہیں"۔۔۔ ابومنصور نے کہا۔"میرے دل میں خدا کا کچھ خوف ابھی باقی ہے۔ مجھ پر بادشاہی کا نشہ ابھی اتنا سوار نہیں ہوا کہ میں نے جس کے ہاتھوں میں تعلیم و تربیت پائی ہے اُسے قید میں ڈال دوں .... آپ چلے جائیں اور اس یقین کے ساتھ جائیں کہ میں سلطان محمود کے ساتھ جنگ میں آپ کے ساتھ ہوں۔"

اُس نے اتالیق کو چلے جانے کا اشارہ کیا۔ اتالیق باوقار چال چلتا باہر نکل گیا۔

"سلطان محمود کو اُس کے جاسوس کیا خبر دیں گے؟" ___ ابومنصور نے کہا ___ "یہی کہ ہم خراسان پر حملہ کریں گے۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ وہ جانتا ہے ہم اُس کے دشمن ہیں۔ اُس نے خراسان کے دفاع کا انتظام کر رکھا ہے۔ آپ گھبرائیں نہیں۔ تیاری میں زیادہ وقت نہ لگائیں۔"

قادر خان رخصت ہو گیا۔ اتالیق سمن تاش کے پاس چلا گیا اور اُس سے پوچھا کہ یہ کہاں تک درست ہے کہ موسیقار نابینا نہیں تھا۔ سمن تاش نے اُسے بتایا کہ وہ اُسے نابینا ہی سمجھتی رہی ہے اور سلطان محمود کو اُسی نے پیغام بھجوایا ہے لیکن موسیقار نے کہا تھا کہ وہ کسی اور کو بھیجے گا۔

"آنے والی تباہی کو خدا ہی روک سکتا ہے" ___ اتالیق نے کہا۔

"میں نے یہی پیغام بھجوایا ہے کہ تباہی کو روکو" ___ سمن تاش نے کہا ___ "اگر ضرورت پڑی تو میں خود غزنی چلی جاؤں گی، خواہ مجھے کیسی ہی سزا بھگتنی پڑے۔"

بزرگ اتالیق نے سمن تاش کو جو تعلیم دی تھی وہ رنگ دکھا رہی تھی۔ سمن تاش نڈر اور بے خوف ہوتی جا رہی تھی۔

وہ جوان آدمی جو ابو منصور کے محل میں جھکا جھکا، مرا مرا، اُداس اُداس سا نابینا موسیقار بنا ہوا تھا وہ خراسان کے پہاڑوں، چٹانوں اور جنگلوں کو چیرتا جا رہا تھا۔ اس کی گردن تنی ہوئی اور سینہ پھیلا ہوا تھا۔ گھوڑے کو آرام دینے کے لیے وہ اس کی رفتار کم کر دیتا اور بڑی پُرسوز آواز میں گانے لگتا۔ گھوڑا یوں چلا جا رہا تھا جیسے اُس کی آواز سے مسحور ہو کر چلا جا رہا ہو۔ اُسے اب پکڑے جانے کا خطرہ نہیں تھا۔ وہ غزنی کی سلطنت میں داخل ہو چکا تھا۔ غزنی ابھی دور تھا۔

اُس نے چوکیوں پر دو گھوڑے بدلے اور خود آرام نہ کیا۔ اسے وقت کا بھی احساس نہ تھا۔ دن تھا یا رات، وہ چلتا گیا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ کون سے دن کا سورج غروب ہو رہا تھا جب اُسے غزنی کی مسجدوں کے مینار دکھائی دینے لگے۔

اور وہ جب اپنے سالار کے پاس پہنچا اُس وقت رات تاریک ہو چکی تھی۔ اُس

نے سالار کو بتایا کہ وہ کیا خبر لایا ہے۔ سلطان محمود نے حکم دے رکھا تھا کہ باہر سے کوئی جاسوس خواہ آدھی رات کو واپس آئے، اُسے اُسی وقت جگا لیا جائے۔ موسیقار کو جس کا نام ابی ظفر تھا، دیکھتے ہی اور اس کی مختصر سی بات سن کر سالار اُسے سلطان محمود کے پاس لے گیا۔ ابی ظفر نے پہلے تو یہ بتایا کہ وہ نابینا موسیقار بن کر ابومنصور ارسلان خان کے محل میں درباری حیثیت میں رہا ہے۔ اس طرح اُسے ابومنصور کے دربار کے علاوہ اُس کے گھر تک بھی رسائی حاصل رہی ہے۔

اُس نے سلطان محمود کو پوری رپورٹ دی کہ کاشغر کا قادر خان اور بلخ کا توغان خان ابومنصور کی فوج کو ساتھ ملا کر خراسان پر حملے کی تیاری کر رہے ہیں اور سلطان کے قتل کا منصوبہ بھی بن چکا ہے۔

"ابومنصور ارسلان خان غزنی کے ساتھ خاندانی دشمنی ختم کرنا چاہتا ہے"۔۔۔ ابی ظفر نے سلطان کو بتایا۔۔۔ "لیکن قادر خان اور توغان خان نے اُسے اتنا خائف کر دیا ہے کہ وہ اُن کا ساتھ دینے پر مجبور ہے۔ اگر آپ اُسے فوجی تحفظ مہیّا کر دیں تو وہ شاید اُن دونوں کے محاذ سے الگ ہو جائے گا۔"

"اُس کے سالاروں کے متعلّق کچھ بتا سکتے ہو؟"۔۔۔ سلطان محمود نے پوچھا۔

"سالار ترکستانی عورتوں کے طلسم میں گرفتار ہیں"۔۔۔ ابی ظفر نے بتایا۔۔۔ "قادر خان نے انہیں بڑی ہی حسین اور جوان عورتوں کے جال میں پھانس رکھا ہے۔ وہ ابومنصور کو کو یہی ایک مشورہ دیئے چلے جا رہے ہیں کہ سلطان محمود پر فوراً وار نہ کیا گیا تو وہ چھوٹی چھوٹی امارتوں اور ریاستوں کو نگل جائے گا۔ وہ کہتے ہیں کہ سلطان محمود ہندوستان سے تو فاتح بن کر آیا ہے لیکن ان فتوحات نے اُسے فوجی لحاظ سے بہت کمزور کر دیا ہے، اس لیے چپکے سے بہت جلدی خراسان پر حملہ کر کے ایک مضبوط مستقر بنا لیا جائے اور وہاں سے چھوٹے پیمانے کے حملے جاری رکھے جائیں۔"

"ابومنصور کی فوجی طاقت میں کچھ اضافہ ہُوا ہے یا ایلک خان کے وقت جتنی تعداد ہے؟"

"سلطانِ غزنی!"۔۔۔ ابی ظفر نے جواب دیا۔۔۔ "ابومنصور نے اس نفری کی کمی پوری

کرلی ہے جو ایلک خان نے ہماری فوج کے ہاتھوں مروائی تھی .... میں ابو منصور کی بیٹی سمن تاش کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ، اُس کا بزرگ اتالیق اور اُس کی ماں آپ کی پرستار ہیں۔ ماں بیٹی ابو منصور کو مجبور کر رہی ہیں کہ وہ آپ کے خلاف میدان میں نہ آئے .... سمن تاش بڑی خوبصورت لڑکی ہے۔ میں نے اس کی زبان سے یہ الفاظ سنے ہیں کہ میں سلطان محمود کی لونڈی بن کر اس کے پاس رہنے کو تیار ہوں "۔

"کیا اس لڑکی کی شادی ہو چکی ہے؟" ــــ سلطان محمود نے پوچھا۔

"نہیں" ــــ ابی ظفر نے جواب دیا اور سمن تاش نے اُسے جو پیغام دیا تھا وہ اُس نے سلطان محمود کو سنا دیا۔ سلطان محمود گہری سوچ میں کھو گیا۔

سلطان محمود نے ابی ظفر کو انعام واکرام دے کر فارغ کر دیا اور اُسی وقت اپنے ایک جوان بیٹے مسعود کو بلایا اور اُسے کہا کہ اُسے ابو منصور ارسلان خان کے پاس جانا ہوگا اور اُسے قائل کرنا ہوگا کہ وہ غزنی کے خلاف ہتھیار نہ اٹھائے ورنہ وہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔ اُسے یقین دلانا ہے کہ اگر وہ دوستی کا معاہدہ کرتا ہے تو اُسے سلطنتِ غزنی کی طرف سے فوجی تحفظ ملے گا۔ سلطان محمود نے مسعود بن محمود کو بہت سی ہدایات دیں اور اسے بتایا کہ اس کے ساتھ کون کون جا رہا ہے۔

مسعود دوسرے ہی دن روانہ ہو گیا۔ اُس کے ساتھ دو مشیر تھے۔ دونوں فوجی تھے اور بیس گھوڑ سواروں کا محافظ دستہ بھی اُس کے ساتھ تھا۔ بارہ تیرہ دنوں کی مسافت تھی۔ مسعود کے ساتھ تحفوں اور سامان کے لیے اونٹوں کا پورا قافلہ تھا۔ ابو منصور کی امارت میں پہنچ کر مسعود شہر سے کچھ دور خیمہ زن ہوا اور اُس نے ابو منصور کے ہاں اپنا ایک ایلچی اس پیغام کے ساتھ بھیجا کہ سلطان محمود کا بیٹا مسعود آپ سے ملنے اور کچھ ضروری امور طے کرنے آیا ہے۔

ابو منصور دوسرے دن شاہانہ شان و شوکت سے مسعود کے پاس آیا۔ تحائف کا تبادلہ ہوا اور مسعود نے اُسے سلطان محمود کا پیغام دیا۔

"میں آپ کے باپ کی تعریف کرتا ہوں کہ اُس کے مخبر بہت ہوشیار ہیں" ــــ ابو منصور

نے کہا۔ "اُس کے اندھے بھی دیکھ سکتے ہیں۔"

"اگر کوئی بہرہ ہمارے ساتھ دوستی کرلے تو وہ سننے کے قابل ہو جاتا ہے"۔۔۔۔ مسعود نے طنزیہ کہا۔ ابو منصور بہرہ تھا اور بہت اونچی آواز میں اُس کے کان میں بولتے تھے تو وہ سنتا تھا۔

"شہزادے!"۔۔۔ ابو منصور نے بُرا مانتے ہوئے کہا۔ "تمہیں باپ نے تیغ زنی سکھا دی ہے، زبان کا استعمال نہیں سکھایا۔ میں اُس اندھے کی بات کر رہا ہوں جو اندھا نہیں تھا لیکن میرے دربار میں بڑی کامیابی سے نابینا موسیقار بنا رہا۔ اسی نے تمہارے باپ کو یہ خبر دی ہے کہ ہم سلطنتِ غزنی کے خلاف لڑنے کی تیاری کر رہے ہیں، اس لیے تم دوستی کا پیغام لے کر آئے ہو"۔

"محترم!"۔۔۔ مسعود نے کہا۔ "میں پیغام لے کر آیا ہوں درخواست نہیں .... اور میں سمجھ نہیں سکا کہ آپ کون سے نابینا موسیقار کی بات کر رہے ہیں جو ہمارا مخبر تھا۔ میں آپ کے ساتھ سیدھی سی بات کرنے آیا ہوں کہ آپ اگر اپنی امارت کو زندہ و سلامت رکھنا چاہتے ہیں تو قادر خان اور توغان خان کی دوستی ترک کر دیں۔ آپ تینوں کی فوج چھ سو ہاتھیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اپنے بڑے بھائی ایلک خان کا انجام آپ کو یاد ہوگا"۔

"کیا آپ انہیں دھمکیاں دینے آئے ہیں؟"۔۔۔ ابو منصور کے ساتھ آئے ہوئے ایک سالار نے کہا۔ "کیا آپ ہمیں اس قدر کمزور سمجھتے ہیں کہ ہم مرعوب ہو کر آپ کی اطاعت قبول کر لیں گے؟"

ابو منصور چونکہ بہرہ تھا، اس لیے وہ اپنے سالار کی بات نہ سن سکا۔ مسعود نے سالار سے بات کی تو ابو منصور وہ بھی نہ سُن سکا۔ وہ دونوں کو باری باری دیکھتا اور سٹپٹاتا تھا کہ یہ آپس میں کیا باتیں کر رہے ہیں۔

"کچھ مجھے بھی بتاؤ"۔۔۔ ابو منصور نے اپنے سالار سے کہا۔ "تم لوگ کیا بات کر رہے ہو؟"

"یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ کاشغر اور بلخ والوں کی دوستی سے باز نہ آئے تو ہم آپ

پر حملہ کر کے آپ کو تباہ و برباد کر دیں گے۔"

ابو منصور نے مسعود کو غصیلی نگاہوں سے دیکھا اور کہا۔ "دیکھو شہزادے! اگر تم ہمیں دھمکی دے کر ہمارے ساتھ دوستی کرنے آئے ہو تو واپس چلے جاؤ اور اپنی فوج کے ساتھ آنا۔"

مسعود نے ابو منصور کے کان میں بلند آواز سے کہا۔ "اگر حکمران بہرہ اور سالار جھوٹا ہو تو ملک اور رعایا کا خدا ہی حافظ ہے۔ محترم! آپ کا سالار جھوٹ بول رہا ہے۔ میں نے کچھ اور کہا تھا۔ اگر سالار حکومت کے کاروبار میں اسی طرح دخل اندازی کرنے لگیں تو حکومت زیادہ دیر نہیں چل سکتی۔"

کچھ دیر بحث مباحثہ ہوتا رہا۔ مسعود نے ابو منصور کو اس حد تک قائل کر لیا کہ اس نے کہا۔ "آپ چند دن یہاں رہیں۔ ہم سوچ کر جواب دیں گے۔ اتنے دن آپ شکار کھیل سکتے ہیں۔ آپ کے آرام کا، کھانے اور دل بہلانے کا پورا انتظام کیا جائے گا۔"

محل کے باورچی اور ملازم آ گئے اور انہوں نے مسعود اور اس کے تمام آدمیوں کے کھانے وغیرہ کا انتظام سنبھال لیا۔ ایک روز مسعود خیمہ گاہ سے ذرا ہٹ کر اکیلا ہی ٹہل رہا تھا کہ محل کا ایک ملازم جو خیمہ گاہ کے انتظام کے لیے آیا تھا مسعود کے قریب آیا اور رازداری سے کہا۔ "کل شکار کے لیے جائیں۔ ابو منصور ارسلان خان کی بیٹی سمن تاش آپ کو جنگل میں ملے گی۔"

"مجھے جنگل میں قتل کیا جائے گا یا خیمے میں؟" مسعود نے پوچھا۔

"آپ کے محافظ آپ کے ساتھ ہوں گے۔" ملازم نے کہا۔ "آپ کو قتل نہیں کیا جائے گا۔"

ابی ظفر نے سلطان محمود کو بتایا تھا کہ سمن تاش اپنے باپ کے خلاف ہے۔ سلطان محمود نے مسعود کے ساتھ سمن تاش کا ذکر ویسے ہی کیا تھا۔ ایک شہزادی کا اپنے باپ کے خلاف ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ امارت کی فوج پر ایک شہزادی کا حکم

نہیں چل سکتا تھا۔ مسعود نے سمن تاش کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ اب ایک ملازم نے اُسے کہا کہ شہزادی سمن تاش اُسے جنگل میں ملے گی تو اُس نے اسے دھوکہ نہ سمجھا۔

دوسرے دن وہ شکار کو چلا گیا۔ وہ اپنے مشیروں کو ساتھ نہ لے گیا۔ پانچ چھ محافظوں کو اُس نے اس طرح ساتھ لیا کہ انہیں اپنے ارد گرد پھیلا دیا تاکہ کسی طرف سے بھی کوئی اس پر قاتلانہ حملہ نہ کر سکے۔ وہ گھوڑے پر سوار کمان میں تیر ڈالے ادھر اُدھر دیکھتا جنگل میں بڑھتا گیا۔ جنگل گھنا ہوتا گیا اور ہری بھری سرسبز چٹانیں بھی آگئیں۔ اُسے اپنے محافظوں کے گھوڑوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

ایک جگہ تو بہت ہی خوشنما تھی۔ چوڑے پتّوں والی بیلیں گھتم گتھا ہو کر درختوں کے ساتھ لپٹی ہوئی تھیں۔ مسعود کو وہاں ایک جوان لڑکی کھڑی نظر آئی۔ اُس کے قریب ایک گھوڑا کھڑا تھا اور لڑکی کے کندھے کے ساتھ کمان لٹک رہی تھی۔ ترکش گھوڑے کی زین کے ساتھ بندھی تھی۔ لڑکی کا چہرہ جس قدر دلنشیں تھا اتنا ہی سنجیدہ تھا۔ وہ چپ چاپ کھڑی تھی۔ اُس کا یہ انداز پُر اسرار سا لگتا تھا۔ مسعود نے پندرہ بیس قدم دُور گھوڑا روک لیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

"اگر آپ مسعود بن محمود ہیں تو گھوڑے سے اُتر کر آگے آجائیں"۔۔۔ لڑکی نے کہا۔۔۔ "آپ کے لیے یہاں کوئی خطرہ نہیں۔ میں سمن تاش ہوں"۔

مسعود گھوڑے سے اُتر کر اُس کے قریب چلا گیا۔ سمن تاش نے اُسے گھاس پر بٹھا لیا۔

"مجھے ایک جوان لڑکی کے بلانے پر یہاں نہیں آنا چاہیئے تھا"۔۔۔ مسعود نے کہا۔۔۔ "لیکن مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ سلطانِ غزنی کی حامی ہیں"۔

"آپ کو غلط بتایا گیا ہے"۔۔۔ سمن تاش نے کہا۔۔۔ "میں سلطانِ غزنی کی نہیں سلطانِ دوجہاں کی پرستار ہوں۔ میں اُس رسول ﷺ کی غلام ہوں جو سلطانِ غزنی کا بھی رسول ﷺ ہے۔ میں اس اصول کی حامی ہوں کہ ایک رسول ﷺ کا کلمہ پڑھنے والوں کو ایک دوسرے کا خون نہیں بہانا چاہیئے"۔

"اور اگر ایک بھائی تخت وتاج کی طمع سے اپنے بھائی کا خون بہانے کے لیے تیار ہو جائے تو اُس کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے ؟"

"اُسے جینے کا کوئی حق نہیں" ــــ سمن تاش نے کہا ــــ "اُس کے خلاف جہاد فرض ہو جاتا ہے"

"ان میں ایک تو تمہارا باپ ہے" ــــ مسعود نے کہا ــــ "میرا یہاں آنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ان کے خلاف جہاد فرض ہو جانے تک نوبت نہ آئے .... کیا تم اپنے باپ کو اس اصول کا پابند نہیں کر سکتیں جس کی تم قائل ہو ؟"

"نہیں" ــــ سمن تاش نے کہا ــــ "میں نے آپ کو یہی بتانے کے لیے بلایا ہے کہ میرا باپ انہی ایمان فروشوں میں سے ہے جن کے خلاف جہاد فرض ہے ۔ آپ شاید حیران ہوں گے کہ کوئی بیٹی اپنے باپ کے خلاف ہو سکتی ہے لیکن میں جس جذبے کے تحت اپنے باپ کے خلاف ہوں اسے سمجھنے کی کوشش کریں ۔ میں آپ سے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ پیشتر اس کے کہ قادر خان اور تغان خان کی فوجیں یہاں آجائیں اور ہماری فوج کے ساتھ مل کر ایک طاقتور فوج بن جائیں ، آپ ہمارے شہر کو محاصرے میں لے کر اس پر قبضہ کر لیں ۔ اس سے یہ ہوگا کہ خون خرابہ کم ہوگا ۔ ہماری فوج آپ کی فوج کے مقابلے میں بہت کمزور ہے ۔ اگر آپ کا مقابلہ تین فوجوں سے ہُوا تو دونوں طرف ایک ہی قوم کا اتنا ہی خون بہہ جائے گا جتنا پہلی خانہ جنگیوں میں بہہ چکا ہے "

"سلطان جو ہندوستان پر بڑھ چڑھ کر حملے کر رہے ہیں ، ایسا کبھی نہیں کریں گے کہ کسی مسلمان امارت یا ریاست پر چڑھ دوڑیں" ــــ مسعود نے کہا ــــ "ہمارا مقصد قبضہ کرنا نہیں ، عالمِ اسلام کو کفر کے خلاف ایک عسکری قوت بنانا ہے ۔ اگر ہمیں آپ کی امارت پر قبضہ کرنا ہوتا تو سلطان مجھے دوستی کا پیغام دے کر نہ بھیجتے "

"میرے ابّا دوستی نہیں کریں گے" ــــ سمن تاش نے کہا ــــ "اُنہوں نے آپ کو دوستی کرنے کے لیے کہا ہے لیکن وہ ان سالاروں اور مشیروں کے قبضے میں ہیں جو قادر خان کے ہی دلکش جال میں آئے ہوئے ہیں ۔ وہ کانوں سے بہرے ہیں ۔

وہ وہی بات سُن سکتے ہیں جو اُن کے کان میں کہی جائے۔"
سمن تاش چپ ہو گئی۔ اُس نے آنکھیں سکیڑ کر ایک طرف دیکھا جیسے کسی شکاری کو گھنی جھاڑیوں میں کسی شکار کی حرکت نظر آ رہی ہو۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے مسعود کو بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور درخت کے پیچھے کر دیا۔ وہاں بیلیں دیواروں کی طرح درختوں پر چڑھی ہوئی تھیں۔ سمن تاش نے مسعود سے کہا ——
"یہاں سے ہلنا نہیں۔ اِدھر اُدھر دیکھتے رہنا۔" اور وہ خود بیلوں میں غائب ہو گئی۔
مسعود حیران و پریشان وہاں کھڑا رہا۔ وہ کسی پھندے میں آ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اپنے قریب ہی اُسے کمان میں سے تیر نکلنے کی آواز سنائی دی۔ وہ چونکا۔ فوراً بعد اُسے کسی کی کربناک آہ سنائی دی۔ مسعود نے منہ سے سیٹی بجائی۔ اُس کے تین چار محافظ جو سیلی طسن سکے تلواریں سونتے اُس کے پاس آ گئے۔ اُس نے سامنے والی سرسبز چٹان پر ایک آدمی کو کھڑے دیکھا جس کے کندھے میں تیر اُترا ہوا تھا۔ سمن تاش نے سامنے آ کر مسعود سے کہا — "میرے ساتھ آؤ۔"
مسعود اپنے محافظوں کے ساتھ اُس چٹان پر گیا جہاں اُس نے وہ آدمی دیکھا تھا جس کے کندھے میں تیر اُترا ہوا تھا۔ وہ آدمی بیٹھ گیا تھا اور کراہ رہا تھا۔ سمن تاش نے خنجر نکال کر اس کی نوک اُس زخمی کی شہ رگ پر رکھ دی۔
"سچ بتا دو تو تمہیں گھوڑے پر اُٹھا لے جاؤں گی اور یہ تیر نکلوا کر زخم کا علاج کرا دوں گی" — سمن تاش نے اُسے کہا — "جھوٹ بولو گے تو درخت کے ساتھ باندھ جاؤں گی۔ سوچو کہ تم کیسی موت مرو گے۔"
زخمی نے رحم طلب نگاہوں سے پہلے سمن تاش کو پھر مسعود کو دیکھا اور بولا — "سلطان محمود کے بیٹے کو قتل کرنے آیا تھا۔"
"تمہیں کس نے بتایا تھا کہ سلطان محمود کا بیٹا یہی ہے؟" — سمن تاش نے پوچھا۔
"مجھے دکھایا گیا تھا" — زخمی نے کہا — "میرے ساتھ ایک اور آدمی تھا۔ وہ بھاگ گیا ہے۔"

"یہ کس کا انتظام ہے؟"

"خانِ کاشغر قادر خان کا"۔ زخمی نے کہا۔ "اور اُس نے آپ کے والد امیرِ محترم ابومنصور ارسلان خان سے بات کر لی تھی"۔

"انہوں نے کیا کہا تھا؟"۔ سمن تاش نے پوچھا۔

"آپ کے والدِ محترم نے کہا تھا کہ میں نے سلطان محمود کے بیٹے کو اپنے جواب کے انتظار کے لیے روک لیا ہے۔ تم لوگ اپنا کام کر سکتے ہو۔ وہ شکار کے لیے ضرور جائے گا۔ اسے ایک دو ایسے ملازم دو جو تمہیں قبل از وقت بتا سکیں کہ وہ شکار پر جا رہا ہے"۔

"اسے گھوڑے پر ڈالو اور لے چلو" سمن تاش نے مسعود کے ایک محافظ سے کہا اور مسعود سے کہا۔ "میں نے آپ کو یہی بات بتانے کے لیے یہاں بلایا تھا کہ آپ یہاں انتظار نہ کریں اور اپنی حفاظت کا انتظام بڑا سخت رکھیں۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ میں نے چٹان پر پودوں کی اوٹ میں اس آدمی کو ہلتا جلتا دیکھ لیا تھا۔ مجھے اس کی کمان بھی تھوڑی سی نظر آ گئی تھی۔ اس جگہ شاہی خاندان کے سوا کوئی بھی شکار کے لیے نہیں آ سکتا۔ میں نے بیلوں کے پیچھے چھپ کر اس پر تیر چلایا تھا"۔

"مجھے کیا کرنا چاہیئے؟"۔ مسعود نے پوچھا۔

"آپ واپس چلے جائیں"۔ سمن تاش نے کہا۔ "مجھے نظر آ رہا ہے کہ ہماری ملاقات میدانِ جنگ میں ہو گی؟"

"کیا تم مجھے میدان جنگ میں ملو گی؟"

"شاید"۔ سمن تاش نے کہا اور اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"یہ آنسو کیوں؟"

"میں پاگل ہوں"۔ سمن تاش نے جذباتی سے لہجے میں کہا۔ ذرا سی خاموشی کے بعد اُس نے مسعود کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اور جھنجھلا کر کہا۔۔۔ "کیا میں پاگل نہیں ہوں مسعود؟ کیا میرا اتالیق پاگل ہے؟ فریب کاروں کی بستی میں حق کی بات کہنے والوں کو پاگل کہا کرتے ہیں۔ میری شادی ایک ایسے شہزادے کے

سانڈھ ہو کی جو شراب پیتا ہے اور جسے احساس ہی نہیں کہ قوم اور مذہب کی کیا ذمہ داریاں ہیں جو اُس پر عائد ہوتی ہیں"۔ اُس کے ایک ہاتھ میں کمان تھی اور دوسرے ہاتھ میں خنجر۔ اُس نے دونوں ہتھیار آگے کر کے پُرجوش آواز میں کہا ۔۔۔ "میری شادی ان سے ہو چکی ہے۔ یہ میرے سہاگ کی دو نشانیاں ہیں۔ کمان اور خنجر۔ عورت مرد کی تفریح اور نمائش کی چیز نہیں۔ کمان اور خنجر عورت کا زیور ہے"۔

"تم ایسی باتیں کیوں کر رہی ہو؟" ۔۔۔ مسعود نے کہا ۔ "جس کے ہاتھ میں کمان اور کندھے کے ساتھ ترکش لٹک رہی ہو، اُس کی آنکھوں میں آنسو نہیں آیا کرتے .... سمن! کیا ہمیں یہیں کھڑے رہنا چاہیئے؟"

"نہیں" ۔۔۔ سمن تاش نے کہا ۔۔۔ "آپ چلے جائیں .... آپ غزنی چلے جائیں۔ آپ کو اُس جاسوس نے جو یہاں نابینا موسیقار بن کے آیا تھا، بہت کچھ بتا دیا ہو گا۔ اُس نے آپ کے والدِ محترم تک میرا پیغام پہنچا دیا ہو گا"۔

"یہ تم اُسی سے پوچھ لو" ۔۔۔ مسعود نے اپنے ایک محافظ سے کہا ۔۔۔ "ابی ظفر کو بلاؤ"۔

ایک گھوڑ سوار گھوڑا دوڑاتا چٹان پر آ گیا۔ وہ بھرے بھرے چہرے والا تنو مند جوان تھا۔ وہ گھوڑے سے اُتر کر مسعود تک گیا تو اُس کی چال سے جیسے چٹان ہل رہی تھی۔

"تم نہیں پہچانتے ہو ظفر؟" ۔۔۔ مسعود نے سمن تاش کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

ابی ظفر سمن تاش کو دیکھ کر مسکرایا۔ سمن تاش بھی مسکرا دی۔

"میں نے تمہیں مشکل سے پہچانا ہے" ۔۔۔ سمن تاش نے اُسے کہا ۔۔۔ "اپنے سلطان تک میرا پیغام پہنچا دیا تھا؟"

"لفظ بہ لفظ" ۔۔۔ ابی ظفر نے جواب دیا۔

"یہ ہمارا بڑا ہی کامیاب جاسوس ہے" ۔۔۔ مسعود نے کہا ۔ "یہ محافظ دستے کا آدمی نہیں۔ اسے میں اپنی راہنمائی کے لیے ساتھ لایا ہوں .... اور سمن! اُس زخمی کو کہاں لے گئے ہیں؟"

"میں فیصلہ نہیں کر سکی کہ اُسے اپنے باپ کے پاس لے جاؤں یا جراح کے

پاس"۔۔۔ سمن تاش نے جواب دیا۔۔"میں جا رہی ہوں۔ معلوم نہیں کہاں ملاقات ہو گی۔ ہو گی یا نہیں۔ آپ کو دوستی کے پیغام کا جواب مل گیا ہے۔ آپ آج ہی روانہ ہو جائیں۔"

سمن تاش ہرن کی طرح کودتی پھلانگتی چٹان سے اُتر گئی۔ مسعود اُسے دیکھتا رہا۔ وہ گھوڑے پر سوار ہوئی اور شہسوار کی طرح ایڑ لگا کر جنگل میں غائب ہو گئی۔ جب تک اُس کے گھوڑے کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی رہی مسعود اُدھر ہی دیکھتا رہا۔

"آپ سمجھ نہیں سکتے کہ یہ لڑکی اسلامی اتحاد کے متعلق کس قدر جذباتی ہے"۔۔۔ ابی ظفر نے کہا۔"میں نے اس کے ساتھ بہت وقت گذارا ہے۔ اسے جتنا میں جانتا ہوں اتنا کوئی نہیں جانتا۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ لڑکی غزنی کی سلطنت کے لیے بہت بڑی قربانی دے گی۔"

مسعود کی ذہنی کیفیت بدل گئی۔ اُس نے اپنے محافظوں سے کہا۔۔۔ "میرے ساتھ چلو"۔۔۔ اور وہ چٹان سے اُتر کر گھوڑے پر سوار ہُوا۔ اُس کے تمام محافظ اُس کے پاس آ گئے تو اس نے شہر کا رُخ کر لیا۔ اُس نے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ تیر کے زخمی کو جس گھوڑے پر لے جایا جا رہا تھا وہ ابھی شہر میں داخل ہی ہُوا تھا۔ سمن تاش کا گھوڑا اس سے آگے نکل گیا تھا۔ زخمی کا خون بہہ رہا تھا۔ مسعود نے حکم دیا کہ اس زخمی کو محل میں لے چلو۔

ابو منصور ارسلان خان اپنے دربار میں بیٹھا تھا۔ مسعود بن محمود اطلاع دیئے بغیر اندر چلا گیا۔ اُس کے پیچھے پیچھے مسعود کا ایک محافظ اندر داخل ہوا۔ اُس نے کندھے پر ایک زخمی کو اٹھا رکھا تھا جس کے کندھے میں ایک تیر اُترا ہُوا تھا۔ مسعود کے اشارے پر محافظ نے زخمی کو فرش پر لٹا دیا۔ زخمی کا خون بہہ رہا تھا۔

"یہ کیا ہے مسعود بن محمود؟"۔۔۔ ابو منصور نے پوچھا۔

"یہ آپ کا وہ جواب ہے جو آپ نے میرے دوستی کے پیغام کا دیا ہے"۔۔۔ مسعود نے کہا۔۔۔"میں آپ کا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں کہ آپ نے مجھے زیادہ دن

انتظار نہیں کرایا۔"

ابو منصور اُٹھ کھڑا ہُوا اور غصّے میں بولا۔" یہ سب کیا ماجرا ہے؟ کیا سلطان محمود نے اپنی اولاد کو دربار کے آداب نہیں سکھائے؟"

"نہیں" ۔۔۔ مسعود نے ابو منصور کے قریب کھڑے ایک سالار سے کہا۔" اپنے آقا کے کان میں کہئے کہ کفّار اور ایمان فروشوں نے ہمارے باپ کو اتنی فرصت نہیں دی کہ دربار میں بیٹھتا اور اپنی اولاد کو دربار کے آداب سکھاتا۔ ہم میدانِ جنگ میں تیروں کی بوچھاڑوں میں پل کر جوان ہوتے ہیں۔"

ابو منصور نے اپنے سالار کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ سالار نے اُس کے کان میں مسعود کے الفاظ دہرائے۔ ابو منصور نے مسعود کو خشمگیں نگاہوں سے دیکھا اور بولا۔" ہندوستان کے ہیروں اور زر و جواہرات نے اس لڑکے کا دماغ خراب کر دیا ہے۔ یہ ہمیں اپنے باپ کے جنگی ہاتھیوں سے ڈرانے آیا ہے۔"

"اپنے آقا کے کان میں کہئے" مسعود نے کہا۔" طاقت ہاتھیوں کی نہیں ایمان کی ہوتی ہے۔ ہم اپنے تمام ہاتھی آپ کو دے دیتے ہیں مگر آپ ہمیں شکست نہیں دے سکیں گے۔ اپنے مہمان کو چوری چھپے قتل کرانے والے میدان میں بڑی جلدی پیٹھ دکھا جاتے ہیں۔"

جب ابو منصور کے کان میں مسعود کے الفاظ پہنچے تو وہ بیٹھ گیا اور بڑبڑانے لگا۔ مسعود دربار سے نکل گیا۔

"حکومت کا نشہ ہی ایسا ہے کہ عقل پر سیاہ کالا پردہ پڑ جاتا ہے"۔ سلطان محمود نے اپنے بیٹے مسعود سے ابو منصور کی ملاقات اور قاتلانہ حملے کی کوشش کی تفصیلات سن کر کہا۔" میں نے دوستی کا پیغام بھیج کر اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ اب میرے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں ہو گا۔ البتہ میرے دل پر ایک بوجھ آپڑا ہے۔ قنوج کا مہاراجہ راجیا پال بھاگ گیا تھا۔ اُس نے اپنا خزانہ پہلے ہی کہیں غائب کر دیا تھا۔ مجھے خزانے کی ضرورت نہیں۔ قنوج کی ضرورت تھی۔ وہ مجھے مل گیا تھا۔ اب ہندوستان

سے اطلاع آئی ہے کہ راجیاپال قنوج میں ہمارے حاکموں کو پیغام بھیج رہا ہے کہ اُس کی جان بخشی کی جاتے اور وہ غزنی کا باجگزار رہے گا مگر لاہور کا مہاراجہ بھیم پال نڈر دوسرے شکست خوردہ مہاراجوں کو ساتھ ملا کر راجیاپال کو خوفزدہ کر رہا ہے اور ہمارے خلاف فیصلہ کُن جنگ کے لیے فوجیں اکٹھی کر رہا ہے...

"مجھے فوراً وہاں چلے جانا چاہیئے مگر میں کاشغر اور بخارا کے سانپوں کا سر کچلنا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ تم کہتے ہو کہ ابو منصور کی بیٹی نے تمہیں کہا ہے کہ ہم اُس کے باپ پر حملہ کریں۔ ہم قوم کی اس بیٹی کی خواہش پوری کر دیں گے اور ہمارے لیے یہ جنگی اقدام اس لیے بھی ضروری ہو گیا ہے کہ یہ لوگ عیسائیوں کے زیرِ اثر ہیں۔ مجھے ان لوگوں سے کوئی خطرہ نہیں۔ اگر انہوں نے خراسان پر حملہ کیا تو منہ کی کھائیں گے، لیکن خطرہ یہ ہے کہ عیسائی ان لوگوں کے ہاں اپنے اڈے بنالیں گے۔ ہماری جنگ اسلام کی مخالف قوتوں کے ساتھ ہے.... میرا خیال ہے کہ ابو منصور اور قادر خان خراسان پر حملے کا منصوبہ تو بنا سکتے ہیں، حملے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ تاہم ہمیں تیار رہنا چاہیئے۔"

سلطان محمود کا یہ خیال غلط نکلا۔ کوئی دو ماہ بعد اُسے اطلاع ملی کہ کاشغر، بخارا اور بلاساغون کی فوجیں بلخ کی سمت بڑھی آرہی ہیں۔ بلاساغون ابو منصور ارسلان کا دارالحکومت تھا۔ سلطان محمود نے پہلے ان تینوں کے اتحاد کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی لیکن اُسے جب ان کی پیش قدمی کی اطلاع ملی تو وہ پریشان سا ہو گیا۔ کاشغر، بخارا اور بلاساغون خراسان کی سرحد سے بہت دُور پہاڑی علاقے میں واقع تھے اور ایک دوسرے سے بھی دور تھے۔ خراسان تک کی مسافت خاصی دشوار تھی۔ راستے میں ایک بڑا دریا بھی تھا۔

"اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تینوں فوجیں بہت عرصے سے جنگ کی تیاریاں کر رہی ہیں" سلطان محمود نے اپنے سالاروں اور مشیروں سے کہا ـــ "اتنی دشوار پیش قدمی تیاری کے بغیر نہیں کی جاسکتی۔"

"سلطان غزنی نے شاید اس پہلو پر توجہ نہیں دی کہ قادر خان راستے میں پہاڑی

قبائل کو مالِ غنیمت کا لالچ دے کر اور اسلام کے خلاف نفرت پھیلا کر اپنے ساتھ ملاتا چلا آ رہا ہے۔ یہ قبائل وحشی، خونخوار اور جنگجو ہیں۔ ان کا اپنا ہی بنایا ہوا کوئی مذہب ہے۔"

"مجھے معلوم ہے" سلطان محمود نے کہا۔ "اسی لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں انہیں بلخ سے کچھ دور میدانی علاقے میں لا کر لڑاؤں گا۔ ان قبائل سے میں واقف ہوں۔ وہ جنگجو اس لیے ہیں کہ آپس میں لڑتے رہتے ہیں اور وہ صرف پہاڑیوں میں لڑ سکتے ہیں۔ اُن کے گھوڑے بھی سنگلاخ وادیوں میں بھاگنے دوڑنے کے عادی ہیں۔"

غزنی سے بلخ تک کا فاصلہ کچھ خاصا زیادہ تھا۔ سلطان محمود نے ابی ظفر (نابینا موسیقار) کی اطلاع پر پہلے ہی خراسان کی فوج کو بلخ سے کچھ دور جمع ہو کر تیاری کی حالت میں رہنے کا حکم بھیج دیا تھا۔ وہاں ہاتھیوں کی تعداد تھوڑی تھی۔ سلطان محمود نے غزنی سے تین سو ہاتھی اس حکم سے بلخ کو روانہ کر دیئے کہ بہت تیز رفتار سے جائیں۔

صرف دو مؤرخوں نے اس جنگ کا ذکر کیا ہے۔ ان میں ایک عطبی ہے اور دوسرا ابن الاثیر۔ انہوں نے لکھا ہے کہ اس لڑائی میں سلطان محمود اپنی جنگی طاقت کی نمائش پر زیادہ توجہ دے رہا تھا تاکہ اس کے دشمن اور پہاڑی قبائل مرعوب ہو جائیں اور آئندہ سر اٹھانے کی جرأت نہ کریں۔

قادر خان، توغان خان اور ابو منصور کی فوجیں ایک دوسری کے پیچھے تیزی سے چلی آ رہی تھیں۔ ان کے لیے رسد کی کمی نہیں تھی۔ پہاڑی قبائل ان کی بہت مدد کر رہے تھے۔ دونوں مورخ لکھتے ہیں کہ یہ قبائل سرپٹ دوڑتے گھوڑوں سے تیر اندازی کے ماہر تھے اور لڑائی میں بھی بھاگتے دوڑتے لڑا کرتے تھے۔ سلطان محمود کے دشمنوں کو ان کی اسی مہارت اور لڑنے کے انداز پر ناز تھا۔ تینوں فوجوں کی اپنی نفری بھی بہت تھی۔ مورخوں کے اندازے کے مطابق سلطان محمود کی فوج بھی اتنی ہی

تھی۔ اس کے پاس ہاتھی تھے جو اس کے دشمنوں کے پاس نہیں تھے۔ اس کے علاوہ سلطان کے پاس تقریباً چار سو رتھ تھے جو اُس نے ہندوستان کی شکست خوردہ فوجوں سے حاصل کیے تھے۔ وہ ان کے استعمال کا قائل نہ تھا لیکن قبائیلوں سے لڑنے کے لیے اُس نے رتھوں کا استعمال ضروری سمجھا۔

یہ ہلکی قسم کے رتھ تھے۔ ہر رتھ کے آگے ایک گھوڑا جوتا جاتا اور اس میں دو آدمی ہوتے تھے۔ دونوں لڑاکے ہوتے تھے۔ ایک گھوڑے کو بھگاتا اور دوسرے کے پاس پھینکنے والی برچھیاں اور تیر و کمان ہوتے تھے سلطان محمود نے رتھوں کے دو دستے تیار کر رکھے تھے اور اب اُس نے دونوں دستوں کو بلخ پہنچنے کا حکم دے دیا تھا۔

مورخوں اور اُس دَور کے جنگی مبصّروں نے لکھا ہے کہ سلطان محمود کی فوج ٹریننگ اور میدانِ جنگ میں ڈسپلن اور دستوں کے باہمی ملاپ کے لحاظ سے ایک عمدہ فوج تھی۔ نہایت دشوار صورتِ حال میں بھی دستوں میں بھگدڑ اور انتشار پیدا نہیں ہوتا تھا۔ البتہ اس معرکے میں سلطان کو اپنی یہ کمزوری پریشان کر رہی تھی کہ اُس کی فوج کی تقریباً نصف نفری ہندوستان میں شہید ہو گئی تھی۔ اس کی کمی کسی حد تک اُس نے اُن ہندوستوں سے پوری کر لی تھی جنہیں وہ جنگی قیدی بنا کر لاتا رہا تھا۔ ان ہندوؤں کو اُس نے اپنی فوج کی بجائے بہتر اور زیادہ مراعات دے رکھی تھیں۔ ان میں سے ہندو اکثر اسلام قبول کرتے رہتے تھے۔ ان دستوں کو وہ ہندوستان نہیں لے جاتا تھا۔

جب سلطان محمود بلخ پہنچا تو اُس نے آرام کیے بغیر دستوں کی تقسیم کا کام شروع کر دیا مگر اُس سے یہ ضروری کام دلجمعی سے نہ ہو سکا کیونکہ اُسے اطلاع ملی کہ دشمن ترمیز کے مقام پر دریائے آکسس پار کر رہا ہے۔ یہ مقام بلخ سے تقریباً پچاس میل دور تھا۔ سلطان محمود کو سالاروں نے مشورہ دیا کہ دریا پار کرنے کے دوران ہی حملہ کر دیا جائے لیکن سلطان نے کہا کہ انہیں اطمینان سے گذر

آنے دو۔ اس کے بعد دریا ہمارا دوست ہوگا۔ سلطان محمود کو اس اطلاع سے یہ اطمینان ہُوا کہ دشمن کا رخ بلخ کی طرف ہے۔

سلطان محمود نے ہاتھیوں کو دو حصّوں میں تقسیم کر کے ایک حصّے کو بلخ سے پانچ چھ میل دُور دائیں اور دوسرے حصّے کو اتنی ہی دُور بائیں جا کر دریا کی طرف چلے جانے کو کہا۔ ان کے ساتھ اُس نے ایک ایک سوار تھا اور ایک ایک دستہ پیادوں کا بھیج دیا۔ انہیں سلطان کے حکم کا انتظار کرنا تھا اور ان کے لیے اہم حکم یہ تھا کہ وہ دشمن کو نظر نہ آئیں۔

چوتھے روز دشمن کا ہراول نظر آیا۔ سلطان محمود کو اطلاع ملی تو وہ اٹھا اور قبلہ رُو ہو گیا۔ اُس نے دو نفل ادا کیے اور دعا کے بعد پہلا حکم یہ دیا کہ دشمن کے ہراول پر ایک بھی تیر نہ چلے۔ وہ حکم دے ہی رہا تھا کہ اُسے اطلاع ملی کہ دشمن کا ایک جاسوس پکڑ لائے ہیں۔ اس کے حکم پر جاسوس کو اس کے سامنے لایا گیا۔

"ہاں سلطان!" — جاسوس نے کہا — "میں بلاساغون کا جاسوس ہوں لیکن میں ایک خبر دینے آیا ہوں، کچھ معلوم کرنے نہیں آیا۔"

"کیا خبر ہے؟" — سلطان محمود نے پوچھا۔

"جو کچھ بھی ہے وہ آپ کے فرزند مسعود کے لیے ہے" — جاسوس نے کہا — "آپ انہیں ذرا جلدی بلا لیں۔"

مسعود کو بلایا گیا تو جاسوس نے سلطان محمود کی موجودگی میں بتایا کہ اُسے ابومنصور کی بیٹی سمن تاش نے اس زبانی پیغام کے ساتھ بھیجا ہے — "میں نے تمہیں کہا تھا کہ میدانِ جنگ میں ملاقات ہوگی۔ میں اُن مستورات کے ساتھ آگئی ہوں جو میرے ابّا اور اس کے سالاروں وغیرہ کی بیویاں اور داشتائیں ہیں۔ ہماری فوجوں کی ترتیب یہ ہے کہ ہماری فوج دائیں پہلو پر ہے۔ بخارا کی فوج بائیں پہلو پر اور درمیان میں قادر خان کی فوج ہے۔ قبائلیوں کو تینوں فوجوں کے ساتھ تقسیم کر دیا گیا ہے۔ میرے ابّا اپنی فوج کی کمان خود کر رہے ہیں۔ آپ کے والدِ محترم بہتر سمجھتے ہیں

کہ وہ ہماری ترتیب جان کر اپنی فوج کی تقسیم کس طرح کریں گے۔ میں تمہیں مشورہ دوں گی کہ ہماری طرف تم آنا۔ میں کوشش کروں گی کہ تم تک زندہ پہنچ سکوں۔ زندہ نہ رہی تو خدا حافظ!"

جاسوس نے کہا۔ "آپ مجھے اپنے پاس رکھ سکتے ہیں۔ شہزادی نے کہا تھا کہ واپس نہ آنا۔"

"سنو مسعود!" سلطان محمود نے جاسوس کو باہر نکال کر مسعود سے پوچھا ——"کیا یہ کوئی جذباتی معاملہ ہے؟ اگر ایسا ہی ہے تو میں تمہیں اس طرف نہیں بھیجونگا۔"

"معاملہ جذباتی ہے لیکن ذاتی یا سفلی جذبات کا نہیں" مسعود نے جواب دیا ——"آپ مجھے اُسی طرف بھیجیں۔ میں اس لڑکی کی بجائے اس کے باپ سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ آپ اس پیغام کو دھوکہ نہ سمجھیں۔ آپ کو اس لڑکی کے متعلّق ابی ظفر بھی بتا چکا ہے اور میں نے بھی آپ کو بہت کچھ بتایا ہے۔"

پانچویں صبح کا سورج سرخ رنگ کی گرد میں اس طرح چھپا ہُوا تھا کہ چمکتے ہوئے گولے کی طرح نظر آتا تھا۔ الیاس بن اسد کی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ دونوں فوجیں اللہ اکبر کے نعرے لگا رہی تھیں اور ایک دوسرے کے خون کی پیاسی تھیں۔ دشمن اسی ترتیب میں آرہا تھا جو سمن تاش نے بتائی تھی۔ گھوڑسوار قاصدوں کی سرپٹ بھاگ دوڑ شروع ہو چکی تھی۔ اُن کی اطلاعوں سے دشمن کی ترتیب کا پتہ چل رہا تھا۔ سلطان محمود اس کے مطابق قاصدوں کو پیغام دے رہا تھا۔ قادر خان کی فوج درمیان میں اور خاصی پیچھے تھی۔ توغان خان اور ابو منصور دائیں اور بائیں، بلخ سے چند میل دُور چلے آرہے تھے۔ یہ گھیرے کی ترتیب تھی۔ وہ بلخ کو اور سلطان محمود کی فوج کو گھیرے میں لینا چاہتے تھے۔

سلطان محمود نے مسعود کو اُس طرف بھیج دیا تھا جدھر ابو منصور کی فوج تھی۔ جدھر سے توغان کی فوج آرہی تھی اُدھر سلطان نے ایک اور تجربہ کار سالار بھیج دیا تھا۔ دشمن کی تینوں فوجوں کے درمیان ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو میل کا فاصلہ۔

تھا۔ ان خالی جگہوں میں سلطان محمود کے دستے جا رہے تھے۔ ہاتھی، رتھ اور پیادہ دستے پہلے ہی اُس طرف نکل گئے تھے۔ اس سے سلطان نے دشمن کے لیے یہ صورت پیدا کر دی کہ توغان خان اور ابو منصور کی فوجیں دائیں بائیں سے سلطان کے گھیرے میں آگئیں۔

سلطان محمود نے اپنے پیغاموں کے ساتھ قاصد دوڑا دیئے۔ سورج اوپر اُٹھ آیا تھا مگر گرد نے اس کی روشنی مدھم کر رکھی تھی۔ اچانک زمین و آسمان کانپنے لگے۔ سلطان محمود نے دشمن کے دائیں اور بائیں پہلوؤں پر حملے کا حکم دے دیا تھا۔ دونوں پہلوؤں پر دونوں اطراف سے حملہ ہوا۔ ایک طرف ہاتھی اور رتھ تھے۔ قبائلیوں نے اپنے مخصوص انداز سے گھوڑے دوڑائے اور تیر اندازی کی کوشش کی لیکن اتنے گھمسان کی جنگ میں انہیں اپنے پرائے کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔

قادر خان کو بھی پتہ نہیں چل رہا تھا کہ اس کے دائیں بائیں کیا ہو رہا ہے۔ اُسے پہلوؤں سے کوئی پیغام نہیں مل رہا تھا۔ اُسے بتانے والا کوئی نہ تھا کہ اُس کے پہلو کچلے اور ہاتھیوں تلے مسلے جا رہے ہیں۔

دائیں طرف ابو منصور کی حالت اچھی نہیں تھی۔ اُس کی فوج پر ایک طرف سے مسعود نے حملہ کیا اور جب اس کی فوج اس طرف متوجہ ہوئی تو پیچھے سے چنگھاڑتے ہاتھیوں، رتھ سواروں اور پیادہ دستوں نے حملہ کر دیا۔ رتھ سواروں کی توجہ قبائلیوں پر تھی۔ جونہی کوئی قبائلی اپنے گھوڑے کو باہر نکالتا اور اپنے انداز سے لڑنے کی کوشش کرتا، دو رتھ سوار اس کے دائیں بائیں دوڑ پڑتے اور اُسے برچھی یا تیر سے گرا لیتے۔

شام سے کچھ پہلے مسعود ایک بلند جگہ کھڑا لڑائی کا منظر دیکھ رہا تھا۔ عقب سے تین گھوڑے سرپٹ دوڑتے آرہے تھے۔ ایک سوار کے ہاتھ میں سفید جھنڈا تھا۔ مسعود کے محافظوں نے گھوڑے اُن کی طرف دوڑا دیئے کیونکہ یہ دھوکہ بھی ہو سکتا

تھا۔ وہ تینوں سواروں کو اپنے ساتھ مسعود کے سامنے لے آئے۔ ان میں ایک سوار سمن تاش تھی جس کے سر اور چہرے پر موٹا پڑا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ دو مرد گھوڑ سوار تھے۔ سمن تاش کود کر گھوڑے سے اتری اور دوڑتی مسعود کے پاس آئی۔

"بڑی مشکل سے تمہارا پتہ چلا ہے"۔۔ وہ ہانپتی ہوئی سانسوں سے بول رہی تھی "میرے ابا بھاگنے کی فکر میں ہیں لیکن ان کا ایک سالار انہیں جھوٹی تسلیاں دے رہا ہے۔ وہ فوج کا قلب پیچھے لے گئے ہیں۔ انہیں یقین ہو گیا ہے کہ انہیں شکست ہو چکی ہے۔ اُن کے پاس قادر خان کا قاصد یہ پیغام لے کر آیا ہے کہ اُس نے بلخ کی طرف پیشقدمی روک دی ہے اور وہ اپنی فوج کو دائیں اور بائیں کمک کے طور پر تقسیم کر رہا ہے۔ اُس نے کہا کہ حوصلہ نہ ہارنا، سلطانی فوج کو ہم گھیرے میں لے رہے ہیں .... میں نے تمہارا سراغ کس طرح لگایا اور یہاں تک کس طرح پہنچی، یہ پھر کبھی بتاؤں گی۔ میں اس لیے آئی ہوں کہ ہمارے قلب کو تم ذرا سی ہمت سے پکڑ سکتے ہو۔ مجھے معلوم نہیں کہ دوسری طرف لڑائی کی صورتِ حال کیا ہے۔ میں اپنی فوج کی بات کر رہی ہوں"۔

مسعود سوچ میں پڑ گیا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"۔ سمن تاش نے کہا۔۔ "میرا گھوڑا لاشوں کو روندتا آیا ہے۔ مرنے والوں میں غزنوی بھی ہیں، ترکستانی اور بخاری بھی مگر مر کر سب ایک جیسے لگتے ہیں۔ وہ مسلمان تھے"۔۔ اُس نے چلا کر کہا۔۔ "اپنی قوم کا خون روکو مسعود! میں جو کہتی ہوں وہ کرو۔ قادر خان کی کمک آ گئی تو یہ قتل و غارت نہیں رک سکے گی۔ اس سے پہلے ہمارے قلب کو مٹھی میں لے لو"۔

"تم ساتھ چلو گی؟"

"نہیں!"۔۔ سمن تاش نے کہا۔ "میں جا رہی ہوں۔ تم آؤ"۔

وہ گھوڑے پر سوار ہو ئی اور دو محافظوں کے ساتھ جو اُس کے زر خرید بنے ہوئے تھے، میدانِ جنگ کے گرد و غبار میں غائب ہو گئی۔ وہ مسعود کو بتا گئی تھی کہ اُس

کا باپ کہاں ہے۔

قادر خان کی پیشقدمی رک گئی تھی۔ وہ اپنی فوج کو دو حصوں میں تقسیم کر کے توغان خان اور ابو منصور کو کمک بھیج رہا تھا۔ سلطان محمود کو اُس کے اِس اقدام کا پتہ اُس وقت چلا جب رات گہری ہو رہی تھی۔ اس وقت حملہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ سلطان نے اپنے پلان میں ردّوبدل کر لیا اور اُسی وقت مسعود اور دوسرے سالار کی طرف پیغام بھیج دیا کہ تازہ صورتِ حال کیا ہے۔

مسعود اپنی جگہ نہیں تھا۔ وہاں ایک نائب سالار نے پیغام وصول کیا۔ مسعود کم و بیش ایک سَو منتخب سپاہیوں اور چھاپہ مار کمانداروں کو ساتھ لے کر ابو منصور کے ہیڈ کوارٹر پر حملہ کرنے چلا گیا تھا۔ یہ ایک شبخون تھا۔ ابو منصور حوصلہ ہار بیٹھا تھا۔ اس کی فوج بُری طرح کچلی گئی تھی۔ سلطان محمود نے اُس پر حملہ ہی ایسے انداز سے کرایا تھا کہ وہ بچ نہیں سکتا تھا۔ وہ اپنی بیٹی کی نشاندہی کے مطابق دریا کے کنارے چلا گیا تھا۔ اُس کے ساتھ اس کا ایک سالار، ہمشیر، تین بیویاں، چند ایک محافظ اور چند قاصد تھے۔ وہاں اس پر حملہ نہیں ہو سکتا تھا۔

مسعود دور کا چکر کاٹ کر وہاں تک پہنچا۔ اُسے دو تین مشعلیں جلتی نظر آئیں۔ اُس نے اپنے آدمیوں کو ہدایات دیں اور انہیں پھیلا کر آگے بڑھا۔ ابو منصور کے صرف دو محافظ جاگ رہے تھے۔ ایک نے دوسرے سے کہا کہ وہ گھوڑوں کی آوازیں سُن رہا ہے۔ دوسرے نے کہا کہ وہی ہوں گے۔ اُس نے ایک مشعل اٹھائی اور اوپر کر کے دو مرتبہ دائیں بائیں ہلائی اور دو مرتبہ اوپر نیچے کی۔ مشعل رکھ کر وہ ایک خیمے کے قریب جا کھڑا ہوا اور منہ سے دھیمی سی آواز نکالی۔ خیمے میں سمن تاش سوئی ہوئی تھی۔ وہ فوراً اُٹھ کر باہر آ گئی اور محافظ سے کہا کہ تم آگے چلے جاؤ۔

چونکہ راہنمائی موجود تھی اس لیے شبخون میں کوئی دشواری اور کوئی خطرہ نہ تھا۔ ابو منصور اور سالار اپنے اپنے خیموں میں سوئے ہوئے تھے۔ ان تک زخمیوں کی

کربناک آوازیں نہیں پہنچ رہی تھیں، نہ وہاں تک خون اور لاشوں کی بو پہنچتی تھی۔ وہ اس خوش فہمی میں بھی مبتلا تھے کہ وہاں تک کوئی خطرہ نہیں پہنچ سکتا مگر ایمان فروش باپ کی دین دار بیٹی ایک بہت بڑا خطرہ بن کر اُس کے ساتھ موجود تھی۔

مسعود نے خیمہ گاہ میں داخل ہو کر ایک مشعل اٹھائی اور ابو منصور کے خیمے میں جا کر اُسے جگایا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا تو مسعود کو دیکھ کر پوری طرح ہوش میں آگیا۔ باہر مسعود کے آدمیوں نے محافظوں کو جگا کر الگ کھڑا کر لیا اور سالار کو بھی پکڑ لیا تھا۔

ابو منصور نے مسعود سے کہا کہ وہ شکست تسلیم کرتا ہے لیکن اُس کی بیٹی کو گرفتار نہ کیا جائے۔ مسعود نے اس کے ساتھ کوئی بات نہ کی۔

نصف شب کا عمل ہوگا۔ سلطان محمود ابھی ابھی میدانِ جنگ کا "چکر" لگا کر آیا تھا۔ اُسے اطلاع دی گئی کہ مسعود ابو منصور کو پکڑ لایا ہے۔ سلطان دوڑتا باہر آیا۔ اُس کے لیے یہ خبر معمولی نہیں تھی۔ ابو منصور کے ساتھ سمن تاش بھی تھی۔ انہیں سلطان اپنے خیمے میں لے گیا۔

"کیا سلطان میری دوستی قبول کر لیں گے؟" — ابو منصور نے پوچھا۔

"میں نے دوستی کا ہی پیغام بھیجا تھا" — سلطان محمود نے کہا — "مگر تم نے میرے بیٹے کو قتل کرانے کی کوشش کی ..... کیا میں تم پر بھروسہ کر سکتا ہوں؟ تم مجھے کس طرح یقین دلا سکتے ہو کہ تمہاری دوستی میں خلوص ہے؟ تمہارے پاس ہے کیا؟ تمہاری حیثیت کیا رہ گئی ہے؟ تم میرے قیدی ہو۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں" — ابو منصور نے کہا — "میرے پاس کچھ نہیں رہا، پھر بھی آپ کی دوستی چاہتا ہوں۔ میں آپ کے خلاف لڑنا نہیں چاہتا تھا مگر ....."

اور اُس نے اقبالِ جرم کے انداز سے بتا دیا کہ وہ مجبور ہو کر اپنی فوج لے آیا ہے۔

سمن تاش کھڑی سن رہی تھی۔ وہ آگے بڑھ کر سلطان کے سامنے دو زانو ہو گئی اور سلطان کا ہاتھ چوم کر کہا — "کیا آپ کے دل میں میرے لیے کچھ جگہ ہے؟" — اُس نے مسعود کی طرف دیکھا اور سلطان محمود سے کہا — "میں یہ دوستی "پکی" کر سکتی ہوں۔"

سلطان محمود اشارہ سمجھ گیا۔ ابو منصور نے کہا۔" ہاں سلطان! میرے پاس یہی کچھ رہ گیا ہے۔۔۔ ایک بیٹی۔۔۔۔ اس نے مجھے آپ کے خلاف لڑنے سے روکا تھا۔ اسے اپنی بیٹی بنالیں۔"

سلطان محمود نے اُسی وقت یہ پیشکش قبول کرلی اور مسعود کی رضامندی سے سمن تاش کو اُس کی بیوی بنانے کا فیصلہ کرلیا۔ یہ لڑائی اور شادی ۱۰۲۰ء میں ہوئی تھی۔

دوسرے دن کی لڑائی فیصلہ کن تھی۔ ابو منصور نے اپنی فوج کو لڑائی سے الگ ہوجانے کا حکم بھیج دیا۔ سلطان محمود نے اُسے قیدی سے مہمان بنالیا تھا۔ قادر خان اور توغان خان میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ ڈیڑھ دو سال بعد ان دونوں نے بھی سلطان محمود کی اطاعت قبول کرلی تھی۔

دیوتا نے پنڈت کو نگل لیا

بھارت

میں کالنجر، قنوج اور گوالیار ایک مثلث کی صورت میں واقع ہیں۔ اس مثلث میں سے ہندوؤں کے دو مقدس دریا، جمنا اور گنگا گذرتے ہیں کئی اور ندی نالے بھی جسم کی رگوں کی طرح پھیلے ہوتے ہیں سلطان محمود غزنوی کے دور میں اس علاقے میں گھنے جنگلات تھے۔ ٹیلے ٹیکریاں اور پہاڑیاں بھی تھیں۔ یہ تینوں مقامات ایک دوسرے سے ڈیڑھ ڈیڑھ سو میل دور ہیں۔ اس دور میں جب غزنی کا بت شکن ہندوستان پر دہشت بن کے چھا گیا تھا، یہ بڑی مشہور راجدھانیاں تھیں۔ قنوج کے متعلق سنایا جا چکا ہے کہ بلند شہر، متھرا، منج اور چھوٹے بڑے کئی ایک قلعوں کی فتح کے بعد محمود غزنوی نے قنوج کو تہ تیغ کر لیا تھا اور قنوج کا مہاراجہ راجیا پال جس کا بڑا شہرہ تھا، محاصرے سے پہلے ہی بھاگ گیا تھا۔

کالنجر کے متعلق یہ وضاحت ضروری ہے کہ آپ پہلے بھی کشمیر کے حملے کی کہانی میں یہ نام پڑھ چکے ہیں۔ وہ دراصل کالانجر ہے جو آج کوٹلی کہلاتا ہے۔ اب جس جگہ کا ذکر ہو رہا ہے یہ کالنجر ہے۔

۱۰۱۸ء کے آخری دنوں میں قنوج کا مہاراجہ راجیا پال سلطان محمود غزنوی کے مقابلے سے پہلے ہی منہ موڑ گیا تھا تو وہ کالنجر، قنوج اور گوالیار کی مثلث سے نکل گیا تھا۔ راجیا پال نے اپنا تمام تر خزانہ شہر سے دور ایک ایسی پہاڑی اور جنگلاتی جگہ چھپا دیا تھا جہاں انسانوں کا گذر کم ہی ہوتا تھا۔ اس کا رازدان صرف ایک

پنڈت تھا اور بعد میں محمود غزنوی کا ایک جاسوس اس خزانے کے راز سے واقف ہُوا تھا۔ اُس نے قنوج کی فتح کے وقت اس پنڈت کو پکڑوا دیا تھا مگر پنڈت نے سُلطان کو بتایا تھا کہ وہ اُسے خزانے کی جگہ لے جاسکتا ہے لیکن وہاں خزانہ نہیں ہو گا۔ وہ راجیا پال اپنے ساتھ لے گیا ہے۔

"وہ گیا کہاں ہے؟"۔ سُلطان محمود نے اُس سے پوچھا۔

"اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں بھی اُس کے ساتھ چلا جاتا"۔ پنڈت نے جواب دیا تھا — "آپ کا قیدی نہ ہوتا"۔

"ہمیں بتایا گیا ہے کہ تم واحد آدمی تھے جو مہاراجہ کے خزانے کے راز سے واقف تھے"۔ سلطان کے ایک سالار نے اُس سے پوچھا — "یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ مہاراجہ تمہیں بتائے بغیر چلا گیا ہو"۔

"خزانے سے جسے پیار ہو وہ انسانوں کے پیار سے محروم ہو جاتا ہے"۔ — پنڈت نے کہا — "جو مہاراجہ اپنے دیوتاؤں اور دیویوں کو اور اپنے مندروں کو توہین، تباہی و بربادی کے لیے چھوڑ گیا ہے، اُس کے لیے مندروں کا ایک پجاری کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ مجھے اُس کے خزانوں کے ساتھ دلچسپی ہوتی تو تمام تر خزانہ میری تحویل میں رہا ہے۔ میں اسے غائب کر سکتا تھا مگر میں نے اس کی خاطر آپ کا ایک آدمی سانپوں سے مروا دیا ہے۔ آپ میرے ساتھ چلیں۔ آپ کو وہ جگہ دکھادوں گا۔ مندروں میں جو کچھ ہے وہ آپ کے حوالے کیا جا چکا ہے"۔

"کیا آپ اسلام قبول کریں گے؟"

"نہیں" — پنڈت نے کہا تھا — "جس طرح آپ کے آدمی میرے دیوتاؤں کو مٹی اور پتھر کے بُت سمجھ کر توڑ رہے ہیں اسی طرح میرے جسم کے بھی ٹکڑے کردیں۔ اپنا مذہب نہیں چھوڑوں گا۔ اگر آپ اپنے مذہب کو سچا سمجھتے ہیں تو دوسرے مذہب کے پیشواؤں کا احترام کریں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کا مذہب بھی یہی کہتا ہے"۔

"میں نے تمہارے مذہب کے پیشواؤں کو اپنے قدموں میں سر رگڑتے دیکھا ہے"

—— سلطان محمود نے پُرجوش آواز اور دادو تحسین کے لہجے میں کہا۔" مگر تم میں جو جرأت ہے میں اس کی تعریف کرتا ہوں ۔ غدّار کسی بھی قوم کا اور کسی بھی مذہب کا ہو وہ قابلِ نفرت ہے .... کہو پنڈت! کیا چاہتے ہو؟"

" اگر مجھ پر کرم کرنا چاہتے ہیں تو مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں"۔ پنڈت نے کہا۔" میں اپنی آنکھوں اپنے مذہب کی توہین نہیں دیکھ سکتا۔ میں اپنے آپ کو گنگا ماتا کے حوالے کر دوں گا یا جنگل میں نکل جاؤں گا اور باقی عمر وہیں گزار دوں گا۔"

"جاؤ پنڈت!"—— سلطان محمود نے کہا۔" جلتے ہوئے قنوج کے دروازے کھلے ہیں چلے جاؤ۔ اگر اپنے مہاراجہ سے کہیں ملاقات ہو جائے تو اُسے کہنا کہ جنگجو بادشاہ اپنی قوم اور اپنے ملک کے ساتھ دھوکہ نہیں کیا کرتے۔"

پنڈت سر جھکائے ہوئے چلا گیا۔

وہ ۲۰ دسمبر ۱۰۱۸ء کا دن تھا جب سلطان محمود غزنوی نے قنوج کا محاصرہ کیا تھا۔ کوئی بھی نہ بتا سکا کہ مہاراجہ کب قنوج سے نکل گیا تھا۔ اُس کے تعاقب کی ضرورت بھی محسوس نہ کی گئی۔ تھوڑا ہی عرصہ بعد سلطان محمود غزنی چلا گیا اور قنوج میں اپنے ایک سالار ابوالقدر سلجوقی کو چھوڑ گیا۔

پنڈت جو سلطان محمود کو یہ کہہ کر وہ گنگا میں ڈوب مرے گا یا باقی عمر جنگل میں گزار دے گا، گھوڑے پر سوار قنوج سے دُور نکل گیا تھا۔ اُس نے اور دور جا کر گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ دریا گہرا تو تھا مگر خاموش تھا۔ وہ موسم سیلاب اور طغیانی کا نہیں تھا۔ گھوڑا اُسے آگے ہی آگے لے جاتا رہا لیکن پنڈت نے اپنے آپ کو گنگا ماتا کے حوالے نہ کیا اور گھوڑا اُسے پار لے گیا۔ آگے گھنا جنگل تھا۔ پنڈت نے گھوڑے کو آرام دیا اور اُسے چرنے چگنے کے لیے چھوڑ دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور جنگل میں داخل ہو گیا۔ جنگل گھنا بھی تھا، کم گھنا بھی اور کہیں کہیں درخت تھے ہی نہیں۔ راستے میں دو تین ندیاں بھی آئیں۔ چٹانوں کی بھول بھلیاں بھی آئیں۔ سورج غروب ہوا۔ رات اندھیری ہوتی چلی گئی۔ اُس کا گھوڑا چلتا گیا۔ آخر وہ

رک گیا۔ علاقہ زیادہ دشوار گزار ہوگیا تھا۔ اُس نے گھوڑے سے اُتر کر اندھیرے میں گھاس پھونس اور خشک ٹہنیاں اکٹھی کرکے انہیں آگ لگادی۔ سردی تھی اور درندوں کا خطرہ بھی تھا۔ اُس نے اپنے اردگرد خشک جھاڑیاں اور ٹہنیاں اور گھاس پھونس جلاتے رات گزاری۔ صبح وہ پھر گھوڑے پر سوار ہوا اور روانہ ہوگیا۔ اب وہاں کوئی راستہ نہیں تھا۔ بیلیں زمین پر پھیل کر درختوں پر چڑھی ہوئی تھیں۔ کھڈ بھی تھے اور درخت اتنے زیادہ کہ ان کے جھکے ہوئے ٹہنوں کے نیچے سے گزرنا محال تھا۔

اُس کا گھوڑا چلتا گیا۔ کچھ دور گیا تو جنگل کم گھنا ہوگیا۔ آگے دو پہاڑیوں کے درمیان کھلی جگہ تھی۔ بکھرے بکھرے درخت اور اونچی گھاس تھی۔ وہ چلتا گیا اور دونوں پہاڑیوں کے درمیان گیا تو اُسے ایک پہاڑی میں سے راستہ نظر آگیا۔ یہاں سے پہاڑی دو حصوں میں کٹی ہوئی تھی۔ وہ اس تنگ راستے میں سے گزر گیا۔ آگے ایک اور پہاڑی آگئی جو کہیں سے دیوار کی طرح عمودی تھی اور کہیں سے اوپر جاکر آگے کو جھکی ہوئی تھی۔

اس وادی میں کچھ دور اُسے خیمے دکھائی دیئے۔ اِن سے ہٹ کر دو خیمے خوشنما کپڑے کے تھے۔ ان سے ذرا پرے گھوڑے اور خچر بندھے ہوئے تھے۔ پنڈت نے گھوڑے کی لگام کو جھٹکا دیا اور ایڑ لگائی۔ گھوڑا دوڑ پڑا۔ چند ایک آدمی ہاتھوں میں تیر و کمان اور برچھیاں اٹھائے سامنے آگئے۔

"پنڈت جی مہاراج ہیں"۔۔۔ کسی نے بلند آواز سے کہا۔

قنوج کا مہاراجہ راجیا پال خیمے سے باہر آیا۔ اُس کے ساتھ اُس کی رانی اور اُس کا بیٹا لچھمن پال بھی آن کھڑا ہوا۔ یہ تھی وہ جگہ جہاں مہاراجہ راجیا پال نے قنوج سے بھاگ کر پناہ لے رکھی تھی۔ اس کی رانی اور بیٹے لچھمن پال کے علاوہ تین ناچنے اور گانے والیاں بھی تھیں۔ کم و بیش پچاس وفادار سپاہی تھے جو مہاراجہ کے محافظ تھے۔ چند ایک ملازم بھی تھے۔ پنڈت کو یہ جگہ معلوم تھی، ورنہ وہ اس جگہ تک کبھی نہ پہنچ سکتا۔

پنڈت گھوڑے سے اترا تو راجیا پال نے آگے بڑھ کر اُسے بازو سے پکڑا اور اپنے خیمے میں لے گیا۔ رانی اور اُس کے بیٹے لچھمن پال نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اُن کے چہروں پر اُداسی اور پریشانی تھی۔ وہ اپنے خیمے میں چلے گئے۔

"کیا آپ مجھ سے یہ پوچھنے کی جرأت کریں گے کہ آپ کی راجدھانی کس حال میں ہے؟"۔ پنڈت نے مہاراجہ قنوج سے پوچھا۔ "کیا آپ میں سننے کی ہمّت ہے کہ مسلمانوں نے قنوج میں مندروں کو کس طرح اجاڑا ہے!"

مہاراجہ راجیا پال نے اُسے ایسی نگاہوں سے دیکھا جو خشمگیں تھیں۔ ان میں شکست اور بے بسی کا تاثر نہیں تھا۔

"میں جب وہاں سے رخصت ہُوا اُس وقت قنوج جل رہا تھا"۔۔۔ پنڈت نے کہا۔ "مندروں میں مسلمان سپاہی ہری کرشن مہاراج کے بُت گھسیٹ کر باہر لا رہے تھے اور انہیں توڑا جا رہا تھا۔ آپ کے محل میں ۔ ۔ ۔ ۔"

"آپ میرے لیے کوئی نئی خبر نہیں لائے"۔۔۔ مہاراجہ راجیا پال نے اُس کی بات کاٹ کر کہا۔ "اس سلسلے میں آپ کے ساتھ بہت باتیں ہو چکی ہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ غزنی کا سلطان محمود لڑنے میں بہت ماہر ہے۔ میں جانتا تھا کہ قنوج میں جب اُس کے مقابلے میں لڑنے والا کوئی نہیں ہوگا اور میں بھی اُسے نہیں ملوں گا تو وہ بھڑک اُٹھے گا اور وہ اپنا غصّہ قنوج کے درو دیوار پر ٹھنڈا کرے گا۔ وہ آسان فتح سے خوش ہونے والا نہیں۔ میں نے قنوج کو، اپنے وقار کو اور مندروں کو کسی خاص مقصد کے لیے قربان کیا ہے"۔

"مگر آپ نے اپنا خزانہ قربان نہیں کیا"۔ پنڈت نے کہا۔

"پنڈت جی مہاراج!"۔ راجیا پال نے کہا۔ "آپ کے دماغ کی خرابی کا میرے پاس کوئی علاج نہیں۔ آپ ہر بات میں مذہب کو سامنے لے آتے ہیں۔ میں جانتا ہوں آپ کہیں گے کہ مجھے خزانے کے ساتھ پیار ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ان باتوں

کو ذرا ذہن سے اتارو مہاراج! مجھے یہ بتاؤ کہ میں جس مقصد کے لیے آپ کو وہاں چھوڑ آیا تھا وہ پورا ہوا یا نہیں؟"

"نہیں" — پنڈت نے جواب دیا۔ "آپ میرے ساتھ بارہ آدمی چھوڑ آئے تھے۔ آپ نے مجھے بتایا تھا کہ یہ درندے ہیں کسی سے نہیں ڈرتے اور انہیں بھگوان نے انسانوں کو قتل کرنے کے لیے دنیا میں بھیجا ہے۔ آپ نے بتایا تھا کہ ان میں عقل اتنی زیادہ ہے کہ بڑا کامیاب فریب دیتے ہیں اور قتل کر کے غائب ہو جاتے ہیں۔ آپ نے کہا تھا کہ ان سے سلطان محمود کو قتل کرانا ہے، اور اگر یہ ممکن نہ ہو سکے تو اُس کے بڑے بڑے سالاروں کو قتل کر دیں۔ آپ نے مجھ پر چھوڑا تھا کہ ان کے ہاتھوں اور کِس کِس کو قتل کرانا ہے"۔

"میں یہ سننے کے لیے بیتاب ہوں کہ آپ نے کِس کِس کو قتل کرایا ہے" — مہاراجہ راجیاپال نے پوچھا۔

"کسی ایک کو بھی نہیں" — پنڈت نے کہا — "میں نے آپ کے ان بارہ دلیر درندوں کو جو آپ کہتے تھے کہ موت سے نہیں ڈرتے، غریب مزدوروں کے لباس میں اپنے ساتھ رکھا مگر مسلمان فوج شہر میں داخل ہوئی تو لوٹ مار شروع ہو گئی اور مکان جلنے لگے۔ میں نے دیکھا کہ بارہ میں سے دس غائب ہو گئے۔ مجھے اُمید تھی کہ وہ اپنا کام کرنے گئے ہیں مگر تھوڑی دیر بعد میں نے باقی دو کو ان کی تلاش کے لیے بھیجا تو پتہ چلا کہ وہ بھی لوٹ مار میں شامل ہو گئے ہیں اور ان میں سے بعض شہر سے چلے گئے ہیں۔ میں نے باقی دو سے پوچھا کہ وہ کسی کو قتل کر سکیں گے؟ انہوں نے جواب دیا کہ مہاراجہ خود تو خزانہ لے کر بھاگ گیا ہے، ہم کس کے لیے کسی کی جان لیں اور اپنی جان کو خطرے میں ڈالیں؟ .... اور وہ بھی میرا ساتھ چھوڑ گئے"۔

مہاراجہ قنوج نے سر جھکا لیا۔

"مہاراج!" — پنڈت نے کہا — "وہ نمک حرام نہیں تھے لیکن وہی وہاں نہ تھا جس کا انہوں نے نمک کھایا تھا تو انہوں نے اتنا بڑا خطرہ مول لینا بیکار سمجھا .... اور مہاراج! کسی بادشاہ کو قتل کر کے آپ اُس کی فوج کو شکست نہیں دے

سکتے، اور یہ غیرت مند جنگجوؤں کا شیوہ بھی نہیں۔ میں اب بھی آپ سے کہتا ہوں کہ اپنی جس فوج کو آپ نے قنوج سے باری چلے جانے کا حکم دیا تھا، اُسے تیار کریں۔ باری کو اپنی راجدھانی بنائیں اور سُلطان محمود کو یہاں سے نکالیں۔ اُس کی فوج تھوڑی رہ گئی ہے۔ لاہور کا مہاراجہ بھیم پال نڈر، گوالیار کا راجہ ارجن اور کالنجر کا راجہ گنڈا آپ کا ساتھ دینے کو تیار ہیں مسلمانوں کو آپ کچل سکتے ہیں۔ آپ کی گدّی کو لوگ مقدّس سمجھتے ہیں۔"

"سب سے پہلے خزانہ وہاں سے نکالنا ہے"۔۔۔ مہاراجہ راجیاپال نے کہا۔۔۔ "پھر سوچیں گے کہ ہمیں کیا کرنا چاہئیے۔ میں ساری عمر یہاں چھپ کر تو نہیں گزار سکتا۔"

ایک دن اور ایک رات کی مسافت کے بعد قافلہ اُس جگہ پہنچا جہاں پنڈت نے مہاراجہ قنوج کا خزانہ چھپایا تھا۔ یہ ایک پہاڑی تھی جس میں اوپر سے نیچے تک شگاف تھا جو اندر کو چلا گیا تھا۔ اس کی شکل کنوئیں جیسی تھی جس کی دیوار ایک طرف سے گرا دی گئی ہو۔ اوپر کے درختوں نے جھک کر اس پر سایہ کر رکھا تھا۔ گول دیواروں کے ساتھ بھی درخت تھے اور دیوار میں بھی تھے جو جھک کر زمین کے ساتھ متوازی ہو گئے تھے۔ اس کنوئیں نما میں پانی کھڑا تھا جو دراصل دلدل تھی۔ اس کے کناروں اور عمودی چٹان کے درمیان تنگ سا راستہ تھا۔ سامنے والی دیوار جیسی چٹان کے دامن کے ساتھ مٹی اور پتھروں کی ٹیکری تھی۔ ٹیکری اور چٹان کے دامن کے درمیان ایک دہانہ تھا جو جھاڑی نما درختوں میں چھپا ہوا تھا۔ یہ ایک غار کا دہانہ تھا۔ غار وسیع تھا۔ اس کے ایک طرف ایک سُرنگ کا مُنہ کھلا ہوا تھا۔ یہ سرنگ ایک اور غار میں چلی جاتی تھی۔ وہاں قنوج کا خزانہ پڑا تھا مگر جہاں سرنگ ختم ہوتی تھی وہاں ایک گہرا گڑھا کھود دیا گیا تھا۔ اس میں سانپ پھینک دیئے گئے تھے۔ گڑھے کے اوپر سرکنڈے ڈال کر ان پر مٹی ڈال دی گئی تھی تاکہ کوئی آدمی خزانے کا سراغ پالے اور وہ اندر جائے تو سرکنڈوں پر پاؤں رکھتے

ہی گڑھے میں جا پڑے جہاں زہریلے سانپ چھوڑ دیئے گئے تھے۔

اب جو قافلہ اس جگہ آیا، اس میں مہاراجہ قنوج تھا اور پنڈت بھی۔ بہت سے خچر اور گھوڑے تھے اور ان کے ساتھ دس بارہ ملازم تھے۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں قنوج کے محاصرے سے پہلے پنڈت چند آدمیوں کو اس حالت میں یہاں لایا تھا کہ ان کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور وہ ایک رسّی پکڑے ہوئے آئے تھے۔ رسّی کا اگلا سرا پنڈت کے ہاتھ میں تھا۔ وہ خزانے کے کچھ بکس رکھنے آئے تھے۔ اس جگہ کو ملازموں سے بھی چھپا کر رکھنا تھا۔

اب مہاراجہ اور پنڈت خزانہ نکالنے کے لیے آئے تو کسی بھی ملازم کی آنکھوں پر پٹی نہیں بندھی تھی۔ انہیں سُرنگ میں داخل کرنے سے پہلے اُس گہرے گڑھے پر جس میں زہریلے سانپ چھوڑے ہوئے تھے، تختے رکھ دیئے گئے۔ پنڈت ان سے گزر کر اندرونی غار میں چلا گیا اور ملازموں کو بھی اندر بلا لیا گیا۔ وہ بکس باہر لا کر خچروں اور گھوڑوں پر لادنے لگے۔ یہ ایک ریاست کا خزانہ تھا جو مہاراجہ راجیاپال کے آباؤ اجداد سے جمع تھا اور بڑھتا ہی رہا تھا۔ منوں کے حساب سے سونا تھا، چاندی تھی، ہیرے جواہرات اور نقدی تھی۔ اسے باہر لانے کے لیے ملازموں کو کئی بار اندر جانا پڑا۔

جب آخری بکس بھی باہر آ گیا اور تمام بکس گھوڑوں اور خچروں پر لاد دیئے گئے تو پنڈت تمام آدمیوں کو غار میں لے گیا اور خود باہر آ گیا۔ وہ ابھی سرنگ میں تھا۔ سانپوں والے گڑھے پر تین تختے رکھے گئے تھے۔ اُس نے بڑی تیزی سے تینوں تختے کھینچ لیے اور انہیں گھسیٹ کر باہر لے آیا۔

"چلو مہاراج!" — پنڈت نے مہاراجہ راجیاپال سے کہا۔

"وہ سب کہاں ہیں؟" — راجیاپال نے پوچھا۔

"وہ اب کبھی باہر نہیں آسکیں گے" — پنڈت نے جواب دیا — "انہیں اندر بھیج کر تختے کھینچ لایا ہوں۔ نکلنے والے آگے بڑھیں گے تو اُس گڑھے میں گریں گے جو میں نے زہریلے سانپوں سے بھر رکھا ہے۔ ایک دو گریں گے تو باقی آگے

نہیں آئیں گے۔ بھوکے پیاسے اندر ہی مر جائیں گے۔"

"کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ انہیں زیادہ انعام دے دیا جائے اور ان کی مرتے وقت کی بد دعائیں نہ لی جائیں؟"

"مہاراج!" — پنڈت نے کہا — "جس طرح آپ نے اس خزانے کی خاطر اپنا مذہب، اپنا وقار اور اپنی قوم کو قربان کر دیا ہے اسی طرح ہر انسان اتنے زیادہ خزانے کی خاطر آپ کو، مجھے، آپ کی رانی اور بیٹے کو قتل کرنے کی سوچے گا۔ اتنے بڑے خزانے میں سے کوئی انسان تھوڑا سا نہیں لینا چاہتا۔ آپ نے اپنی رعایا کے ساتھ کونسی نیکی کی ہے؟ .... انسان جب تخت پر بیٹھتا اور سر پر تاج رکھتا ہے تو اُس کی نظریں رعایا سے ہٹ جاتی اور خزانے پر جم جاتی ہیں۔ وہ انسان سمجھتا نہیں، سوچتا نہیں کہ خزانے اور حکومت کا پیار اُسے اس حال تک پہنچا دیتا ہے جس میں آج آپ ہیں۔ آپ ڈرے ہوئے گیدڑ کی طرح چھپتے پھر رہے ہیں۔ اپنی رعایا کو جو آپ کی ہم مذہب ہے آپ نے اپنے دشمن کے حوالے کر دیا ہے۔"

"پنڈت جی مہاراج! آپ مجھے بار بار شرمسار نہ کریں" — مہاراجہ راجیا پال نے کہا — "میں کچھ کر کے دکھاؤں گا۔"

"میں اسی لیے آپ کے ساتھ ہوں کہ آپ کچھ کر کے دکھائیں" — پنڈت نے کہا — "آپ بھول گئے ہیں کہ قنوج کی گدی ہندو جاتی کی بہادری کی، علم و ہنر کی اور ہندوستان کے وقار کی علامت ہے۔ تمام راجے مہاراجے آپ کو اپنا سردار مانتے تھے۔ اب بھی مانتے ہیں۔ میں آپ کو اس جنگل سے نکالوں گا.... چلئے۔ یہاں رکنا بہت خطرناک ہے۔"

وہ چل پڑے۔ غار کے اندر سے آوازیں آ رہی تھیں۔ جن آدمیوں کو اندر بند کر آئے تھے وہ پنڈت کو پکار رہے تھے۔ پنڈت اور راجیا پال دو گھوڑوں اور خچروں کو ایک دوسرے کے پیچھے باندھے دُور ہی دُور ہٹتے جا رہے تھے آگے

ایسا جنگل اور ایسا دشوار گزار علاقہ تھا جہاں درندے اور جنگلی جانور ہو سکتے تھے، کسی انسان کا گزر ممکن نہیں تھا۔

"پنڈت جی!"۔۔۔ راجیا پال نے کہا۔۔۔ "آپ کی وفاداری نے میرا سر جھکا دیا ہے۔ میں آپ کو اتنا انعام دینا چاہتا ہوں جتنا آج تک کسی نے مجھ سے وصول نہیں کیا۔ اپنے منہ سے مانگو۔ کیا انعام دوں!"

"ایک انعام ہے جو آج تک کوئی مہاراجہ کسی وفادار کو نہیں دے سکا"۔۔۔ پنڈت نے کہا۔۔۔ "آپ دے سکتے ہیں"۔

"مانگو مہاراج! کہو کیا دوں؟"

"غزنی کے سلطان کا سر"۔۔۔ پنڈت نے کہا۔

مہاراجہ راجیا پال کی ہنسی نکل گئی۔

"یہ سر جسم سے الگ ہو جائے تو نہ صرف یہ کہ ہندوستان کو روز روز کے حملوں سے نجات مل سکتی ہے، بلکہ اسلام کا پھیلاؤ ہمیشہ کے لیے رک سکتا ہے"۔۔۔ پنڈت نے کہا۔۔۔ "یہ دھرتی ہمیشہ کے لیے پاک ہو سکتی ہے مگر مجھے نظر آرہا ہے کہ ہماری آنے والی نسلیں بھی مسلمانوں کے خلاف لڑتی رہیں گی، کشت و خون ہوتا رہے گا لیکن اسلام اس ملک سے نہیں نکلے گا۔ ہمارے بعد آنے والوں میں عقل ہوئی تو وہ لڑنے مرنے کی بجائے مسلمانوں کو ختم کرنے کے کچھ اور طریقے اختیار کریں گے۔ اگر ہم مسلمانوں کو اپنی دھرتی ماتا سے نکال نہ سکیں تو یہی کافی ہوگا کہ ہم اسلام اور اس مذہب کے پیروکاروں کے خلاف اتنی نفرت پیدا کر دیں کہ کوئی ہندو اسلام قبول کرنا تو درکنار کسی مسلمان کے قریب سے گزرنے سے بھی سمجھے کہ ناپاک ہو گیا ہے"۔

"مہاراج!"۔۔۔ مہاراجہ راجیا پال نے کہا۔۔۔ "مجھے اپنے مذہب سے نفرت ہوتی جا رہی ہے۔ ہر ہر مہادیو اور ہری کرشن نے ہماری کیا مدد کی ہے؟ آپ ہمیں ہمیشہ دیوتاؤں کے قہر سے ڈراتے ہیں۔ کیا ان کے پاس صرف قہر ہے کرم نہیں؟ ہر بار اور ہر جگہ فتح مسلمانوں کی ہی کیوں ہوتی ہے؟ آپ کے مہادیو کا قہر مسلمانوں

پر کیوں نہیں گرتا؟"

"یہ دیوتاؤں کے بھید ہیں" — پنڈت نے کہا — "جب انسان دیوتاؤں کا حکم نہیں مانتا تو وہ اُس کے دماغ میں خلل ڈال دیتے ہیں، پھر وہ ایسی ہی باتیں کرتا ہے جیسی آپ کر رہے ہیں"۔

گھوڑے چلے جا رہے تھے۔ دُور بھیڑیوں کی چیخ و پکار اور لکڑبگوں کی قہقہہ نما آوازیں اور کبھی کبھی کسی شیر کی دھاڑ سنائی دیتی تھی۔ گھوڑے دشوار گزار علاقے سے گزر رہے تھے۔

"میں نے مندروں کو ہیروں اور جواہرات سے سجایا ہے" — راجیاپال کہتا جا رہا تھا — "میں نے پنڈتوں، رشیوں اور سادھوؤں کی بہت خدمت کی ہے۔ آپ کے مندر کو اور اس میں رکھے ہوئے پتھر کے دیوتاؤں کو میں نے عطر سے نہلایا ہے .... میرا تخت کہاں ہے؟ میرا تاج کہاں ہے؟ قنوج کی وہ گدی کہاں ہے جس کے گن سارا ہندوستان گاتا تھا؟ مجھے کیا سُوجھی کہ میں مسلمانوں کی فوج کے آنے سے پہلے ہی بھاگ اٹھا؟ مجھے کس نے اشارہ دیا تھا؟"

"خزانے کے پیار نے" — پنڈت نے کہا — "آپ خود دل چھوڑ بیٹھے"۔

سوال کا جواب نہیں دے سکتے .... میں خود اپنے سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔ پنڈت جی مہاراج! آپ مجھے آج تک نہیں سمجھا سکے کہ مذہب کیا ہے۔ میں یہی سمجھ سکا ہوں کہ کسی نگری کا راجہ مندر میں چلا جائے تو رعایا اُسے اچھا سمجھنے لگتی ہے۔ آج تک یہی سمجھا ہوں کہ رعایا کو مذہب کے نام پر دھوکہ دیا جا سکتا ہے، اپنے دل میں مذہب کی محبت ہو یا نہ ہو۔ قنوج کی گدی کی سارا ہندوستان صرف اس لیے پوجا کرتا ہے کہ میرے باپ دادا آپ کے بتوں کو عطر سے نہلاتے رہے ہیں۔ میں نے اس رسم کو جاری رکھا لیکن میرے دل میں اپنے مذہب کی محبت کبھی بھی پیدا نہ ہو سکی"۔

"آپ گمراہ ہو گئے ہیں مہاراج!"

"ہاں!" — راجیاپال نے کہا — "میں گمراہ ہو گیا ہوں۔ کیا آپ کو یاد نہیں رہا کہ میں نے متھرا میں ہری کشن کے قدموں میں بیٹھ کر کہا تھا کہ میرے سامنے

دیویوں دیوتاؤں کی بات نہ کرو، اتحاد پیدا کرو اور مل کر محمود کا مقابلہ کرو مگر ایسا نہ ہوا۔ سب نے شکست کھائی۔ میں نے سنا ہے کہ لاہور کے مہاراجوں نے انسانی جانوں کی قربانیاں بھی دی تھیں۔ نوجوان لڑکیوں کو قتل کر کے ان کے خون سے دیوتاؤں کے پاؤں دھوئے تھے مگر انہیں شکست ہوئی۔

"میں آپ کو اپنے مذہب کا کرشمہ دکھاؤں گا" — پنڈت نے کہا۔

"میں نے کرشمے دیکھ لیے ہیں" — راجیپال نے کہا — "مجھے یہ بتاؤ کہ مسلمانوں میں وہ کونسی طاقت ہے کہ اتنی دور سے آتے ہیں۔ ان کی فوج تھوڑی ہوتی ہے۔ ان کو رسد نہیں مل سکتی مگر وہ ہمیں شکست دے جاتے ہیں .... آپ مجھے جواب نہیں دے سکتے۔ میں آپ کو بتاتا ہوں۔ آپ کو یاد ہو گا کہ ایک بار ایک مسلمان جاسوس کو پکڑ لائے تھے۔ آپ بھی موجود تھے۔ ہم اس سے پوچھتے تھے کہ اس کے اور ساتھی کہاں کہاں ہیں اور یہ بھی کہ محمود کا اب ارادہ کیا ہے آپ کو یاد ہو گا کہ اس نے کیا جواب دیا تھا"

"ہاں ہاں، یاد ہے" — پنڈت نے کہا — "اس نے کہا تھا کہ میرے جسم کے ٹکڑے کر دو، میں کچھ نہیں بتاؤں گا"

"اور اس نے کچھ نہیں بتایا تھا" — مہاراجہ راجیپال نے کہا — "میں نے اسے سونے کے ٹکڑے دکھائے تھے۔ وہ نہیں مانا تھا۔ میں نے راج محل کی سب سے زیادہ خوبصورت رقاصہ اس کے حوالے کر دی تھی۔ وہ ہنس پڑا تھا اور اس نے کہا تھا کہ میرے ایمان کو تم خرید نہیں سکتے۔ پھر آپ ایک پٹاری لے آئے تھے جس میں بڑا ہی زہریلا سانپ تھا۔ آپ نے اسے کہا تھا کہ آپ اسے اس سانپ کے ساتھ کال کوٹھڑی میں بند کر دیں گے۔ وہ اس سے بھی نہیں ڈرا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ ایمان کو سانپ نہیں ڈس سکتا"

"ہاں مہاراج!" — پنڈت نے کہا — "مجھے یاد ہے۔ ہم نے اسے تنگ سی کوٹھڑی میں بند کر کے اس میں سانپ چھوڑ دیا تھا مگر یہ آدمی سانپ کے زہر سے تڑپ تڑپ کر مر گیا تھا، اس نے راز کی کوئی بات نہیں بتائی تھی"

"یہ ہے مسلمانوں کی قوت!" مہاراجہ نے کہا۔ "یہ ایمان کیا ہے؟"
"اِسے ہم دھرم کہتے ہیں" ۔ پنڈت نے کہا ۔ "یہ ہم میں بھی پیدا ہو سکتی ہے۔"
"باتیں۔ باتیں کھوکھلی اور بے جان باتیں" ۔ مہاراجہ نے آہ لے کر کہا جیسے اُسے پنڈت کی باتوں کے ساتھ کوئی دلچسپی نہ ہو ۔ "آپ کو مذہب سے ہٹ کر کوئی بات کرنی نہیں آتی یا آپ کو سانپوں کے ساتھ دلچسپی ہے۔ آپ سانپ پکڑنا اور پالنا جانتے ہیں۔"

جب یہ خزانہ اپنے پہلے ڈھکے چھپے ٹھکانے پر پہنچا تھا اُس وقت سلطان محمود بڑی احتیاط سے قنوج کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اُسے بتایا گیا تھا کہ اُس کا اصل اور بڑا ہی خونریز مقابلہ قنوج میں ہو گا۔ کوئی جاسوس اُسے یہ نہیں بتا سکا تھا کہ قنوج میں مقابلہ ہو گا ہی نہیں اور وہاں مہاراجہ برائے نام فوج چھوڑ کر اور اُس کے سالاروں کے خفیہ قتل کا انتظام کر کے غائب ہو چکا ہے۔ اس سلسلے کی ایک قسط میں سنایا جا چکا ہے کہ غزنی کے ایک جاسوس کی اِسی پنڈت کے ساتھ اسی خزانے والے غار میں ملاقات ہو گئی تھی اور پنڈت نے یہ جان کر کہ یہ غزنی کا جاسوس ہے، اُسے یہ غلط اطلاع دے کر گمراہ کیا تھا کہ قنوج میں کئی فوجیں جمع ہیں جو غزنی کی فوج کو کچل کر رکھ دیں گی۔

جاسوس ضابح بروک نے اسی اطلاع کو مستند سمجھ کر سلطان محمود کو چوکنا کر دیا تھا۔ سلطان محتاط ہو کر اور قدم پھونک پھونک کر آگے بڑھتا رہا اور مہاراجہ راجیا پال قنوج سے نکل گیا۔ پنڈت دراصل وقت چاہتا تھا کہ وہ راجیا پال کو جم کر مقابلہ کرنے کے لیے روک لے لیکن راجیا پال منہ موڑ گیا۔ اگر سلطان محمود اپنی مخصوص رفتار سے پیشقدمی کرتا جسے صحیح معنوں میں برق رفتار پیشقدمی کہتے ہیں اور جس کے لیے غزنی کی فوج شہرت یافتہ تھی تو وہ راجیا پال کے فرار سے پہلے قنوج پہنچ جاتا مگر پنڈت کا دھوکہ کامیاب رہا۔

راجیا پال اور پنڈت نے خزانہ اپنے ٹھکانے پر پہنچا دیا۔ وہاں ایک قدرتی غار تھا جسے انہوں نے اور زیادہ لمبا کر لیا تھا۔ رات کو جب اتنے زیادہ بکس

وہاں پہنچے تو محافظوں میں سے صرف چار پانچ کو اس اعتماد میں لیا گیا کہ اُن سے بکس اتروا کر غار میں رکھوائے جائیں۔

اس سے اگلی رات وہاں جشن منایا گیا۔ شراب کا ذخیرہ ساتھ تھا ناچنے اور گانے والیاں بھی تھیں۔ ان کے سازندے بھی تھے۔ رات کو مشعلیں جلا کر جنگل میں منگل بنا دیا گیا۔ مہاراجہ نے اپنے محافظوں کو خوب عیش کرائی اور انہیں نقد انعام بھی دیئے۔ اب اُس کی زندگی اور سلامتی کا دارومدار انہی چند ایک محافظوں پر تھا۔ انہیں وہ بہت بڑی قیمت دے کر بھی خوش رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس جشن میں دو افراد نہیں تھے۔ ایک تو پنڈت تھا اور دوسرے اُس کی رانی۔ مہاراجہ راجیا پال دونوں کی غیر حاضری کو محسوس نہیں کر رہا تھا۔ پنڈت اپنے خیمے میں عبادت میں مصروف تھا۔ اُس نے چھوٹے چھوٹے دو بُت اپنے ساتھ رکھے ہوئے تھے۔ عبادت کے بعد وہ کوئی مذہبی کتاب پڑھ رہا تھا کہ رانی خیمے میں آئی۔ وہ بوڑھی ہو گئی تھی۔ راجیا پال کو اس کے ساتھ اتنی سی دلچسپی رہ گئی تھی کہ وہ اُس کے جوان اور اپنے جانشین بیٹے کی ماں تھی۔ وہ پنڈت کے پاس بیٹھ گئی۔

"کیا آپ نے سمجھنے کی کوشش کی ہے کہ مہاراج کیا کر رہے ہیں اور ان کے ارادے کیا ہیں؟" پنڈت نے رانی سے پوچھا۔ "کیا یہ موقع خوشیاں منانے اور شراب پینے کا ہے؟"

"میں کچھ نہیں سمجھ سکی" رانی نے جواب دیا۔ "میری نگاہیں اب اپنے بیٹے پر لگی ہوئی ہیں۔ اس کا مستقبل تاریک ہو گیا ہے۔ ہمارے ہاتھ میں باری ہے جیسے ہم قنوج کی طرح اپنی راجدھانی بنا سکتے ہیں۔ قنوج ہمیں واپس نہیں مل سکتا..... میرا خیال ہے کہ مہاراج پاگل ہو چکے ہیں۔ میں ان سے کوئی بات پوچھتی ہوں تو مجھے یوں ٹال دیتے ہیں جیسے راج کے ساتھ میرا کوئی تعلق ہی نہ ہو..... کیا آپ کچھ نہیں کر سکتے؟ کوئی ٹونہ، کوئی جادو کر دکھائیں۔ آپ

کے ہاتھ میں بہت کچھ ہے"۔

"میں یہی سوچ رہا ہوں"۔۔۔ پنڈت نے کہا۔۔۔"مہاراج کے دماغ پر قابو پانے کی کوشش کروں گا ..... میرا حساب بتا رہا ہے کہ ایک انسان کی قربانی دینی پڑے گی۔ ایک لڑکی کا خون بہانا پڑے گا۔"

"لڑکی کہاں سے آئے گی؟"

"میں نے دیکھ لی ہے"۔۔۔ پنڈت نے کہا۔۔۔"وہ ناچنے والی جو سب سے چھوٹی ہے ... نندیا"

"کریں"۔۔۔ رانی نے کہا۔۔۔"آپ جب چاہیں اُسے قربانی کے لیے لے سکتے ہیں۔ وہ بہت خوبصورت ہے اور نوجوان بھی ہے۔ قربانی ایسی ہی لڑکی کی ہونی چاہیئے۔"

باری دریائے گنگا سے دُور ایک قصبہ تھا جو قنوج سے تین دنوں کی مسافت پر تھا۔ یہ قنوج کی ریاست میں تھا۔ تمام مورخین نے لکھا ہے کہ مہاراجہ راجیا پال نے باری کو اپنا دارالحکومت بنا لیا تھا جہاں اُس نے اپنے بیٹے لچھمن پال کو بھیج دیا تھا۔ اُس نے باری کو قنوج کے پیمانے کا شہر بنانے کے لیے تعمیر شروع کرا دی تھی۔ اُس نے اپنی فوج قنوج کے محاصرے سے پہلے ہی باری بھیج دی تھی لیکن جنگل میں وہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ کیا کرے۔ سلطان محمود اُس پر آسیب کی طرح غالب آ گیا تھا۔ ایک مورّخ سبط الجوزی نے یہاں تک لکھا ہے کہ مہاراجہ راجیا پال درپردہ اسلام قبول کرنے کا ارادہ کر چکا تھا۔

جنگل کی ایک رات تھی۔ مہاراجہ کو یہاں آئے ڈیڑھ دو مہینے گزر چکے تھے۔ پنڈت اپنے خیمے میں عبادت میں مصروف تھا۔ گھٹاؤں کی گرج سنائی دی اور ہوا تیز ہو گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد بجلی چمکی اور بڑی زور کا دھماکہ ہوا۔ اس کے بعد بجلی بار بار چمکنے اور کڑکنے لگی۔ جنگل دودھ کی مانند سفید روشنی سے روشن ہو جاتا تھا۔ اتنی زور کا مینہ برسنے لگا جیسے ژالہ باری ہو رہی ہو۔ اُس

وقت مہاراجہ راجیا پال اپنے خیمے میں نہیں بلکہ اُس غار میں تھا جس میں اُس نے ایک اور غار کھدوا کر خزانہ چھپا رکھا تھا۔ وہ اپنے خیمے کو جانے لگا تو بجلی اور بارش نے اُسے روک لیا۔

یہ ایک طوفانی بارش تھی۔ آسمان پھٹا جا رہا تھا۔ بجلی اتنی زور سے کڑکتی اور چمکتی تھی کہ دل دہل جاتے تھے۔ غار میں ایک مشعل جل رہی تھی۔ باہر گھوڑے ڈر کر ہنہنا رہے تھے۔ پنڈت غار کے مُنہ میں نمودار ہُوا اور اندر چلا گیا۔ اُس نے مہاراجہ کو بتایا کہ وہ اُس کے خیمے میں گیا تھا۔ وہ اُسے نہ ملا تو اِدھر آگیا۔ اُسے مہاراجہ کے متعلق فکر پیدا ہو گیا تھا۔ بارش اور تیز ہو گئی۔

ڈیڑھ ایک گھنٹے کے بعد باہر شور و غل بپا ہو گیا۔ گھوڑے بڑی زور سے ہنہنانے لگے۔ باہر بھگدڑ مچ گئی تھی۔ بارش کے شور کے ساتھ ایک اور شور سنائی دینے لگا اور اس کے ساتھ یہ گھبرائی ہوئی آوازیں ـــ "پانی آگیا.... سیلاب آگیا.... خیمے اُکھاڑ دو"

مہاراجہ اور پنڈت نے غار کے دہانے میں سے دیکھا۔ بجلی چمکتی اور کڑکتی تھی تو انہیں سیلابی پانی غرّاتا دکھائی دیتا اور لوگ بھاگتے دوڑتے نظر آتے تھے۔ لچھمن پال دوڑتا غار میں آگیا۔ یہ جگہ دو پہاڑیوں کے درمیان تھی۔ ان لوگوں کو معلوم نہیں تھا کہ یہاں سے اوپر کے علاقے کا برساتی سیلاب گزرتا ہے۔ اب یہ سیلاب چڑھ رہا تھا۔ بارش اور تیز ہو گئی تھی۔ بجلی پہلے کی طرح کڑک رہی تھی اور اس کے ساتھ سیلاب غرّاتا ہُوا گزر رہا تھا اور چڑھ بھی رہا تھا۔ مہاراجہ کے آدمی بلند جگہوں پر جا رہے تھے۔

پانی غار میں بھی آنے لگا۔ غار ذرا اونچا تھا اس لیے اندر تھوڑا پانی آ رہا تھا۔

"مہاراج!ـــ پنڈت نے راجیا پال سے کہا ـــ"یہ ہر ہر مہادیو کا قہر ہے۔ سر جھکا لیں۔ معافی مانگیں۔ توبہ کریں۔ کیا آپ نے ایسی بارش کبھی دیکھی ہے؟"

مہاراجہ نے قہقہہ لگایا جیسے اُس کا دماغی توازن صحیح نہ رہا ہو۔ بولا ـــ

اُب طوفان میرا کیا بگاڑلیں گے۔ اب بجلیاں مجھے نہیں ڈرا سکیتں ..... لے جاؤ میرا خزانہ"!

پنڈت نے بارش اور سیلاب کے شور سے بلند آواز میں کہا۔ "مہاراج! آپ کو کیا ہوگیا ہے؟ باہر شیطان چیخ رہے ہیں۔ اس قہر کو سمجھیں۔ میں جو کہتا ہوں وہ کریں۔ ہاتھ جوڑیں۔ میں جو پڑھتا ہوں وہ آپ بھی پڑھتے جائیں"۔

مہاراجہ ایک بار پھر ہنسا۔ لچھمن پال جو جوان راجکمار اور جنگجو تھا، چہرے پر خوف کے آثار لیے اور ہاتھ جوڑے ہوئے کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ اُس کے مُنہ سے گھبرائی ہوئی آواز نکلی ۔۔۔ "وہ دیکھو"۔

مہاراجہ اور پنڈت نے غار کے دہانے کی طرف دیکھا۔ ایک اژدہا جس کا سر انسان کے سر جتنا بڑا تھا، غار میں داخل ہو رہا تھا۔ لچھمن پال کے پاس تلوار تھی جو اُس نے نکال لی۔ اژدہا آہستہ آہستہ رینگتا آ رہا تھا۔ شاید سیلاب میں کہیں سے بہتا آیا تھا۔ ایسے اژدہا دلدل یا پانی میں رہتے ہیں۔ وہاں خوراک نہ ملے تو خشکی پر آ جاتے ہیں۔ یہ سالم انسان یا جانور کو نگل لیتے اور دو دو تین تین مہینے سوئے رہتے ہیں۔ ان کی لمبائی چھ سے بارہ فٹ تک ہوتی ہے۔ بعض اژدہا اس سے بھی لمبے ہو سکتے ہیں۔

یہ جو غار میں داخل ہو رہا تھا، نو دس فٹ لمبا تھا۔ لچھمن پال نے تلوار نکالی تو پنڈت نے اُسے آگے بڑھنے سے روک دیا۔ مہاراجہ اُٹھ کر پیچھے ہٹ گیا۔ پنڈت نے مشعل اُٹھائی اور آگے کر دی۔ اژدہا ابھی پورا غار میں نہیں آیا تھا۔ پنڈت کو معلوم تھا کہ اژدھا زہریلے نہیں ہُوا کرتے نہ یہ ڈستے ہیں، بلکہ یہ شکار کو نگلا کرتے ہیں۔

"پنڈت جی مہاراج!" ۔۔۔ مہاراجہ راجیاپال نے کہا۔ "آپ کو سانپوں کو پکڑنے اور قبضے میں رکھنے کی مہارت ہے۔ کیا آپ اس پر بھی قابو پا سکتے ہیں؟"

پنڈت نے نظریں اژدہا پر جمائے رکھیں اور مشعل کا شعلہ اُس کے اور

اپنے درمیان کیے رکھا۔ اُس نے کہا۔" اگر یہ دھرتی کا اژدہا ہُوا تو میں اسے قابو میں لے لوں گا لیکن مہاراج ! یہ دیوتا ہے"۔۔۔ پنڈت نے اُسے کچھ بتا کر کہا۔" یہ پڑھتے رہیں۔ ہری کرشن آپ سے کوئی بہت بڑا کام کرانا چاہتے ہیں"۔

مہاراجہ اور اُس کے بیٹے لچھمن پال نے وہی پڑھنا شروع کردیا جو پنڈت نے بتایا تھا۔ پنڈت نے مشعل کا ڈنڈہ پکڑے ہوئے شعلہ آگے کر رکھا تھا اس لیے اژدہا جو بہت آہستہ آہستہ اندر آرہا تھا کُنڈلی مارنے لگا اور رُک کر اکٹھا ہوگیا۔ وہ سَر کو اٹھاتا اور اِدھر اُدھر دیکھتا تھا۔ پنڈت نے لچھمن پال سے کہا کہ اندر کے غار میں رسّہ ہوگا وہ لے آؤ۔

لچھمن پال نے تلاش کر کے رسّے کا ایک لمبا ٹکڑا پنڈت کے ہاتھ میں دے دیا۔ پنڈت نے مشعل لچھمن پال کو دے کر اُسے کہا کہ اژدہا کے آگے کیے رکھے۔ اُس نے رسّے کا پھندا بنالیا۔ اژدہا اپنی آنکھوں کے آگے شعلے کی وجہ سے کچھ دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اُس نے ایک بار سَر اُٹھایا تو پنڈت نے پھندا پھینکا جو اُس کے سَر سے سرک کر گردن پر چلا گیا۔ پنڈت نے رسّہ کھینچا تو اژدھا کا منہ کھُل گیا اور اُس کا اتنا لمبا جسم تڑپنے لگا۔ پنڈت اُچھل کر اُس پر بیٹھ گیا اور رسّہ اس کے گرد اس طرح لپیٹ کر کس دیا کہ وہ بے بس ہوگیا۔

بارش کا زور تھمنے لگا تھا۔ پنڈت نے مہاراجہ راجیا پال کو اژدہا سے بہت ڈرایا۔ مہاراجہ پر خاموشی طاری ہوگئی تھی۔ پنڈت نے اُسے کہا کہ وہ اب غار میں ہی آرام سے سو جائے۔

دوسرے دن مہاراجہ کی آنکھ اُس وقت کھُلی جب سورج بہت اُوپر آگیا تھا۔ اُس نے غار سے دیکھا۔ وہاں نہ پنڈت تھا نہ اژدھا لچھمن پال بھی نہیں تھا۔ وہ باہر نکلا۔ باہر کی دنیا بدلی ہُوئی تھی۔ سیلاب گزر گیا تھا۔ خیمے کھڑے کیے

جا رہے تھے۔ مہاراجہ نے کسی سے کہا کہ پنڈت کو بلا لائے۔

پنڈت آیا تو مہاراجہ نے اُس سے پوچھا ”رات اژدہا کو مار دیا گیا تھا؟“

”وہ اژدہا نہیں دیوتا تھا“ — پنڈت نے کہا — ”وہ آپ کو وہی بات کہنے آیا تھا جو میں ایک عرصے سے آپ کو کہہ رہا ہوں۔ میں بھی اسے اژدہا ہی سمجھا تھا۔ کوئی انسان اتنے بڑے اژدہا پر قابو نہیں پا سکتا۔ مجھے اشارہ ملا تو میں نے اسے رسّے سے قابو کر لیا۔ آپ سو گئے پھر راجکمار چلا گیا تو اژدہا نے مجھے اپنا آپ دکھایا۔ میں اس کے ساتھ باہر نکل گیا۔ اُس نے کہا کہ مندروں کی تباہی اور ہماری توہین کا انتقام لو۔ ہماری روحوں کو بہت تکلیف پہنچ رہی ہے۔ ہم جب آتے ہیں تو بجلیاں چمک چمک کر ہمارا راستہ روشن کرتی ہیں اور بارش ہمارا راستہ دھو ڈالتی ہے۔ ہم اپنی بجلیاں ان پر بھی گرا سکتے ہیں جنہوں نے ہماری روحوں کو تکلیف دی ہے لیکن ہم انہیں باز آ جانے کا موقع دے رہے ہیں ... دیوتا نے مجھے کہا کہ اپنے راجہ سے کہو کہ اپنی راجدھانی میں مسلمانوں کی اذانیں بند کرو۔ یہ آوازیں ہمیں چین نہیں لینے دیتیں“

”دیوتا کہاں چلے گئے ہیں؟“ — مہاراجہ قنوج نے پوچھا — ”کہاں گئے ہیں؟“

”جہاں سے آئے تھے“ — پنڈت نے کہا — ”میں نے ان کے قدموں میں سر رکھ کر معافی مانگی ہے۔ آپ کی طرف سے بھی ہاتھ جوڑے تھے مگر وہ سخت ناراض تھے۔ کہتے تھے کہ ان کی بجلیاں ان پہاڑوں کو جڑوں سے اکھاڑنے آئی تھیں۔ ہم سب کو جلا کر بھسم کرنے آئی تھیں۔ دیوتا کہتے تھے کہ مہاراجہ کا خزانہ دفن کر دیں گے ...... میں نے بڑی مشکل سے انہیں راضی کیا۔ انہوں نے کہا ہے کہ ایک لڑکی (رقاصہ) کی قربانی دو۔ ان کے اشارے پر میں نے رقاصہ کا انتخاب کر لیا ہے“

”کون ہے وہ؟“

”نندیا“

”نہیں“ — مہاراجہ راجیپال نے کہا — ”پنڈت جی مہاراج! میں نندیا کی

قربانی نہیں دوں گا"۔

"آپ غزنی کے سلطان کا مقابلہ نہیں کر سکے"۔۔۔ رانی نے خشمگیں لہجے میں کہا۔۔۔ "کیا آپ دیوتاؤں کا مقابلہ کر سکتے ہیں؟ ..... نندیا کی قربانی دی جائے گی"۔

"تم چپ رہو"۔۔۔ مہاراجہ نے گرج کر کہا۔

"پتی دیوتا نہیں ہو سکتا"۔۔۔ رانی نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔۔۔ "دیوتا پتی ہو سکتا ہے۔ مجھے دیوتاؤں کا حکم ماننا ہے، آپ کا نہیں"۔

"پتا مہاراج!"۔۔۔ راجیاپال کے بیٹے نے جو قریب ہی کھڑا تھا، کہا۔۔۔ "مجھے تلوار کا دھنی آپ ہی نے بنایا تھا۔ مجھے مجبور نہ کریں کہ ایک بیٹے کی تلوار اپنے باپ کا سر تن سے جدا کر دے۔ کوئی سپوت اپنا وطن اور اپنا مذہب اپنے باپ پر قربان نہیں کر سکتا۔ پنڈت جی مہاراج جو کہتے ہیں وہی ہو گا..... پتا مہاراج! مجھے معلوم ہے کہ آپ نے اپنا دھرم چھوڑ نہیں دیا لیکن آپ نے غزنی کے سلطان کو اپنے دماغ پر اور اپنے دل پر سوار کر لیا ہے"۔

مہاراجہ راجیاپال نے جب اپنی رانی اور اپنے بیٹے کا روّیہ دیکھا تو وہ دب گیا۔ وہ کچھ بھی نہ بولا۔ اس نے پنڈت سے یہ پوچھنے کی بھی جرأت نہ کی کہ دیوتاؤں نے صرف اسی کو تباہ کرنے کا تہیّہ کیوں کر رکھا ہے۔ متھرا قنوج سے زیادہ مقدّس جگہ تھی۔ وہاں کرشن مہاراج نے جنم لیا تھا۔ تھانیسر کا مندر بھی ہندوؤں کی بہت بڑی عبادت گاہ تھی۔ وہاں گھنٹیوں، سنکھوں اور بھجنوں کی بجائے اذانیں گونج رہی ہیں۔ دیوتاؤں نے وہاں کے راجوں مہاراجوں کو اژدہا بن کر نہیں ڈرایا تھا۔

مہاراجہ نے دیکھا کہ اس کی رانی اور اس کے بیٹے پر دیوتاؤں کا خوف طاری ہو گیا ہے تو وہ کچھ کہے بغیر اس غار میں چلا گیا جس میں اس نے خزانہ رکھوایا تھا۔

"یہ ہے ہندوؤں کا مذہب"۔۔۔ قنوج کے بڑے مندر کے سامنے ایک

آواز گرج رہی تھی۔

یہ آواز اُس خطیب کی تھی جو غزنی سے سلطان محمود غزنوی کے ساتھ آیا تھا۔ غزنی کی فوج کے ساتھ چند ایک امام بھی ہُوا کرتے تھے۔ جتنی فوج ایک جگہ اکٹھی ہو وہ نماز باجماعت پڑھا کرتی تھی۔ فرصت کے وقت امام اپنے اپنے دستوں کا ایمان اور حوصلہ برقرار رکھنے کے لیے وعظ سنایا کرتے تھے۔

غزنی کا خطیب قنوج کے بڑے مندر کے چبوترے پر کھڑا تھا۔ اُس کے ارد گرد ٹوٹے ہوئے بُتوں کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے سامنے غزنی کی فوج کھڑی تھی۔ اس کے پیچھے قنوج کے جنگی قیدی کھڑے تھے۔

"یہ ہے ہندوؤں کا مذہب" ــــ وہ بلند آواز سے کہہ رہا تھا ــــ "دیکھ لو ان کے خداؤں کے ٹکڑے تمہارے قدموں میں پڑے ہیں۔ خدا ایک ہے۔ وحدہٗ لاشریک ہے۔ تم یہاں کوئی ملک فتح کرنے کے لیے اور یہاں لوٹ مار کرنے کے لیے نہیں آئے۔ تم یہاں ایک باطل مذہب کی بیخ کنی کے لیے آئے ہو۔ تم سوال پوچھنا چاہو گے کہ ہم نے ہندوستان کا انتخاب کیوں کیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ سرزمینِ عرب کا ایک مجاہد محمد بن قاسم ایک مسلمان لڑکی کی پکار پر یہاں آیا تھا۔ اُس نے یہاں ایک بڑے جابر اور ظالم راجہ کو شکست دی لیکن یہ نوجوان قہر اور دہشت بن کر نہیں آیا تھا۔ اُس نے ثابت کر دیا کہ مسلمان کی تلوار چٹانوں کو کاٹ سکتی ہے اور مسلمان کا حسنِ سلوک پتھر کو موم کر سکتا ہے....

"محمد بن قاسم نے یہاں کے پتھروں کو موم کر دیا اور یہاں کے بُت اپنے آپ ٹوٹنے لگے۔ ہندو جوق در جوق اسلام قبول کرنے لگے۔ شمال مغربی ہندوستان اللہ اور رسولؐ کے نُور سے منوّر ہو گیا اور یہ مقدّس روشنی سارے ہندوستان میں پھیلنے لگی مگر حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ مجاہد کو مجرم بنا دیا گیا۔ محمد بن قاسم ایک ناہنجار خلیفہ کے قہر کا نشانہ بن گیا۔ ہندوستان سے وہ گیا تو ہندوؤں کے باطل مذہب نے پھر سر اٹھایا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مسجدیں مندر بنتی چلی گئیں اور ہندوؤں نے ریاکاری اور دہشت گردی سے مسلمانوں کا جینا حرام کر دیا ....

"غزنی کے مجاہدو! تم صرف غزنی کے پرچم کے نہیں اسلام کے علمبردار ہو۔ یہ خطّہ جو دارالاسلام بن گیا تھا بُت خانہ بن گیا۔ حق پر باطل غالب آنے لگا۔ اس باطل کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہ قوم جو ہندو کہلاتی ہے، سانپوں کی نسل سے ہے۔ اس کی خصلتیں زہریلے سانپوں سے ملتی ہیں اور یہ قوم سانپوں کی پجاری ہے۔ اس کے ہاں خدائے وحدہٗ لاشریک کا کوئی تصور نہیں جس دریائے گنگا اور جمنا کو تم نے روندا ہے اور اسے بارہا عبور کیا ہے انہیں بھی ہندو اپنے دیوتا کہتے ہیں۔ ان دریاؤں کے غلیظ پانی کو مقدس سمجھتے ہیں اور اس کی عبادت کرتے ہیں۔ اس میں نہا کر کہتے ہیں کہ گناہ دھل گئے ہیں بجلی چمکتی اور کڑکتی ہے تو اسے دیوتاؤں کا قہر کہتے ہیں اور مندروں کی گھنٹیاں بجنے لگتی ہیں۔ اژدہا کو دیکھ لیں تو اسے دیوتا کہتے اور اس کی پوجا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ درندے معصوم بچوں اور نوجوان لڑکیوں کی قربانی دیتے اور ان کے خون سے ان بتوں کے پاؤں دھوتے ہیں۔ کیا انسانی عقل اس درندگی کو نیکی کہہ سکتی ہے؟ اسے تم عبادت کہہ سکتے ہو؟ ....

"اسلام کے پاسبانو! تم یہاں پنڈتوں کی اس ریاکاری کا قلع قمع کرنے آئے ہو۔ اگر تم نے اس مذہب کو جڑوں سے نہ اکھاڑ پھینکا تو یہ زمین ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کے خون کی پیاسی رہے گی۔ یہ قوم جو چند ایک توہمات کو اور اپنے بے بنیاد عقیدوں اور رسموں کو مذہب کہتی ہے مسلمانوں کی جڑیں کھوکھلی کرتی رہے گی۔ یہ کوئی مذہب نہیں۔ ان لوگوں کے پنڈتوں نے ان پر خوف طاری کر کے اپنی فریب کاری کو مذہب کا نام دے رکھا ہے۔ اگر ان کا مذہب سچا ہے تو ان کے ان خداؤں سے جو تمہارے قدموں میں پڑے ہیں، کہو کہ ہم سے اپنی توہین کا انتقام لیں۔ رات جو گزر گئی ہے بجلی کے دھماکوں سے کانپ رہی تھی۔ کیا تم اطمینان کی نیند نہیں سوئے رہے؟ کیا گذشتہ رات کی طوفانی بارش نے تمہیں ذرا سا بھی پریشان کیا تھا؟ .... نہیں بجلیاں اور طوفان کسی مسلمان کو نہیں ڈرا سکتے مگر تم رات کو ہندوؤں کو دیکھتے۔ وہ ساری رات ہاتھ جوڑ کر، خوف سے

کانپتے ہری رام ہری کرشن کا ورد کرتے رہے تھے ... حق وصداقت اور ایمان تمہاری قوت ہے۔ اس کے سامنے کوئی قلعہ کھڑا نہیں رہ سکتا۔ تمہارے خون کے جو قطرے اس زمین پر گریں گے وہ گلُ ولالہ کی صورت میں کھلیں گے اور یہ زمین اللہ کے نور سے گلرنگ ہو جائے گی"۔

قنوج کی فتح کا دھماکہ ڈیڑھ سو میل دور کالنجر میں اور اتنی ہی دور گوالیار میں بھی سنائی دیا۔ قنوج سے بھاگے ہوئے کچھ لوگ کالنجر جا پہنچے اور وہاں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ قنوج پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا ہے اور وہاں کا مہاراجہ لاپتہ ہے۔ کالنجر کا راجہ گنڈہ ایک مدت سے یہی ایک خبر سن رہا تھا کہ غزنی کے مسلمانوں نے حملہ کیا ہے اور فلاں راجہ بھاگ گیا ہے یا اس نے ہتھیار ڈال کر سلطان محمود کی اطاعت قبول کر لی ہے اور وہ غزنی کا باجگزار ہو گیا ہے۔ راجہ گنڈہ سلطان محمود کی پیشقدمی پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ اب سلطان اس کے دروازے پر آن پہنچا تھا۔ ڈیڑھ سو میل کوئی فاصلہ نہیں تھا۔ راجہ گنڈہ نے اسی وقت گوالیار کو روانگی کا حکم دے دیا۔

وہ جب گوالیار پہنچا تو اسے پتہ چلا کہ راجہ ارجن کو قنوج کے سقوط کی اطلاع مل چکی ہے۔ وہ پریشان بھی تھا اور بھڑکا ہوا بھی مگر وہ یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ مہاراجہ قنوج بھاگ گیا ہے، حالانکہ بتانے والوں نے یہی بتایا تھا کہ جب قنوج کا محاصرہ ہوا تو قلعے میں فوج بہت تھوڑی تھی اور مہاراجے کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ کوئی مقابلہ بھی نہ ہوا۔ مسلمان شہر میں داخل ہوئے اور شہر اور مندروں کی تباہی شروع ہو گئی۔

کالنجر اور گوالیار کے مہاراجوں نے مل کر مشترکہ منصوبہ بنایا کہ سلطان محمود پر جاسوسوں کے ذریعے نظر رکھی جائے کہ وہ آگے بڑھتا ہے یا قنوج میں رہتا ہے یا واپس چلا جاتا ہے۔ اگر وہ قنوج میں رکتا ہے تو اس پر وہیں حملہ کیا جائے اور اس حملے میں لاہور کے راجہ بھیم پال نڈر کی فوج کو بھی شامل کیا جائے۔

مہاراجہ کالنجر ابھی گوالیار میں ہی تھا کہ قنوج کے راج دربار کا ایک اعلیٰ رتبے کا آدمی کالنجر کے راستے گوالیار پہنچا۔ کالنجر میں اُسے بتایا گیا تھا کہ مہاراجہ گنڈا گوالیار میں ہے ۔ اس آدمی نے دونوں مہاراجوں کو بتایا کہ مہاراجہ قنوج محاصرے سے پہلے ہی کہیں غائب ہو گیا تھا۔ غزنی کا سلطان محمود آیا تو اُس نے خزانہ کھلوایا۔ خزانہ بالکل خالی تھا۔ مہاراجہ کے گھر کے ہیرے جواہرات اور زیورات وغیرہ بھی غائب تھے۔ قلعے میں فوج بھی پوری نہیں تھی۔

" اس کا مطلب یہ ہُوا کہ مہاراجہ راجیا پال دشمن کو دیکھے بغیر غائب ہو گیا تھا"۔۔ مہاراجہ گنڈہ نے کہا۔۔" اور وہ فوج کو بھی ساتھ لے گیا تھا"۔

" کیا ہندو جاتی اس کا یہ گناہ معاف کر دے گی؟" ۔۔ راجہ ارجن نے غضبناک آواز میں کہا ۔" کیا یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ گیا کہاں ہے ؟"

" یہ معلوم نہیں ہو سکا"۔۔ اس آدمی نے جواب دیا۔۔" اور دوسری خبر یہ ہے کہ سلطان محمود غزنی چلا گیا ہے"۔

" اور اُس کی فوج ؟"

" کچھ ساتھ لے گیا ہے، کچھ قنوج میں چھوڑ گیا ہے"۔

" کہیں ایسا تو نہیں کہ مہاراجہ راجیا پال نے سلطان محمود کے ساتھ کوئی خفیہ معاہدہ کر لیا ہو ؟"۔۔ راجہ ارجن نے پوچھا۔۔" اور سلطان کو خوش کرنے کے لیے اپنی فوج جسے وہ اپنے ساتھ لے گیا ہے ، ضرورت کے وقت سلطان کو دے دے ؟"

" ہمیں سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا پڑے گا"۔ مہاراجہ گنڈہ نے کہا۔۔" راجیا پال کو ہم سارے ہندوستان کی عزّت کا رکھوالا سمجھتے تھے مگر وہ بزدل نکلا۔ متھرا، مہابن، بلند شہر اور منج کی فوجیں ختم ہو چکی ہیں۔ لاہور کے راجہ بھیم پال نڈر پر نظر اٹھتی ہے مگر وہ غزنی والوں کا باجگزار ہے۔ وہ ہمارا ساتھ نہیں دے گا"۔

" مگر ہم یہاں بیٹھے تماشہ تو نہیں دیکھ سکتے"۔۔ راجہ ارجن نے کہا۔۔" اپنے دیس اور اپنے مذہب کی خاطر ہمیں اپنا سب کچھ داؤ پر لگانا ہو گا۔ مسلمانوں

کو ہم اتنی آسانی سے ہندوستان کی حکمرانی نہیں لینے دیں گے۔ مسلمانوں کی حکمرانی کا مطلب یہ ہوگا کہ صرف ہمیں ہی نہیں، ہمارے مذہب کو بھی ختم کر دیا جائے گا۔"

مؤرخین نے جن میں گردیزی، ابن الاثیر، سمتھ اور فرشتہ قابلِ ذکر ہیں، لکھا ہے کہ کالنجر اور گوالیار کے مہاراجوں نے سلطان محمود کے خلاف متحدہ محاذ بنا لیا اور ان کے درمیان طے پایا کہ معلوم کیا جائے کہ مہاراجہ قنوج کہاں ہے اور راجہ بھیم پال نڈر کے ہاں ایلچی بھیجا جائے کہ وہ سلطان محمود کے خلاف لڑنے کے لیے تیار ہو جائے تاکہ اُسے فیصلہ کن شکست دی جا سکے۔

سلطان محمود غزنی چلا گیا اور قنوج کا قلعہ اپنے ایک سالار ابوالقدر کے حوالے کر گیا تھا۔ غزنی کی تاریخ میں دو سالاروں کو زیادہ شہرت ملی ہے۔ ایک ابوعبداللہ بن محمد الطائی تھا اور دوسرا ارسلان جاذب۔ ابوالقدر کا ذکر بہت کم آیا ہے لیکن قنوج میں اُس نے ایسے دفاعی انتظامات کیے اور انتظامیہ کا ایسا ڈھانچہ بنایا کہ قنوج کو اس نے محفوظ کر دیا تھا۔

مہاراجہ قنوج کا سراغ لگانا ممکن نہیں تھا۔ اُسے پنڈت نے اژدہا سے ڈرا دیا تھا اور اُس پر اس لیے بھی خاموشی طاری ہو گئی تھی کہ اُس کی پسندیدہ رقاصہ کو انسانی قربانی کے لیے منتخب کر لیا گیا تھا۔ اُس کا بیٹا لچھمن پال اُس کے پاس غار میں جا بیٹھا اور کہنے لگا کہ اُسے باری کو راجدھانی بنانے کی اجازت دی جائے۔ وہاں وہ تیاری کر کے سلطان محمود کو قنوج سے نکال لے گا اور شکست کا انتقام لے گا۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ وہ لاہور، کالنجر اور گوالیار کے مہاراجوں کو بھی اپنے ساتھ ملا لے گا۔

"کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ سلطان محمود تمہیں نئی راجدھانی آباد کرنے دے گا؟" — راجیا پال نے کہا۔ "اُس کے جاسوس دُور دُور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اُسے جونہی پتہ چلا کہ ہم باری میں اپنی فوج تیار کر رہے ہیں، وہ ہم پر ٹوٹ پڑے گا۔"

"تو کیا ہم جنگلوں میں چھپے رہیں گے؟" — لچھمن پال نے پوچھا۔
"میں نے ایک محفوظ طریقہ سوچا ہے" — راجیاپال نے کہا۔ "میں قنوج سلطان محمود کے پاس چلا جاتا ہوں۔ اُسے اس پر راضی کر لوں گا کہ مجھ سے تاوان لے لے اور میں اس کا باجگزار بھی رہوں گا اور وہ مجھے باری کو راجدھانی بنانے اور فوج تیار کرنے کی اجازت دے دے۔ میں اس کے ساتھ معاہدہ کروں گا کہ اس کے خلاف کبھی نہیں لڑوں گا اور اسے بوقتِ ضرورت فوج بھی دوں گا۔"
"نہیں" — لچھمن پال نے کہا — "آپ کا جانا ٹھیک نہیں۔ آپ اس پہلو پر غور کریں کہ سلطان محمود آپ سے خزانہ مانگے گا۔ اگر آپ نہیں دیں گے تو آپ کو قتل کرا دے گا..... اگر ایسا نہ ہوا تو بھی میں آپ کو نہیں جانے دوں گا کیونکہ ہم میں سے کسی کو آپ پر بھروسہ نہیں۔ آپ کے دماغ پر غزنی کا سلطان اتنا زیادہ سوار ہو گیا ہے کہ آپ اپنے مذہب سے بھی منحرف ہو گئے ہیں۔"
"تو کیا میں تم سب کا قیدی ہو گیا ہوں؟" — مہاراجہ نے پوچھا۔
"پنڈت جی مہاراج کہتے ہیں کہ آپ پر کسی شیطانی روح کا سایہ پڑ گیا ہے" — اُس کے بیٹے لچھمن پال نے کہا — "یہ سایہ لڑکی کی جان کی قربانی سے ہٹ جائے گا۔ پنڈت جی مہاراج کہتے ہیں کہ بھگوان جب کسی پر قہر برسانے پر آتے ہیں تو اُسے سب سے پہلے اپنے مذہب سے گمراہ کرتے ہیں۔"
"مذہب..... مذہب..... مذہب" — راجیاپال نے طنزیہ کہا۔ "میں مذہب سے تنگ آ گیا ہوں۔ میں کسی کا قیدی نہیں۔ تم جاؤ۔ باری چلے جاؤ۔ راجدھانی آباد کرو۔ میں تمہارا باپ ہوں۔ تم میرے جانشین ہو۔ میں تمہاری حفاظت کے لیے جو بہتر سمجھوں گا کروں گا۔"

پنڈت نے اپنا خیمہ اب دُور نصب کرایا تھا۔ مہاراجہ کی طرح اس کا خیمہ تین خیموں پر مشتمل تھا۔ ایک کو اُس نے عبادت گاہ بنا رکھا تھا۔ اس کے خیمے میں کوئی نہیں جا سکتا تھا۔ اُس نے جب رقاصہ نندیا کو اپنے ہاں بلایا تو وہ حیران

ہوئی کہ پنڈت نے اُسے کیوں بلایا ہے۔ وہ کسی رقاصہ کے ساتھ بات تک نہیں کیا کرتا تھا۔ نندیا اُس کے خیمے میں چلی گئی۔

"نندیا!" — پنڈت نے کہا "تم پاپ کی جلتی پھرتی مورتی ہو۔ تم مرجاؤگی تو لومڑی یا گیدڑی کے روپ میں دوسرا جنم لوگی۔ تمہارا وہ جنم دکھوں سے بھرا ہوگا۔ تمہاری روح بھٹکتی اور روتی رہے گی۔ تم پہلے جنم کو یاد کرکر کے بہت اذیّت اٹھاؤگی، لیکن ہر ہر مہادیو تم پر معلوم نہیں کیوں مہربان ہوگئے ہیں۔ انہوں نے تمہیں اپنی پتنی بنانے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ دیوتا کی خواہش حکم ہوتا ہے نندیا! تم اس جیون کو نہیں چھوڑنا چاہوگی لیکن تم خوش ہوجاؤ کہ تم آکاش کی رانی بنوگی۔"

"وہ کس طرح مہاراج؟"

"ہم تمہیں دیوتا کے قدموں میں قربان کررہے ہیں" — پنڈت نے کہا — "چاند کی بارھویں رات دیوتا تمہیں لینے آئیں گے۔ تمہارا خون اس زمین پر بہہ جائے گا کیونکہ یہ خون پاک نہیں۔"

"میں سمجھ گئی ہوں مہاراج!" — نندیا نے گھبرا کر کہا — "آپ میری گردن کاٹ دیں گے ... نہیں مہاراج! میں یہ موت نہیں مرنا چاہتی۔"

"تمہیں مرنا ہوگا نندیا!" — پنڈت نے کہا — "اپنے مذہب اور اپنے مہاراجہ کی خاطر تمہیں جان دینی ہوگی۔"

نوجوان رقاصہ نے بھاگ جانے کے لیے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پنڈت نے اُسے تسلّی دلاسہ دیا اور کہا — "تم دیوتاؤں کی خواہش کو ٹھکراؤگی تو تمہارا یہ حسین چہرہ جھرّیوں سے بھر جائے گا۔ آنکھیں سفید ہوجائیں گی اور کمر جھک جائے گی۔ تم مہاراجہ کے قابل نہیں رہوگی۔ وہ تمہیں جنگل میں چھوڑ آئیں گے ... دیوتا آگئے ہیں۔ آؤ تمہیں دکھاؤں۔"

وہ اُسے دوسرے کمرے میں لے گیا جو خیمہ ہی تھا۔ اُس نے ایک جگہ خشک گھاس ڈال رکھی تھی۔ لکڑی سے گھاس ہٹائی تو ایک گڑھا نظر آیا۔ پنڈت

نے نندیا کو آگے کر کے گڑھا دکھایا۔ اس میں ایک اژدہا کنڈلی مارے ہوئے تھا۔ اس پر رسّہ لپٹا ہُوا تھا۔ نندیا کی دبی دبی سی چیخ نکل گئی۔

"یہ ہیں دیوتا جو ہمارے مہمان ہیں"

"کیا آپ مجھے اس گڑھے میں پھینک دیں گے؟" — نندیا نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

پنڈت نے ایک پھول رقاصہ کی ناک سے لگا دیا اور کہا کہ اسے سونگھو۔ یہ مہادیو کا تحفہ ہے۔ رقاصہ نے پھول سونگھا اور اُس پر غنودگی طاری ہوگئی۔ ذرا سی دیر بعد وہ ڈولنے لگی۔ پنڈت نے اُسے تھام لیا اور دوسرے خیمے میں جا کر لٹا دیا، پھر اس نے جا کر اژدہا پر گھاس بکھیر کر اُسے چھپا دیا۔

دو تین راتیں گذر گئیں۔ رات کے اندھیرے میں کوئی آدمی سایہ بن کر دبے پاؤں خیموں کے ساتھ ساتھ چلتا اور رُکتا تھا۔ ایک رات وہ پنڈت کے خیمے کے ساتھ جا کھڑا ہوا اور بیٹھ کر کان خیمے کے ساتھ لگا دیئے۔ وہ خیمے کے اردگرد رینگتا رہا اور رینگتا ہوا پرے چلا گیا۔ اگلی رات وہ مہاراجہ کے خیموں کے قریب چلا گیا۔ للکار سنائی دی — "کون ہے" — یہ سایہ سا وہیں سے غائب ہوگیا۔ اندھیرے میں سنسناتا ہُوا ایک تیر آیا جو اُس کے قریب سے گذر کر زمین میں جا لگا۔ وہ چھپالیوں کی طرح جھاڑیوں میں چلا گیا جہاں سے گیدڑ کی آوازیں سنائی دیں۔ محافظوں نے کہا — "گیدڑ ہے" — انہوں نے تلاش ترک کر دی۔

چند روز بعد مہاراجہ راجیاپال نے دو آدمی بلائے۔ دونوں اعلیٰ حکام تھے اور اُس کے معتمد۔ انہوں نے ہر حال میں مہاراجہ کا ساتھ دیا تھا۔ اب بھی انہوں نے اُسے یقین دلایا تھا کہ ہر مصیبت میں اور اُس کے ہر فیصلے میں اُس کا ساتھ دیں گے۔ اُس نے انہیں کہا کہ وہ قنوج جا کر سلطان محمود کی اطاعت قبول کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے کیونکہ اس کے بغیر وہ اپنا مستقبل نہیں بنا سکتا۔ مہاراجہ باگنگزار بن کر باری کو آباد کرنا چاہتا تھا لیکن پنڈت، اس کی رانی

اور اس کا بیٹا اس فیصلے کے سخت خلاف تھے۔

مہاراجہ نے اپنا شاہانہ لباس اتار کر بالکل معمولی سے کپڑے پہن لیے۔ ایسا ہی لباس اپنے دونوں ساتھیوں کو پہنایا۔ سر اور چہرے پر گرد ڈال لی۔ وہ تینوں جب یہ بھیس بدل رہے تھے، اُس وقت پنڈت اُس کے خیمے میں آیا لیکن اُسے کوئی دیکھ نہ سکا۔ اُس نے تینوں کو بھیس بدلتے دیکھا تو اُسے شک ہُوا۔ وہ وہیں سے واپس چلا گیا۔ مہاراجہ کا خیمہ سب سے الگ تھلگ اور دُور ہٹا ہُوا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اُسے کسی نے نہیں دیکھا۔

وہ تینوں گھوڑوں پر سوار ہوئے اور دوسری طرف جدھر ویرانہ تھا، نکل گئے۔ قنوج کی طرف جانے کے لیے جنگل میں سے نکلنے کا ایک ہی راستہ تھا جو چٹانوں کے درمیان سے گذرتا تھا۔ وہاں گھنے پودے اور درخت تھے۔ تینوں سوار ایک چٹان کی اوٹ میں جا کر خیمہ گاہ سے اوجھل ہو گئے اور اطمینان سے چلنے لگے۔ وہ جب دو چٹانوں کے درمیان سے گذر رہے تھے تو مہاراجہ کا گھوڑا جو آگے جا رہا تھا، رُک گیا اور آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا۔ اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ مہاراجہ کے ایک ساتھی نے کہا کہ گھوڑے نے سانپ دیکھ لیا ہے۔ اتنے میں دوسرے دو گھوڑے بھی رُک کر کانپنے لگے۔ گھوڑا اگر سانپ کو دیکھ لے تو بے لگام ہو کر بھاگ اٹھتا ہے یا ایک جگہ رک کر کانپنے لگتا ہے۔

جھاڑیوں میں سے ایک گرجدار اور بھاری سی آواز سنائی دی ـــ "واپس جاؤ۔ دل کے ارادے دل میں مار دو۔ واپس جاؤ۔ جہاں جا رہے ہو وہاں ذلّت کی موت ہے"ـــ یہ آواز رُک رُک کر آتی تھی اور اس کے ساتھ دھیمی سی آواز میں گھنٹیاں بجتی تھیں۔ ان کے بجنے کا خاص انداز تھا جس سے ہر ہندو واقف تھا۔ ایسی گھنٹیاں مندروں میں بجا کرتی ہیں۔

"یہ آواز کسی انسان کی معلوم نہیں ہوتی"ـــ مہاراجہ کے ایک ساتھی نے کہا۔

اچانک ایک گھنے پودے میں سے ایک اژدہا کا سر نظر آیا۔ اژدہا آہستہ آہستہ باہر آ رہا تھا۔ تینوں گھوڑے بدکے اور پیچھے کو بھاگ اٹھنے کی بجائے

دائیں بائیں ہو کر سرپٹ دوڑ پڑے اور بکھر گئے۔ گھوڑے بے لگام ہو گئے تھے۔ تینوں ماہر سوار تھے۔ انہوں نے دماغ حاضر رکھے اور گھوڑوں کو تھک جانے تک دوڑنے دیا۔

اُن کے چلے جانے کے بعد اژدہا ایک اور جھاڑی میں چلا گیا۔ ایک گڑھے میں سے جس پر ہری جھاڑیاں اور گھاس تھی، پنڈت نے سر نکالا۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر وہ اوپر آ گیا اور کھڑا ہو گیا۔ اُس نے ہاتھ اپنے ماتھے پر مارا جیسے اُسے تینوں سوار نکل جانے کا افسوس ہُوا ہو۔ اُس نے آسمان کی طرف دیکھا اور وہیں کھڑا رہا۔

کہیں سے ایک آدمی اُس کے سامنے آ گیا۔ پنڈت اسے پہچانتا تھا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر محافظ تھا۔ اُس نے نیام سے تلوار نکال لی اور بولا ــــ "نِندیا کہاں ہے؟"

"تم یہاں کیا لینے آئے ہو؟" ــ پنڈت نے اُسے ڈانٹتے ہوئے کہا ــــ "چلے جاؤ یہاں سے ورنہ مہاراجہ سے کہہ کر قتل کرا دوں گا"

"تمہاری اور مہاراجہ کی جانیں ہمارے قبضے میں ہیں" ــ محافظ نے کہا ــــ "میں پوچھتا ہوں تم نے نِندیا کو کہاں چھپا رکھا ہے؟ .... میں اس کی قربانی نہیں دینے دوں گا۔ تم یہاں سے زندہ نہیں جا سکو گے پنڈت!"

پنڈت اُسے دیوتاؤں کے قہر سے ڈرانے لگا۔ قریب کی ایک گھنی جھاڑی سے جو پنڈت کے پیچھے تھی۔ اژدہا نے سر نکالا اور آہستہ آہستہ باہر آنے لگا۔ ادھیڑ عمر محافظ نے دیکھا مگر پنڈت کو خبردار نہ کیا۔ اژدہا نے جھپٹ کر پنڈت کی ران منہ میں لے لی۔ پنڈت نے چیخ ماری۔ اژدہا نے اُسے اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا۔ اژدہا مگرمچھ کی طرح شکار کو چباتا نہیں سالم نگلتا ہے اور اس میں بہت وقت لگتا ہے۔ پنڈت نے چیخ چیخ کر محافظ سے کہا "اسے کاٹ دو۔ اسے تلوار سے کاٹ دو"

"یہ تمہارا دیوتا ہے پنڈت جی مہاراج!"۔۔۔ محافظ نے کہا۔"میں جانتا ہوں یہ کب سے تمہاری قید میں ہے۔ میں مہاراجہ کا وفادار ہوں، تمہارا نہیں۔ مجھے سب معلوم ہے تمہارا دیوتا ہمارے مہاراجہ کو روک نہیں سکتا"۔

"مجھے اس سے چھڑاؤ.... آگے آؤ"۔۔۔ پنڈت چلا رہا تھا۔

"نندیا کہاں ہے؟"

"بتادوں گا"۔۔۔ پنڈت نے درد سے کراہتے ہوئے کہا۔"اسے کاٹ دو"۔

"نندیا کہاں ہے؟"۔۔۔ محافظ نے کہا۔"وہ تمہارے لیے ناچنے والی ایک بے معنی لڑکی ہے لیکن میں اسے اپنی بیٹی سمجھتا ہوں۔ وہ یتیم لڑکی ہے جسے میرے ماں باپ نے پالا پوسا اور مہاراجہ کے ہاتھ بیچ دیا تھا۔ مجھے اس بچی کے ساتھ اتنا پیار تھا کہ میں اس کی خاطر مہاراجہ کے پاس آگیا۔ میں نے مہاراجہ کو تیر اندازی اور تیغ زنی کے جوہر دکھائے تو اس نے مجھے اپنے پاس رکھ لیا۔ میں مہاراجہ کا کم اور نندیا کا محافظ زیادہ ہوں"۔

"میرے خیمے سے دو سَو قدم پورب کی طرف چلے جانا"۔۔۔ پنڈت نے کہا۔"وہاں دو ٹیلوں کے درمیان جاؤ گے تو دائیں ٹیلے میں ایک شگاف دیکھو گے۔ اس میں چلے جانا۔ آگے گُف ہے۔ بہت سجی ہوئی جگہ ہے۔ تم بھی وہیں رہنا چاہو گے۔ تمہیں نندیا وہیں ملے گی.... آگے آؤ بدبخت! مجھے اس سے چھڑاؤ"۔

"تم اپنی ریاکاری کا شکار ہو رہے ہو"۔۔۔ محافظ نے کہا۔"تمہاری اپنی فریب کاریاں تمہیں نگل رہی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ اژدہا ہے دیوتا نہیں ہے"۔۔۔ محافظ نے قہقہہ لگایا اور تلوار نیام میں ڈال کر وہاں سے اُس سمت دوڑ پڑا جو اُسے پنڈت نے بتائی تھی۔

اژدہا نے پنڈت کو زمین پر بار بار پٹخا اور اس کی ران چھوڑ کر اس کا سر اپنے منہ میں لے لیا۔ پنڈت بے ہوش ہو چکا تھا۔ اژدہا اُسے اچھال اچھال کر

نگلنے لگا۔

ادھر عمر محافظ نے گھوڑا کہیں دور کھڑا کر رکھا تھا۔ وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور اُس جگہ پہنچا جو اُسے پنڈت نے بتائی تھی۔ نشانیاں بڑی صاف تھیں۔ وہ ٹیلے کے شگاف میں داخل ہو گیا۔ آگے خاصی کھلی گف تھی جس کے فرش پر مخمل جیسا کپڑا بچھا تھا۔ کچھ مورتیاں رکھی تھیں اور لوبان سلگ رہا تھا۔ نوجوان رقاصہ نے محافظ کو یوں دیکھا جیسے اُسے پہچانتی ہی نہ ہو۔ محافظ پرانی عمر کا تجربہ کار آدمی تھا۔ اُسے شک ہوا کہ نندیا کسی دوائی کے اثر میں ہے ورنہ یہاں سے اکیلی کہیں نکل جاتی۔ محافظ نے نندیا کو بلایا تو وہ مسکرائی۔

محافظ نے وقت ضائع نہ کیا۔ وہ تنومند آدمی تھا۔ اُس نے نندیا کو اُٹھا کر کندھے پر ڈال لیا اور باہر لے جا کر گھوڑے پر سوار کیا۔ خود بھی سوار ہوا اور جنگل کو نکل گیا۔

مہاراجہ راجیا پال کا بیٹا لچھمن پال اپنے باپ کو ڈھونڈھ رہا تھا۔ وہ پنڈت کے خیمے میں گیا۔ پنڈت وہاں نہیں تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ پنڈت نے نندیا کو کہاں رکھا ہوا ہے۔ وہاں گیا تو وہاں نندیا نہیں تھی۔ واپس خیمہ گاہ میں آیا تو ایک ملازم نے اُسے بتایا کہ پنڈت کو اُس نے فلاں طرف جاتے دیکھا تھا۔ وہ بہت بڑی گٹھڑی کو گھسیٹ کر لے جا رہا تھا۔ لچھمن پال اُدھر گیا۔ اُسے گٹھڑی گھسیٹنے کے نشان نظر آ رہے تھے۔ یہ نشان اُسے وہاں تک لے گئے جہاں اژدہا پنڈت کو آدھے سے زیادہ نگل چکا تھا۔ پنڈت کی ٹانگیں اژدہا کے منہ سے باہر تھیں۔

لچھمن پال نے تلوار نکالی اور اژدہا کو دو حصّوں میں کاٹ دیا مگر پنڈت جس شکنجے میں آ چکا تھا اس سے نہ نکل سکا۔ وہ بے حِس ہو چکا تھا۔ کبھی کا مر گیا تھا۔ لچھمن پال نے دیکھا کہ وہاں ایک موٹا کپڑا پڑا تھا اور ایک رسّہ بھی تھا۔ اُس نے رسّے کا یہ ٹکڑا پہچان لیا۔ جس رات اژدہا غار میں آیا تھا، لچھمن پال وہیں تھا۔ رسّے کا یہ ٹکڑا اُسی نے پنڈت کو دیا تھا۔ اُس نے اژدہا کو بھی

پہچان لیا لیکن سمجھ نہ سکا کہ یہ قصہ کیا ہے اور ہُوا کیا ہے۔

مہاراجہ راجیاپال بہت دُور جاکر اپنے ساتھیوں سے ملا۔ اُن کے گھوڑے بے لگام اور سرپٹ دوڑ دوڑ کر شل ہو گئے تھے۔ اس سے سواروں کو یہ فائدہ پہنچا کہ پورے دن کی مسافت آدھے دن میں طے ہو گئی۔ وہ قنوج کی طرف صحیح سمت پر جارہے تھے۔

محافظ دن بھر نندیا کو لیے لیے پھرتا اور اُسے دوائی کے اثر سے نکالنے کی کوشش کرتا رہا۔ شام کے بعد نندیا اپنے آپ میں آنے لگی اور اُس نے اس طرح باتیں کیں جیسے خواب سے بیدار ہوئی ہو۔ پنڈت نے کسی دوائی کے ذریعے اس کے دماغ کو ماؤف کر رکھا تھا۔ اُسے اتنا ہی اچھی طرح یاد تھا کہ پنڈت نے اُسے کہا تھا کہ وہ دیوتاؤں کو راضی کرنے کے لیے اُس کی جان کی قربانی دے گا۔ باقی سب باتوں کو وہ خواب کی باتیں سمجھتی تھی۔

"پنڈت خود دیوتا کا نوالہ بن گیا ہے"۔۔۔ محافظ نے اُسے بتایا۔۔۔ "اُس نے ایک اژدہا پکڑ رکھا تھا۔ اُس سے وہ مہاراجہ کا راستہ روکنا چاہتا تھا مگر اژدہا نے اُسی کو کھالیا"۔

"مہاراجہ کہاں ہیں؟"

"قنوج گئے ہیں"۔۔۔ محافظ نے جواب دیا "مسلمانوں سے صلح کریں گے"۔

"مسلمانوں سے صلح کرنے گئے ہیں؟"۔۔۔ نندیا نے حیران ہو کے کہا۔

"ہاں!"۔۔۔ محافظ نے جواب دیا۔۔۔ "اِن کی سلامتی اسی میں ہے۔ میری طرح وہ بھی سمجھ گئے ہیں کہ پنڈتوں کا یہ مذہب اُن کا اپنا فریب ہے اور میدانِ جنگ میں کوئی مدد نہیں کرسکتا۔ مہاراجہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں نے مندروں کو تباہ و برباد کر دیا ہے تو ہمارے دیوتاؤں نے اُن کا کیا بگاڑ لیا ہے؟"

"تم بھی اپنے مذہب کے خلاف ہو گئے ہو؟"۔۔۔ نندیا نے پوچھا۔

"ہمارا مذہب کیا ہے نندیا؟"۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔۔۔ "راجوں مہاراجوں

کوشش کرنا اور اُن کی جان بچانے کے لیے اپنی جان دے دینا ہمارا مذہب ہے .... مگر یہ باتیں ہمارے سوچنے کی نہیں۔ ہمیں اب یہ سوچنا ہے کہ جائیں کہاں .... کالنجر قریب ہے۔ ڈیڑھ دن کا سفر رہ گیا ہے۔ وہاں کے دربار میں تمہیں اور اپنے آپ کو پیش کروں گا۔ کسی نے قبول کر لیا تو وہیں رہیں گے۔ نہیں تو کہیں اور چلے چلیں گے۔"

انہوں نے وہ رات سفر میں گذاری۔ اگلی صبح وہ کالنجر کے قریب پہنچ گئے تھے ___ اور اُس صبح مہاراجہ راجیاپال قنوج میں داخل ہُوا۔ اُس کے دو نو ساتھی ساتھ تھے۔ تینوں کے حلیے عام سی قسم کے مسافروں جیسے تھے۔ مہاراجہ نے اپنی راجدھانی دیکھی تو اسے دھچکہ سا لگا۔ شہر اُجڑا اُجڑا تھا اور بعض مکان جلے ہوئے تھے۔ مہاراجہ آگے بڑھتا گیا اور بڑے مندر کے سامنے گھوڑے سے اُترا۔ کسی نے اُس کی طرف آنکھ اٹھا کے بھی نہ دیکھا۔ وہ مندر کے چبوترے پر چڑھ گیا۔ مندر خاموش تھا۔ وہاں بدبو سی تھی۔ یہاں تو خوشبو ہُوا کرتی تھی۔ اندر گیا تو مندر ویران تھا۔ نہ کوئی بُت نہ مُورتی۔ یہ تو اُجڑی ہوئی سرائے لگتی تھی۔ وہ اندرونی کمروں میں گیا۔

"میں کچھ نہیں سمجھ سکتا" ___ اُس نے جذبات سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں کچھ نہیں جانتا۔ کیا یہ دیوتاؤں کا قہر ہے کہ ہم اجڑے ہمارا شہر اُجڑا؟ .... کیا یہ میرا جرم ہے؟ .... میں نہیں جانتا کون جھوٹا ہے اور کون سچّا ہے۔ یہاں تو بھجنوں میں دیوتاؤں کے ساتھ میرا نام بھی لیا جاتا تھا۔"

"سچّا وہ خدا ہے جو بھجنوں اور گھنٹوں سے بے نیاز ہے" ___ اُس کے عقب سے آواز آئی۔

مہاراجہ نے گھوم کے دیکھا۔ ایک آدمی اُس کی زبان بول رہا تھا "کیا قنوج کا مہاراجہ اپنے جاہ وجلال کے اور اپنے باطل مذہب کے کھنڈرات دیکھ رہا ہے؟ .... کیا مہاراجہ عبرت حاصل کرنے آیا ہے؟"

"اوہ، تم؟ سنگرام؟" ___ مہاراجہ نے اس آدمی کو پہچانتے ہوئے پوچھا

"تم نہیں ہو؟ کیا کر رہے ہو؟"
"جو لوگ بہروپ میں آتے ہیں انہیں اصلی روپ میں لانے کا کام کرتا ہوں" — سنگرام نے کہا۔ "میں اب سنگرام نہیں عثمان ہوں، مسلمان ہو گیا ہوں۔ آپ مجھے غدار کہہ سکتے ہیں مگر مہاراجہ خود ہی قوم سے غداری کر جائے تو....."
"میں کسی کو غدار کہنے نہیں آیا" — مہاراجہ نے کہا "غزنی کے سلطان سے ملنے آیا ہوں"
"سلطان غزنی جا چکا ہے" — عثمان نے کہا "یہاں سالار ابوالقدر سلجوقی ہے"
"اس کے پاس لے چلو"

سالار ابوالقدر سلجوقی کو جب بتایا گیا کہ یہ شخص مہاراجہ قنوج ہے تو اس نے یقین نہ کیا۔ اسے یقین دلایا گیا تو اس نے پوچھا کہ مہاراجہ کیوں آیا ہے؟
"سلطان کی اطاعت قبول کرنے آیا ہوں" — مہاراجہ نے کہا — "آپ چاہیں تو مجھے قید کر لیں، چاہیں تو قتل کر دیں"
"میں ایک مہاراجہ کو اس حلیئے میں نہیں دیکھ سکتا" — ابوالقدر سلجوقی نے کہا — "اگر آپ کے کپڑے خون آلود ہوتے تو میں اور زیادہ خوش ہوتا کہ آپ اپنے ملک کے لیے لڑے ہیں مگر آپ میرے پاس آ گئے ہیں۔ میں آپ کا احترام کرتا ہوں" — ابوالقدر نے حکم دیا — "مہاراجہ کو غزنی کے امراء کا لباس پہنا کر لایا جائے اور ان کے ساتھیوں کو عزت سے رکھا جائے"

کچھ دیر بعد مہاراجہ نہا دھو کر نہایت اچھی پوشاک میں ابوالقدر کے سامنے آیا۔ ابوالقدر نے اس سے پوچھا کہ اس کے پاس ہے کیا جس کے بل بوتے پر وہ اپنے آپ کو قیدی نہیں سمجھتا اور اطاعت قبول کرے گا؟
"آپ کو یہاں خزانہ خالی ملا ہو گا" — مہاراجہ راجیا پال نے کہا — "وہ تمام

خزانہ میرے پاس ہے۔ میرے پاس باری نام کی اور جگہ ہے اور وہاں کچھ فوج بھی ہے۔ اگر آپ مجھے یقین دلا دیں کہ باری میں مجھے اپنی ریاست قائم کرنے دیں گے تو میں تاوان بھی ادا کروں گا اور باج بھی اور میں دوستی کا معاہدہ بھی کر دوں گا۔"

"آپ بھاگ گئے کیوں تھے؟" ــــ ابوالقدر نے پوچھا۔

"میں اس سوال کا جواب نہیں دوں گا" ــــ مہاراجہ نے کہا ــــ "کیونکہ یہ خوشامد ہوگی۔ میں نے اپنے دیوتاؤں کی بھی کبھی خوشامد نہیں کی۔"

"کیا آپ اسلام قبول کریں گے؟"

"میں مذہب کے نام سے بیزار ہوں" ــــ مہاراجہ نے جواب دیا ــــ "میں آپ کے سلوک سے اس قدر متاثر ہوا ہوں کہ کسی دن میرا دل مجھے کہے گا کہ اسلام قبول کر لو، لیکن ابھی آپ میری درخواست پر غور کریں۔"

"میں سلطانِ غزنی کے نام پر آپ کی درخواست قبول کرتا ہوں" ــــ ابوالقدر نے کہا ــــ "آپ اپنی نئی ریاست قائم کر لیں۔ میرے کچھ عسکری حکام باری جا کر جائزہ لیں گے کہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ تحریری معاہدہ ابھی ہو جائے گا۔ تاوان اور باج سلطانِ غزنی مقرر کریں گے۔ قاصد آج ہی روانہ ہو جائے گا۔"

ادھر نندیا اپنے محافظ کے ساتھ کالنجر پہنچ گئی۔ محافظ نے مہاراجہ کالنجر کو یہ خبر سنائی کہ مہاراجہ راجیاپال غزنی کی اطاعت قبول کرنے کے لیے قنوج چلا گیا ہے۔ مہاراجہ کالنجر گنڈہ تڑپ اٹھا۔ اس نے اسی وقت راجہ ارجن دگوالیارم کے نام پیغام لکھوا کر بھیج دیا جس میں لکھا کہ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا کہ راجیاپال کے قتل کا انتظام کیا جائے اور راجہ بھیم پال نڈر سے مل کر سلطان محمود کو ہمیشہ کے لیے ختم کیا جائے۔

غزنی کی آبرو

۴۰۹ ہجری (۲۰-۱۰۱۹ عیسوی) کے حج میں چند مہینے باقی تھے۔ حج کو جانے والوں کے قافلے تیار ہو رہے تھے۔ ہر علاقے کے سینکڑوں لوگ اکٹھے ہو جاتے اور گھوڑوں، خچروں اور اونٹوں پر اور پیدل قافلے کی صورت میں حج کو جایا کرتے تھے۔ ان قافلوں میں تاجر بھی شامل ہو جایا کرتے تھے۔ بعض مسافر اپنے بیوی بچوں کو بھی ساتھ رکھتے تھے۔ قافلہ جتنا چھوٹا ہوتا تھا، اس پر ڈاکوؤں کے حملے کا اتنا ہی زیادہ خطرہ ہوتا تھا، اس لیے قافلے بہت بڑے ہوتے تھے۔ جوں جوں قافلے بڑھتے جاتے تھے ان میں مسافر شامل ہوتے جاتے تھے۔

اس کے مطابق ڈاکوؤں نے بھی اپنے گروہوں کی نفری بڑھالی تھی۔ آگے چل کر سلطان صلاح الدّین ایوّبی کے دَور میں صلیبیوں نے اپنے فوجی دستوں سے حاجیوں کے قافلوں کو لوٹنا شروع کر دیا تھا۔ معروف مؤرخ محمد قاسم فرشتہ نے بہت سے مؤرّخوں کے حوالوں سے لکھا ہے کہ حماد بن علی نام کا ایک عرب سلطان محمود غزنوی کے دَور کا طاقت ور رہزن تھا۔ اُس نے عرب ممالک کے پسماندہ قبائل میں سے اپنا ایک گروہ بنا رکھا تھا جو قافلوں کو لوٹتا تھا۔ اس کا یہ گروہ ایک فوج بنتا جا رہا تھا۔ وہ عرب علاقوں میں حاجیوں کے قافلوں کو روکتا اور مال و دولت اور نوجوان لڑکیاں اڑا لے جاتا تھا۔ دو تین قافلے غزنی کے بھی لوٹے گئے تھے۔ محمود غزنوی کو اطلاع ملی تھی لیکن اُسے

ہندوستان کی جنگیں اور اپنے ہاں کی خانہ جنگی مہلت نہیں دیتی تھی کہ ڈاکوؤں کے انسداد کے لیے کچھ کرتا۔ اس کے علاوہ غزنی کے قافلے عرب کے دور دراز علاقوں میں لوٹے گئے تھے جو سلطان محمود کی دسترس سے باہر تھے۔

فرشتہ نے اُس دور کی تحریروں کی شہادت پر لکھا ہے کہ سلطان محمود کے دور میں القادر باللہ عباسی خلیفہ تھا اور خلافت کی گدّی بغداد میں تھی۔ خلافت اب اقتدار کی گدّی بن کر رہ گئی تھی۔ القادر باللہ ایک علاقے کا حکمران بھی تھا جس کے دفاع اور توسیع کے لیے وہ کوشاں رہتا تھا۔ اس کی یہ کوششیں درپردہ ہوتی تھیں۔ اقتدار پرستی اور شہنشاہیت کے لیے جھوٹ اور فریب ضروری ہوتا ہے، چنانچہ خلیفہ بعض سازشوں کا خالق تھا۔ سلطان محمود کے ساتھ بھی اُس کی ایک ٹکر ہو چکی تھی۔ مورّخ لکھتے ہیں کہ خلیفہ القادر باللہ کو معلوم تھا کہ عرب کے بعض قبائل جو بدّو کہلاتے ہیں، حماد بن علی کی قیادت میں قافلوں کو لوٹتے ہیں لیکن خلیفہ دانستہ نگاہیں پھیرے ہوئے تھا۔

انہی دنوں جب ہر علاقے میں حاجیوں کے قافلے تیار ہو رہے تھے، بغداد میں حماد بن علی خلیفہ کے ایک سالار کے گھر میں بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ دو بڑی حسین لڑکیاں تھیں جو کچھ دیر وہاں خاموش بیٹھی رہیں۔ سالار انہیں دیکھتا اور مسکراتا رہا۔ ان لڑکیوں کے علاوہ حماد بن علی کچھ اور تحفے بھی لایا تھا۔ تھوڑی دیر بعد لڑکیاں اور تحفے کسی اور کمرے میں چلے گئے۔ سالار اور حماد اکیلے رہ گئے۔

"خلیفہ کے مزاج کیسے ہیں؟" — حماد نے پوچھا —"حج کا موسم آ رہا ہے۔"

"خلیفہ کے مزاج پہلے کی طرح میرے ہی ہاتھ میں ہیں" — سالار نے جواب دیا — "مجھے معلوم تھا حج سے پہلے تم آؤ گے۔ ہمارا حصہ ہمیں مل جائے۔ خلیفہ کی پرواہ نہ کرو۔ اُسے خلافت کی گدّی سے پیار ہے اور اُسے ایسے مشیروں اور درباریوں کی ضرورت ہے جو اسے یقین دلاتے رہیں کہ وہ ساری دنیا کا بادشاہ ہے اور اُس کی رعایا اُس سے بہت خوش ہے۔ یہ کام ہم

کر رہے ہیں۔ اس کی نظر میں تم بہت بڑے تاجر ہو جس کی تجارت غزنی سے ہندوستان اور مصر تک پھیلی ہوئی ہے۔"

"اب میں اپنی تجارت غزنی تک پھیلانا چاہتا ہوں" ــــ حماد بن علی نے کہا ــــ "وہاں سے مجھے خبر ملی ہے کہ سینکڑوں آدمیوں کا قافلہ حج کے لیے آرہا ہے۔ اس کی تعداد بڑھتی جائے گی۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس قافلے میں ہندوستان کی دولت آرہی ہے.... کیا یہ صحیح ہے کہ غزنی کا سلطان محمود ہندوستان کے خزانے خالی کر لایا ہے؟"

"اس کے تحفے خلیفہ کے پاس بھی پہنچ چکے ہیں" ــــ خلیفہ کے سالار نے جواب دیا ــــ "یہ صحیح ہے کہ سلطان محمود ہندوستان سے اتنے زر و جواہرات اور درہم و دینار لایا ہے جو تمہارے اور میرے تصوّروں میں بھی نہیں آ سکتے۔"

"اور مجھے بتایا گیا ہے کہ اُس نے اپنی فوج کو مالِ غنیمت سے مالامال کر دیا ہے" ــــ حماد نے کہا ــــ "ان فوجیوں کے لواحقین حج کے لیے آرہے ہیں۔ ہندوستان کا قیمتی سامان ان کے ساتھ آرہا ہے جو ہماری منڈیوں میں فروخت ہوگا۔ قافلے کے ساتھ غزنی کے وہ تاجر بھی آرہے ہیں جنہوں نے سلطان کی فوج سے سامان خریدا ہے۔ ایسا قافلہ اس سے پہلے میرے ہاتھ کبھی نہیں آیا تھا۔ اب میری توجہ اسی قافلے پر مرکوز ہے۔ میں آپ کے پاس اس لیے آیا ہوں کہ آپ مجھے یقین دلائیں کہ میں اس قافلے پر ہاتھ ڈالوں تو خلیفہ میری گردن نہیں پکڑے گا۔ میں جانتا ہوں کہ خلیفہ سلطان محمود سے ڈرتا ہے۔"

"کیا میں نے تمہیں بتایا نہیں کہ خلیفہ تمہیں تاجر سمجھتا ہے؟" ــــ سالار نے کہا ــــ "کون جان سکے گا کہ غزنی کے قافلے کا تم نے صفایا کیا ہے؟.... ہاں، تمہیں ایک احتیاط کرنی پڑے گی۔ قافلہ بہت بڑا ہے اس لیے تمہارے ساتھ بہت سے آدمی ہونے چاہئیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سلطان محمود قافلے کے ساتھ فوج کا ایک دستہ بھی بھیج دے۔ وہ پکا مسلمان

ہے اور سنا ہے کہ وہ حج کے لیے جانے والوں اور حج سے واپس آنے والوں کا بہت احترام کرتا ہے اور انہیں ہر طرح کی سہولت دیتا ہے"

"اب تو میں بھی فوج اکٹھی کر سکتا ہوں" ــــ حماد بن علی نے کہا ــــ "تمام قبیلے میرے زیرِ اثر ہیں۔ میں سات آٹھ سو لشکری بڑی آسانی سے لے آؤں گا۔ کیا آپ ان قبیلوں سے واقف نہیں؟ .... اور پھر میں آمنے سامنے آ کر للکار کر تھوڑے ہی لڑوں گا۔ میں گھات لگاؤں گا۔"

"کسی پہاڑی علاقے میں؟" ــــ سالار نے جواب دیا۔

"نہیں۔ کید کے ریگستان میں" ــــ حماد نے جواب دیا ــــ "آپ کیسے سالار ہیں؟ کیا آپ ریگستان کی گھات نہیں جانتے؟ جب قافلے پر اچانک حملہ ہوگا تو قافلے والے اِدھر اُدھر بھاگیں گے۔ انہیں چھپنے کی کوئی جگہ نہیں ملے گی۔ میں کید کے ریگستان سے واقف ہوں۔ ایک علاقہ ریتیلے ٹیلوں کا ہے۔ اس کی بُھول بھلیوں سے صرف ہمارے قبیلے واقف ہیں۔ کوئی اجنبی ان میں پھنس جائے تو اُسے باہر نکلنے کا راستہ نہیں ملتا۔ اس علاقے میں غزنی کی فوج بھی نہیں لڑ سکتی۔ میرے ساتھ جو قبائل ہیں وہ انسان نہیں جن ہیں .... آپ مجھے خلیفہ سے ملوا دیں۔ اس کی خدمت میں بھی کچھ پیش کروں گا۔"

خلیفہ القادر باللہ عباسی اپنے خاص کمرے میں بیٹھا تھا اور اُس کا سالار جو اُس کا منظورِ نظر تھا اسے بتا رہا تھا کہ حماد بن علی اُس سے ملنے آیا ہے۔ وہ تحفے جو حماد لایا تھا، خلیفہ کے سامنے پڑے تھے۔ سالار نے حماد کی بہت تعریف کی اور خلیفہ کو بتایا کہ حماد بن علی بڑے کام کا آدمی ہے۔ وہ تمام سرکش قبائل کو آپ کی خلافت کا غلام بنا رہا ہے اور آپ کے لیے وہ ان قبائل میں سے فوج تیار کر رہا ہے۔ جب کبھی ہمیں ضرورت پڑی، یہ قبائل ہمارے دوش بدوش لڑیں گے۔"

"یہ قبائل سرکش اور خود سر ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ قافلوں کو لوٹتے ہیں اور

لڑکیاں بھی اٹھا لے جاتے جنہیں وہ بیچ ڈالتے ہیں“۔

”یہ اُن لوگوں کا بہتان ہے جو حماد کی مقبولیت اور طاقت سے خوفزدہ ہیں اور حسد کرتے ہیں“۔۔۔ سالار نے چاپلوسی کا کمال دکھاتے ہوئے کہا ۔۔۔ ”ہر وہ انسان جو لوگوں میں مقبول ہے وہ حاسدوں کے دل کا کانٹا سمجھا جاتا ہے۔ آپ کے بھی دشمن ہیں۔ وہ جب دیکھتے ہیں کہ آپ کی رعایا آپ کا نام سن کر سجدہ ریز ہو جاتی ہے تو وہ جلتے اور کڑھتے ہیں۔ حماد بن علی نے تمام سرکش قبائل کو اپنا مرید بنا رکھا ہے اور خود آپ کا مرید ہے۔ وہ تمام قبائل کو آپ کا مرید بنا چکا ہے“۔

”امیر المومنین!“۔۔۔ ایک اور درباری حاکم جو سالار کا ہی آدمی تھا، بول پڑا ۔۔۔ ”اِس عمر میں بھی آپ کا چہرہ مبارک جوانی کے خون سے دمک رہا ہے۔ حماد بن علی آپ کے لیے جو تحفہ لایا ہے، وہ آپ رات کو اپنے حرم میں دیکھ لیں گے“۔

”اور آپ اس تحفے کے قابل ہیں“۔۔۔ سالار نے کہا ۔۔۔ ”آپ حماد کو شرفِ باریابی بخشیں۔ وہ باہر انتظار کر رہا ہے“۔

”اسے انتظار میں باہر کیوں کھڑا رکھا گیا ہے“۔۔۔ خلیفہ نے ساری دنیا کے بادشاہ کی طرح جلالی سے لہجے میں کہا ۔۔۔ ”ایسے آدمی کو ہم اپنے برابر بٹھائیں گے“۔

فوراً حماد بن علی کو حاضر کیا گیا۔ وہ وجیہہ عرب تھا۔ چہرہ لال اور آنکھیں شربتی رنگ کی تھیں۔ ادھیڑ عمر تھا لیکن لگتا جوان تھا۔ اُس کے چہرے پر اُن عربوں کا جلال تھا جنہوں نے رُومیوں اور زرتشتوں کو گھٹنوں بٹھا دیا اور اسلام کا پرچم سمندر پار یورپ میں جا گاڑا تھا۔ حماد کے بازو لمبے اور کندھے سیدھے اور گوشت سے بھرے ہوئے تھے۔ وہ جب اندر آیا تھا تو اُس کے قدموں کے نیچے زمین ہلتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر تبسم تھا اور وہ مردانہ وقار کا شاہکار تھا۔ اُس کی آنکھوں کی چمک میں، اُس

کے چہرے کی دمک میں اور اُس کے ظاہری جاہ وجلال میں شائبہ تک نہ ملتا تھا کہ یہ شخص لٹیرا اور قاتل ہے۔

خلیفہ اُٹھ کھڑا ہوا اور ہاتھ حماد کی طرف بڑھا کر بولا ــــ "آگے آؤ حماد بن علی! خدا کی قسم، ہمیں تمہارے چہرے پر لکھا نظر آتا ہے کہ تم قصرِ خلافت کے پاسبان ہو۔ لوٹ مار کرنے والے وحشی قبائل کو لگام ڈال کر تم نے خلافت پر اور اسلام پر عظیم احسان کیا ہے۔"

"میں آپ کی رعایا ہوں یا امیرالمومنین!" ــــ حماد نے کہا ــــ "رعایا میں کون ایسا فرد ہے جو آپ کی عبادت نہیں کرتا؟ آپ نے ٹھیک فرمایا ہے کہ میں قصرِ خلافت کا پاسبان ہوں۔ میں اپنی جان اور صحرائی قبیلوں کی وفاداری پیش کرنے آیا ہوں۔"

خلیفہ نے حماد کو یوں اپنے برابر بٹھا لیا جیسے کسی نے سانپ اپنی آستین میں ڈال لیا ہو۔

یہ ۲۰-۱۰۱۹ء کا دور تھا جب سپین اُندلس کہلاتا تھا اور وہاں اسلامی پرچم لہرا رہا تھا مگر سرنگوں ہوتا جا رہا تھا۔ قرطبہ سازشوں کا اور اقتدار پرست پہلوانوں کا اکھاڑہ بن چکا تھا۔ طارق بن زیاد کی ہڈیاں خاک ہو چکی تھیں اور اُس کی روح اُس اُندلس کے لیے تڑپ رہی تھی جسے فتح کرنے کے لیے اُس نے سمندر پار کر کے کشتیاں جلا ڈالی تھیں تاکہ واپسی کا تصوّر ہی مِٹ جائے۔ وہ اُندلس، وہ طارق بن زیاد کا اُندلس ویسے ہی چاپلوس مشیروں اور درباری خوشامدیوں کی بھینٹ چڑھ رہا تھا جیسے بغداد کے قصرِ خلافت میں بھی موجود تھے۔ اُن دنوں جب بغداد میں ایک لٹیرا اور صحرائی قزّاق خلیفہ کے دربار میں ایک معزّز تاجر کے بہروپ میں پیش کیا گیا تھا، سپین کے حکمران چچا کا بھتیجا اُس کے خلاف لڑ رہا تھا۔ یہ خانہ جنگی تھی۔ وہاں خلافت وجہِ پیکار بنی ہوئی تھی۔ جو کوئی خلافت کی گدّی پر بیٹھ جاتا وہ ہر اُس آدمی کو قتل کرانے کی درپردہ

کوشش کرتا تھا جس سے اُس کے اقتدار کو خطرہ ہوتا تھا۔ اس کے باوجود اُس کے خلاف سازشیں ہوتی تھی۔

خوشامدیوں اور چاپلوسوں کا ایک ٹولہ تھا جو ہر خلیفہ کی مدح سرائی کرتا اور اُس پر غالب آجاتا تھا۔ دشمن سلطنتِ اسلامیہ کی جڑوں میں اُتر کر اُسے چوہوں کی طرح کھا رہے تھے۔ غدّاروں کے وارے نیارے تھے۔ نااہل اور بددیانت لوگ عہدے اور رُتبے حاصل کرنے لگے اور جو عہدوں اور رُتبوں کے اہل تھے وہ مشتبہ، تخریب کار اور شرپسند کہلانے لگے۔ اہلِ قلم بھی اپنا ایمان اور صداقت نیلام کر بیٹھے اور اندلس میں اسلام کا چراغ ٹمٹمانے لگا۔ اِدھر خلافتِ بغداد بھی شخصی حکومت کی صُورت اختیار کر چکی تھی۔ وزیر اور مشیر مفاد پرستی کے شکار ہو گئے، اور صحرائی قزّاق معززین میں شمار ہونے لگے تھے۔ حماد بن علی ایسے ہی افراد میں سے تھا۔ ایک سُلطان محمود غزنوی تھا جو اسلام کی مشعل اٹھائے ہند کے بُت خانے میں جان کی بازی لگائے ہوئے تھا۔ اسی لیے وہ اقتدار کے بھوکے لوگوں کے دلوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا۔

حماد بن علی کے ساتھ چار محافظ تھے جن میں ایک وجیہہ تُرک ازتگین تھا۔ وہ کوئی ایک سال پہلے حماد کے گروہ میں شامل ہُوا تھا اور حماد کا قابلِ اعتماد محافظ بن گیا تھا۔

جس طرح ہر اسلامی مملکت میں حج پہ جانے والوں کے قافلے تیار ہو رہے تھے، ایسا ایک قافلہ غزنی میں بھی تیار ہو رہا تھا۔ تیاری یہ تھی کہ قافلے میں زیادہ سے زیادہ لوگ شامل ہو جائیں تاکہ قزّاقوں اور رہزنوں سے محفوظ رہیں۔ قافلے میں تاجر بھی شامل ہو رہے تھے۔ گردونواح کے لوگ بھی غزنی میں جمع ہو رہے تھے۔ اونٹوں، گھوڑوں اور بیلوں کی خرید و فروخت ہو رہی تھی۔ بیل اور گھوڑا گاڑیاں تیار ہو رہی تھیں۔ یہ میلے کا

منظر تھا۔ اِس میلے میں حماد بن علی کے آدمی بھی گھوم پھر رہے تھے۔ وہ جائزہ لے رہے تھے کہ قافلے کے ساتھ کتنا مال جا رہا ہے اور جو لوگ ساتھ جا رہے ہیں وہ مزاحمت کے قابل ہیں یا نہیں۔

قافلے کو ڈیڑھ ایک ماہ بعد روانہ ہونا تھا۔ عرب کے صحرا میں کہیں ایک نخلستان تھا ــــ وسیع اور سرسبز ــــ وہاں خیمے لگے ہوئے تھے۔ مشعلیں جل رہی تھیں۔ خیموں کا ایک شہر آباد ہو گیا تھا۔ خیموں سے ذرا پرے سو سو آدمی گول دائرے میں زمین پر بیٹھے تھے۔ ایک جگہ قالین بچھے تھے۔ ان پر حماد بن علی بیٹھا تھا۔ وہاں بھی مشعلیں اور قندیلیں جل رہی تھیں۔ گول دائرے میں ایک رقاصہ ناچ رہی تھی۔ تین چار خوبصورت اور جوان عورتیں حماد کے ساتھ بیٹھے ہوئے آدمیوں کو شراب پیش کر رہی تھیں۔ ان کے کندھے، سینے اور نصف پیٹھیں ننگی تھیں۔ انہوں نے جو لمبے فراک پہن رکھے تھے ان پر ستارے سے چمک رہے تھے۔ ان عورتوں کی چال ایسی تھی جیسے ریت پر تیر رہی ہوں۔ مہمانوں کے آگے سالم بکرے روسٹ کر کے رکھے ہوئے تھے۔

رقاصہ کا رقص اور اس کے ساتھ صحرائی ساز وجد آفریں تھے۔ یہ الف لیلہ کی ایک بڑی ہی حسین اور پُراسرار رات تھی۔ صحرا کا یہ حصہ عام گزرگاہ سے بہت دُور تھا۔ یہ حماد بن علی کی دنیا تھی اور اس دنیا میں جو ریت کے سمندر میں جزیرے کی مانند تھی، اسی کی بادشاہی تھی۔ اُس کے پاس بیٹھے ہوئے لوگ عرب کے سرکش اور آزاد قبائل کے سردار اور سرکردہ لوگ تھے۔ ان کے انداز بتا رہے تھے کہ یہ کسی قانون کے پابند نہیں اور ان کے دِلوں میں خدا کا خوف بھی نہیں۔ اس محفل میں اتنی حسین لڑکیاں کسی اور ہی جہان کی مخلوق لگتی تھیں۔

رات شراب اور عیاشی میں بہتی، ڈوبتی اور اُبھر اُبھر کر ڈوبتی گزر گئی۔ سُورج اُبھرا تو یہ لوگ سو گئے، اور جب سُورج صحرا کو جھلساتا ہوا ڈوب گیا تو یہ پُراسرار لوگ

جاگ اُٹھے اور اُسی کھلی جگہ جا بیٹھے جہاں رات رقص اور شراب کی محفل جمی تھی مگر آج رات وہاں کوئی رقاصہ نہیں تھی۔ شراب پلانے والی عورتیں موجود تھیں۔

"میرے عزیز دوستو!" حماد بن علی نے سب سے مخاطب ہو کر کہا —— "حاجیوں کے قافلے چلنے والے ہیں اور دُور کے قافلے چل بھی پڑے ہوں گے مگر اب بہت بڑا شکار آرہا ہے یہ غزنی کا قافلہ ہے۔ اس کے ساتھ ہندوستان کا مالِ غنیمت آرہا ہے۔ تم نے اس سے پہلے غزنی کے قافلے مارے ہیں مگر اتنا مال ہاتھ نہیں آیا تھا۔ مجھے اطلاع ملی ہے کہ اب جو قافلہ آرہا ہے وہ تمہیں برسوں کے لیے مالا مال کردے گا مگر اس قافلے پر ہاتھ ڈالنا آسان نہیں ہوگا۔ قافلے میں ڈیڑھ ہزار سے زیادہ لوگ ہوں گے۔ سب مسلّح ہوں گے اور ان میں فوجی بھی ہوں گے۔ اس قافلے پر چند ایک آدمیوں کا گروہ ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ ہم سب کو مِل کر ایک فوج کی طرح حملہ کرنا ہوگا ..... کیا تم لوگ مجھے بتا سکتے ہو کہ ہر ایک کتنے آدمی اپنے ساتھ لا سکتا ہے؟"

"ایک ہزار" —— ایک نے ہاتھ اُٹھا کر کہا۔

"چھ سَو" —— ایک اور نے کہا۔

"چار سو"

ہر ایک نے بتایا کہ وہ کتنے آدمی لا سکتا ہے۔ یہ تعداد پانچ ہزار بن گئی۔

"یہ یاد رکھو کہ یہ پانچ ہزار قزّاق نہیں سپاہی درکار ہیں" —— حماد بن علی نے کہا۔ "ہو سکتا ہے ہمیں ایسی ضرورت پیش نہ آئے لیکن ہمیں باقاعدہ لڑائی کے لیے تیار رہنا چاہئے۔ میں بغداد سے آرہا ہوں۔ مجھے خلیفہ کے ایک سالار نے بتایا ہے کہ غزنی کا سلطان جس کا نام محمود ہے، حاجیوں کی بہت عزّت کرتا ہے اور ان کا بہت خیال رکھتا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ اتنے بڑے قافلے کے ساتھ فوج کا ایک دستہ بھیج دے۔"

ہر سردار نے پُرجوش آواز میں حماد کو یقین دلایا کہ وہ اپنے ساتھ ایسے جنگجو لا رہا ہے جو غزنی کی فوج کو کاٹ کر رکھ دیں گے۔

"اگر تم واقعی سپاہی بن کر آؤ گے تو تمہیں ایک اور انعام ملے گا"۔۔حماد بن علی نے کہا اُس کے پاس ایک بڑی ہی خوبصورت لڑکی بیٹھی تھی۔یہ لڑکی ایک سال سے اُس کے پاس تھی۔اُس نے لڑکی کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا "یہ غزنی کے حسن کا نمونہ ہے۔غزنی کے قافلے کے ساتھ ایسی بہت سی لڑکیاں آرہی ہیں۔پورے پورے کنبے آرہے ہیں۔یہ ایسا انعام ہے جو تمہیں اور کہیں سے نہیں ملے گا"۔

لڑکی جو مسکرا رہی تھی، سنجیدہ ہوگئی اور اُس کا چہرہ سُرخ ہوگیا۔حماد بن علی سب کو بتانے لگا کہ قافلے پر کس مقام پر حملہ کرنا ہے۔حماد کے پیچھے اس کا باڈی گارڈ ارتگین کھڑا تھا۔وہاں محافظ کو ساتھ رکھنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن وہ ان قبائل کا بادشاہ تھا اور بادشاہ اپنے ساتھ محافظ رکھا کرتے تھے۔جب حماد قبائل کے سرداروں سے مخاطب تھا، لڑکی نے نظر بچا کر ارتگین کی طرف دیکھا۔ارتگین کا چہرہ بے تاثر تھا۔لڑکی نے اُسے گھور کر دیکھا تو ارتگین کے چہرے کا رنگ بدل گیا جیسے اُس سے کوئی غلطی سرزد ہوگئی ہو۔

قبائلی سرداروں نے غزنی کے قافلے پر حملے کا منصوبہ طے کر لیا اور انہوں نے کید کے ریگستان کو حملے کے لیے موزوں سمجھا۔

اُسی رات کا واقعہ ہے کہ حماد بن علی گہری نیند سو گیا تھا۔دوسرے خیمے میں غزنی کی یہ لڑکی جس کا نام سبیلہ تھا، جاگ رہی تھی۔اس کی نیند اُڑ گئی تھی خیمہ گاہ پر موت کا سکوت طاری تھا۔ان لوگوں کو کوئی غم نہیں تھا۔کوئی خطرہ نہیں تھا۔انہیں پہرہ کھڑا کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔رہزنی اور قزاقی ان کا پیشہ تھا۔وہ وحشی تھے۔ان تک قانون کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا تھا۔

سبیلہ نے اُٹھ کر اپنے خیمے کا پردہ ذرا سا ہٹایا اور باہر دیکھا۔باہر تاریکی تھی۔وہ کسی کے انتظار میں تھی۔وہ پھر لیٹ گئی۔کچھ دیر بعد پھر اُٹھی اور خیمے کا پردہ ہٹا کر دیکھا اور اُس کی نظریں ایک دُوسرے کے ساتھ کھڑے دو درختوں پر رک گئیں۔ان کے پسِ منظر میں ستاروں بھرا آسمان تھا۔دیکھتے ہی دیکھتے دونوں

درختوں کے درمیان ایک انسانی سایہ آن رکا۔ کوئی آدمی وہاں آن کھڑا ہُوا تھا۔ سبیلہ نے ایک مردانہ چغہ اپنے اُوپر ڈالا اور خیمے میں سے نکل کر دبے پاؤں کھجور کے اُن دو درختوں کی طرف چل پڑی۔

سایہ درختوں کے درمیان سے غائب ہوگیا۔ تھوڑی دیر بعد دو سائے کھجوروں کے سیاہ ستونوں میں تحلیل ہوگئے۔ وہ ارتگین تھا۔ رات جب محفل برخاست ہُوئی تھی تو سبیلہ نے موقع دیکھ کر ارتگین سے کہہ دیا تھا کہ رات وہ کھجور کے ان دو درختوں کے درمیان آجائے جو پانی کے کنارے الگ تھلگ کھڑے ہیں۔

ارتگین اور سبیلہ کی آپس میں کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ وہ یوں چوری چھپے ملتے۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیا کرتے تھے۔ دونوں کا ان قزاق قبائل کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا، نہ وہ ان میں سے تھے۔ دونوں کو ایک قافلے سے اغوا کیا گیا تھا۔

سبیلہ غزنی کی فوج کے ایک شتر سوار کی بیٹی تھی۔ اُس کا باپ صرف شتر سوار ہی نہیں تھا، وہ سلطان محمود کا معتقد اور مرید تھا۔ وہ ہندوستان بھی اپنی فوج کے ساتھ گیا تھا۔ اپنے بچوں کو وہ سنایا کرتا تھا کہ اسلام ایک سچا اور عظیم مذہب ہے، جسے ساری دنیا میں پھیلانا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ وہ انہیں اسلام کی عسکری کہانیاں بھی سنایا کرتا تھا۔ یہ کہانیاں سبیلہ کے خون میں شامل ہو گئی تھیں مگر وہ بارہ تیرہ سال کی تھی جب اُس کا باپ ایک لڑائی میں مارا گیا۔ سبیلہ کی ماں نے اپنے خاوند کے ایک دوست کے ساتھ شادی کرلی۔ اُس کے پہلے بھی بچے تھے جن کے ساتھ اسے بہت پیار تھا۔ وہ انہی میں مگن رہا۔ سبیلہ اور اس کے چھوٹے دو بھائیوں کو وہ پیار اور شفقت نہ دے سکا۔

سبیلہ کی عمر سولہ سترہ سال ہُوئی تو سوتیلے باپ نے اُسے خاصی بڑی عمر کے ایک آدمی کے ساتھ بیاہ دیا۔ اس آدمی کی پہلے بھی دو بیویاں تھیں۔ سبیلہ کے سوتیلے باپ نے دراصل اس آدمی سے نقد رقم وصول کی تھی۔ سبیلہ کا خاوند رُتبے والا دولت مند آدمی تھا۔ وہ شراب بھی پیتا تھا۔ ارتگین اس آدمی کا خاص ملازم تھا۔ وہ چونکہ

شہسوار تھا، تیر انداز اور تیغ زن بھی تھا اس لیے آقا نے اُسے اپنا محافظ بھی بنا رکھا تھا۔ ارتگین ترک غلام تھا۔ اس کا بچپن اور لڑکپن غلامی میں گزرا تھا۔ وہ جب جوانی میں داخل ہُوا تو اُس کا قد بت اور چہرے کا حسن نکھر آیا۔ اُس کے سابقہ مالک نے اُس کی وجاہت سے متاثر ہو کر اسے گھوڑ سواری، تیر اندازی اور تیغ زنی سکھا کر اپنا محافظ بنا لیا تھا۔ اُس دور میں اپنے ساتھ ایک محافظ رکھنا بہت بڑا اعزاز سمجھا جاتا تھا۔

اس آقا کی موت کے بعد اسے ایک اور ایسے ہی دولتمند نے خرید لیا۔ اس آقا نے چند برسوں بعد ایک تاجر کی بیٹی کے ساتھ شادی کی اور اس کے عوض ارتگین اسے تحفے کے طور پر دے دیا۔ آخر میں وہ اس آدمی کے ہاتھ فروخت ہُوا جس کے ساتھ سبیلہ کی شادی ہوئی تھی۔ سبیلہ کا ارتگین کے ساتھ اتنا ہی تعلق تھا کہ وہ اس کے خاوند کا محافظ اور خاص ملازم تھا۔

ایک سال قبل سبیلہ کا خاوند ایک قافلے کے ساتھ کہیں جا رہا تھا کہ راستے میں ڈاکوؤں نے گھیر لیا۔ قافلے والوں نے مقابلہ کیا مگر انہوں نے ہتھیار ڈالنے میں دیر نہ کی۔ ارتگین ابھی تک مقابلے میں ڈٹا ہُوا تھا۔ وہ گھوڑے پر سوار تھا۔ گھوڑے کو سرپٹ دوڑا کر اور گھوم پھر کر لڑتا تھا۔ ڈاکوؤں کے سردار نے اعلان کیا کہ اس شخص کو زندہ پکڑ لو۔

قافلے والے دل چھوڑ بیٹھے تھے۔ ارتگین اکیلا لڑ رہا تھا۔ آخر ڈاکوؤں نے اس کے گھوڑے کو زخمی کر کے ارتگین کو گرا لیا اور اسے پکڑ لیا۔ ڈاکوؤں کے ہاتھ قافلے کا تمام تر مال لگا اور دو بڑے قیمتی انسان۔ ایک ارتگین تھا اور دوسری سبیلہ۔ سبیلہ کی بدنصیبی یہ تھی کہ وہ بہت خوبصورت تھی۔ وہ عورت تھی۔ روتی ہوئی ڈاکوؤں کے ساتھ چل پڑی، البتہ ارتگین کو ساتھ لے جانا مشکل ہو گیا۔ وہ ڈاکوؤں کو للکارتا تھا کہ وہ دو دو آدمی باری باری اس کے مقابلے میں آئیں مگر اس کے ہاتھ پاؤں رسیوں سے باندھ کر اُسے ایک گھوڑے پر بٹھا دیا گیا۔ سبیلہ کا خاوند مارا گیا تھا۔

چند دنوں کی مسافت کے بعد ارتگین اور سبیلہ کو کسی جگہ حماد بن علی کے سامنے پیش کیا گیا۔ ڈاکوؤں کا یہ گروہ اُسی کا تھا۔ سبیلہ پر تو خاموشی طاری تھی، ارتگین حماد کو بھی للکار رہا تھا۔ حماد چرب زبان تھا۔ اُس نے ارتگین کو موم کرلیا اور جب ارتگین نے اُسے بتایا کہ وہ غلاموں کے خاندان کا فرد ہے اور تین آقاؤں کا محافظ رہا ہے تو حماد نے اسے اپنے پاس بٹھالیا۔

"یہاں تم کسی کے غلام نہیں ہو" — حماد بن علی نے کہا — "یہاں تم بادشاہ ہو، سلطان ہو۔ تمہاری وجاہت دیکھ کر اور یہ سُن کر کہ تم میرے اتنے زیادہ آدمیوں کے ہاتھ نہیں آتے تھے، میں نے تمہیں اپنے ساتھ رکھنے کا ارادہ کرلیا ہے۔ تمہاری قدر میرے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔"

"کیا تم مجھے اپنے جیسا ڈاکو بنانا چاہتے ہو؟" — ارتگین نے خشمگیں لہجے

"کیا تم غلام رہنا چاہتے ہو؟" — حماد نے کہا — "کیا تم آزادی کی زندگی پسند نہیں کرو گے؟"

حماد نے اُسے قائل کرلیا کہ وہ اُس کے ساتھ رہے۔ حماد کو جب پتہ چلا کہ وہ اس لڑکی سبیلہ کے خاوند کا محافظ تھا جسے اُس کا گروہ اغوا کر لایا تھا تو اُس نے سبیلہ سے کہا — "اگر تم یہاں ملکہ بن کے رہنا چاہتی ہو تو اپنے خاوند کے محافظ سے کہو کہ وہ ہمارے ساتھ رہے، ورنہ تم دونوں کا انجام بہت بُرا ہو گا۔"

سبیلہ نے ارتگین کو الگ لے جا کر کہا کہ وہ اُس کی خاطر اُس کے ساتھ رہے۔ سبیلہ نے اُسے بتایا کہ حماد نے اُسے کیا دھمکی دی ہے۔ ارتگین حماد کا قائل ہو ہی چکا تھا، سبیلہ کے مظلوم آنسوؤں نے اُس سے فیصلہ کروالیا کہ وہ حماد کے ساتھ رہے گا۔ حماد نے اُسے بہترین گھوڑا دیا اور اُسے اپنا ذاتی محافظ بنالیا اور سبیلہ حماد کی داشتہ بن گئی۔ دونوں ایک سال کے عرصے میں اس ماحول میں گھُل مِل گئے تھے۔ ارتگین رہزنی کی دو وارداتوں میں شریک ہوا تھا۔ وہ چونکہ حماد کا محافظ تھا

اس لیے وہ قزاقی میں کم ہی شامل ہوتا تھا۔ بدّوؤں کے یہ قبائل اتنے سرکش تھے کہ اپنے اپنے سردار کے سوا کسی اور کا حکم نہیں مانتے تھے۔ حماد بن علی کو سب نے صرف اس لیے اپنا بے تاج بادشاہ تسلیم کر لیا تھا کہ اس نے خلیفۂ بغداد کو اور پھر اس حاکم کو جو حماد کو گرفتار کر سکتا تھا، اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ خلیفہ کو تو بتایا ہی نہیں گیا تھا کہ حماد رہزن اور قزاق ہے۔

اس ایک سال کے دوران ارتگین اور سبیلہ کی ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ ارتگین اس کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ دونوں کو ایک دوسرے سے یہی لگاؤ تھا کہ دونوں اغوا ہوئے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دونوں نے اس زندگی کو پسند کر لیا ہے۔ سبیلہ کو حماد نے ملکہ بنا دیا تھا اور ارتگین کے ساتھ حماد کا یہ وعدہ پورا ہو گیا تھا کہ وہ یہاں غلام نہیں آزاد ہوگا۔ بدّو اُس کا احترام کرتے تھے۔

اُس رات جب سبیلہ ارتگین سے ملنے گئی تو یہ پہلی خفیہ ملاقات تھی۔

تھا کہ سبیلہ نے اُسے یوں چوری چھپے کیوں بلایا ہے۔ کیا وہ اپنے آقا سے بے وفائی کرنا چاہتی ہے؟ کیا اُس نے در پردہ تعلقات کے لیے ارتگین کو منتخب کیا ہے؟

"کیوں سبیلہ!" — ارتگین نے اِدھر اُدھر دیکھ کر پوچھا۔ "ایسی کیا بات ہے کہ تم نے مجھے دن کے وقت اپنے خیمے میں بلانے کی بجائے رات کے اس وقت یہاں بلایا ہے؟"

"میں نے تمہیں اپنے مرے ہوئے خاوند کا غلام سمجھ کر نہیں بلایا" — سبیلہ نے کہا — "اپنے آپ کو نہ میرا غلام سمجھو نہ حماد بن علی کا ... میں تمہارے سینے میں ایک انسان کو بیدار کرنا چاہتی ہوں۔ ایسا انسان جو کسی کا غلام نہیں ہوتا۔ وہ اپنے خدا کا اور اپنے مذہب کا اور اپنے وطن کا غلام ہوتا ہے۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہو سبیلہ!" — ارتگین نے پھیکی سی ہنسی ہنستے ہوئے کہا — "معلوم ہوتا ہے تم خواب دیکھ رہی ہو۔ نیند میں بول رہی ہو۔"

"یہی بتانے کے لئے تمہیں یہاں بلایا ہے کہ میں جاگ اٹھی ہوں"۔ سبیلہ نے کہا۔ "وہ سبیلہ جاگ اٹھی ہے جو غزنی کی فوج کے ایک شتر سوار کی بیٹی تھی۔ یہ بیٹی اُس روز مر گئی تھی جس روز اُس کی ماں نے اپنے مجاہد خاوند کی موت کے بعد ایک ایسے آدمی کے ساتھ شادی کر لی تھی جو مجاہد نہیں تھا پھر یہ بیٹی بک گئی ——— تمہارے آقا کے ہاتھ۔ میں نے اس بیٹی کا گلا گھونٹ دیا تھا"۔

"عورت اور غلام کی لوحِ تقدیر پر یہی لکھا ہوتا ہے"——— ارتگین نے کہا——— "تم نے بھی اپنی قسمت دیکھ لی ہے۔ میں نے بھی اپنی تقدیر کا لکھا دیکھ لیا ہے لیکن مجھے اس کا کوئی افسوس نہیں۔ میں غلام پیدا ہوا تھا۔ قبیلے کے ساتھ خانہ بدوشی میں پل کر جوان ہوا اور ہاتھوں ہاتھ بکتا رہا۔ میں نے صرف ایک بار سُنا تھا کہ اسلام کسی انسان کو اجازت نہیں دیتا کہ وہ کسی انسان کو اپنا غلام بنائے۔ میں ہنس پڑا تھا کیونکہ انسانوں کو غلام رکھنے والے مسلمان ہی تھے"۔

"وہ گناہگار تھے"——— سبیلہ نے کہا——— "اسلام کی نگاہ میں کسی کو غلام رکھنا گناہ ہے۔ میری شادی تمہارے آقا سے ہوئی تو یہ بھی گناہ تھا۔ یہ شادی نہیں تھی، یہ سودا ہوا تھا۔ مجھے بیچا گیا تھا۔ میں شروع کے چند دن اُداس رہی پھر اپنے آپ کو سنبھال لیا کہ یہ تو عورت کی قسمت ہی ایسی لکھی گئی ہے۔ میں نے اپنے آپ کو مار لیا اور میں خوش رہنے لگی۔ تم نے مجھے ہنستے بھی دیکھا تھا مگر یہ میرا جسم تھا جو زیور اور ریشمی کپڑوں سے سجا ہوا تھا، اور یہ میرا حسن تھا جس نے مجھے فروخت کرایا تھا۔ میری روح روتی تھی"۔

"تمہاری شادی کسی تم جیسے جوان اور خوبرو مرد کے ساتھ ہونی چاہیئے تھی"——— ارتگین نے کہا۔

"میں اپنی شادی کا رونا نہیں رو رہی"——— سبیلہ نے کہا——— "جب میرا باپ زندہ تھا تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میری شادی ہوگی۔ باپ نے میرے ذہن میں یہ ڈال دیا تھا کہ میں مسلمان ہوں اور کفر کو جان اور مال کی قربانی دے کر ختم کرنا میرا فرض ہے۔ کبھی کبھی مجھے یوں لگتا تھا جیسے ہندوستان کے بُت خانے

مجھے للکار رہے ہیں۔ میرا باپ دو مرتبہ ہندوستان گیا تھا۔ وہ کفرستان کے قلعوں کی تسخیر میں شریک تھا۔ اُس نے دیوتاؤں کے بُت ٹوٹتے دیکھے تھے۔ اُس نے بُت خانوں میں اذانیں سنی تھیں۔ میرا باپ اُن مجاہدینِ اسلام میں سے تھا جن کی عمر سیدانِ جہاد میں گزر جاتی ہے..... میری رگوں میں اس باپ کا خون ہے"۔

"سبیلہ!" ـــ ارتگین نے کہا ـــ "کیا تم بھول گئی ہو کہ ہم دونوں کہاں بیٹھے ہیں؟ کسی نے دیکھ لیا تو حماد ہم دونوں کو ہاتھ پاؤں باندھ کر صحرا میں پھینک دے گا۔ صحرا کی موت کو تصور میں لا سکتی ہو؟ ..... مجھے جلدی جلدی بتاؤ کہ آج رات تم اپنے ماضی کو کیوں یاد کر رہی ہو۔ اگر تم نے اپنا من مار لیا تھا تو اسے زندہ کیوں کر رہی ہو؟ یہ زنجیریں ٹوٹ نہیں سکتیں جن میں تم اب جکڑی گئی ہو۔ میں تو دیکھ رہا تھا کہ تم یہاں خوش ہو"۔

"ہاں ارتگین!" ـــ سبیلہ نے کہا ـــ "میں یہاں خوش تھی۔ اگر انسان صرف گوشت اور ہڈیوں کا مجسّمہ ہے تو میں یہاں بہت خوش تھی مگر رات میرا مجسّمہ مر گیا ہے اور روح زندہ ہو گئی ہے۔ قزاق کی داشتہ مر گئی ہے اور مجاہد کی بیٹی زندہ ہو گئی ہے..... اب میں تمہیں بیدار کرنے آئی ہوں۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے"۔

"کیا میں تمہیں یہاں سے بھگا لے جاؤں؟" ـــ ارتگین نے پوچھا ـــ "بڑا مشکل کام ہے"۔

"نہیں" ـــ سبیلہ نے کہا ـــ "میں یہاں سے نہیں بھاگوں گی۔ تم بھاگ جاؤ ..... سنو ارتگین! جب تم میرے خاوند کے محافظ اور غلام تھے تو میرا تمہارے ساتھ کیا سلوک تھا۔ تمہیں یاد ہے ایک بار میرا خاوند تمہیں کہیں بھیج رہا تھا اور تم بیمار تھے مگر میرا خاوند کہہ رہا تھا کہ تم خواہ راستے میں مر جاؤ، تمہیں جانا پڑے گا۔ اُس وقت میں نے تمہیں بچایا تھا۔ میں خاوند سے لڑ پڑی تھی کہ وہ تمہیں اس حالت میں اتنے لمبے سفر پر بھیج رہا تھا کہ تم اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل نہیں تھے۔ میں نے تمہیں رکوا لیا تھا اور میں طبیب کو تمہارے علاج

کے لیے لائی تھی۔ تم نہیں جانتے کہ اپنے خاوند سے مجھے کیسی کیسی بیہودہ باتیں سننا پڑی تھیں۔"

"مجھے یاد ہے سبیلہ"۔۔۔ ارتگین نے کہا۔ "آقا نے مجھے بھی بہت کچھ کہا تھا اور اُس نے یہاں تک کہا تھا کہ تمہاری اور سبیلہ کی ایک دوسرے میں یہ دلچسپی فوراً ختم ہو جانی چاہیئے، ورنہ تم جانتے ہو کہ غلاموں کی سزا کیا ہے ..... میں ان قزاقوں کے ساتھ خوش ہوں سبیلہ! یہاں مجھے کوئی غلام نہیں کہتا۔ اگر تم کسی تکلیف میں ہو تو تم نے میرے ساتھ جو نیکیاں کی ہیں، ان کا صلہ دینے کے لیے اپنی جان بھی قربان کر دوں گا۔"

سبیلہ کچھ دیر چپ چاپ رہی اور ارتگین کو دیکھتی رہی۔ صحرا کی وہ رات بھی چپ چاپ تھی۔ خیمہ گاہ میں جیسے لاشیں پڑی تھیں۔ صحرائی لومڑیاں بھی سو گئی تھیں مگر سبیلہ کے سینے سے بگولے اُٹھ رہے تھے۔

"کہو سبیلہ!"۔۔۔ ارتگین نے کہا۔ "چپ کیوں ہو گئی ہو۔ اپنے غلام کو آزما لو۔"

"سوچ رہی ہوں کہ تم میری بات سمجھ بھی سکو گے یا نہیں"۔ سبیلہ نے آہ لے کر کہا۔ "کہہ دیتی ہوں۔ سن لو ..... مجھے اپنی ذات کے لیے کچھ نہیں چاہیئے۔ کوئی صلہ نہیں چاہیئے۔ تم نے حماد بن علی کی باتیں غور سے سُنی تھیں جو وہ بدوؤں کے سرداروں سے کہہ رہا تھا! وہ غزنی کے حاجیوں کے قافلے کو لُوٹنا چاہتا ہے۔"

"کیا تم اسے روک سکتی ہو؟"۔۔۔ ارتگین نے کہا۔ "کیا تم نے ابھی تک غزنی کو دل سے اتارا نہیں؟"

"اتار دیا تھا"۔۔۔ سبیلہ نے کہا۔ "لیکن غزنی کی آبرو میرے خون میں موجود ہے۔ حماد جب غزنی کا قافلہ لُوٹنے کی باتیں کر رہا تھا تو میں نے کچھ بھی محسوس نہ کیا مگر جب اُس نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ یہ غزنی کے حُسن کا نمونہ ہے اور یہ

تمہارا انعام ہوگا اور غزنی کے قافلے کے ساتھ ایسی بہت سی لڑکیاں ہوں گی تو میرا جسم کانپ اٹھا جیسے ہوا کا بڑا ہی سرد جھونکا آیا ہو یا زمین ہل گئی ہو۔ میرا مجاہد باپ میری آنکھوں کے سامنے آگیا۔ اُس کی وہ باتیں مجھے سنائی دینے لگیں جو وہ بارہ تیرہ برس کی عمر تک مجھے سناتا رہا تھا۔ میں عورت تھی۔ حماد کی زبان کا تیر میرے دل میں اُتر گیا۔ میں اس پر جوابی حملہ نہ کر سکی۔"

"تم نے شاید اسی بات سے خفا ہو کر میری طرف دیکھا تھا؟" — ارتگین نے پوچھا۔

"ہاں!" — سبیلہ نے کہا — "میرے سینے میں انتقام کا شعلہ بھڑک اٹھا تھا اور اُس وقت خدا کے بعد صرف تم تھے جس کی طرف میں دیکھ سکتی تھی مگر تمہارا چہرہ بتا رہا تھا کہ تم نے کچھ بھی محسوس نہیں کیا۔ میں نے اُسی وقت سوچ لیا تھا کہ تمہیں تنہائی میں بلاؤں گی اور تمہارے دل میں بھی اُس مٹی کی آبرو کا احساس بیدار کروں گی جس نے تمہیں جنم دیا تھا.... میں نے یہ بھی سوچا تھا کہ میں بے بس اور مجبور ہوں اور قزاق قبیلوں کے اس بادشاہ کا میں کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتی۔ میں نے یہ چوٹ برداشت کرنے کا بھی ارادہ کیا تھا مگر حماد کے خیمے میں جا کر اس نے مجھے بدمست اور مخمور نگاہوں سے دیکھا اور جب میں نے اس کے جسم کی تپش محسوس کی تو میرے سینے کے شعلے پھر بھڑک اُٹھے۔"

ارتگین خاموش تھا جیسے وہ کچھ سن ہی نہ رہا ہو۔

"سن رہے ہو ارتگین؟"

"سن رہا ہوں" — ارتگین نے کہا — "تمہارے انتقام کے شعلے بے بس اور مجبور ہیں۔"

"حماد نے کہا" سبیلہ اپنا ہے "غزنی کا سلطان محمود اپنے آپ کو بت شکن کہلاتا ہے" — اُس نے قہقہہ لگا کر کہا — "محمود مجھ جیسا لٹیرا ہے۔ ڈاکہ زن ہے۔ میں کسی روز اس بت شکن کا بت توڑ دوں گا" — یہ سن کر میرا خون کھول اُٹھا۔ وہ جب گہری نیند سو گیا تو میں نے اُس کا خنجر نکال لیا۔

میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ میں نے شمع کی روشنی میں اندازہ کر لیا کہ اس شخص کا دل کہاں ہے۔ میں اسے ایک ہی وار میں ٹھنڈا کر دینا چاہتی تھی۔ پھر میرے ہاتھ ساکن ہو گئے۔ مجھے اطمینان ہونے لگا کہ میں غزنی کی توہین کا اور غزنی کے سلطان کی توہین کا انتقام لے رہی ہوں۔ میرا ہاتھ اوپر اٹھا اور ایسے لگا کہ کسی غیبی ہاتھ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا ہو.....

"مجھے آواز سی سنائی دی ۔۔۔ اس ایک شخص کو قتل کر کے نہ تم زندہ رہ سکتی ہو نہ ان بدوؤں سے غزنی کے قافلے میں آنے والی بیٹیوں کو بچا سکتی ہو۔ صبح یہ وحشی اور درندے اپنے بادشاہ کے خون کا جو انتقام تم سے لیں گے اسے تصور میں لاؤ"۔ میرا ہاتھ رک گیا۔ میں نے سوچا۔ بہت سوچا۔ میں کوئی جرم نہیں کر رہی تھی اس لیے عقل میرا ساتھ دے رہی تھی۔ مجھے یاد آ گیا کہ میں نے تمہیں بلا رکھا ہے۔ تم سے بات کر کے کچھ کروں گی ..... ارتگین! غزنی کی بیٹیاں قزاقوں کی داشتائیں نہیں بنیں گی۔ سلطان محمود قزاق اور لٹیرا نہیں۔ میں ان بیٹیوں کی آبرو بچانے کے لیے کفارہ ادا کروں گی"۔

"کیا حماد بن علی کو میرے ہاتھوں قتل کرانا چاہتی ہو؟"

"نہیں" ۔۔۔ سبیلہ نے جواب دیا۔ "اس ایک آدمی کے قتل سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ یہ مر گیا تو بھی یہ لوگ غزنی کے قافلے کو لوٹ لیں گے۔ میں نے یہ سوچا ہے کہ تم یہاں سے نکل جاؤ۔ میں نہیں رہوں گی۔ اگر میں بھی تمہارے ساتھ نکل بھاگی تو یہ لوگ ہمارا پیچھا کریں گے۔ تم مرد ہو۔ گھوڑا تیز دوڑا سکتے ہو۔ سفر کی سختیاں برداشت کر سکتے ہو۔ میں شاید نہ کر سکوں۔ میں تمہارے لیے بوجھ نہ بن جاؤں۔ رفتار سست ہوئی تو ہم پکڑے بھی جائیں گے"۔

"یہ لوگ میرا بھی پیچھا کر سکتے ہیں" ۔۔۔ ارتگین نے کہا۔ "تم نہیں یہ خطرہ ہو گا کہ میں غزنی جا کر اطلاع دے دوں گا کہ راستے میں قافلے پر حملہ ہو گا اور سلطان محمود قافلے کے ساتھ فوج کے ایک دو دستے بھیج دے گا"۔

"اس کے باوجود تم چلے جاؤ" ۔۔۔ سبیلہ نے کہا۔ "ہمیں خطرہ تو مول لینا ہی ہوگا..... تم ڈر رہے ہو۔ تمہارا ڈر بجا ہے۔ تمہاری کوئی بیٹی نہیں۔ تمہاری

کوئی بہن نہیں۔ میں تمہاری بہن ہوتی تو تم میری عزت پر مر مٹتے۔ ارتگین! غزنی کی مٹی تمہاری بیٹی ہے۔ تمہاری بہن اور تمہاری ماں ہے۔ میں جانتی ہوں کہ اس مٹی نے تمہیں کچھ نہیں دیا۔ تمہیں وہاں غلام سمجھا گیا۔ میں اچھی طرح سمجھتی ہوں کہ جس ملک کے حکمران اپنی رعایا کو بھوکا اور ننگا رکھتے ہیں اور انہیں ان حقوق سے محروم رکھتے ہیں جو انسان کو خدا نے دیئے ہیں تو ان انسانوں کے دلوں سے اپنے وطن اور اپنے مذہب کی محبت نکل جاتی ہے۔ وہاں بھائی بھائی کا دشمن ہو جاتا ہے ....

"میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ تم سلطان محمود کے پاس پہنچ گئے اور اسے یہ بتایا کہ تم غلام تھے تو وہ تمہیں گلے لگا لے گا" — سبیلہ نے کہا — "پھر تم غلام نہیں رہو گے۔ تم سلطان کی نگاہ میں اور خدا کی نگاہ میں بھی قابلِ احترام انسان بن جاؤ گے۔ اپنے آپ میں غیرت بیدار کرو ارتگین! اپنے وطن اور اپنے مذہب کی بیٹیاں وطن کی آبرو ہوتی ہیں۔ وہ قومیں ذلیل و خوار ہوتی ہیں جو اپنی بیٹیوں کی ناموس کو فراموش کر دیتی ہیں۔"

"میں تمہاری ایک بات بھی نہیں سمجھ سکا سبیلہ!" — ارتگین نے کہا — "میرے دل میں کسی نے وطن کی محبت پیدا ہی نہیں کی۔ مجھے نوکری کرنی ہے۔ اسی لیے ایک قزاق کے پاس بھی مطمئن ہوں لیکن تم جو کہو گی کر دوں گا۔ تم مظلوم ہو پھر بھی تمہارا ایمان محفوظ ہے۔ میں کہہ چکا ہوں کہ تمہاری نیکیوں کا صلہ ضرور دوں گا۔ کہو، مجھے کیا کرنا ہے؟"

"یہاں سے اس طرح نکلو کہ کسی کو پتہ نہ چلے" — سبیلہ نے کہا — "تم راستے سے واقف ہو۔ پندرہ بیس دنوں میں غزنی پہنچ جاؤ گے۔ اگر غزنی کے حاجیوں کا قافلہ وہاں سے چل پڑا ہو تو اسے روک لینا اور میر کارواں کو بتا دینا کہ راستے میں کیا خطرہ ہے۔ اسے کہنا کہ تم فوج کا انتظام کرنے جا رہے ہو۔ اگر قافلہ ابھی وہیں ہو تو سلطان محمود کے پاس چلے جانا اور اسے بتانا کہ قافلے پر پانچ ہزار بدّو حملہ کریں گے۔ سلطان سے یہ ضرور کہہ دینا کہ قوم کی ایک بیٹی نے پیغام بھیجا ہے کہ حجاز کے قافلے

نہیں رُک سکتے، قزاقوں کو روکا جاسکتا ہے۔ فوج کو ساتھ بھیجنا ورنہ غزنی کی بیٹیاں بابل اور بغداد کے بازاروں میں بک جائیں گی۔ سلطان سے کہنا کہ قافلے سے ایک بھی بیٹی اغوا ہو گئی تو خدا سلطان کو کبھی نہیں بخشے گا"۔

"میں کہہ دوں گا" — ارتگین نے کہا۔ "میں کہہ دوں گا۔ دعا کرو کہ میں زندہ وہاں پہنچ جاؤں، مگر تم یہاں سے نہیں نکلو گی؟ ..... میں تمہیں اس درندے کے پاس چھوڑ کر کس طرح جاسکوں گا؟"

"تم چلے جاؤ ارتگین! تم چلے جاؤ" سبیلہ نے جذبات سے لرزتی آواز میں کہا — "اگر زندہ رہی تو باقی عمر تمہاری غلام رہوں گی۔ میرے جسم اور میری روح کے مالک صرف تم ہو گے، پھر تم نہیں میں غلام ہوں گی۔ تم غزنی پہنچ جاؤ گے۔ تم کوئی گناہ نہیں کر رہے۔ خدا تمہارے ساتھ ہے"۔

"کیا تم ان لوگوں کو کسی طرح میرے تعاقب سے روک سکتی ہو؟"

"کوشش کروں گی" — سبیلہ نے کہا — "میں نے ان لوگوں سے بہت کچھ سیکھ لیا ہے۔ تمہیں اپنا آقا یاد ہے نا جو میرا خاوند تھا۔ اس کی بیویوں کو تم بھی جانتے تھے اور تم یہ بھی جانتے تھے کہ میرے خاوند کی محل جیسی حویلی میں کیسی کیسی سازشیں ہوتی تھیں۔ جہاں دولت اور عورت ہو، وہاں سے خلوص اور شرافت رخصت ہو جاتی ہے۔ میں شیطان کی اس دنیا کا ایک حصہ بنی رہی ہوں۔ میں ہر شیطانی کام کر سکتی ہوں ..... تم یہاں کے ایک سردار گوگیل کو جانتے ہو گے جس نے کہا تھا کہ وہ ایک ہزار آدمی اپنے ساتھ لائے گا۔ مجھے اس شخص سے نفرت ہے۔ اس نے مجھے کہا تھا کہ میں حماد سے ہٹ کر اُس کے ساتھ چلی چلوں۔ میں نے اُسے کہا تھا کہ میں حماد کی بیوی نہیں پھر بھی اُسے دھوکہ نہیں دوں گی۔ اُس نے مجھے لالچ دیئے تھے اور پھر دھمکی دی تھی کہ وہ مجھے اغوا کر لے گا۔ اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ میں نے اگر حماد کو بتا دیا تو وہ مجھے قتل کرا دے گا ..... میں شاید اس سے انتقام لوں۔ تم یہاں کی باتیں چھوڑو ارتگین! بتاؤ تم کب یہاں سے نکلو گے"۔

"ابھی" — ارتگین نے کہا — "اب مجھ سے اور کچھ نہ پوچھو۔ تم چلی جاؤ۔

رات کا آخری پہر گذر رہا ہے"۔ سبیلہ نے اُس کا ایک ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر آنکھوں سے لگایا پھر چُوما اور وہاں سے اپنے خیمے میں آگئی۔

خیمہ گاہ میں وہی سکوت تھا جو پہلے تھا۔ ان لوگوں کو جاگنے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ ارتگین ان کے بے تاج بادشاہ کا خاص محافظ تھا۔ اُسے خیمہ گاہ میں گھومتے پھرتے، کوئی گھوڑا یا اونٹ کھولتے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ جس خیمے میں کھانے پینے کا سامان پڑا تھا وہاں سے کچھ اٹھاتے بھی اسے کوئی ٹوک نہیں سکتا تھا۔ اُس نے جب دیکھا کہ سبیلہ اپنے خیمے میں پہنچ گئی ہوگی، وہ اپنے خیمے میں گیا۔ برچھی، تلوار، کمان اور ترکش اٹھائی، کچھ کپڑے لیے۔ سفری تھیلے اٹھائے اور رسد والے خیمے میں چلا گیا۔ وہاں سے پانی کے مشکیزے اور کھانے کا سامان اُٹھایا اور ایک اونٹ جا کھولا۔ سامان اس کے ساتھ باندھا اور اس پر سوار ہو کر اُسے اٹھایا۔

سبیلہ اپنے خیمے میں پردہ ذرا ہٹا کر دیکھ رہی تھی۔ اسے خیمے سیاہ ڈھیروں کی طرح نظر آرہے تھے۔ اُس کا دِل دھڑک رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اُسے خیموں سے دور ایک اونٹ کا ہیولہ اس طرح نظر آیا جیسے اونٹ افق کی لکیر پر چلا جا رہا ہو۔ سبیلہ کے ہونٹوں سے دعا سرگوشیاں بن کے نکلنے لگی اور اونٹ کا ہیولہ چھوٹا ہوتا گیا، دور ہٹتا گیا پھر وہ اُس کے آنسوؤں کی دھند میں چھپ گیا۔۔۔ سبیلہ بستر پر جا گری اور اُس کی آنکھ لگ گئی۔

اُس کی جب آنکھ کھلی، آدھا دن گزر گیا تھا۔ وہ اُٹھ بیٹھی۔ اُسے رات کی بات یاد آئی تو اُسے خوف سا محسوس ہُوا جیسے ارتگین اُسے دھوکہ دے کر حماد کو بتا دے گا۔ وہ خیمے سے نکلی۔ ارتگین کے خیمے کا پردہ اٹھایا۔ وہ وہاں نہیں تھا۔ اُس کے ہتھیار اور اُس کے کپڑے بھی وہاں نہیں تھے۔ سبیلہ ارتگین کے خیمے سے نکل رہی تھی تو حماد اپنے خیمے سے باہر آیا۔ اُس نے سبیلہ کو اپنے پاس بلا کر پوچھا کہ وہ ارتگین کے خیمے میں کیا لینے گئی تھی۔

سبیلہ نے اپنے چہرے پر گھبراہٹ کا تاثر پیدا کر کے کہا۔ ”میں ارنگین کو دیکھنے گئی تھی کہ وہ وہاں ہے یا نہیں .... مجھے ڈر ہے کہ وہ زندہ نہیں ہے۔ وہ قتل ہو چکا ہے۔“

”قتل؟“ — حماد بن علی نے پوچھا — ”تمہارا دماغ ٹھکانے معلوم نہیں ہوتا۔ یہاں کون کسی کو قتل کر سکتا ہے؟“

”گوگیل“ — سبیلہ نے کہا — ”گوگیل نے ارنگین کو غائب کر دیا ہے۔ اب میری باری ہے۔ میں نے آپ کو پہلے نہیں بتایا تھا۔ آپ جب مجھے یہاں لائے تھے تو گوگیل نے مجھے لالچ اور دھمکیاں دے کر منوانے کی کوشش کی تھی کہ میں آپ سے بھاگ کر اُس کے پاس چلی جاؤں۔ میں نے اسے کہا تھا کہ میں اپنے آقا کو دھوکہ نہیں دوں گی۔ اس کے بعد وہ اب آیا ہے۔ گذشتہ رات میں آپ کے ساتھ آپ کے خیمے میں گئی تھی۔ آپ سو گئے تو میں وہاں سے نکل کر اپنے خیمے میں جانے کی بجائے ٹہلتے ٹہلتے پانی تک چلی گئی۔ گوگیل شاید میرا پیچھا کر رہا تھا۔ وہ میرے پاس آ گیا اور مجھے ورغلانے لگا۔ میں نے اسے ٹالنا چاہا تو اس نے مجھ پر دست درازی کی۔ میں اپنے آپ کو اکیلی سمجھ رہی تھی لیکن اچانک ارنگین آ گیا۔ وہ مجھے بتائے بغیر میری حفاظت کے لیے مجھ سے کچھ دور موجود رہا....

”گوگیل نے اُسے آپ کا غلام سمجھ کر گالیاں دیں اور وہاں سے چلے جانے کو کہا۔ ارنگین نے اُسے بڑی دلیری سے کہا کہ وہ اپنے آقا کی عزت پر جان قربان کر دے گا۔ گوگیل نے اُسے کہا کہ یہ رات تمہاری زندگی کی آخری رات ہے۔ جاؤ۔ اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو اپنے آقا کے خیمے میں سونا .... وہ چلا گیا۔ ارنگین مجھے میرے خیمے میں چھوڑ کر چلا گیا۔ میں جانتی ہوں کہ گوگیل درندہ ہے۔ اُس نے رات کو ارنگین کو غائب کروا دیا ہے۔“

حماد بن علی غصے سے پھنکارنے لگا اور اُس نے گوگیل کو بلوا بھیجا۔

"میں جانتا ہوں کہ تم قبیلے کے سردار ہو"۔ حماد بن علی نے گوگیل سے کہا۔ "لیکن تم بھول گئے ہو کہ میں کون ہوں ...... میں تمہیں بخش دوں گا۔ میرا آدمی مجھے واپس کر دو"۔

"کون سا آدمی؟"۔ گوگیل نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ارنگین"۔ حماد نے کہا۔ "میرا محافظ جو گذشتہ رات تمہارے اور سبیلہ کے درمیان آگیا تھا"۔

گوگیل حیران و پریشان ہو گیا۔ سبیلہ نے حماد سے کہا کہ یہ شخص اپنا جرم چھپانے کے لیے انجان بن رہا ہے۔

"گوگیل!" حماد بن علی نے اُسے کہا۔ "کیا تم ایک غلام اور ایک داشتہ کی خاطر مجھ سے دشمنی مول لے رہے ہو؟ اس وقت ہمیں اتحاد اور اتفاق کی ضرورت ہے۔ میں تمہیں اس جیسی دس لڑکیاں لا دوں گا مگر تم نے میری داشتہ پر دست درازی کر کے میرے محافظ کو غائب کر دیا ہے۔ کیا تم قبیلے کے سردار رہو گے؟ کیا تم مجھ سے ٹکر لے کر سردار رہ سکو گے؟ زندہ رہ سکو گے؟"

بات بڑھ گئی۔ چونکہ گوگیل نے ارنگین کو غائب نہیں کیا تھا اس لیے وہ آگ بگولہ ہو رہا تھا۔ حماد نے تمام سرداروں کو اکٹھا کر لیا اور سبیلہ سے کہا کہ وہ سب کو سنائے کہ گوگیل نے کیا کیا ہے۔ سبیلہ نے وہی بات سنا دی جو وہ حماد کو سنا چکی تھی۔ گوگیل غصے سے اُٹھا اور یہ کہہ کر چل پڑا۔ "میرا اور میرے قبیلے کا تمہارے ساتھ کوئی تعلق نہیں"۔

اُس نے پیٹھ پھیری ہی تھی کہ حماد نے اپنے قریب کھڑے ایک آدمی کی کمان لی اور اُس کی ترکش سے تیر نکال کر کمان میں ڈالا۔ دوسرے لمحے تیر گوگیل کی پیٹھ میں اُترا ہوا تھا اور وہ ریت پر تڑپ رہا تھا۔ اسی روز حماد نے ایک خاص تقریب منعقد کر کے گوگیل کے قبیلے کا ایک اور سردار مقرر کر دیا۔ اس نے سب سے کہا کہ میں جانتا تھا کہ مجھے میرا محافظ واپس نہیں ملے گا۔ گوگیل نے اسے یقیناً قتل کروا کے اس کی لاش کہیں دبا دی ہے۔۔

اُس وقت تک ارتگین بہت دور نکل گیا تھا۔ صبح طلوع ہونے تک وہ اونٹ کو دوڑاتا رہا تھا۔ سورج اُبھرا تو اُس نے اونٹ کی رفتار کم کر دی۔ اُس نے گھوم گھوم کے دیکھا۔ اُس کے تعاقب میں کوئی نہیں آ رہا تھا۔

حماد بن علی نے قبائلی سرداروں کو آخری ہدایات دیں اور انہیں کید کے صحرا کے قریب ایک جگہ بتا کر کہا کہ وہ اپنے آدمیوں کو وہاں جمع کریں۔ اسی روز سب اپنے اپنے قبیلوں کو روانہ ہو گئے اور حماد بھی وہاں سے چلا گیا۔ وہ جب اپنے ٹھکانے پر پہنچا تو اُس کا ایک اور جاسوس غزنی سے آیا جس نے اُسے بتایا کہ غزنی کے قافلے کی نفری اور زیادہ بڑھ گئی ہے اور اس میں مالدار تاجروں کی خاصی تعداد ہے۔ اُس نے حماد کو یہ بھی بتایا کہ راستے میں لوگ اس قافلے کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس طرح یہ قافلہ اور زیادہ بڑا ہو جائے گا۔ اس جاسوس کو کوئی ایسے آثار نہیں ملے تھے کہ قافلے کی حفاظت کے لیے فوج کا کوئی انتظام ہوگا یا نہیں۔

"میں حجاز تک فوج کا دستہ کیسے بھیج سکتا ہوں"— غزنی میں سلطان محمود غزنوی قافلے کے ایک وفد سے کہہ رہا تھا— "قوم کے ہر فرد کو سپاہی ہونا چاہئیے"۔

قافلے کا ایک وفد (محمد قاسم فرشتہ کی تحریر کے مطابق) سلطان محمود کے پاس یہ درخواست لے کر گیا تھا کہ قافلہ بہت بڑا ہے اور اس کے ساتھ خواتین اور بچے بھی ہیں اور تاجروں کا قیمتی مال بھی ساتھ جا رہا ہے اس لیے قافلے کی حفاظت کے لیے فوج کا ایک دستہ ساتھ ہونا چاہئیے۔

"میں بے خبر نہیں کہ حاجیوں کے قافلے رہزنوں اور قزاقوں کے ہاتھوں لٹتے رہتے ہیں"— سلطان محمود نے کہا— "میں حج پر جانے والوں کو ہر سہولت اور مدد دیا کرتا ہوں مگر یہ ممکن نظر نہیں آتا کہ میں مکہ معظمہ تک فوج قافلے کے ساتھ بھیجوں۔ اتنے بڑے قافلے میں بے شمار آدمی ایسے ہوں گے جو لڑ سکتے ہیں اور شہسوار بھی ہیں۔ قافلے میں سپاہی بھی حج کو جا رہے ہیں۔ آپ لوگ پوری طرح مسلح ہو کر جائیں۔ تیر و کمان ساتھ رکھیں۔ مجھے اتنے

بڑے قافلے پر حملے کا کوئی خطرہ نظر نہیں آتا۔ قافلے وہ لٹتے ہیں جن میں مسافر بہت کم ہوتے ہیں۔ آپ لوگ بے خوف ہو کر جائیں۔"

جب وفد چلا گیا تو سلطان محمود نے اپنے مشیروں اور سالاروں کی ایک محفل میں کہا۔"میں نے ان لوگوں کو مایوس کیا ہے۔ یہ فریضۂ حج ادا کرنے جا رہے ہیں۔ مجھے ان کی درخواست مان لینی چاہیئے تھی لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہمیں فوج کی کتنی زیادہ ضرورت ہے۔ یہاں کے حالات ٹھیک نہیں۔ سرحدوں پر ہر وقت خطرہ موجود رہتا ہے۔ ابھی دو تین دن گزرے ہندوستان سے تشویشناک خبریں آئی ہیں۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ قنوج کا مہاراجہ راجیا پال جو وہاں سے بھاگ گیا تھا، ہمارے قلعہ دار کے پاس گیا اور اُس نے ہماری شرائط تسلیم کرنے کا معاہدہ کیا اور قنوج سے کچھ دُور اپنی نئی راجدھانی بنانے کی اجازت مانگی ہے۔ میں اُس سے تاوان اور باج وصول کروں گا اور اُسے نئی راجدھانی بنانے کی اجازت دے دوں گا مگر وہاں کے تین مہاراجے، کالنجر، گوالیار اور لاہور، مہاراجہ راجیا پال کے دشمن بن گئے ہیں۔ قنوج سے پیغام آیا ہے کہ یہ مہاراجے مہاراجہ قنوج کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کر رہے ہیں اور انہوں نے ہمیں فیصلہ کن شکست دینے کے لیے متحدہ محاذ بنالیا ہے۔ معلوم نہیں کب ہمیں ہندوستان کو کوچ کرنا پڑے۔"

قافلہ روانہ ہونے والا تھا۔ سلطان محمود کے پاس جو وفد گیا تھا اس کے ارکان نے قافلے کے تمام مسافروں سے کہہ دیا تھا کہ وہ مسلح ہو کر چلیں۔ ہتھیار اکٹھے کرنے کے لیے قافلے کی روانگی ایک دو دنوں کے لیے ملتوی ہو گئی۔

اور اُس وقت سلطان محمود کو اطلاع دی گئی کہ ارتگین نام کا ایک آدمی بڑی بری حالت میں آیا ہے۔ کہتا ہے بہت دُور سے آیا ہوں اور یہ

بھی کہتا ہے کہ حاجیوں کے قافلے کو روکے رکھو۔ سلطان محمود حاجیوں کے کے نام پر ضروری کام بھی چھوڑ دیا کرتا تھا۔ اُس نے ارتگین کو فوراً بلالیا۔ وہ تو زندہ لاش بن چکا تھا۔ منہ کھلا ہوا اور آنکھیں بند ہوئی جارہی تھیں۔ وہ کھڑا رہنے کے قابل نہیں تھا۔ اُسے سہارا دے کر بٹھایا گیا، مشروب پلائے گئے، کچھ کھلایا گیا تو وہ ہوش میں آنے لگا۔ وہ اچانک اُٹھ کھڑا ہوا اور کمرے میں تیز تیز ٹہلنے لگا۔

"سلطانِ غزنی و خراسان سے گستاخی کی معافی چاہتا ہوں"۔ ارتگین نے کہا "ایک مہینہ ہو گیا ہے، میں پاؤں پر نہیں چلا۔ پہلے اونٹ پر سوار رہا اور جب پہاڑی علاقہ آیا تو ایک سوار سے گھوڑا چھین کر اونٹ اُسے دے دیا۔ راستے میں دو اور سواروں سے گھوڑے چھینے اور تھکن اور بھوک سے آدھ موئے گھوڑے اُن کے پاس چھوڑے۔ گھوڑے کی پیٹھ پر کھاتا پیتا رہا اور کسی گھوڑے کو ذرا بھی نہ چلنے دیا ورنہ ڈیڑھ ماہ کی مسافت ایک ماہ میں طے نہ ہوتی"۔

"وہ بات کیا ہے جو تمہیں اس حال میں میرے پاس لائی ہے؟"۔ سلطان محمود نے پوچھا۔

"اگر آپ حجاز کے قافلے کے ساتھ فوج کے دو دستے نہیں بھیج سکتے تو قافلے کو غزنی سے باہر نہ نکلنے دینا"۔ ارتگین نے کہا "کید کے صحرا میں قافلے کو لوٹنے کے لیے قزاقوں کا وہ گروہ بلکہ وہ فوج خیمہ زن ہے جسے خلیفۂ بغداد کی پشت پناہی حاصل ہے"۔

"خلیفۂ بغداد کی پشت پناہی؟"

"اگر سلطانِ غزنی کو ایک غلام کی بات پسند نہیں آئی تو غلام جان بخشی چاہتا ہے"۔ ارتگین نے کہا "اگر خلیفہ کی پشت پناہی نہیں تو اس کے سالاروں اور حاکموں کی مدد حاصل ہوگی۔ اگر یہ بھی نہیں تو اسے جھوٹ نہ سمجھنا کہ تمام بدو قبیلے ایک شخص حماد علی کی قیادت میں غزنی کے قافلے

کو کیدر کے صحرا میں اُس جگہ جہاں ٹیلے زیادہ ہیں، لوٹ لیں گے اور لڑکیوں کو اُٹھا لے جائیں گے۔ حماد بنِ علی بغداد گیا تھا۔ میں چونکہ اس کے ساتھ تھا اس لیے میں یقین کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ وہ پہلے خلیفہ کے ایک سالار اور دو بڑے حاکموں سے ملا تھا، پھر وہ اسے خلیفہ کے پاس لے گئے تھے۔"

ارتگین نے سلطان محمود کو تفصیل سے بتایا کہ حماد بنِ علی نے کس طرح اور کہاں بدّو قبائل کے سرداروں کو اکٹھا کیا اور قافلے پر حملے کا منصوبہ طے کیا ہے۔ قزّاقوں کی تعداد پانچ ہزار ہوگی۔

"پانچ ہزار" — سلطان محمود حیرت زدہ ہو گیا۔

"اتنی زیادہ تعداد کی وجہ یہ ہے کہ حماد بنِ علی کے جاسوسوں نے جو یہاں آکر قافلے کی تیاری دیکھ گئے ہیں، وہاں جاکر بتایا ہے کہ قافلے میں ہندوستان سے آیا ہوا مال جا رہا ہے اور قافلے میں زیادہ تر لوگ فوجی ہیں یا لڑنے والے ہیں" — ارتگین نے کہا۔ "قافلے کی نفری ڈیڑھ ہزار بتائی گئی ہے۔"

"قافلے میں کوئی فوجی نہیں ہے" — سلطان محمود نے کہا۔ "اگر فوجیوں کو حج کی فرصت ہوتی تو سب سے پہلے میں جاتا" — وہ گہری سوچ میں کھو گیا اور بولا — "میں حجاز کے قافلے کو نہیں روک سکتا۔ اگر میں خود حج پر جا نہیں سکتا تو جانے والوں کے جان و مال کی حفاظت میرے فرائض میں ہے۔ میں حاجیوں کی سلامتی کی خاطر سلطنتِ غزنی کی سلامتی خطرے میں ڈال سکتا ہوں" — وہ بولتے بولتے رُک گیا اور اُس نے ارتگین کو بڑی غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا — "لیکن میں نے تم سے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ تم ہو کون اور تم جو قزّاقوں کے سرغنہ کے خاص آدمی ہو، دل میں ہمارے قافلے کی ہمدردی کس طرح لے کر آئے ہو؟ کیا تم اللہ کے اس سپاہی کو دھوکہ دے سکو گے جس کے نام سے ہندوستان کے دیوتاؤں کے بُت کانپ جاتے ہیں؟"

"غزنی کی ایک بیٹی جو بہت بڑے دھوکے کا شکار ہے، غزنی کی بیٹیوں کے لئے کفارہ ادا کرنا چاہتی ہے" ۔ التگین نے کہا "وہ آبرو باختہ غزنی کی آبرو کو بچانے کے لیے اپنے سلطان کو پکار رہی ہے ۔ میں ایک غلام ہوں، ابنِ غلام ہوں، ترک ہوں لیکن جنم غزنی کی مٹی میں لیا ہے ۔ اس لڑکی نے جس کا نام سبیلہ ہے اور جس کا باپ آپ کی فوج میں شتر سوار تھا اور شہید ہو گیا ہے، مجھ جیسے غلام کے دل میں غزنی کی مٹی کی عظمت پیدا کر دی ہے ۔ اگر سلطانِ عالی مقام کا دل بہت مضبوط ہے تو سنیں"

التگین نے اپنا ماضی اور پھر سبیلہ کی زندگی کی کہانی سلطان محمود کو سنا دی اور اُسے تفصیل سے سنایا کہ سبیلہ نے اُسے کس طرح غزنی آنے کے لیے تیار کیا تھا ۔ سلطان محمود کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں ۔

"جس قوم کی بیٹیاں اس مجبوری کی حالت میں بھی اپنے ایمان اور کردار کو مرنے نہ دیں اس قوم کو کوئی شکست نہیں دے سکتا" ۔ سلطان محمود نے کہا اور اپنے سامنے بیٹھے ہوئے حاکموں وغیرہ سے مخاطب ہو کر کہا "تم اپنی اُبھرتی ہوئی نسل کو گناہوں میں ڈبو دو لیکن روایات جو خون میں شامل ہو گئی ہیں وہ ایک نہ ایک دن رنگ لائیں گی .... اور تم" ۔ سلطان نے التگین کی طرف ہاتھ کر کے کہا "تم غلام نہیں ہو ۔ آگے آؤ" ۔ وہ آگے آیا تو سلطان نے اُسے گلے لگا لیا اور بولا "ہم سب غلام ہیں .... اللہ کے رسولؐ کے غلام اور یہی مسلمان کی عظمت ہے" ۔ سلطان نے پرجوش آواز میں کہا ـــ "قافلہ جائے گا اور اس کے ساتھ فوج بھی جائے گی ۔ غزنی کی سرحدوں پر ہمارا خدا نظر رکھے گا" ۔

یہ تو جذبات کی بات تھی کہ سلطان محمود نے کہہ دیا کہ فوج جائے گی لیکن اُس نے فوج کو کبھی جذباتی کیفیت میں استعمال نہیں کیا تھا ۔ اُس نے دو سالاروں اور مشیروں کو بلایا ۔ غزنی کی سرحدوں کی، اندرونی حالات

کی اور ہندوستان سے آنے والے پیغامات کی صورتِ حال پر بات چیت کی اور جائزہ لیا کہ قزاقوں کی تعداد اگر پانچ ہزار ہے تو فوج کی کتنی نفری ساتھ بھیجی جائے۔ سلطان محمود نے کہا کہ بدّو گھوڑے اور اونٹ دوڑاتے ہوئے لڑتے ہیں اور وہ بھاگنے کا راستہ بھی صاف رکھتے ہیں، اس لیے قافلے کے ساتھ چھاپہ مار دستہ اور ایک دستہ تیر اندازوں کا بھیجا جائے۔

اُس وقت کی کسی بھی تحریر سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ فیصلہ کیوں کیا گیا کہ جو دستے قافلے کے ساتھ بھیجے گئے ان کی قیادت کسی سالار کی بجائے قاضی القضاۃ ابو محمد کو دی گئی۔ محمد قاسم فرشتہ نے مختلف مؤرخوں اور اپنی تحقیق کے حوالوں سے یہ تین نام۔ حماد بن علی، ارتگین اور قاضی القضاۃ ابو محمد وثوق سے لکھے ہیں۔ قاضی القضاۃ کی حیثیت آج کے چیف جسٹس کی ہوتی تھی۔ مذہبی امور کے فیصلے بھی وہی کرتا تھا۔ اُس دور میں قاضی فنِ حرب وضرب کی مہارت بھی رکھتے تھے۔

فرشتہ لکھتا ہے "سلطان محمود نے قاضی القضاۃ ابو محمد کو خاصی فوج دے کر قافلے کے ساتھ بھیجا۔ سلطان محمود نے ابو محمد کو تیس ہزار درہم اس مقصد کے لیے دیئے کہ لڑائی کی بجائے یہ رقم قزاقوں کو دے کر اُن سے معاہدہ کرلیا جائے کہ قافلے کو خیریت سے جانے دیں... سلطان کا یہ انتظام دیکھ کر قافلے میں کئی ہزار لوگ شامل ہو گئے۔"

اور قافلہ روانہ ہو گیا۔ قافلے کو الوداع کہنے کے لیے سلطان محمود خود گھوڑے پر سوار دُور تک ساتھ گیا۔ وہ قافلہ کئی میل لمبا تھا۔ سلطان اِدھر اُدھر گھوڑا دوڑتا اور مسکراتا اور مسکراتے ہوئے سب کو ہاتھ ہلاتا اور خیریت سے واپس آنے کی دعائیں دیتا جا رہا تھا۔ پھر وہ ایک بلند جگہ جا کھڑا ہوا اور اُس وقت وہاں سے اُترا جب قافلے کا آخری مسافر اُس کے سامنے سے گزر گیا۔ وہ بہت دیر تک جاتے ہوئے قافلے کو دیکھتا رہا۔ آخر اُس کی آہ نکل گئی اور اُس نے کہا "خوش نصیب ہیں جو حجاز کو جا رہے

ہیں .... اللہ ان کا محافظ ہو"۔
ارتکین قاضی القضاۃ کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا۔

کِید کے صحرا میں ایک وسیع خِطّہ ایسا تھا جہاں صحرائی ٹیلے دیواروں اور عمارتوں کی طرح کھڑے تھے۔ ان میں بعض ٹیلے ستونوں کی شکل کے تھے اور بعض ڈراؤنے ڈراؤنے سے۔ ان میں سے راستہ گذرتا تھا۔ یہ جگہ بہت ہی خطرناک تھی۔ بھول بھلیاں تھیں۔

اس سے ذرا پرے حماد بن علی نے کیمپ لگا رکھا تھا۔ یہ کم و بیش چار ہزار بدّوؤں کی خیمہ گاہ تھی۔ وہ غزنی کے قافلے کو لوٹنے کے لیے آگئے تھے۔ وہ لڑاکے تھے، شہسوار تھے اور نڈر تھے۔ ان کا کوئی مذہب نہیں تھا۔ وہ اپنے قبیلے کے سردار کو ہی قابلِ عبادت سمجھتے تھے اور ان سے بڑا سردار ان کے سردار کو سمجھتے تھے جو اُس وقت حماد بن علی تھا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ سرداروں کے سردار پر نہ تیر اثر کرتا ہے نہ کوئی اور ہتھیار۔ قزاقی کو وہ جائز پیشہ سمجھتے تھے۔ ان کی نگاہ میں یہ کوئی مذموم حرکت نہیں تھی۔

حماد بن علی کے ساتھ سبیلہ بھی تھی۔ وہ بظاہر خوش تھی لیکن اندر سے کھوئی کھوئی رہتی تھی۔ وہ قافلے کے انتظار میں بے تاب تھی ـــ اور اُس وقت تو وہ اندر سے کانپنے لگی جب رات کے وقت ایک بدّو نے آکر حماد کو بتایا کہ قافلہ بہت بڑا ہے اور اس کے پیچھے پیچھے فوج بھی آرہی ہے۔ بدّو نے یہ بھی بتایا کہ قافلہ کوئی ایک کوس دور پڑاؤ کئے ہوئے ہے۔

حماد بن علی اس خطّے کو جو دنیا کی نظروں سے اوجھل تھا، اپنی زمین سمجھتا تھا جیسے وہاں ہوائیں بھی اسی کے حکم سے چلتی ہوں۔ اُس نے دیکھ بھال کا کوئی انتظام نہ کیا۔ قاضی القضاۃ نے رات کو ہی کمانداروں سے صلاح مشورہ کر کے ٹیلوں کے علاقے میں موزوں بلندیوں پر تیر انداز

بٹھا دیئے اور حماد کی خیمہ گاہ کا جائزہ بھی لے لیا لیکن اُس نے سلطان محمود کی ہدایات کے مطابق حملے میں پہل کرنے کی بجائے دوستانہ معاہدہ بہتر سمجھا۔ رات بھر فوج بیدار رہی۔

اُدھر بدّو قبائل حملے کے لیے تیار ہو گئے۔ صبح طلوع ہوئی تو غزنی کی فوج کے دو آدمی حماد بن علی کے پاس گئے اور اُسے قاضی القضاۃ کا پیغام دیا کہ تم لوگ قافلے کو گذرنے دو۔ اس کے عوض تمہیں پانچ ہزار درہم ادا کیے جائیں گے۔

حماد بھڑک اُٹھا اور غصّے سے تھوک اُڑاتے ہوئے بولا۔ "پانچ ہزار درہم .... پانچ ہزار درہم سے تم میرے پاؤں کی خاک بھی نہیں خرید سکتے۔ تم میری توہین کرنے آئے ہو۔ میں بھکاری نہیں۔" اُس نے بدّوؤں کے خیموں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "اپنے قاضی سے جا کر کہو کہ میری طاقت دیکھے۔ کیا میں انہیں ایک ایک درہم دے کر واپس لے جاؤں؟ تمہارے قافلے کی ساری دولت میری ہے۔ تمام مال و دولت اور میری پسند کی تمام جوان عورتیں میرے حوالے کر دو اور قافلہ خیریت سے گذر جائے۔"

"حمادِ بن علی!" ایک پیغامبر نے کہا "طاقت پر اتنا غرور نہ کر۔ فرعون نہ بن۔ ہم درخواست لے کر نہیں آئے۔ دوستی کا ہاتھ بڑھانے آئے ہیں۔ قافلہ مال و دولت اور خواتین سمیت یہاں سے خیریت سے گزرے گا لیکن یہ ریت تیرے قزّاقوں کے خون سے لال ہو جائے گی۔"

"چلے جاؤ یہاں سے" — حماد نے گرج کر کہا۔ "میں اپنے خیمے میں آئے ہوئے مہمان کو قتل نہیں کیا کرتا۔ جاؤ۔"

پیغامبر واپس آ رہے تھے تو انہیں ارتگین مل گیا۔ اُس نے پوچھا کہ حماد نے کیا جواب دیا ہے۔ اُسے جب بتایا گیا تو وہ ہنس پڑا اور تیر و کمان کندھے سے لٹکائے ایک بلندی پر کھڑا رہا۔

قاضی القضاۃ کو سلطان محمود نے تیس ہزار درہم دیئے تھے لیکن اُس نے یہ رقم ضائع کرنی مناسب نہ سمجھی۔ اُس نے یہ جانتے ہوئے کہ اتنا بڑا قزاق پانچ ہزار درہم کی پیش کش کو اپنی توہین سمجھے گا یہی پیشکش کی جو دراصل چیلنج تھا کہ حماد آؤ اور قافلے پر حملہ کرو۔ قاضی القضاۃ ابو محمد نے اپنی پیشکش کا جواب سنا تو اس نے فوج کو موزوں مقامات پر کر دیا۔ فوج کی نفری تھوڑی سی تھی۔

حماد بن علی نے غصے کی حالت میں بدوؤں کو اکٹھا کیا اور ٹیلوں کے باہر باہر سے انہیں پیشقدمی کر کے قافلے پر حملے کا حکم دیا۔ قافلہ ٹیلوں کے باہر تھا۔ حماد گھوڑے پر سوار ساتھ ساتھ تھا۔ اُس کے ساتھ ایک علمبردار تھا۔ علم سیاہ رنگ کا تھا۔ ساتھ دو محافظ تھے۔ اُدھر قافلے میں لٹنے والے کچھ لوگ تھے۔ وہ گھوڑوں اور اونٹوں پر سوار ہو گئے۔ عورتیں ہاتھ بلند کر کے دعائیں مانگنے لگیں۔ بدوؤں کے کالے اور کرخت چہرے بڑے ڈراؤنے تھے ـــــ اور دُور ایک ٹیلے پر سبیلہ کھڑی تھی۔

التگین بلندی سے اُتر کر ٹیلوں کے اندر چلا گیا، اور ٹیلوں کی اوٹ میں اُس طرف نکل گیا جدھر سے بدوؤں کی فوج جا رہی تھی ـــــ ان کے گھوڑوں اور اونٹوں کی چال ہی سستی تھی۔ التگین چھپ کر دیکھتا رہا۔ پھر اسے حماد بن علی نظر آیا۔ وہ بہت دُور نہیں تھا۔ التگین نے اپنی کمان میں تیر ڈالا اور حماد کے چہرے کا نشانہ لے کر تیر چھوڑ دیا۔ تیر حماد کی کنپٹی میں اُتر گیا۔ وہ تیورا کر گھوڑے سے گرا۔ اُس کے محافظ ابھی دیکھ ہی رہے تھے کہ یہ کیا ہوا ہے کہ ایک تیر علمبردار کی گردن میں دائیں سے لگا اور بائیں کو نکل گیا۔ یہ تیر بھی التگین کا تھا۔ پرچم گر پڑا۔

التگین دوڑ کر ٹیلے پر چڑھا اور بڑی ہی بلند آواز سے چلانے لگا ـــــ
"خدا کی قسم، میں نے حماد بن علی کو مار ڈالا ہے .... غزنی کی آبرو کی قسم، بدوؤں کا پرچم گر پڑا ہے"

اپنے سرداروں کے سردار کو اور اپنے عَلَم کو گرتا دیکھ کر قبائلیوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ تب قاضی القضاۃ ابو محمد نے فوج کو حملے کا حکم دے دیا۔ ارتگین نے اُسے پہلے بتا دیا تھا کہ وہ حماد کو پہچانتا ہے اور وہ سب سے پہلے اُسے مارنے کی کوشش کرے گا۔ ابو محمد نے اسے کہا تھا کہ اگر وہ اسے حملے سے پہلے مارے تو للکار کر آواز دے۔ خدا نے ان کا یہ منصوبہ کامیاب کر دیا۔

اس کے بعد جو کچھ ہُوا وہ بدوؤں کا قتلِ عام تھا۔ وہ اب اپنے آپ کو بچانے کے لیے لڑ رہے تھے اور اس کوشش میں وہ ٹیلوں کے اندر آ گئے جہاں وہ سمجھتے تھے کہ چھپ سکیں گے مگر ابو محمد نے وہاں پہلے ہی ٹیلوں پر تیرانداز بٹھا رکھے تھے۔ ان میں سے جو بدّو باہر کو بھاگے انہیں تعاقب کر کے ختم کیا گیا۔

اس خاک وخون میں ٹیلوں کے اندر گھوڑوں کے شور اور زخمیوں کی چیخ و پکار میں ایک نسوانی آواز سنائی دے رہی تھی — "ارتگین.... ارتگین" یہ سبیلہ کی پکار تھی۔ اسے غزنی کا ایک سوار اٹھا کر گھوڑے پر نہ ڈال لیتا تو وہ گھوڑوں تلے روندی جاتی۔

دوپہر تک کید کا معرکہ ختم ہو چکا تھا۔ اس سے آگے قافلے کے ساتھ فوج کا چھوٹا سا ایک محافظ دستہ بھیجا گیا۔ قاضی القضاۃ باقی فوج کو واپس غزنی لے گیا۔ اس کے ساتھ بدّوؤں کے بے شمار گھوڑے اور اونٹ تھے جن پر اُن کے خیمے اور دیگر سامان لدا ہُوا تھا۔

"ارتگین!" — ابو محمد نے راستے میں اسے کہا — "تم غلام نہیں ہو اور تم سبیلہ! غزنی کی نہیں اسلام کی آبرو ہو۔ اسلام زندہ رہے گا۔"

........—— ۰ ——

....اور ایک بُت شکن پیدا ہوا

آخری حصہ

سلطان محمود غزنوی کے جہاد اور جاسوسوں کی جذباتی اور واقعاتی کہانیاں

عنایت اللہ

جہانگیر بُک ڈپو

• لاہور • راولپنڈی • ملتان • فیصل آباد • حیدر آباد • کراچی

قانونی مشیر: چوہدری ریاض اختر (ایم اے، ایل ایل بی)

آپ کے مشورے اور شکایات کے لئے۔
E-mail:info@jbdpress.com
www.jbdpress.com

سرورق : JBD آرٹ سیکشن، لاہور
سٹاکسٹ: مکتبہ داستان، ۲۶ پٹیالہ گراؤنڈ، لاہور

آفس: 257 ریواز گارڈن، لاہور۔فون: 042-7213318 فیکس: 042-7213319
سیلز ڈپو: اردو بازار، لاہور فون: 042-7220879، سیلز ڈپو: اردو بازار، کراچی۔فون: 021-2765086
سیلز ڈپو: اقبال روڈ نزد کمیٹی چوک، راولپنڈی۔فون: 051-5539609
سیلز ڈپو: نزد یونیفارم سنٹر جامع مسجد صدر، رسالہ روڈ حیدرآباد۔ فون: 0300-3012131
سیلز ڈپو: اندرون بوہڑ گیٹ، ملتان۔فون: 061-4781781
سیلز ڈپو: کوتوالی روڈ، نزد امین پور بازار، فیصل آباد۔فون: 041-2627568
نیاز جہانگیر پرنٹرز، غزنی سٹریٹ اردو بازار، لاہور نے پرنٹ کی۔فون: 042-7314319

فہرست

پیش لفظ

سلطان محمود غزنوی کے دور کی تاریخ ساز اور ولولہ انگیز کہانیوں کا چوتھا اور آخری مجموعہ پیش کیا جا رہا ہے۔ پانچ کہانیوں کے اس مجموعے کی آخری دو کہانیوں میں آپ کو سومنات پر محمود غزنوی کے حملے کی تفصیلات ملیں گی۔ یہ تفصیلات مختلف مؤرخین کی کتابوں سے اور اُس دور کے وقائع نگاروں کی تحریروں سے لی گئی ہیں۔ نصابی کتابوں میں اتنا ہی لکھا ہے کہ محمود غزنوی نے سومنات پر حملہ کیا اور جب وہاں کا بُت توڑنے لگا تو پجاریوں نے اُسے خزانہ پیش کر کے کہا کہ وہ بُت کو نہ توڑے۔ محمود غزنوی نے کہا کہ میں بُت شکن ہوں بُت فروش نہیں ہوں۔

بات صرف اتنی سی نہیں تھی۔ محمود غزنوی کا سومنات پر حملہ ایسے ہی تھا جیسے نپولین نے روس پر کیا تھا۔ موجودہ صدی میں نازی جرمنی نے بھی روس پر حملہ کیا تھا۔ دونوں کے حملے نہ صرف ناکام ہوئے بلکہ دونوں تباہ و برباد ہو گئے۔ سومنات پر سلطان محمود غزنوی کے حملے کا انجام یہی نظر آ رہا تھا۔ نقشے پر غزنی اور سومنات کا فاصلہ دیکھئے۔ پہاڑوں، جنگلوں، بے شمار دریاؤں کے علاوہ بیکانیر کے صحرا سے محمود غزنوی نے فوج کو جس طرح گزارا وہ ایمان اور جہاد فی سبیل اللہ کا ایک معجزہ تھا۔ پھر سومنات کا جو دفاع تھا وہ غزنی کی فوج کے لیے ناقابلِ تسخیر تھا۔ سب سے بڑا خطرہ یہ کہ غزنی کی فوج کو رسد اور کمک مل ہی نہیں سکتی تھی۔ یہ فوج اُس مقام تک چلی گئی تھی جہاں سے واپسی ناممکن ہوتی ہے۔ لیکن اللہ کے شیروں نے فتح حاصل کی۔ جنگی علوم کے مبصر آج بھی حیران ہیں کہ سومنات کی فتح کیونکر ممکن ہوئی تھی۔

سومنات کی فتح کے بعد غزنی کی بچی کھچی فوج کو واپسی پر گائیڈوں نے گمراہ کیا اور اس پر جاٹوں نے مسلسل شبخون مارے لیکن سلطان محمود غزنوی کی فہم و فراست اور خداداد عسکری قابلیت اُس کی فوج کو نکال لائی۔

سومنات کی فتح کے پس منظر میں کچھ اور کہانیاں بھی ہیں۔ میں ان کہانیوں کو سامنے لایا ہوں۔ سومنات کے بُت کی شرمناک حقیقت بھی بے نقاب کی ہے اور وہ الفاظ بھی پیش کر رہا ہوں جو محمودؒ غزنوی نے اُس وقت کہے تھے جب اُسے شو دیو کا بُت نہ توڑنے کے لیے بے بہا خزانہ اور بے حد حسین لڑکیاں پیش کی گئی تھیں۔

سومنات کی فتح کے بعد محمودؒ غزنوی ایک بار پھر ہندوستان میں آیا اور اُس نے پنج ند کے علاقے میں دریائے سندھ میں جاٹوں کے خلاف کشتیوں میں دریائی جنگ لڑی تھی۔ جاٹوں کی کشتیوں کی تعداد چار ہزار اور محمود غزنوی کی کشتیوں کی تعداد ایک ہزار چار سو تھی۔ یہ غزنی والوں کا ایک مثالی معرکہ تھا جو نصابی کتابوں یا عام تاریخوں میں نہیں ملتا۔

ان آخری دو کہانیوں میں اور باقی تین کہانیوں میں آپ کو ہندو لڑکیوں کی حسین عیّاری اور شکست خوردہ راجوں مہاراجوں کی زیر زمین کارروائیوں کی بڑی دلچسپ روئیداد ملے گی۔

پاکستان کے نوجوانوں کو ان کہانیوں میں جہاں تفریحِ طبع کا سامان ملے گا وہاں ان کا ایمان تر و تازہ ہوگا اور دلوں میں ولولہ پیدا ہوگا۔

عنایت اللہ
مدیر "حکایت" لاہور

رتن کماری، رضیہ اور راجیا پال

قنوج پر غزنی کی فوج کا قبضہ تھا اور وہاں سالار ابوالقدر سلجوقی قلعہ دار تھا مہاراجہ راجیا پال جو محاصرے سے پہلے ہی فرار ہو گیا تھا، بھیس بدل کر قنوج کے قلعے میں گیا تھا اور ابوالقدر سلجوقی سے درخواست کی تھی کہ وہ شکست تسلیم کر چکا ہے اور اس کے عوض اُسے ایک مقام میں جس کا نام باری تھا، راجدھانی قائم کرنے کی اجازت دے دی جائے۔ ابوالقدر سلجوقی نے اُسے اجازت دے دی تھی لیکن یہ بھی کہا تھا کہ معاہدے کی شرائط سلطان محمود طے کریں گے۔ اُسی روز ایک قاصد کو غزنی روانہ کر دیا گیا تھا۔

سلطان محمود نے شرائط مقرر کر دی تھیں جو راجیا پال نے قبول کر لی تھیں۔ ان میں اہم یہ تھیں کہ راجیا پال کسی بھی حالت میں غزنی کی فوج کے خلاف نہیں لڑے گا۔ اس کی نئی راجدھانی میں غزنی کی فوج کے کچھ کماندار اور ان کا عملہ رہے گا جو نئی ریاست کی فوج اور دیگر شعبوں پر نظر رکھے گا۔ راجیا پال پر کسی نے حملہ کیا تو غزنی کی فوج اس کی مدد کو پہنچے گی۔ سلطان محمود نے اُس کی فوج کی حد مقرر کر دی تھی اور اس کی ریاست باری کا دفاع اپنے ذمے لے لیا تھا۔

چونکہ مہاراجہ راجیا پال نے خود کہہ دیا تھا کہ اُس نے تمام تر خزانہ قنوج سے نکال کر کہیں چھپا لیا تھا، اِس لیے سلطان محمود نے اُس سے تاوان وصول

کرنے کا بھی حکم دیا۔ اِس کے علاوہ اُسے باجگزار بھی بنالیا گیا۔ سلطان محمود نے غزنی سے ابوالقدر سلجوقی کو یہ حکم بھی دیا کہ راجیاپال پر نظر رکھی جائے اور اس کے متعلق اطلاعات غزنی بھیجی جاتی رہیں۔ ان احکام سے پتہ چلتا ہے کہ سلطان محمود کو مہاراجہ قنوج کے ساتھ گہری دلچسپی تھی جس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ مہاراجہ قنوج کو مغلوج کیے رکھنا چاہتا تھا۔

مہاراجہ راجیاپال نے غزنی کے ساتھ تو دوستی کرلی مگر سارا ہندوستان اُس کا دشمن ہو گیا۔ تین بڑے ہی طاقتور مہاراجے اُس کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ ان میں ایک کالنجر کا مہاراجہ گنڈہ تھا جسے بعض مورخوں نے نندہ رائے بھی لکھا ہے۔ دوسرا گوالیار کا راجہ ارجن تھا اور تیسرا لاہور کا مہاراجہ ترلوچن پال تھا جو سلطان محمود کے سامنے نہیں آتا تھا کیونکہ وہ سلطان کا باجگزار تھا لیکن اس نے اپنی فوج قنوج سے کچھ دور گھنے جنگلوں میں رکھی ہوئی تھی۔ بعض مورخوں نے لکھا ہے کہ وہ ترلوچن پال نہیں بلکہ اُس کا بڑا بھائی بھیم پال نڈر تھا لیکن زیادہ تر نے اسے ترلوچن پال ہی کہا ہے۔ وہ دوسرے مہاراجوں کے لیے ایک دھوکہ بنا ہوا تھا۔ انہیں کہتا تھا کہ وہ ضرورت کے وقت اپنی فوج سامنے لائے گا۔

یہ تینوں مہاراجے اس کوشش میں تھے کہ راجیاپال سلطان محمود کی اطاعت ترک کردے اور ان کے ساتھ مل جائے مگر راجیاپال ان سب سے قطع تعلق کیے رکھنا چاہتا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ غزنی کے فوجی حاکم اُس کے ساتھ تھے جو اُس پر نظر رکھتے تھے۔

*

ان میں ایک کماندار ذوالقرنین تھا جسے ہندوستان کی جنگوں کا تجربہ سب سے زیادہ تھا اور وہ بھیرہ اور ملتان میں بہت عرصہ رہا تھا۔ اِس عرصے میں اُس نے اُس وقت کی ہندوستانی زبان سیکھ لی تھی اور وہ ہندوؤں کو بڑی اچھی

طرح سمجھتا تھا۔ اسی لیے اُسے بارے میں مہاراجہ راجیاپال کا مشیر بنایا گیا تھا۔ وہ دراز قد اور خوبرو جوان تھا۔ ہنس مُکھ اور ملنسار ۔ وہ ہندوؤں میں بھی ہر دلعزیز تھا۔

ذوالقرنین نے ایک ہندو لڑکی رتن کماری کے ساتھ شادی کر لی تھی جو رتن کماری نہیں رہی تھی بلکہ رضیہ بن گئی تھی ۔ یہ لڑکی اُسے متھرا میں ملی تھی لیکن یہ ملاقات بڑے ہی خوفناک حالات میں ہوئی تھی ۔ فضا میں خون کی بو رچی ہوئی تھی اور ارد گرد لاشیں گل سڑ رہی تھیں۔ غزنی کی فوج نے جب متھرا پر حملہ کیا تھا تو شہر سے باہر ایک خونریز معرکہ ہوا تھا ۔ ایک دو روز پہلے طوفانِ بادو باراں نے تباہی مچائی تھی ۔ ہندوستان کے کونے کونے سے ہندو متھرا کی پوجا کے لیے آئے تھے ۔ بعض لوگ اپنے بال بچوں کو بھی ساتھ لائے تھے۔

متھرا کی فوج نے جلدی ہتھیار ڈال دیئے تھے ۔ شام کا وقت تھا ۔ ذوالقرنین اپنے دو سواروں کے ساتھ متھرا کے ارد گرد گشت کر رہا تھا۔ ماحول بھیانک تھا۔ طوفان سے درختوں کے ٹہن ٹوٹ کے گرے ہوئے تھے ۔ باہر سے آئے ہوئے ہندوؤں کے خیمے اکھڑے پڑے تھے اور لاشیں بھی تھیں ۔ لڑائی میں زائرین کی کچھ تعداد ماری بھی گئی تھی ۔

ذوالقرنین کو شام کے گہرے دھندلکے میں کسی کے بھاگتے قدموں کی آہٹ سنائی دی ۔ اُس نے اُس کے پیچھے گھوڑا ڈال دیا ۔ بھاگتے قدم رک گئے اور اُسے رونے اور سسکنے کی آوازیں سنائی دیں ۔ ذوالقرنین نے گھوڑے سے اُتر کر دیکھا ۔ اُسے ایک درخت کے گرے ہوئے ٹہن کی شاخوں میں ایک عورت یا بچی بیٹھی ہوئی نظر آئی ۔ ذوالقرنین نے شاخوں میں سے ہاتھ بڑھا کر اُسے اٹھایا تو وہ اور زیادہ رونے لگی ۔ اس کے رونے میں دہشت زدگی نمایاں تھی ۔ اس کا قد پُرکشش اور لمبا تھا ۔ قریب ہو کے دیکھا ۔ وہ جوان لڑکی

تھی۔
"مجھے قتل کر دو"___ وہ کانپتی ہوئی آواز میں فریادیں کرنے لگی ___ "مجھے ہاتھ نہ لگاؤ۔ مجھے جان سے مار دو۔ اپنے ساتھ نہ لے جاؤ"۔

"ہم یہاں عورتوں کو قتل کرنے نہیں آئے لڑکی!"___ ذوالقرنین نے کہا ___ "ہم عورتوں کی جان اور عزت کے محافظ ہیں۔ تم کہاں جانا چاہتی ہو۔ ہم تمہیں وہاں پہنچا دیں گے"۔

"میں مرنا چاہتی ہوں"___ لڑکی نے روتے ہوئے کہا ___ "مجھے میرے ماں باپ کے پاس پہنچا دو"۔

"کیا وہ مر گئے ہیں؟"

"ہاں۔ وہ مر گئے ہیں"___ لڑکی نے کہا ___ "میں جہاں سے اٹھ کر دوڑی تھی وہاں ان کی لاشیں پڑی ہیں۔ میرا ایک جوان بھائی بھی مارا گیا ہے"۔

یہ لڑکی اپنے والدین اور بھائی کے ساتھ بڑی دور سے آئی تھی۔ پہلے طوفانِ بادوباراں نے انہیں تباہ کیا، پھر وہ دونوں فوجوں کی لڑائی میں کچلے گئے۔ لڑکی کہیں چھپ گئی تھی اس لیے بچ گئی۔ اب اپنے آپ کو غزنی کے فوجیوں کے قبضے میں دیکھ کر اس کی رہی سہی جان بھی نکل گئی۔ ذوالقرنین اسے اس حالت میں اکیلے نہیں چھوڑنا چاہتا تھا مگر لڑکی اس کے قدموں میں گر پڑی اور فریادیں کرنے لگی ___ "میں کنواری ہوں۔ کسی غیر مرد کے ساتھ جانے سے پہلے مر جانا چاہتی ہوں"۔

ذوالقرنین کو اسے اپنے ساتھ لے جانے میں بڑی سخت مشکل پیش آئی۔ وہ چلتی نہیں تھی۔ اسے گھسیٹنا بھی پڑا اور اٹھانا بھی پڑا۔ ذوالقرنین اسے بار بار کہتا تھا کہ ہمارے لیے یہ گناہ ہے کہ ایک نوجوان اور بے آسرا لڑکی کو اس خوفناک ماحول میں اکیلا چھوڑ جائیں۔ وہ لڑکی کو ساتھ لے کر اپنے اعلیٰ کمانڈر کے پاس چلا گیا۔ وہ وقت لڑکیوں اور بچوں کو سنبھالنے کا نہیں تھا۔ اسے کہا گیا کہ اسے اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہو تو رکھ لو۔ کسی ہندو کے حوالے کرنا چاہو تو کر دو لیکن یہ دیکھ لینا کہ تمہارے فرائض کے

راستے میں نہ آئے۔

یہ ہندو لڑکی ذوالقرنین کے فرائض کے راستے میں تو نہ آئی، اس کی زندگی میں ہمیشہ کے لیے آگئی۔ وہ چونکہ کماندار تھا اس لیے اُس کا خیمہ الگ تھا۔ لڑکی تمام رات اُس کے خیمے میں رہی۔ کانپتی رہی۔ روتی رہی۔۔ ذوالقرنین کی مِنّت سماجت کرتی رہی اور اُس کی آنکھ لگ گئی۔ اس کی آنکھ کھلی تو اُس نے ذوالقرنین میں کوئی تبدیلی نہ دیکھی، نہ اُس میں کوئی تبدیلی آئی۔ اس کی رات ویسے ہی گزر گئی جیسے وہ باپ اور بھائی کے قریب سویا کرتی تھی۔

"کیا میں تمہیں اچھی نہیں لگی؟" ۔۔۔لڑکی نے ذوالقرنین سے پوچھا۔

"اگر تم مجھے اچھی نہ لگتیں تو تمہارا وہ خطرہ پورا ہو جاتا جس کے ڈر سے تم میرے ساتھ نہیں آرہی تھیں" ۔۔۔ذوالقرنین نے کہا۔ "تم نے کہا تھا کہ تم کنواری ہو۔ میں کہہ رہا ہوں کہ تم بہت خوبصورت ہو۔ میں تمہیں پاک لڑکی سمجھتا ہوں اور پاک رکھوں گا۔ اب کہو کہاں جانا چاہتی ہو۔ دل سے سب خوف اتار دو۔"

لڑکی اُسے کچھ دیر دیکھتی رہی، پھر اُس کے پاؤں پکڑ لیے۔ ذوالقرنین نے اپنے پاؤں پیچھے کر لیے اور کہا۔ "ہمارے مذہب میں کسی انسان کو اجازت نہیں کہ کسی کو اپنے آگے سجدہ کرنے پر مجبور کرے۔ مجھے گناہ گار نہ کرو.... کہو کہاں جانا ہے؟"

لڑکی نے آہ بھری اور بولی ۔۔۔ "لڑکی کو ماں باپ کا گھر چھوڑ کر کہیں نہ کہیں تو جانا ہی ہوتا ہے۔ میرے ماں باپ مجھے چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ اب تم بتاؤ کہ کہاں جاؤں؟"

"اگر میرے ساتھ رہنا چاہتی ہو تو تمہیں اپنا مذہب چھوڑنا پڑے گا" ۔۔۔ ذوالقرنین نے کہا۔ "تم تھوڑے ہی دنوں بعد محسوس کرو گی کہ تم نے اچھا کیا ہے کہ اپنا مذہب چھوڑ دیا ہے۔"

لڑکی خاموش ہو گئی پھر گہری سوچ میں کھو گئی۔ ذوالقرنین اسے بتانا نہیں چاہتا تھا کہ وہ اُس کے دل میں اُتر گئی ہے۔ وہ بہت ہی خوبصورت لڑکی تھی۔ اُس نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ اس لڑکی کو وہ اپنی بیوی بنالے ورنہ یہ اُس کے فرائض کے راستے میں حائل ہو جائے گی۔ غزنی کا یہ کماندار کچھ دیر کے لیے تو اپنے فرائض کو بھول گیا تھا۔

"میں تم پر کوئی شرط عائد نہیں کر رہا"۔۔۔ ذوالقرنین نے کہا۔"اور میں تمہیں مجبور سمجھ کر تم پر اپنا فیصلہ نہیں ٹھونس رہا۔ اگر جانا چاہو تو بتا دو"۔

"مجھے ہری کرشن کے قدموں میں بٹھا دو"۔۔۔ لڑکی نے کہا۔"میں ساری عمر مندر میں گزار دوں گی"۔

ذوالقرنین کا خون ابل پڑا۔ اُس کی آواز میں غصّے کی جھلک آگئی ۔۔۔"اپنے آپ کو دھوکے نہ دو لڑکی! پتھر کے ہری کرشن کے سائے میں تم پنڈتوں کی داشتہ بنی رہو گی اور تمہاری ساری عمر اسی طرح گزر جائے گی۔ تم کمسن ہو۔ نادان ہو۔ اسی لیے مجھے تم سے ہمدردی ہے، ورنہ تم کیا ہو۔ ایک لڑکی ہو۔ ایک لڑکی سارا ہندوستان نہیں ہو سکتی۔ میں اتنی دور سے صرف ایک خوبصورت لڑکی کی خاطر نہیں آیا۔ میں ان بتوں کو توڑنے آیا ہوں۔ باہر نکل کر اپنے خداؤں کے ٹکڑے بکھرے ہوئے دیکھو۔ انہیں انسان پاؤں تلے مسل رہے ہیں"۔

لیکن لڑکی مذہب میں ڈوبی ہوئی تھی۔ یہ مذہبی جنون ہی تھا کہ ماں باپ اُسے اتنی دور سے متھرا لائے تھے۔ وہ مذہب کی تبدیلی سے جیسے کانپنے لگی تھی۔ ذوالقرنین نے اُسے دوسری صورت یہ بتائی کہ وہ جہاں جانا چاہے اُسے وہاں تک پہنچا دیا جائے گا لیکن مندر میں نہیں جانے دے گا۔ لڑکی پر طوفان، لڑائی، خون اور لاشوں کی اور اپنے ماں باپ کی موت کی اتنی دہشت طاری تھی کہ وہ ذوالقرنین کے خیمے سے باہر نکلنے سے بھی گھبرا رہی تھی اور

اسی شخص کو اپنا پاسبان سمجھنے لگی تھی۔

وہ تین چار دن خیمے سے نہ نکلی اور کوئی فیصلہ بھی نہ کر سکی۔ ذوالقرنین کو متھرا سے آگے جانے کا حکم مل گیا۔ جب لڑکی نے دیکھا کہ وہ اکیلی رہ گئی ہے تو اُس نے ذوالقرنین سے بیتاب ہو کر کہا کہ وہ جہاں جا رہا ہے اُسے اپنے ساتھ لیتا چلے۔ ان تین چار دنوں میں لڑکی نے دیکھ لیا تھا کہ یہ گٹھا ہوا، دراز قد جوان بہت نیک آدمی ہے یا پتھر ہے۔ وہ جو کچھ بھی تھا اس کنواری لڑکی کے لیے فرشتہ تھا۔

اُسی روز لڑکی کو فوج کے امام کے پاس لے جا کر مسلمان کر لیا گیا۔ وہ رتن کماری سے رضیہ بن گئی اور سالار کی اجازت سے ذوالقرنین اور رضیہ کی شادی ہو گئی۔ غزنی کی فوج کے چند اور حاکموں کی بیویاں بھی ساتھ تھیں۔ رضیہ کو اُن کے حوالے کر دیا گیا۔ اِن عورتوں سے ذوالقرنین کو پتہ چلا کہ رضیہ اُسے فی الواقع فرشتہ سمجھتی ہے مگر اُسے یہ بھی بتایا گیا کہ وہ اسلام کے فرائض اور عبادت وغیرہ کو سمجھنے میں ہچکچاہٹ یا دشواری محسوس کرتی ہے یا اُس نے اسلام کو دل سے قبول نہیں کیا۔

*

ایک سال گزر گیا تھا۔ ذوالقرنین اب باری میں مہاراجہ راجیپال کے ساتھ تھا۔ راجیپال تو جیسے مر ہی گیا تھا۔ وہ اب جنگجو نہیں صرف مہاراجہ رہ گیا تھا۔ اُس کے پاس خزانے کی کمی نہیں تھی۔ وہ مہاراجوں کی شان و شوکت سے رہتا تھا۔ ناچنے اور گانے والیاں بھی موجود تھیں۔ اُس نے نئے سرے سے حرم بھی بنا لیا تھا۔ وہ غزنی کے فوجی افسروں کو جو باری میں رہتے تھے، راگ رنگ کی محفلوں میں مدعو کیا کرتا تھا لیکن ان میں سے کوئی بھی نہیں جاتا تھا۔

باری میں مندر بھی تھا۔ پنڈت اور رشی بھی آ گئے تھے۔ سلطان محمود کے حکم کے مطابق وہ راجیپال کے مذہب میں دخل نہیں دیا کرتے تھے۔ سلطان

نے حکم بھیجا تھا کہ اسلام کی تبلیغ کی جائے اور ان کے سامنے اسلامی کردار کا نمونہ پیش کیا جائے ۔ یہ کام فوجی کر رہے تھے ۔ دو چار دنوں بعد ایک دو ہندو اسلام قبول کر لیتے تھے ۔ ذوالقرنین نے رضیہ سے بھی کہہ رکھا تھا کہ وہ ہندو عورتوں کو بتاتی رہا کرے کہ مسلمانوں کا کردار کس قدر بلند ہے اور یہ بھی کہ اسلام کے احکام ہی ایسے ہیں کہ مسلمانوں کو اپنا کردار پاک اور بلند رکھنا پڑتا ہے ۔

رضیہ اسی کردار کی پرستار تھی ۔ اس نے مسلمان مرد کا کردار اپنی آنکھوں دیکھا تھا ۔ وہ ہندو عورتوں کے ساتھ اسی کا ذکر کرتی رہتی تھی ۔

غزنی میں سلطان محمود غزنوی سلطنت کے اُلجھے ہوئے امور سلجھانے میں مصروف تھا اور اُن مسلمانوں کو اپنے محاذ پر لانے کی کوشش کرتا رہتا تھا جو اُس کے دشمن بنے ہوئے تھے مگر اُس کے کان ہندوستان کی طرف لگے رہتے تھے ۔ وہ تھوڑی سی فوج کو ہندوستان کے دل میں بٹھا آیا تھا متھرا ہندومت کا دِل تھا ۔ اسلام کا خنجر اس دل میں اُتر ہوا تھا ۔ کبھی ہو نہیں سکتا تھا کہ ہندو راجے مہاراجے خاموش بیٹھے رہتے ۔

سلطان محمود کو یہ بھی احساس تھا کہ ہندو لڑنے والی قوم ہے ڈرنے والی نہیں ۔ اُس نے دیکھا تھا کہ ہندو کس طرح جانیں قربان کرتے ہیں ۔ ان میں خرابی یہ تھی کہ ان کے سالاروں کو لڑانے کا ڈھنگ نہیں آتا تھا ۔ وہ ٹوٹ پڑنے اور کٹ مرنے کو لڑائی کہتے تھے ۔ اس کے مقابلے میں سلطان محمود کا شمار تاریخ کے مانے ہوئے ذہین جرنیلوں میں ہوتا تھا ۔ اُس کی جنگی چالیں ایسی تھیں جو دشمن کو جال میں پھانس لیتی تھیں ۔ دشمن کے پاس دو ہی چالیں رہ جاتی تھیں ۔ وہ ہتھیار ڈال دے ، بھاگ اُٹھے یا دیواروں سے ٹکرانے کے انداز سے لڑے اور ختم ہو جائے ۔

مذہب کے معاملے میں ہندو مسلمانوں سے کم نہیں تھے ۔ ہندوؤں پر تو مذہب کا جنون طاری تھا ۔ وہ مذہب کے نام پر لڑتے اور بے جگری

سے لڑتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ حق اور باطل کو نہیں سمجھتے تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کی ٹکر حق سے ہے اور وہ سچے خدا کے نام لیواؤں کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ انہیں کوئی بتاتا نہیں تھا کہ حق پرستوں کے ساتھ خدا ہوتا ہے۔ یہ حق پرستی کا ہی کرشمہ تھا کہ خدا نے سلطان محمود کو وہ عسکری فہم و فراست، جرأت اور شجاعت عطا کی تھی جس کے آگے پہاڑوں کے سینے بھی چاک ہو جاتے تھے۔

سلطان محمود کہا کرتا تھا کہ سانپ کو آخر کار انسان کے ہاتھوں مرنا ہی ہوتا ہے لیکن انسان چوکنا رہتا ہے کہ سانپ بے خبری میں ڈس نہ لے۔ وہ ہندوؤں کو سانپ اور بچھو کہا کرتا تھا جن کی فطرت صرف ڈنک مارنا تھا۔

"میں ہندوؤں سے غافل نہیں ہو سکتا"۔۔۔ اب بھی وہ اپنے سالاروں اور مشیروں وغیرہ سے کہہ رہا تھا۔۔۔ "ان کے سر ابھی کچلے نہیں گئے۔ میں ان کے ہتھیار ڈالنے سے مطمئن نہیں ہو سکتا۔ سانپ بل میں چلا جائے یا اسے ٹوکری میں بند کر دو تو اس کی فطرت بدل نہیں جاتی۔ اس کا زہر ختم نہیں ہو جاتا۔ موقع ملتے ہی وہ ڈنک مارے گا"۔

وہ اکثر کہا کرتا تھا۔۔۔ "مجھے خدا اتنی لمبی عمر نہیں دے گا کہ میں محمد بن قاسم کی سرزمین کو ہندوؤں سے پاک کر سکوں۔ معلوم نہیں میرے بعد آنے والے ادھر توجہ دیں گے یا نہیں۔ اگر انہوں نے ہندو کے ساتھ دوستی کر لی تو یہ اسلام کے ساتھ دشمنی ہوگی۔ ہندو جب تک زندہ ہے اسلام کو ڈستا رہے گا اور ہندوستان کی زمین مسلمانوں کے خون سے تر رہے گی۔ اُن کی مدد کو کوئی نہیں پہنچے گا جنہیں مدد کو پہنچنا ہوگا اُن پر ہندو اپنی دوستی کا اور اپنے پیار کا فریب طاری کیے رکھے گا۔ ہندو اُس بیوی کی مانند ہے جو خاوند کے پاؤں دھوتی ہے اور اُس کے جسم کا حصہ بنی نظر آتی ہے مگر اُس کی در پردہ آشنائی کئی مردوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ وہ خاوند کے لیے پیار میں لپٹا ہوا فریب بنی رہتی ہے"۔

سلطان محمود کے پیر و مُرشد شیخ ابوالحسن خرقانی نے اُسے کہا تھا ـــ "دو قومیں ایک مٹی کی اور ایک سانچے کی بنی ہوئی ہیں۔ ایک یہودی، دوسرے ہندو۔ اسلام دشمنی ان کی فطرت کا حصہ اور مذہب کا فریضہ ہے۔ جس دور میں مسلمان ان سے غافل ہوئے یا انہیں دوست بنا بیٹھے، وہ دور اُمّتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے زوال کا دور ہوگا۔ ملّت اپنا ملّی وقار کھو بیٹھے گی۔ سلطنتوں اور ریاستوں میں بٹے ہوئے مسلمانوں کے حکمران قوم کو رعایا بنالیں گے۔ ان کی زبانیں بند کردیں گے اور انہیں ہندو اور یہودی کے خلاف بات کرنے سے روک دیں گے کیونکہ انہیں اپنی حکمرانی اور بادشاہی کا تحفظ اسلام کے ان دشمنوں کی خوشنودی میں نظر آئے گا۔ وہ اسلام کی تاریخ کا سیاہ دور ہوگا۔ خدا کی یہ زمین مسلمانوں کے خون سے لال ہوتی رہے گی۔"

سلطان محمود اپنے اس روحانی پیشوا کی بات بڑی غور سے سُن رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں ٹھہر گئی تھیں اور اُس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اُس کی رُوح کانپ رہی ہے۔

"اور تمہاری اس سلطنت پر بے دین من مانی کریں گے۔" ابوالحسن خرقانی کہہ رہے تھے ـــ "غزنی، کابل، قندھار گھروہ بزا اُس قوم کے پاؤں تلے روندے جائیں گے جس کا کوئی دین نہیں اور جسے دین والے مسلمان اپنا ہمدرد سمجھیں گے۔"

"یا شیخ و مُرشد ما!" ـــ سلطان محمود نے تڑپ کر کہا۔ "قوم پر آنے والی بدبختیوں کو میں آج کیسے روک سکتا ہوں؟ میں کیا کروں؟"

"تمہارا مقبرہ اُن کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا" ـــ شیخ خرقانی نے کہا۔ "مستقبل کا خونی کھیل تمہارے اور میرے مقبروں کے اردگرد کھیلا جائے گا۔ ہم کچھ نہیں کرسکیں گے۔ کچھ کرنا ہے تو آج کرلو..... اور وہ تم کررہے ہو۔ میں تمہیں یہ بتانا چاہوں گا کہ کیا نہ کرو۔ تم بار بار اُس طلسم میں جارہے ہو

جسے ہندوستان کہتے ہیں۔ وہاں زروجواہرات ہیں۔ عورت کا حُسن ہے اور یہ حُسن بے حجاب ہے۔ وہاں کے پیڑ پودوں میں حُسن ہے۔ اگر تم اور تمہارے سالاروں اور تمہارے کمانداروں نے اپنے ذہن و دل اس طلسم سے آزاد رکھے تو تم وہ قلعہ تعمیر کر سکو گے جس کی دیواروں سے کفر ٹکرا ٹکرا کر اپنا سر پھوڑتا رہے گا۔"

"کبھی کبھار میری فوج کا کوئی فرد کسی ہندو لڑکی کے ساتھ شادی کر لیتا ہے" سلطان محمود نے کہا۔ "اُسے باقاعدہ مسلمان کیا جاتا ہے۔ کیا یہ سلسلہ چلتا رہے یا اسے روک دوں؟"

"ایک حکایت سنو گے محمود!" شیخ خرقانی نے کہا۔ "میری جوانی میں میرے والدِ بزرگوار مرحوم و مغفور کا ایک مرید ہوا کرتا تھا۔ تاجر تھا اور دولتمند۔ وہ کسی ملک سے چیتے کا بچہ لے آیا۔ میں نے دیکھا تھا۔ بڑا پیارا تھا۔ بلّی کا بچہ لگتا تھا۔ وہ شخص اُسے گود میں بٹھا کر دودھ پلایا کرتا تھا۔ اپنے بستر میں سُلایا کرتا تھا۔ بچہ بڑا ہوا تو اُسے پرندوں اور غزال کا گوشت کھلایا کرتا تھا۔ وہ جدھر جاتا، چیتا اُس کے ساتھ ہوتا۔ چیتے کو اپنے مالک کی بُو کے ساتھ بھی پیار تھا۔ ایک روز یہ شخص میرے والدِ بزرگوار کے پاس آیا۔ اُس نے اپنا بازو کہنی سے کلائی تک پٹیوں میں باندھ رکھا تھا۔ کہنے لگا چیتے نے کاٹ کھایا ہے میرے والد نے کہا وہ تو تم سے پیار کرتا تھا۔ وہ شخص بولا، اُس نے پیار سے ہی کاٹا ہے لیکن دانت گوشت میں اُتر گئے ہیں اور کھال اُتر گئی ہے۔ بڑی مشکل سے خون بند ہوا۔ جسم سے آدھا خون بہہ گیا ہے....

"وہ چلا گیا تو والد نے مجھے کہا۔ کچھ سمجھے ہو حسن!... درندوں کے پیار میں بھی درندگی ہوتی ہے اور چیتا اپنی فطرت سے مجبور ہے کہ انسان کو اپنا دشمن سمجھے۔ محمود! ہندو اور یہودی وہ درندے ہیں جن کے پیار میں بھی درندگی ہے اور وہ اپنی فطرت سے مجبور ہیں کہ مسلمان کو اپنا دشمن سمجھیں۔ تم خود سوچ لو کہ مسلمان ہندو عورتوں کے ساتھ شادی کریں یا نہ

کریں۔ ایک دوسرے کے جسموں سے لذّت حاصل کی جا سکتی ہے مگر فطرت اس لذّت سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔"

*

سلطان محمود نے ایسا حکم تو جاری نہیں کیا تھا کہ کوئی فوجی کسی ہندو عورت کے ساتھ شادی نہیں کر سکتا، البتّہ اُس نے سالاروں اور فوج کے ساتھ جانے والے اماموں سے کہا تھا کہ وہ فوجیوں کو ہندو لڑکیوں میں دلچسپی نہ لینے دیں۔ اس کے باوجود بڑے ہی خاص حالات میں کوئی فوجی کسی ہندو عورت کے ساتھ شادی کر لیتا تھا۔ ان میں کماندار ذوالقرنین بھی تھا۔ اس لڑکی سے جو رتن کماری سے رضیہ بن گئی تھی، سالار ابوالقدر سلجوقی بھی متاثر ہو گیا تھا اور امام بھی۔ لڑکی کسمپرسی کی حالت میں تھی۔ یہ خبر سلطان محمود تک پہنچ گئی تھی اور اُس نے کسی نمایاں ردِّعمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔

ہندوستان سے قاصد باقاعدگی سے غزنی جا رہے تھے۔ ان کے ساتھ وہ رپورٹیں بھی سلطان کے پاس جاتی تھیں جو ہندوستان میں بکھرے ہوئے جاسوس فراہم کیا کرتے تھے۔ ان کے مطابق لاہور کا مہاراجہ اپنی فوج سمیت راجدھانی سے غائب تھا۔ وہ دریائے جمنا اور گنگا کے دوآبہ سے باہر شمالی جنگلات میں کہیں روپوش تھا۔ جاسوسوں کو اُس کے ارادوں کا ابھی پتہ نہیں چلا تھا۔

ارادوں کی تکمیل کا منصوبہ کالنجر میں بن رہا تھا۔ وہاں کے مہاراجہ گنڈہ کے محل میں گوالیار کا راجہ ارجن اور لاہور کا مہاراجہ ترلوچن پال بیٹھے تھے۔ ان کے ساتھ گوبند نام کا ایک ہندو اور کالنجر کا بڑا پنڈت بھی موجود تھے۔ ان کے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ مہاراجہ قنوج راجیپال دھوکہ دے گیا ہے اور اُس نے خودمختاری کے پردے میں سلطان محمود کی غلامی قبول کر لی ہے۔ وہ اس مسئلے پر بحث کر رہے تھے کہ راجیپال کو کس طرح سلطان محمود کے خلاف کیا جائے۔

بحث جب زیادہ گرم ہوئی اور یہ مہاراجے باتوں پر ہی زور دینے لگے تو اُن کے درمیان سونے کی چوڑیاں آپڑیں۔ سب نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اُن کی نظریں ذرا اوپر اُٹھیں اور کمرے کے اندر کھلنے والی شاہ نشین کے باریک ریشمی پردے پر رُک گئیں۔ یہ شاہ نشین بالاخانے پر تھی۔ وہاں دربارِ عام کے دوران رانیاں اور راجکماریاں بیٹھا کرتی تھیں۔ اس باریک پردے کے پیچھے ایک عورت کھڑی نظر آرہی تھی جو سرتاپا برہنہ تھی۔ سب کی نظریں جھک گئیں۔

"یہ چوڑیاں پہن لو" — پردے کے پیچھے سے عورت کی آواز آئی — "نظریں مت جھکاؤ۔ میں تمہاری عزت ہوں۔ میں بھارت ماتا ہوں۔ میں اندراولی ہوں۔ دیکھ لو مجھے۔ میں ننگی ہوں۔ تم نے مجھے ننگا کیا ہے۔ تم میں شرم نہیں رہی۔ نظریں کیوں جھکالی ہیں؟"

وہ مہاراجہ گنڈہ کی رانی تھی۔ گنڈہ غصّے سے اُٹھا۔

"یہاں سے چلی جاؤ شکنت آ" — اُس نے کہا "میں اب تمہارے سامنے اُس وقت آؤں گا جب شوجی اور ہری کرشن مہاراج کی توہین کا انتقام لے چکوں گا۔ جب تک غزنی کا ایک بھی سپاہی بھارت ماتا میں موجود ہے، مجھ پر تمہارا چہرہ اور جسم حرام ہے"

"تمہاری رگوں میں راجپوتی خون کی جگہ شراب دوڑ رہی ہے" — رانی نے کہا — "تم غیرت والے ہوتے تو اس محل میں بیٹھے شراب نہ پی رہے ہوتے۔ تم اُن جنگلوں میں کیوں نہیں چلے جاتے جہاں تم نے ماؤں کے سپوت مسلمانوں سے مروا دیئے ہیں۔ تم اُن مندروں کے ملبے تلے دب کر مر کیوں نہیں گئے جنہیں ناپاک مسلمانوں نے تباہ و برباد کر دیا ہے"

"رانی شکنت آ" — مہاراجہ گنڈہ گرج کر بولا — "تم یہاں سے چلی کیوں نہیں جاتیں؟"

پنڈت اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس دربار میں پنڈت مہاراجوں اور اُن کے

فوجی افسروں پر چھائے رہتے تھے۔ بعض علاقوں میں اُن کا حکم چلتا تھا۔
اُس نے رانی کو ایسے پردے کے پیچھے برہنہ کھڑے دیکھا جہاں سے وہ نظر آرہی تھی، وہ آگ بگولے کی طرح اُٹھا اور مہاراجوں سے مخاطب ہُوا:

"آپ کہتے ہیں کہ رانی کیوں نہیں جاتی؟" ــــ اُس نے ایسی آواز میں کہا جس میں غصہ بھی تھا طنز بھی ــــ "میں کہتا ہوں رانی اسی حالت میں ہمارے سامنے کیوں نہیں آجاتی تاکہ ہم اچھی طرح دیکھ سکیں کہ ایک ننگی، بے مذہب اور بے غیرت قوم کیسی ہوتی ہے۔ دو سال ہو گئے ہیں۔ تم نے باتوں کے سوا کیا کیا ہے؟ کیا یہ بہتر نہیں کہ تلواریں پنڈتوں اور عورتوں کو دے دو کہ وہ لڑیں اور تم یہاں شراب پیٔو اور ناچنے والیوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناؤ؟ اب تو دیوتاؤں کو تمہاری قسموں کا بھی اعتبار نہیں رہا"۔ اُس نے اوپر دیکھا اور بولا "چلی جاؤ رانی! میں ان مہاراجوں کے ماتھوں پر پسینے کے قطرے دیکھ رہا ہوں۔ شاید ندامت کے یہ قطرے ان کے خون کو گرما دیں گے"۔

رانی چلی گئی اور پیچھے ایسا سکوت چھوڑ گئی جس میں غزنی کی فوج کے لیے طوفان پرورش پا رہا تھا۔ تینوں مہاراجے ایک دوسرے سے آنکھ ملانے سے گھبرا رہے تھے۔

"قنوج کے قلعے میں غزنی کی فوج کی نفری پوری ایک ہزار بھی نہیں" ــــ پنڈت نے کہا ــــ "تم حملہ کرو تو لڑائی کے بغیر اس نفری سے ہتھیار ڈلوا سکتے ہو۔ ان کی مدد کو کون آئے گا؟"

"ان ایک ہزار کو مار لوگے تو کیا حاصل ہوگا؟" ــــ گوالیار کے راجہ ارجن نے کہا "محمود طوفان کی طرح آئے گا اور ایسا انتقام لے گا جسے ہندوستان کی تاریخ ہمیشہ یاد رکھے گی"۔

"لڑائیاں لڑنا اور لڑانا آپ کے بس کی بات نہیں پنڈت جی مہاراج!" — مہاراجہ گنڈہ نے کہا — "ہمیں سلطان محمود کی جنگی طاقت کو بیکار کرنا ہے۔ ہمیں یہ سوچنا ہے کہ ہم سب مل کر غزنی پر چڑھائی کر سکتے ہیں؟۔۔۔ ہمیں وہ منبع بند کرنا ہے جہاں سے یہ سیلاب آتا ہے"۔

"آپ کے لیے یہ ممکن نہیں" — پنڈت نے کہا — "لاہور کے مہاراجہ ترلوچن پال آپ کے ساتھ بیٹھے ہیں۔ ان کے دادا مہاراجہ جے پال نے غزنی پر کتنے حملے کئے تھے اور اُن کا کیا حشر ہوا تھا۔ یہی ناکہ چتا پر کھڑے ہو کر انہوں نے اپنے آپ کو زندہ جلا ڈالا تھا۔۔۔۔ میں مہاراجہ ترلوچن پال سے پوچھتا ہوں کہ مسلمان متھرا کو صاف کر گئے، بلند شہر اور منج کو تباہ کر گئے اور انہوں نے قنوج پر قبضہ کر لیا۔ مہاراجہ لاہور نے کیا کیا؟ اپنی فوج کو قریب ہی جنگل میں چھپائے رکھا اور دوسروں کو لڑنے کی شہ دیتے رہے"۔

"میں جو چال چلنا چاہتا تھا اس کا مجھے موقع نہیں ملا" — لاہور کے مہاراجہ ترلوچن پال نے کہا — "میں غزنی کی فوج پر عقب سے حملہ کرنا چاہتا ہوں مگر کسی بھی جگہ لمبا مقابلہ نہ ہوا۔ محمود ایک ایک دن میں ایک ایک قلعہ فتح کرتا گیا۔ قنوج سے راجیا پال پہلے ہی بھاگ گیا تھا۔ میں نے دشمن کی پیٹھ دیکھی ہی نہیں"۔

"ترلوچن مہاراج!" — مہاراجہ گنڈہ نے کہا — "مجھے آپ کی یہ چال پسند نہیں آئی۔ اگر آپ اپنی فوج غزنی کے سلطان کے راستے میں لے آتے تو وہ اتنی جلدی آگے نہ بڑھتا۔ حالات کچھ اور ہوتے"۔

"مہاراجہ ترلوچن پال کی چال کو میں سمجھتا ہوں" — پنڈت نے کہا — "یہ اپنی فوج گنگا جمنا کے دوآبے میں صرف اس لیے لیے پھرتے رہے کہ جنگ کو لاہور سے دور رکھیں اور دوسروں کو لڑاتے رہیں"۔

ترلوچن پال بھڑک اٹھا اور چلّا چلّا کر کہنے لگا کہ اُس کی توہین کی جا رہی ہے۔

"میں اس کی معافی مانگ لیتا ہوں" — پنڈت نے کہا — "لیکن ہمیں یہ یقین دلا دیں کہ اب آپ اپنی فوج سامنے لے آئیں گے اور اعلان کر دیں گے کہ آپ غزنی کے باجگزار نہیں ہیں۔"

اس محفل کی صورت اجلاس کی تھی ۔ اجلاس کی صورت ہنگامہ خیز ہو گئی ۔ تب وہ آدمی بولا جو فوجی نہیں تھا ۔ اُس کا نام گوبند تھا ۔

"اگر آپ جیسے دس اور مہاراجے اپنی فوجیں لے کے آجائیں تو بھی غزنی والوں کو شکست نہیں دے سکتے" — گوبند نے کہا — "جو میں جانتا ہوں وہ آپ نہیں جانتے ۔ کیا آپ میری عقل اور ذہانت کی تعریف نہیں کریں گے کہ قنوّج کے قلعہ دار سالار ابوالقدر سلجوقی کے ساتھ دوستی جتنی میری گہری ہے اتنی اُس کے اپنے کسی آدمی کے ساتھ نہیں ؟ وہ مجھے اپنا جاسوس سمجھتا ہے ، مگر میں اُس کے سینے میں سے راز نکال کر آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں ۔ میں آپ کی آنکھیں اور کان ہوں ۔ یہ میں اس لیے جتا رہا ہوں کہ آپس کی چپقلش کو بھول کر آپ میری باتیں غور سے سنیں ۔"

سب خاموش ہو کر اُس کی طرف متوجہ ہوئے ۔ وہ سب گوبند کی قابلیّت کے مدّاح تھے ۔ وہ اُن کا جاسوس تھا ۔ انہیں صحیح اور بروقت خبریں دیتا رہتا تھا ۔ اُس نے سالار ابوالقدر کا اعتماد حاصل کر لیا تھا ۔ اُس نے اپنا مذہب تبدیل نہیں کیا تھا ۔ اُس نے کہا تھا کہ وہ مسلمان ہو گیا تو ہندو اسے اپنے قریب بھی نہیں بیٹھنے دیں گے ۔ وہ دوہری یا دوغلی جاسوسی کر رہا تھا ۔ اُس کے اس فریب سے نہ ہندو مہاراجے واقف تھے نہ غزنی کے فوجی حکام جو قنّوج کے قلعے میں مقیم تھے ۔ وہ دونوں سے دولت سمیٹ رہا تھا ۔

*

اب وہ مہاراجوں کے اجلاس میں بیٹھا انہیں بتا رہا تھا — "آپ پہلے ہی یہ مشورہ رد کر چکے ہیں کہ قنّوج پر حملہ کیا جائے کیونکہ وہاں غزنی کی فوج

صرف ایک ہزار ہے۔ آپ آئندہ اس اقدام کو ذہن میں نہ لانا۔ راجیا پال کی نئی راجدھانی باری کو بھی غزنی والوں نے اپنا فوجی اڈہ بنالیا ہے۔ وہاں اتنا امن اور سکون ہے کہ قنّوج سے جو ہندو خاندان بھاگ گئے تھے وہ باری میں آباد ہو گئے ہیں۔ راجیا پال کی فوج بھی وہیں ہے جسے غزنی کے فوجی تربیّت دے رہے ہیں۔ غزنی والوں کا سلوک اتنا اچھا ہے کہ اب تک کئی ہندو فوجی مسلمان ہو چکے ہیں۔ ہندوؤں کی جوان لڑکیاں بھی اسلام قبول کر رہی ہیں...

"راجیا پال کا بیٹا لچھمن پال بھی وہیں ہے۔ وہ بہت پریشان ہے۔ اُس کے دل میں مسلمانوں کی دشمنی جوش مار رہی ہے مگر وہ اپنے باپ کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔ اُس نے مجھے یہاں تک کہا ہے کہ وہ اپنے باپ کو قتل کرنا چاہتا ہے لیکن وہ غزنی والوں کے انتقام سے ڈرتا ہے۔ اس وقت مہاراجہ راجیا پال غزنی والوں کا دوست ہے۔ میں نے وہاں کے حالات کا جو جائزہ لیا ہے، ان کے پیشِ نظر مجھے ایک ہی صورت نظر آتی ہے کہ راجیا پال کو ایسے خفیہ طریقے سے قتل کرایا جائے کہ غزنی والوں کو شک تک نہ ہو کہ اُسے آپ نے قتل کرایا ہے۔"

مہاراجہ گنڈہ نے اپنی ران پر زور سے ہاتھ مار کر کہا۔ "میں یہی سوچ رہا تھا۔ اگر راجیا پال مر جائے یا مارا جائے تو ہم اس کے بیٹے لچھمن پال کو اپنے ساتھ اس طرح ملا سکتے ہیں کہ وہ غزنی والوں کا دوست بنا رہے اور جب ہم سب اپنی فوجوں کی ایک متحدہ فوج بنا لیں تو لچھمن پال غزنی کے فوجی حاکموں کو قید میں ڈال کر اعلان کر دے کہ وہ غزنی کا باجگزار نہیں اور اُسے غزنی کی اطاعت قبول نہیں۔ سلطان محمود فوج کشی کرے گا۔ ہم اب قلعہ بند ہو کر نہیں لڑیں گے۔"

سب نے اپنی رائے دی اور طے ہُوا کہ مہاراجہ راجیا پال کو قتل کر دیا جائے مگر اصل مسئلے کا حل کسی کے پاس نہ تھا کہ قتل کون کرے اور کس طرح

کرے۔ گوبند نے کہا کہ راجیاپال مسلمانوں کا قیدی ہے اور اس کے محافظ جَیش میں تین چار غزنی کے فوجی ہیں۔ کسی نے مشورہ دیا کہ اُس کے دربار کی کسی ناچنے گانے والی سے اسے زہر دلایا جائے۔ یہ مشورہ اس لیے رد کر دیا گیا کہ راز فاش ہو جائے گا۔ کوئی پیشہ ور عورت یہ کام نہیں کرے گی۔

"ایک طریقہ میرے ذہن میں آیا ہے"۔ پنڈت نے کہا۔ "مجھے آپ اپنا ایلچی بنا کر مہاراجہ راجیاپال کے پاس بھیجیں۔ میرے ساتھ آپ کچھ اور آدمی بھی بھیجیں گے۔ میں باری سے باہر خیمہ زن ہو جاؤں گا اور راجیاپال کو پیغام بھیجوں گا کہ کالنجر کا ایلچی آیا ہے اور وہ اپنی خیمہ گاہ میں مہاراجہ کو مدعو کرنا چاہتا ہے۔ اگر وہ آگیا تو میں اسے وہ زہر دوں گا جو آہستہ آہستہ اثر کرے گا۔ وہ دو تین روز بعد بیمار پڑ جائے گا۔ کسی کو شک تک نہ ہوگا کہ اسے زہر دیا گیا ہے۔ پندرہ دنوں تک وہ پیٹ کی بیماری سے مر جائے گا لیکن زہر دینے سے پہلے میں اُسے قائل کرنے کی کوشش کروں گا کہ وہ غزنی والوں کا دوست بنا رہے لیکن وقت پڑا نہیں ایسا دھوکہ دے جیسے پیٹھ میں خنجر مارا جاتا ہے۔ میں دیکھ لوں گا کہ وہ ہمیں دھوکہ دے گا یا سلطان محمود کو۔ میں اس کے مطابق فیصلہ کروں گا کہ اُسے زندہ رہنے دیا جائے یا ختم کر دیا جائے۔"

"غزنی والے اُسے باہر نہیں جانے دیں گے"۔ گوبند نے کہا۔ "آپ کوشش کر دیکھیں۔ میں سالار ابوالقدر کے اعتماد کا آدمی ہوں۔ مجھے بھی راجیاپال سے ملنے کی اجازت نہیں.... ہاں، ایک طریقہ ہے۔ مہاراجہ راجیاپال خوبصورت اور جوان لڑکیوں کا شیدائی ہے۔ اگر آپ دو تین لڑکیاں ساتھ لے جائیں اور کسی طرح اُس کے کان میں ڈال دیں کہ آپ جو تحفے لائے ہیں ان میں اس کی پسند کا مال بھی ہے تو وہ غزنی والوں کی منت سماجت کر کے بھی آپ کے پاس آ جائے گا۔"

"طریقہ کوئی بھی اختیار کیا جائے"۔ گوالیار کے راجہ ارجن نے کہا۔"اور کوئی بھی راجیا پال کو قتل کرے، میں اُسے سونے سے اور جاگیر سے مالا مال کر دوں گا اور اُسے اتنی حسین لڑکی ہمیشہ کے لیے دے دوں گا جو اُس نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھی ہوگی"۔

اُس نے گوبند کی طرف دیکھا اور اُسے کہا۔"تم یہ کام کر سکتے ہو۔ تم وہاں کے بھیدی ہو۔ کوئی راستہ، کوئی طریقہ نکال لو گے... پنڈت مہاراج بھی چلے جائیں۔ دونوں میں جو بھی کامیاب ہو گیا وہ میری ریاست کا سب سے زیادہ امیر اور سب سے بڑی جاگیر اور سب سے خوبصورت داشتہ کا مالک ہوگا۔ اس کے بعد ہم طے کریں گے کہ ہمیں کیا کرنا ہے"۔

چند دنوں بعد گوبند قنّوج کے قلعے میں سالار ابوالقدر سلجوقی کے پاس بیٹھا ہوا تھا اور اُسے بتا رہا تھا کہ کالنجر میں کیا منصوبہ بنا ہے۔ وہاں جو باتیں ہوئی تھیں وہ سب سنا دیں اور یہ بھی بتایا کہ مہاراجہ راجیا پال کے حفاظتی انتظامات اور زیادہ سخت کر دیئے جائیں۔

"لاہور کے مہاراجہ ترلوچن پال کی فوج کہاں ہے؟"۔ سالار سلجوقی نے پوچھا۔

"یہاں سے زیادہ دور نہیں"۔ گوبند نے جواب دیا۔"ابھی یہ پتہ نہیں چلا کہ کس مقام پر ہے۔ ہو سکتا ہے وہ لاہور واپس چلا جائے لیکن سب سے زیادہ خطرناک آدمی وہی ہے.... میں آپ سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں۔ راجیا پال کو یہ تمام مہاراجے قتل کرنا چاہتے ہیں۔ آپ میں سے کوئی بھی ہر ملازم، محافظ یا دربار کے ہر آدمی کو نہیں پہچانتا۔ میں سب کو پہچانتا ہوں۔ مجھے اُس کے قریب کہیں رہنے دیا جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اُسے کوئی دھوکے میں قتل کر دے۔ اس کے بیٹے لچھمن پال کو اس سے دور رکھا جائے اور اُس پر کڑی نظر رکھی جائے"۔

گوبند کی اب کوشش یہ تھی کہ اُسے راجیاپال کے قتل کا موقع مل جائے کیونکہ اسے بہت بڑے انعام کی توقع تھی مگر سالار سلجوقی نے اُسے اتنی ہی اجازت دی کہ وہ راج محل کے ارد گرد بلا روک ٹوک گھوم پھر سکتا ہے، تنہائی میں راجیاپال سے نہیں مِل سکتا۔

سالار سلجوقی کے لیے گوبند کی لائی ہوئی اطلاعیں قیمتی تھیں۔ اُس نے گوبند کو انعام واکرام دے کر کہا کہ وہ باری چلا جائے اور راج محل کے قریب رہ کر مشکوک آدمیوں پر نظر رکھے۔ کماندار ذوالقرنین کو سالار سلجوقی نے پیغام بھیجا کہ راجیاپال سے کوئی ایلچی ملنے آئے تو اُسے ملاقات کی اجازت نہ دی جائے۔

تین چار روز بعد کالنجر کا پنڈت ایلچی بن کر پہنچ گیا اور اُس نے راجیاپال کو پیغام بھیجا کہ ایلچی اُسے باہر ملنا چاہتا ہے۔ ذوالقرنین نے پیغام لانے والے کو راجیاپال کے پاس جانے ہی نہ دیا۔ پنڈت مایوس ہو کر واپس جانے لگا تو گوبند اُس کے پاس پہنچ گیا اور اُسے بتایا کہ راجیاپال مسلمانوں کا قیدی ہے اور اُس پر پابندیاں زیادہ ہو گئی ہیں۔ پنڈت نے اُسے کہا کہ وہ راجیاپال کے قتل کا انتظام کرے۔

گوبند مہاراجوں کا بھی نمک خوار تھا۔ اُس نے ان پر مزید اعتماد پیدا کرنے کے لیے پنڈت سے کہا کہ وہ راجیاپال کے بیٹے لچھمن پال کو اپنے ساتھ لے جائیں ورنہ سالار ابوالقدر سلجوقی اُسے قید کر دے گا۔ گوبند نے پنڈت کو بتایا کہ لچھمن پال میں جوانی کا خون ہے۔ اُس نے کچھ ایسی حرکتیں کی ہیں جن سے غزنی والوں کو اُس کی نیت پر شک ہو گیا ہے اور وہ اُس کی نظر بندی کی باتیں کر رہے ہیں۔

وہاں سے گوبند لچھمن پال کے پاس گیا اور اُسے بھی یہی باتیں بتائیں۔ لچھمن پال چوری چھپے چلا گیا اور گوبند سے کہہ گیا کہ وہ اس کے باپ کو قتل کرا دے۔ اُس نے بھی گوبند کو ایسا انعام دینے کا وعدہ کیا جس سے گوبند کا دماغ

اور زیادہ روشن ہو گیا۔

سالار ابو القدر سلجوقی نے ایک قاصد غزنی کو اس رپورٹ کے ساتھ روانہ کر دیا جو اُسے گوبند نے دی تھی۔ اُس نے پیغام میں یہ بھی لکھوایا کہ یہاں کے مہاراجوں کا کوئی بھروسہ نہیں بہتر ہو گا کہ فوج کا ایک سوار دستہ بھیج دیا جائے تاکہ محاصرے یا حملے کی صورت میں مزید فوج آنے تک دشمن کو روکا جا سکے۔

ادھر گوبند نے راجیاپال کے راج محل میں آنے جانے کی اجازت حاصل کر لی تھی اور وہ اب اس سوچ میں رہنے لگا کہ راجیاپال کو کس طرح قتل کیا جائے۔ وہ چونکہ ہندو تھا اس لیے اُس کا اٹھنا بیٹھنا ہندوؤں کے ساتھ تھا۔ وہ مندر میں بھی جاتا تھا۔ وہ چونکہ جاسوس تھا اس لیے اُس نے مندر کے پنڈت کے ساتھ گہرے مراسم پیدا کر لیے تھے اور اُس کے ساتھ راجیاپال اور سلطان محمود کی باتیں بھی کر لیتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو مذہب پرست ظاہر کرتا تھا۔

ایک روز پنڈت نے اُسے بتایا "ایک ہندو لڑکی ہے جو مسلمان ہو چکی ہے اور اب کماندار ذوالقرنین کی بیوی ہے۔ مجھے ہندو عورتوں نے بتایا ہے کہ وہ مسلمان تو ہو گئی ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ہندو مت اس کے دل سے پوری طرح نہیں نکلا۔ عورتیں بتاتی ہیں کہ اپنے خاوند کے ساتھ اُسے اتنی زیادہ محبت ہے کہ اُس کے مذہب کو اپنا مذہب سمجھتی ہے مگر جب وہ خاوند سے ہٹ کر ارد گرد دیکھتی ہے تو ہندو نظر آتی ہے۔ اُس نے عورتوں کو یہاں تک کہا ہے کہ اُس کے خاوند نے اُسے یہ کہہ رکھا ہے کہ وہ ہندو عورتوں میں اسلام کی تبلیغ کرتی رہا کرے۔ اس بہانے وہ ہندو عورتوں میں اٹھتی بیٹھتی ہے لیکن اسلام کی کوئی بات نہیں کرتی .... میں سوچا کرتا ہوں کہ اسے کس طرح اس مسلمان سے نجات دلائی جائے۔ دراصل ہندو مت اس کے خون میں بچپن سے شامل کر دیا گیا تھا۔ ذوالقرنین نے اس

پر ایسا احسان کیا ہے کہ وہ اُسی کی ہو کے رہ گئی ہے۔"

گوبند کے کان کھڑے ہوئے۔ اُس کا دماغ شیطانیّت سے بھرا ہوا تھا اور وہ بڑا ذہین انسان تھا۔ وہ اس سوچ میں کھو گیا کہ کیا اس لڑکی کو راجپال کے قتل کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے؟

سوچ سوچ کر اُس کے دماغ میں ایک ترکیب آگئی۔ اُس نے پنڈت سے کہا کہ اُسے وہ اُن عورتوں سے ملا دے جن کے ساتھ وہ دل کی باتیں کیا کرتی ہے۔ پنڈت نے اُسے بتایا کہ وہ دو عورتوں کے ساتھ دریا میں نہانے کے لیے بھی چلی جایا کرتی ہے اور ذوالقرنین کو اس پر پورا بھروسہ ہے۔

دو تین روز بعد رضیہ دو ہندو عورتوں کے ساتھ دریا کی طرف جا رہی تھی۔ راستے میں درختوں اور جھاڑیوں کا جنگل تھا۔ ایک درخت کے نیچے ایک آدمی سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اُس کی لمبی داڑھی تھی اور سر کے بال کندھوں پر پڑے ہوئے تھے۔ چہرے سے وہ مسلمان لگتا تھا مگر اُس کے لباس اور حلیے سے شک ہوتا تھا کہ وہ ہندو سادھو یا رِشی ہے۔ اُس نے رضیہ اور اُس کے ساتھ دو عورتوں کو دیکھا تو سر اٹھایا۔ وہ انہیں بڑی غور سے دیکھ رہا تھا۔ جب عورتیں اس کے قریب سے گزریں تو اُس نے انگلی اُوپر اٹھا کر انہیں رُکنے کا اشارہ کیا۔ وہ رکیں تو اُس نے انہیں بٹھا لیا اور نظریں رضیہ کے چہرے پر گاڑ دیں۔

رضیہ کی نظریں جیسے اس شخص کی نظروں میں جکڑی گئی ہوں۔ وہ لڑکی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے تھا۔ اُس نے اپنے دونوں ہاتھ رضیہ کے سر پر رکھ دیئے اور دونوں انگوٹھوں سے اس کی پیشانی کو آہستہ آہستہ مَلنے لگا۔ عورتوں نے دیکھا کہ رضیہ کی آنکھیں ٹھہر گئی تھیں اور وہ سادھو کی آنکھوں میں ٹکٹکی باندھے ہوئے تھی۔ اُس پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا تھا۔

"روح بھٹک رہی ہے"۔ سادھو نے ایسی آواز میں کہا جو بلند سرگوشی تھی۔"روح کہیں اور ہے جسم کہیں اور ہے۔ روح پاک جسم ناپاک ہے۔ ایک آنکھ میں کشن مراری دوسری آنکھ میں گھُپ اندھیرا ہے۔ اگلا جنم بڑا کٹھن ہے۔ لومڑی کا روپ ملے گا۔ لوگ مکّار لومڑی کہیں گے"۔

وہ اچانک جیسے بیدار ہو گیا ہو۔ اُس نے سر جھٹک کر کہا"جاؤ.... چلی جاؤ.... ایسی روحیں بھی ہوتی ہیں"۔ وہ پریشان اور مضطرب ہو گیا۔ اپنے آپ سے باتیں کرنے کے لہجے میں کہنے لگا"میں نہیں دیکھ سکتا۔ تم نہیں دیکھ سکو گی۔ ایک آنکھ کے اندھیرے میں کیا ہے؟.... تم برداشت نہیں کر سکو گی.... جاؤ.... مندر اور مسجد کے درمیان اندھیرا ہے۔ اس میں ٹھوکریں کھاتی رہو۔ اپنا انجام مت پوچھو۔ سنو گی تو مر جاؤ گی۔ مرو گی نہیں تو پاگل ہو جاؤ گی"۔

اُس کی پریشانی، بےچینی اور اضطراب میں اور انداز میں پُراسرار تاثر تھا اور جس طرح اُس نے رضیہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مترنّم سی سرگوشی میں بات کی تھی، اس میں کچھ ایسا اثر تھا جیسے رضیہ ہپناٹائز ہو گئی ہو۔ وہ فطرتًا ہندو تھی۔ اس کے ساتھ ہندو عورتیں تھیں۔ ہندو توہم پرست قوم ہے اور توہم پرستی ان کا مذہب ہے۔ ان پر ایسا تاثر طاری ہو گیا کہ وہ سادھو کے آگے سے اٹھتی ہی نہیں تھی۔ رضیہ کو ذوالقرنین کی محبت نے مسلمان تو کر لیا تھا لیکن اُس کی فطرت سے ہندو مت نہیں نکلا تھا۔ سادھو کے اشارے واضح تھے۔ وہ سمجھ گئی کہ اُس نے مسلمان ہو کر گناہ کیا ہے اور اس کی سزا اُسے یہ ملے گی کہ اگلے جنم میں وہ لومڑی بنے گی۔ یہ بھی ہندوؤں کا عقیدہ ہے۔

ان عورتوں نے سادھو کی مٹھی چاپی شروع کر دی۔ وہ بولتا ہی نہیں تھا۔ بولا تو اُس نے بھجن گنگنانے شروع کر دیئے۔ بڑی مشکل سے اُس نے بات کی۔

*

"اس لڑکی (رضیہ) کو دریا پر مت لے جاؤ"۔ سادھو نے مخمور آواز میں کہا "مہترا کا مگر مچھ اسے سالم نگل لینے کے لیے آ گیا ہے۔ ہم نے ویسے ہی اس لڑکی کو نہیں دیکھا تھا۔ ہوا میں ایک بُو آئی تھی جسے دنیا کا کوئی انسان نہیں سمجھ سکتا۔ یہ اُن بدروحوں کی بُو ہوتی ہے جو اپنے گناہوں کی آگ میں جل رہی ہوتی ہیں۔ تم قریب آئیں تو یہ بُو ہمیں اس لڑکی کے جسم سے آئی۔ اس کی روح جو مرنے کے بعد بدروح بن جائے گی، زندگی میں ہی جل رہی ہے"۔

رضیہ نے گھبراہٹ اور خوف کے لہجے میں کہا "ہاں رشی جی! میں گناہگار ہوں۔ میں بہت بےچین ہوں۔ ایک وہ انسان ہے جس نے میرے دل پر قبضہ کر لیا ہے، دوسرا قبضہ میرے مذہب کا ہے میں نادان اور مجبور ہوں"۔

"مگر پاپ جو ہو چکا ہے اس کی سزا سے کیسے بچو گی؟"

"کیسے بچوں گی؟"۔ رضیہ نے پوچھا۔ "مجھے بتائیں، آپ ہی بتائیں روح کو سزا سے بچانے کے لیے میں اپنا جسم چتا پر جلا لوں گی۔ اگلے جنم کے عذاب سے بچنے کے لیے میں اپنی جان کی قربانی دے دوں گی"۔

"ہم بتاتے ڈرتے ہیں"۔ سادھو نے کہا۔ "ہمّت ہے تو سنو۔ پانی سے دُور رہو۔ قربانی ایک جان کی دینی ہے لیکن وہ جان تمہاری نہیں ہو گی"۔ سادھو نے آنکھیں بند کر لیں اور اُس کے ہونٹ ہلتے رہے۔ کچھ دیر بعد بولا "بہت بڑے آدمی کا خون کرنا ہے.... مہاراجہ کا خون۔ پاپی کا خون۔ ایسے مہاراجے کا خون جس نے اپنے بھگوان کو مسلمانوں کے حوالے کیا اور آج اُن کی نظر بندی میں خوش ہے.... سنو لڑکی! نجات چاہتی ہو تو اپنے مہاراجہ کو قتل کرو، پھر اپنے خاوند کو قتل کرو۔ پہلے مہاراجہ کے خون کا تلک اپنے ماتھے پر لگاؤ، پھر اس پر اپنے خاوند کے خون کا تلک لگاؤ، پھر مندر میں چلی جانا۔ تمہیں ایک اشارہ ملے گا۔ روشنی نظر آئے

گی۔ یہ تمہاری نجات کی نشانی ہو گی"
"قتل ؟" ___ رضیہ کی آنکھیں ٹھہر گئیں۔ اُس نے سرگوشی کی ___ "قتل ؟..... نہیں"۔

"راجپوت کی بیٹی پاپی کو قتل کرنے سے ڈرتی ہے ؟" ___ سادھو نے کہا ___ "اگر ڈرتی ہے تو نہ کر۔ جل۔ مگرمچھ کا نوالہ بن اور لومڑی بن کے واپس آ۔ اسی مہاراجہ کے کتے تمہارا شکار کریں گے۔ اسی مہاراجہ کے تیر سے تم زخمی ہو گی۔ مرو گی نہیں۔ جسم میں تیر لیے ہوئے زندہ رہو گی۔ زخم میں پیپ پڑے گی۔ اس میں کیڑے پڑیں گے۔ تم جنگلوں میں چیختی چلاتی پھرو گی"۔

"مہاراج !" ___ ایک عورت نے کہا ___ "دیوتاؤں کا حکم ٹالا نہیں جا سکتا۔ اسے قتل کا کوئی ایسا طریقہ بتا دیں جو آسان ہو اور یہ پکڑی بھی نہ جائے"۔

سادھو نے اپنے مخمور اور پُراسرار لہجے اور انداز میں رضیہ کو جو طریقہ بتایا وہ یہ تھا کہ راجیا پال عورتوں کا شکاری اور شیدائی تھا۔ رضیہ خوبصورت اور جوان لڑکی تھی۔ وہ مہاراجہ کے سامنے جائے اور اپنی نمائش کرے۔ چونکہ رضیہ مسلمان کماندار کی بیوی تھی اس لیے یہ امکان تھا کہ راجیا پال اس پر ہاتھ نہیں ڈالے گا۔ یہ کام رضیہ کا تھا کہ راجیا پال کو اپنا آپ پیش کرے اور اُس کی خواب گاہ میں اس طرح جائے کہ اُسے کوئی دیکھ نہ سکے۔ ہاتھ میں خنجر لے جائے اور اُسے ختم کر آئے۔ پھر اپنے خاوند کو اسی طرح قتل کر کے مندر میں چلی جائے۔ وہاں پنڈت اسے کہیں دور بھیج دے گا۔

"کیا میں اتنی جرأت کر سکوں گی ؟" ___ رضیہ نے پوچھا۔

سادھو نے اپنے پاس رکھی ہوئی ایک ٹوکری میں سے ٹٹول کر ایک ڈبیہ نکالی اور کھولی۔ اس میں سفوف سا تھا۔ اُس نے ذرا سا سفوف ایک کپڑے میں باندھ کر رضیہ کو دیا اور کہا کہ جب قتل کرنے کے لیے روانہ ہو گی تو یہ سفوف ایک گھونٹ پانی میں ملا کر پی لینا۔ جرأت اور دلیری آ جائے گی۔

اُسی شام مندر میں گوبند ان دو عورتوں کے پاس بیٹھا تھا۔ وہ اُسے بتا رہی تھیں کہ رضیہ ان کے ساتھ دریا پر جانے کی بجائے واپس آگئی تھی۔

"اسے کچھ شک تو نہیں ہُوا؟"۔۔۔ گوبند نے پوچھا۔

"شک تو ہم دونوں کو بھی نہیں ہُوا تھا جو اچھی طرح جانتی تھیں کہ یہ تم ہو"۔۔۔ ایک عورت نے کہا۔ "تمہارا بہروپ پوری طرح کامیاب تھا۔ اس کے بعد ہم نے لڑکی کو کئی ایک کہانیاں سنا کر قائل کر لیا ہے کہ وہ کام کر دے"۔

رضیہ کو قائل کرنے کی اتنی زیادہ کوشش کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ سہارا اور تائید چاہتی تھی جو اُسے مِل گئی۔ ذوالقرنین نے اُسے کہا تھا کہ وہ ہندو عورتوں میں اسلام کی تبلیغ کیا کرے مگر ہندو عورتوں نے اس سے اپنا پیدائشی اور آبائی رنگ اُترنے نہ دیا۔۔۔ اور اگلی ہی رات جب ذوالقرنین دن بھر کی گشت اور دیگر کاموں کا تھکا ہارا گہری نیند سویا ہُوا تھا، رضیہ کے سینے میں رتن کماری جاگ اٹھی۔ اُس نے اُٹھ کر پانی میں وہ سفوف ملایا جو اُسے "سادھو" نے دیا تھا اور بڑی تیزی سے پانی پی لیا۔ اُس پر گھبراہٹ اور ہیجان کی کیفیت طاری تھی۔ وہ وہیں کھڑی چاندنی سے روشن خلائیں گھورتی رہی۔ آہستہ آہستہ گھبراہٹ اور ہیجان میں کمی آنے لگی۔ سرور طاری ہونے لگا اور پھر لڑکی اپنے اندر ایسی قوت محسوس کرنے لگی جیسے وہ غزنی پر حملہ کرنے کے لیے تیار ہو گئی ہو۔

ایک ہی روز پہلے اُس نے اپنے خاوند ذوالقرنین سے کہا تھا کہ وہ راج محل کی عورتوں کے پاس جانا چاہتی ہے اور وہ کوشش کرے گی کہ وہاں کی عورتوں کو مسلمان بنا سکے۔ ذوالقرنین خوش ہُوا کہ رضیہ تبلیغ کا کام دلچسپی سے کر رہی ہے۔ وہ گئی۔ راج محل میں سب جانتے تھے کہ وہ مسلمان کماندار کی بیوی ہے۔ وہ عورتوں کے پاس جاتے جاتے مہاراجہ راجیا پال کے کمرے میں چلی گئی۔ راجیاپال اُسے دیکھ کر صرف اس لیے خوش نہ ہُوا کہ وہ کماندار کی بیوی ہے بلکہ اس لیے زیادہ خوش ہُوا کہ وہ خوبصورت لڑکی ہے۔ اُس نے لڑکی کو تپاک اور احترام سے بٹھایا۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ اس طرح باتیں کر رہے تھے جیسے وہ ایک مدّت سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ اجنبیّت لڑکی کے اس انکشاف نے دور کر دی تھی کہ وہ ہندو تھی اور مسلمان ہوگئی ہے مگر اُس نے دل سے اسلام کو قبول نہیں کیا۔ اجنبیت کے ساتھ ساتھ شرم وحجاب بھی اُٹھ گیا۔ لڑکی کا ارادہ چونکہ کچھ اور تھا اس لیے اُس نے کہا کہ وہ رات کو آئے گی لیکن ایسے راستے سے کہ اُسے کوئی آتے جاتے نہ دیکھ سکے۔

راجیاپال بھی یہی چاہتا تھا کہ لڑکی کو کوئی نہ دیکھ سکے۔ پکڑے جانے کی صورت میں راجیاپال کو معلوم تھا کہ ذوالقرنین دونوں کو قتل کر دے گا۔ چنانچہ راجیاپال نے اُسے محفوظ راستہ اور ایک اور کمرہ دکھا دیا۔

اگلی ہی رات رضیہ اُس راستے سے اُس کمرے میں پہنچ گئی جو راجیاپال نے اُسے دکھایا تھا۔ راجیاپال نے اُسے کہا کہ وہ شراب تو نہیں پیئے گی کیونکہ اُسے خاوند کے پاس جانا ہے۔ رضیہ نے اُسے کہا کہ وہ خود ہی ڈالے اور خود ہی پیئے۔ راجیاپال کھڑا تھا۔ وہ جھک کر پیالے میں شراب ڈال رہا تھا۔ رضیہ سفوف کے اثر میں تھی۔ اُس نے کپڑوں کے اندر سے خنجر نکالا اور ہاتھ اوپر کر کے خنجر راجیاپال کی پیٹھ میں اتار دیا۔ اُس نے خنجر کھینچا۔ اس کے ساتھ ہی راجیاپال سیدھا ہوا۔ اُس کے منہ سے ابھی آواز بھی نہیں نکلی تھی کہ رضیہ نے اُس کے دل پر وار کیا۔ رضیہ نے خنجر کھینچا اور اس کے ساتھ ہی راجیاپال منہ کے بل گر پڑا۔ رضیہ نے اُسے دیکھا۔ وہ ذرا سا ہلا پھر بے حس ہوگیا۔ رضیہ کو جیسے احساس ہی نہیں تھا کہ اُس نے ایک انسان کو قتل کر دیا ہے۔ انسان بھی کوئی معمولی آدمی نہیں، مہاراجہ تھا اور وہ غزنی کے اُس سلطان کا دوست تھا جس نے ہندوؤں کی جنگی طاقت کو اسی طرح توڑ پھوڑ ڈالا تھا جس طرح اُس نے باطل کے بت توڑے تھے۔ رضیہ نے عجیب سا اطمینان محسوس کیا۔ یہاں تک کہ اُس نے وہ پیالہ اٹھایا جس میں راجیاپال نے شراب ڈالی تھی۔ اُس نے پیالہ اٹھایا اور منہ سے لگا لیا۔ اس سے پہلے اُس نے کبھی شراب نہیں پی تھی۔

وہ جس راستے سے کمرے میں داخل ہوئی تھی، اُسی راستے سے باہر نکل گئی اور بڑے اطمینان سے چلتی اپنے گھر پہنچ گئی۔ وہاں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں خون آلود خنجر تھا۔ اب اسے اپنے خاوند کو قتل کرنا تھا۔ کھلے ہوئے دریچے میں سے چاندنی ذوالقرنین کے چہرے اور سینے پر پڑ رہی تھی۔ وہ گہری نیند سویا ہوا تھا۔ اُس کا سینہ اُوپر تھا۔ دل پر ایک ہی وار کافی تھا۔

رضیہ آہستہ آہستہ آگے بڑھی۔ اُس نے خنجر والا ہاتھ ہوا میں بلند کیا۔ اُس کی نظریں ذوالقرنین کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ ذوالقرنین جانے کیا خواب دیکھ رہا تھا کہ وہ مسکرایا۔ رضیہ کے اندر ایسی تبدیلی آئی جیسے وہ خواب سے بیدار ہو گئی ہو۔ ذوالقرنین کی محبت نے سفوف کا اثر زائل کر دیا اور اس اثر کو زائل کرنے میں شراب نے بھی کام کیا تھا۔ رضیہ کا ہاتھ کانپا اور ہاتھ سے خنجر چھوٹ کر ذوالقرنین کے پیٹ پر گرا۔ وہ جاگ اٹھا اور رضیہ اس کے اوپر گر پڑی۔ وہ رو رہی تھی۔

ذوالقرنین نے تیزی سے اٹھ کر دیا جلایا۔ وہ اپنے بستر پر خون آلود خنجر پڑا دیکھ کر حیران رہ گیا۔ رضیہ چہرہ ہاتھوں میں چھپائے ہوئے سسکیاں لے رہی تھی۔ ذوالقرنین نے اُسے اٹھایا اور پوچھا کہ یہ سب کیا ہے۔

"میں تمہیں قتل نہیں کر سکتی" — اُس نے روتے ہوئے کہا۔ "میں اپنے دل میں خنجر نہیں اتار سکتی۔"

اُس نے ذوالقرنین کو بتایا کہ وہ مہاراجہ راجیا پال کو قتل کر آئی ہے اور اب اس کے ہاتھ سے ذوالقرنین کو قتل ہونا تھا۔ اُس نے بتایا کہ کس طرح وہ دو عورتوں کے ساتھ دریا میں نہانے جا رہی تھی کہ اُسے ایک سادھو ملا۔ اُس نے سادھو کی باتیں سنائیں۔ ان عورتوں نے اُسے جس طرح راجیا پال کے لیے تیار کیا تھا، وہ بھی بتایا۔ سفوف کا بھی ذکر کیا۔

"میں نے تمہاری محبت کو قبول کیا تھا، تمہارے مذہب کو نہیں" —

رضیہ نے کہا "تم نے مجھے خدا کی عبادت سکھلائی اور پڑھائی تھی مگر میں تمہارے خدا کی بجائے تمہاری عبادت کرتی رہی۔ مجھے بچپن سے بتایا جاتا رہا ہے کہ مسلمان ناپاک ہوتے ہیں۔ ہمارے دلوں میں مسلمانوں اور اسلام کے خلاف نفرت پیدا کی جاتی ہے۔ میں تم سے نفرت نہ کر سکی"۔ اُس نے لپک کر خنجر اٹھایا اور ذوالقرنین کی طرف بڑھا کر کہا۔ "مجھے اپنے ہاتھوں قتل کر دو۔ میں زندہ نہیں رہنا چاہتی"۔

ذوالقرنین نے اس کے ہاتھ سے خنجر لے لیا اور اُسے کہا کہ وہ زندہ رہے گی اور اُس کا دل گواہی دے گا کہ اسلام سچا مذہب ہے اور مسلمان ناپاک نہیں ہوتے۔ اُس نے بڑی مشکل سے رضیہ کو سنبھالا۔

دوسرے دن ذوالقرنین نے ایک قاصد قنوج کو سالار ابوالقدر سلجوقی کے لیے اِس پیغام کے ساتھ دوڑا دیا کہ راجیاپال قتل ہو گیا ہے۔ رضیہ کی نشاندہی پر اُن دو عورتوں کو پکڑا گیا جو رضیہ کے ساتھ دریا کو گئی تھیں۔ انہیں ڈرایا دھمکایا گیا تو انہوں نے گوبند کو پکڑوا دیا۔ گوبند نے ان عورتوں اور رضیہ کے ساتھ لاتعلقی کا اظہار کیا۔ ذوالقرنین نے دو گھوڑے منگوائے۔ گوبند کے ٹخنوں سے الگ الگ رسے باندھ کر گھوڑوں کے ساتھ باندھ دیئے گئے۔ سواروں سے کہا گیا کہ وہ گھوڑے چلا دیں۔ ایک گھوڑا دائیں کو چلا اور دوسرا بائیں کو۔ پیشتر اس کے کہ گوبند کی ٹانگیں جسم سے الگ ہو جائیں، وہ درد سے بلبلا اٹھا۔ گھوڑے روک لیے گئے۔ اُس نے بتا دیا کہ راجیاپال کو اُسی نے قتل کرایا ہے اور گوالیار اور کالنجر کے مہاراجوں نے اسے انعام پیش کیا تھا۔ اس نے مہاراجوں کا تمام تر منصوبہ بھی بتا دیا، اور یہ بھی کہ وہ دو غلا جاسوس ہے۔

سالار ابوالقدر سلجوقی آ گیا۔ اُس نے سارا واقعہ سن کر گوبند سے کہا کہ وہ بھاگ جائے۔ گوبند حیران سا ہو کے چلا تو سلجوقی نے اپنے ایک محافظ سے کمان لی۔ اس میں تیر ڈالا اور دوسرے لمحے تیر گوبند کی پیٹھ میں اترا ہوا تھا۔ سالار سلجوقی نے حکم دیا کہ اسے گھسیٹ کر دور پھینک آؤ۔

ایک شکست خوردہ مہاراجے کا قتل اتنا اہم واقعہ نہیں تھا کہ سلطان محمود کو اس کی اطلاع دی جاتی مگر اہم اور فوری توجہ کا طالب اس واقعہ کا پس منظر تھا اور ہندوستان کے مہاراجوں کے ارادے بڑے خطرناک تھے۔ سلجوقی نے غزنی کو ایک تیز رفتار قاصد بھیج دیا۔

سلطان محمود نے جب اس قاصد کی زبانی پیغام سنا تو اس نے اسی وقت اپنی فوج کو ہندوستان کی طرف کوچ کی فوری تیاری کا حکم دے دیا۔

تین چار روز بعد غزنی کی فوج ایک تاریخی جنگ لڑنے کے لیے غزنی سے روانہ ہوئی۔ ادھر گوالیار، کالنجر اور لاہور کی فوجیں فیصلہ کن جنگ لڑنے کے لیے تیار ہونے لگیں۔

نو صدیاں

اور ستر سال گزرے سلطان محمود غزنوی کے مرشد اور روحانی پیشوا شیخ ابوالحسن خرقانی نے اُسے کہا تھا — "جس دور میں مسلمان، ہندو اور یہودی سے غافل ہوئے یا انہیں دوست بنا بیٹھے، وہ اُمّتِ رسولؐ کے زوال کا دور ہو گا .... وہ اسلام کی تاریخ کا سیاہ دور ہو گا۔ خدا کی یہ زمین مسلمانوں کے خون سے لال ہوتی رہے گی .... تمہاری اس سلطنت (غزنی) پر بے دین حکمرانی کریں گے۔ غزنی، کابل، قندھار، گردیز اُس قوم کے پاؤں تلے روندے جائیں گے جس کا کوئی دین نہیں اور جسے یہاں کے مسلمان اپنا ہمدرد سمجھیں گے .... تمہارا مقبرہ ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ مستقبل کا خونی کھیل تمہارے اور میرے مقبروں کے اردگرد کھیلا جائے گا۔ ہم کچھ نہیں کر سکیں گے کچھ کرنا ہے تو آج کر لو۔"

سلطان محمود غزنوی نے اپنی ساری عمر باطل کے خلاف لڑتے میدانِ جنگ میں گزار دی۔ آخر میں وہ تپ دق کا مریض ہو گیا تو اُس نے اپنے طبیب کو سختی سے کہہ دیا تھا کہ کسی کو پتہ نہ چلے کہ سلطان کو دق تیزی سے کھا رہا ہے۔ اُس کے پیر و مرشد نے اُسے کہا تھا کہ کچھ کرنا ہے تو آج کر لو۔ اُس نے اپنے آج کا آرام اور سکون اور اپنا جسم ملّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کل پر قربان کر دیا، مگر آج غزنی اور ہرات میں اُس کے اور اُس کے روحانی پیشوا کے مقبروں کے اردگرد ایک بے دین قوم خونی کھیل کھیل رہی ہے اور مسلمانوں کی دھجیاں اُڑ رہی ہیں۔ غزنی، کابل، قندھار اور گردیز

اُس قوم کے قدموں تلے روندے جا رہے ہیں جس کا کوئی دین نہیں اور جسے وہاں کے مسلمان حکمران اپنا ہمدرد سمجھتے ہیں۔

کیوں؟ ایسا کیوں ہُوا؟ حریّت کے چراغوں کی روشنی کہاں گئی؟ حریّت کے چراغ ملّت کے لہُو سے روشن رہا کرتے ہیں۔ وہ لہو بِک گیا، وہ ایمان نیلام ہو گیا اور شہیدوں کا لہو جیسے زمین نے ہضم کر لیا ہو۔ تاریخ کے ساتھ ہم نے بے انصافی کی۔ تاریخ نے محمود کے ساتھ بے انصافی کی۔ یہ ہمارے دین کے دشمن کا کمال ہے کہ اُس نے بُت شکن کو بُت فروش ثابت کر دیا۔ حق کے علمبردار کو لُٹیرا کہا اور تاریخ کے منہ میں جھوٹ ڈال کر جھُوٹ کو سچ کہلوایا۔ سبق جو ہم بھلا بیٹھے تھے، وہ ہمارے دشمن نے یاد رکھا اور دشمن نے یہ بھی یاد رکھا کہ کسی قوم کو وقار اور شجاعت سے محروم کرنا ہو تو اُس کی تاریخ سے درخشاں باب پھاڑ کر ان کی جگہ عیش و عشرت اور جسمانی لذّت پرستی کے افسانے رکھ دو۔

ہمارے دشمن نے ہمیں تاریخ سے بیگانہ رکھا۔ لہو کی تحریروں کو شراب سے دھو ڈالا۔ جذبوں پر جنسیّت کا فسوں طاری کر دیا، پھر ہم بھُول گئے کہ ہم کیا تھے اور ہمارے فرائض کیا تھے۔ ہم اس دھرتی پر بدمست ہو کر چلنے لگے جس میں محمد بن قاسم کے سرفروشوں کا لہُو ملا ہُوا ہے اور جس کی مٹی میں غزنی کے شہیدوں کی بُوباس رچی بسی ہُوئی ہے۔ یہی وہ بُوباس ہے جو قوم کو اور اُبھرتی ہوئی نسلوں کو طوفاں بگریباں اور باطل کے خلاف معرکہ آرا رکھتی ہے۔ قوم وہی پورے وقار سے زندہ و بیدار رہتی ہے جو اپنے شہیدوں کے لہو کی تحریروں کو بجھنے نہیں دیتی۔ انہیں اپنے لہو سے شوخ اور تروتازہ رکھتی ہے۔ آبا و اجداد کے نقوشِ پا کو مٹنے نہیں دیتی۔ ان پر اپنے نقش ثبت کر کے انہیں اپنے پیچھے آنے والوں کے لیے نمایاں رکھتی ہے۔

دشمن نے ہماری تاریخ سے وہ ورق پھاڑ ڈالے جن پر لکھا تھا کہ جہاں

آج مینار پاکستان کھڑا ہے، وہاں نو صدیاں پہلے جنگل ہُوا کرتا تھا۔ اس جنگل میں لاہور کے مہاراجوں نے مسلمان لڑکیوں کی انسانی قربانیاں دی تھیں۔ ان کے خُون سے اپنے پتھر کے دیوتاؤں کے پاؤں دھوئے تھے۔ اسی لاہور میں جسے اندرونِ لاہور کہتے ہیں، مسلمان نوجوانوں نے غزنی کے جاسوسوں کو چھپا کے رکھا اور ان کی مدد اور رہنمائی کی تھی۔ ان جاسوسوں کو بچانے کے لئے مسلمان عورتوں نے اپنی جانیں اور عصمتیں لُٹا دی تھیں۔ وہ قید خانے یہیں کہیں ہُوا کرتے تھے جن میں مسلمانوں کو اذیتیں دے دے کر ختم کیا جاتا تھا۔

ملتان کے ریگستان کو جس کی فضا میں محمد بن قاسمؒ کے مجاہدوں کے نعرے آج بھی ایک مقدس اور ولولہ انگیز گونج بن کر بھٹک رہے ہیں، غزنی کے شیروں نے اس ریت کو اپنے لہُو سے سیراب کیا تھا۔ وہ ملتان کی گلیوں میں لڑے تھے۔ وہ جُھلستے اور جُھلساتے ریگستانوں میں لڑے تھے۔

سلطان محمود غزنوی باطل کی جنگی طاقت پر جس قہر سے ٹوٹا تھا، سب مورُخ اُس کی گواہی دیتے ہیں۔ ملتان اسلام کے نام پر قرامطی نام کے ایک باطل عقیدے کا مرکز بن گیا تھا۔ قرامطیوں کی فوج اور غیر فوجی قرامطی غزنی کی حق پرست فوج کے آگے چٹانوں کی طرح کھڑے ہو گئے تھے۔ ان چٹانوں کو ریزہ ریزہ کرنے کے لیے سلطان محمود سپاہیوں کی طرح لڑا تھا۔ ملتان کی گلیوں میں بھی لڑائی ہُوئی تھی۔ مورُخ کہتے ہیں کہ سلطان محمودؒ نے اس قدر تلوار چلائی تھی کہ اُس کا دایاں ہاتھ تلوار کے دستے پر اکڑ گیا تھا اور اس پر دشمن کا اس قدر خون جم گیا تھا کہ لڑائی کے بعد اُس کی انگلیاں دستے سے اکھڑتی نہیں تھیں۔ تلوار اس کے بازو کا حصّہ بن گئی تھی بہت دیر تک اُس کے ہاتھ پر گرم پانی ڈالتے رہے تھے تو ہاتھ کُھلا اور تلوار سے الگ ہُوا تھا۔ یہ وہ قہر تھا جو دشمن کی نفرت سے پیدا ہُوا کرتا ہے

— آج بھی ہمارا وہی دشمن ہے مگر ہمیں اس کی محبت کے سندیس دیئے جا رہے ہیں اور سلطان محمود غزنوی کا مقبرہ ایک بے دین قوم کے ٹینکوں اور طیّاروں کی گرج سے لرز رہا ہے۔

ہمارے حصّے میں سلطان محمودؔ کے سترہ حملے آئے۔ باقی تمام داستان بُت پرستوں کی دھرتی کی مٹی میں دب گئی ہے۔ ایک عظیم روایت کو سترہ حملوں کا نام دے کر اسے حرّیت سے خالی کر دیا گیا ہے۔ ہماری تاریخ کو ہندو نے ڈس لیا ہے۔ حق کے اس پیامبر اور بُت شکن کی زندگی کا ہر ایک لمحہ ہماری تاریخ ہے۔ اس تاریخ کی روح زندہ ہے، اسے زندہ کرنا ہے۔

١٠٢٠ء عیسوی (٤١٢ ہجری) کے موسمِ سرما کا آغاز تھا جب غزنی کی فوج سیلاب کی طرح غزنی سے ہندوستان کو آ رہی تھی۔ سیلاب سے مراد یہ نہیں کہ وہ کوئی بہت بڑا لشکر تھا۔ وہ اُس لشکر کے نصف سے بھی کم تھی جو گنگا جمنا کے دوآبہ میں اُس کے مقابلے اور اُسے ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کے لیے جمع ہو رہا تھا۔ تمام موٴرخ متفق ہیں کہ اب کے ہندو مہاراجوں نے جو متحدہ فوج اکٹھی کی تھی، اُس کی نفری یہ تھی— ایک لاکھ پ[illegible]ن ہزار پیادہ۔ چھتیس ہزار گھوڑ سوار اور چھ سو چالیس جنگی ہاتھی— اُس [illegible] کا ایک موٴرخ فرختی تھا۔ جس نے ہندو کی جنگی طاقت یہ لکھی ہے— ایک لاکھ تینتیس ہزار پیادہ، چھتیس ہزار گھوڑ سوار اور نو سو جنگی ہاتھی۔

اگر ہم ان دونوں میں سے کسی کو بھی صحیح مان لیں تو بھی یہ حقیقت قائم رہتی ہے کہ سلطان محمودؔ جو فوج لے کے آ رہا تھا، اس کی تعداد اس سے نصف تھی۔ اس کے علاوہ سلطان محمودؔ کی سب سے زیادہ خطرناک کمزوری یہ تھی کہ وہ اپنے وطن سے ہزاروں میل دُور دشمن کے ایسے علاقے میں لڑنے کے لیے آ رہا تھا جو دشمنوں سے گھِرا ہوا تھا۔ وہاں کے پیڑ پودے اور وہاں کے پتھر بھی اُس کے دشمن تھے۔

ہندوستان کی ریاست قنّوج کا مہاراجہ راجیاپال قتل ہوگیا تھا۔ اس کی اطلاع مِلتے ہی سلطان محمود نے فوج کو کوچ کا حکم دے دیا تھا۔ غزنی کی فوج کے لیے ایک ہندوستانی مہاراجہ کا قتل کوئی اہمیّت نہیں رکھتا تھا لیکن راجیاپال سلطان محمود کے لیے اس لیے اہم تھا کہ وہ غزنی کا اتحادی بن گیا تھا۔ اِس کا قتل سلطان کے لیے بڑا واضح اشارہ تھا کہ ہندوستان کے مہاراجے متحدہ ہو گئے ہیں اور ان کا دم خم ابھی ٹوٹا نہیں۔ قنوج کے قلعہ دار سالار ابوالقدر سلجوقی نے راجیاپال کے قتل کے پیغام کے ساتھ ہندوستان کے مہاراجوں کی سرگرمیوں کی اطلاع بھی دے دی تھی۔

شیخ ابوالحسن خرقانی کے علاوہ سلطان محمود ایک اور عالم ابوسعید عبدالملک بن عثمان کا بھی معتقد تھا۔ یہ عالم غزنی سے بہت دُور رہتے تھے سلطان کبھی کبھار اُن سے ملنے اتنی لمبی مسافت طے کر کے جایا کرتا تھا۔ اب اُس نے ہندوستان کو کوچ کیا تو دوسرے پڑاؤ کے اگلے روز جب فوج جارہی تھی، آگے سے ایک سالار سرپٹ گھوڑا دوڑاتا فوج کے وسط میں آیا جہاں سلطان محمود تھا۔ اُس نے سلطان کو بتایا کہ ابوسعید عبدالملک راستے میں کھڑے ہیں سلطان نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور وہاں پہنچا جہاں ابوسعید کھڑے تھے سلطان گھوڑے سے کُود کر اُترا اور ابوسعید کے گھٹنے چھُو کر مصافحہ کیا۔

"مجھے کل پتہ چلا ہے کہ آپ ہندوستان جارہے ہیں" — ابوسعید عبدالملک نے کہا۔ "اللہ آپ کے ساتھ ہے جنگی امور اور رموز کو آپ سمجھتے ہیں، میں کوئی پند و نصیحت نہیں کرسکتا۔ اتنا ہی کہوں گا کہ آپ تاریخ لکھنے جارہے ہیں جو ہماری آنے والی نسلوں کے لیے مشعلِ راہ ہوگی۔ اِس جنگ کو اپنی ذاتی جنگ نہ سمجھنا اور یاد رکھنا کہ سدا بادشاہی اللہ کی ہے۔ تخت و تاج کا نشہ دل و دماغ سے اتار دینا۔ یہ ایسا نشہ ہے جسے چڑھ جائے وہ دین کو بھول کر دنیا کا ہو رہتا ہے اور بھول جاتا ہے کہ ایک

ملنے کے بعد ہی اُس کی موت آسکتی ہے۔ اُس کے کان بند ہو جاتے ہیں کسی کی فریاد وہ سُن نہیں سکتا۔ اُس کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔ وہ دیکھ نہیں سکتا کہ اُس کی رعایا بھوکی اور ننگی ہے۔ اُسے وہی نظر آتا ہے جو اُسے اُس کے درباری دکھاتے ہیں، اور درباری اُسے وہی دکھاتے ہیں جس میں اُن کا اپنا مفاد ہوتا ہے۔“

سلطان محمود سر جھکائے کھڑا سن رہا تھا۔

”میں آپ کو زیادہ دیر نہیں روکوں گا محمود!“— ابوسعید عبدالملک کہہ رہے تھے —”یہ نہ بھولنا کہ تمام دنیائے کفر کی نظریں آپ پر لگی ہوئی ہیں۔ سب آپ کی موت کے منتظر ہیں۔ آپ کے پڑوسی جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، وہ بھی آپ کی موت کے خواہش مند ہیں۔ عہد کر لیں کہ آپ مر جائیں تو بھی زندہ رہیں۔ اپنی قوم کے دل میں اور تاریخ میں زندہ رہیں۔ آنے والی نسلیں آپ کو ایک روایت بنا کر زندہ رکھیں۔ اگر آپ نے ہندوستان کے بُت پرستوں کا سر نہ کچلا تو وہ اُس وقت تک مسلمانوں کا سر کچلتے رہیں گے جب تک کہ وہاں ایک بھی مسلمان باقی ہے۔“

”دعا کریں اللہ مجھے کامیابی عطا فرمائے“— سلطان محمود نے کہا۔”اب میں وہاں اپنی باقاعدہ حکومت قائم کر کے لوٹوں گا۔ وہاں اپنا امیر اور کافی فوج بھی رکھوں گا۔“

”الوداع محمود!“ ابوسعید نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا—”اللہ آپ کا ہمسفر اور مددگار ہو۔“

سُلطان محمود نے اُن کا ہاتھ چوما اور گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

سلطان محمود جانتا تھا کہ دشمن اُس کے آگے بھی ہے اور پیچھے بھی۔ آگے ہندو اور پیچھے مسلمان۔ مگر اُسے معلوم نہیں تھا کہ اب دشمن اُس کے ساتھ بھی جا رہا ہے۔ یہ سلجوقی تھے جو سلطان محمود کی اطاعت قبول کر کے

اُس کی فوج میں شامل ہو گئے تھے۔ سلجوقی جنگجو تھے۔ یہ غزر قبیلے کے لوگ تھے جو اپنے سردار لقمان سلجوقی کے ساتھ اس قبیلے سے الگ ہو گئے اور اپنے آپ کو سلجوقی کہلانے لگے تھے۔ وہ بخارا کے پہاڑی علاقے میں آباد ہو گئے۔ اُنھوں نے ترکستانیوں اور سمانیوں کی لڑائیوں میں سمانیوں کا ساتھ دیا، بلکہ سمانی اُن کے بل بوتے پر لڑا کرتے تھے۔ اس طرح وہ ایک جنگی طاقت بنتے گئے۔

لقمان سلجوق کے بیٹے اسرائیل سلجوق نے بخارا میں خاصا اثر ورسوخ حاصل کر لیا۔ اُس نے ایک حکمران الپتگین کی بہت مدد کی۔ اسرائیل اور الپتگین کی گہری دوستی ہو گئی۔ سلطان محمود نے اپنے ان دشمنوں کو کچلنے کے لیے حملہ کیا تو دونوں بخارا کے پہاڑی علاقوں میں بھاگ گئے تھے۔

ایلک خان ایک طاقتور حکمران تھا۔ وہ کسی نہ کسی کو ساتھ ملا کر سلطان محمود کے ساتھ بہت لڑا تھا مگر اُس نے ہر بار شکست کھائی۔ آخری شکست کے بعد جب وہ اپنے خاندان کے ساتھ کسی خوشنما پہاڑی علاقے میں چھپا ہوا تھا تو اسرائیل اسے ملنے گیا۔ اس لڑائی میں اسرائیل کے سلجوقی ایلک خان کے ساتھ نہیں تھے۔ اسرائیل اُسے تلاش کرتا اُس تک پہنچ گیا۔ ایک تو قدرت نے اُس جگہ کو اپنا حُسن دے رکھا تھا، دوسرے ایلک خان کی خیمہ گاہ نے وہاں محل جیسی رونق بنا رکھی تھی۔ وہ اپنی دنیا کا بادشاہ تھا۔ اپنی بادشاہی کو وہ سلطنتِ غزنی تک پھیلانے کے لیے لڑ رہا تھا مگر شکست کھا گیا۔

اُس کی خیمہ گاہ میں عورتیں بھی تھیں۔ ناچنے گانے والیاں بھی تھیں اور محل کے تمام تر لوازمات اور شان وشوکت وہاں موجود تھی۔ اسرائیل جب وہاں گیا تو ایلک خان اُسے اپنے خیمے میں ملا۔ یہ خیمہ محل کے کمرے جیسا خوشنما اور کشادہ تھا۔ اسرائیل کو وہ جانتا تھا۔ اسرائیل وجیہہ جوان تھا۔ خوبرو تھا۔ اُس کی آنکھیں سبز تھیں اور وہ سلجوقیوں کا سردار

تھا اور سلجوقی ایک جنگی طاقت تھے۔

"اب میرے پاس کیوں آئے ہو؟"— ایلک خان نے اُس سے پوچھا۔

"یہ دیکھنے کے لیے کہ میدانِ جنگ سے بھاگے ہُوئے سردار کی حالت کیسی ہوتی ہے"— اسرائیل نے طنزیہ کہا— "آپ کو مجھ سے یہ گِلہ ہے کہ میں آپ کی مدد کو نہیں آیا، اور مجھے یہ شکایت ہے کہ آپ نے مجھے مدد کے لیے بلایا نہیں۔ کیا آپ اپنے آپ کو اتنا طاقتور سمجھ بیٹھے تھے کہ میرے بغیر غزنی کے محمود کو شکست دے سکیں گے؟"

"تمہیں خود آنا چاہیئے تھا"— ایلک خان نے کہا۔

"نہیں"— اسرائیل بولا— "آپ محمود کو شکست دے کر خود غزنی اور بخارا کے بادشاہ بننے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ سمانی میرے قبیلے کی مدد کے بغیر ترکستانیوں کو شکست نہیں دے سکتے تھے۔ سمانی اُس وقت ختم ہُوئے جب سلجوقیوں نے اُن کا ساتھ چھوڑ دیا۔ ترکستانی آج بھی ہم سے ڈرتے ہیں"

"کیا تم مجھے طعنے دینے آئے ہو؟"— ایلک خان نے کہا— "کیا تم یہ دیکھنے آئے ہو کہ میں کتنا کمزور ہو گیا ہُوں؟"

"نہیں ایلک خان!"— اسرائیل نے کہا "شکست کا اتنا اثر قبول نہ کرو کہ دوست اور دشمن کو بھی پہچان نہ سکو۔ ہم دونوں کا دشمن ایک ہے .... غزنی کا سلطان محمود .... آپ اکیلے اُسے شکست نہیں دے سکتے۔ میں اکیلا اپنے سلجوقیوں کے ساتھ اُسے شکست دے سکتا ہوں اور دوں گا۔ میں یہ دیکھنے آیا ہوں کہ آپ میری کیا مدد کر سکتے ہیں۔ کیا مجھے کچھ فوج دے سکتے ہیں؟ .... اگر نہ دے سکیں تو بھی میں سلطان محمود سے لڑوں گا۔ الپتگین میرے ساتھ ہے"

"ہوش کی بات کرو اسرائیل!" ایلک خان نے کہا "تم نے دو سرحدں

کو مدد دی ہے اور مدد کے انداز سے لڑے ہو۔ تمہارا آمنا سامنا محمود کی فوج سے نہیں ہوا۔ محمود اپنی جنگی چالوں سے اپنے سے دگنی اور طاقتور فوج کو بھی شکست دے دیا کرتا ہے۔ اُس کی فوج بے لگام ہو کر نہیں بلکہ سدھائے ہوئے گھوڑوں کی طرح لڑتی ہے۔ اشاروں پر حرکت کرتی ہے۔ ہم میں وہ بات نہیں۔"

"ایلک خان!" اسرائیل نے کہا "اس شکست نے آپ کے دماغ پر گہرا اثر کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ مجھے آپ سے مدد لینی بھی نہیں چاہئیے۔ اگر خان پر یہ دہشت سوار ہے تو خان کے سپاہی تو کانپ رہے ہوں گے۔ مجھے سُلطان محمود سے لڑنا ہے۔ وہ بہت بڑی طاقت بنتا جارہا ہے۔ ہندوستان کی دولت نے اُسے بہت زیادہ طاقتور بنا دیا ہے اور وہ دن دُور نہیں جب بلخ، بخارا، سمرقند، تُرکستان اور خوارزم سلطنتِ غزنی کے غلام ہوں گے اور ہم مجرموں کی طرح دور کہیں پہاڑیوں میں بھاگے بھاگے پھریں گے۔"

"سنا ہے کچھ سلجوقی بھی اُس کی فوج میں شامل ہو گئے ہیں"۔۔۔ ایلک خان نے کہا۔

"اُس نے ہندوستان کے زر و جواہرات سے ان سلجوقیوں کو خریدا ہے" ۔۔۔ اسرائیل نے کہا۔ "اُس کا ایک سالار بھی سلجوقی ہے۔ ابوالقدر سلجوقی۔ وہ ہندوستان میں کہیں قلعہ دار ہے۔"

"کیا تم ان لوگوں کو واپس اپنے قبیلے میں نہیں لاسکتے؟"۔۔۔ ایلک خان نے پوچھا۔

"یوں کہو ایلک خان! کیا تم ان لوگوں کے ہاتھوں سلطان محمود کو نہیں مروا سکتے؟"۔۔۔ اسرائیل نے کہا۔ "لڑائی صرف میدان میں نہیں لڑی جاتی خانِ محترم! میں محمود کو اُس کے سالار ابوالقدر سلجوقی سے مرواؤں گا، لیکن ایک بار میدان میں لڑوں گا۔ اگر میں ہار گیا تو اُن سلجوقیوں کو استعمال کروں

گا جو محمودؒ کی فوج میں ہیں "

شراب کا دور چل رہا تھا۔ شراب بڑی خوبصورت عورتیں پیش کر رہی تھیں۔ ایلک خان کے پاس تین چار جوان لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ وہ بخارا کے قدرتی حُسن کا شاہکار تھیں۔ اسرائیل ان سے زیادہ نہیں تو انہی جیسا خوبرو تھا اور مردانہ جاہ و جلال کا بڑا خوبصورت اور مضبوط مجسمہ۔

"میں اپنے آپ کو غزنی کے تخت پر بیٹھا ہُوا دیکھا کرتا ہوں" ــــ اسرائیل سلجوقی نے شراب کا جام لہرا کر کہا۔ اس میں شراب کا نشہ بھی تھا، طاقت کا بھی۔

ایلک خان نے اُسے دو چار روز کے لیے روک لیا۔

رات چاندنی اور فضا میں پھولوں کی بھینی بھینی مہک تھی۔ اسرائیل اپنے خیمے سے دُور ٹہل رہا تھا۔ اُس نے محسوس کیا کہ وہ اکیلا نہیں۔ اُس نے اپنے خنجر پر ہاتھ رکھا اور رُک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ ایک سایہ درختوں کی چھاؤں میں سے بڑھا آرہا تھا۔ سایہ مرد کا نہیں تھا۔

"کون؟"

"مریم" ــــ چاندنی میں آکر یہ سایہ نسوانی حسن کا متحرک مجسمہ بن گیا ــــ اُس نے کہا ــــ "ایلک خان کی بھتیجی ہوں"

اسرائیل نے اُسے قریب ہو کر غور سے دیکھتے ہوئے کہا ــــ "کل تم بھی ایلک خان کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں .... یہاں کیوں آئی ہو؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے؟" ــــ مریم نے کہا ــــ "لیکن اس سے پہلے کہ آپ کچھ اور سمجھیں، میں آپ کو بتا دوں کہ میں آپ کی وجاہت اور مردانہ حسن اور جسم سے متاثر ہو کر نہیں آئی۔ مجھے آپ کے عزم نے متاثر کیا ہے۔ خیال رکھیں، مَیں کنواری ہوں اور میں ایلک خانیوں کی غیرت ہوں مگر یہ غیرت مجھے خطرے میں نظر آرہی ہے۔ چچا ایلک خان

دل چھوڑ بیٹھے ہیں۔ یہ میری غیرت کو گوارا نہیں۔ کیا غزنی کا سلطان محمود جن ہے؟ بھوت ہے؟ دیو ہے؟ میں اُس مرد پر اپنا سب کچھ قربان کر دوں گی جو محمود کی سلطنت کو تباہ کر کے اُسے بھٹکنے کے لیے ان پہاڑوں میں چھوڑ دے گا!"

اسرائیل ہنس پڑا اور بولا ”شہزادی کو محمود کے ساتھ کیا دشمنی ہے؟"

”اسرائیل سلجوقی کو محمود سے کیا دشمنی ہے"؟ — مریم نے کہا — ”اِدھر آئیے۔ بیٹھ کے باتیں کریں ..... دشمن دشمن ہوتا ہے۔ کیا اور کیوں کا فیصلہ دشمن کو شکست دے کر کیا جاتا ہے"

”مریم!" — اسرائیل نے کہا — ”تمہارا جسم کنوارہ ہے۔ تمہارا دماغ کنوارہ نہیں لگتا۔ تم نے بڑی پختہ بات کی ہے"

وہ درختوں کے نیچے جا کے بیٹھ گئے اور تھوڑی ہی دیر بعد اُن کے ہاتھ ایک دوسرے کے ہاتھوں میں اُلجھ گئے، پھر وہ ایک سایہ بن گئے اور اسرائیل نے سرگوشی کی۔ ”ایلک خان سے بات کروں؟"

”وہ نہ مانے تو مَیں خود آجاؤں گی" — مریم کی سرگوشی سُنائی دی — ”مَیں ہمیشہ کے لیے تمہاری ہوں اسرائیل! مَیں ایسے ہی ایک مرد کے انتظار میں تھی جس کے ارادوں کو میرا عزم گلے لگا سکے۔ سلطان محمود کو ختم کرنے کے لیے مجھے جس طرح بھی استعمال کرنا چاہو گے مجھے تیار پاؤ گے"

وہ چلی گئی۔

اسرائیل وہاں تین راتیں رہا۔ تینوں راتیں مریم اُسے وہاں ملی جہاں پہلی رات ملی تھی۔ آخری رات اُس کے خاندان کی ایک اور شہزادی عنبرین بھی جو اُس کی ہم عمر تھی، اُس کے ساتھ تھی۔ مریم اسرائیل کے پاس گئی تو عنبرین دور کھڑی رہی تھی۔ پھر اسرائیل چلا گیا۔

"مریم!"— وہ واپس آئی تو عنبرین نے اُسے کہا— "تمہارا انتخاب اس سے بہتر نہیں ہو سکتا تھا۔ تمہارا خاوند اسرائیل ہی ہونا چاہیئے، مگر مریم! اسرائیل کے ساتھ شادی کر کے تم سلطان محمود کے ساتھ دشمنی بھی کر لو گی۔ کیا تم نے سنا نہیں کہ چچا ایلک کہہ رہے تھے کہ وہ اپنے خاندان کی بیٹیاں محمود کے خاندان میں دے کر اُس کے ساتھ صُلح کر لیں گے؟"

"یہ اُن کی شکست کی دلیل ہے"— مریم نے کہا— "وہ سلطان محمود سے اس قدر خوفزدہ ہیں کہ اپنی بیٹیاں تک دینے کو تیار ہو گئے ہیں۔ اسرائیل سلطان محمود کے ساتھ کسی قیمت پر صلح نہیں کرے گا"

"اور شکست کھائے گا"— عنبرین نے جھنجھلا کر کہا— "اُس کا انجام وہی ہو گا جو چچا ایلک خان کا ہو رہا ہے، جو سلطان محمود کے ہاتھوں قادر خان کا ہُوا تھا، جو خوارزم شاہوں کا ہُوا اور جو قرامطیوں کا ہُوا ہے"۔

"اسرائیل ان سب کا انتقام لے گا"— مریم نے فخر سے کہا— "عنبرین! تم ایسی باتیں کیوں کیا کرتی ہو جن سے غزنی والوں کی غلامی اور شکست کی بُو آتی ہے؟"

"غزنی والوں کی غلامی نہیں اسلام کی غلامی کہو"— عنبرین نے کہا— "تم دنیا کی باتیں کرتی ہو، میں اُس دنیا کی باتیں کر رہی ہوں جس میں ہمیں مر کر جانا ہے۔ آپس میں لڑ کر ہم نے کیا پایا ہے؟ ہم نے وہ طاقت ضائع کر دی ہے جو اسلام کے دشمنوں کے خلاف استعمال ہونی چاہیئے تھی۔ اگر ہم سب نے مل جُل کر سلطان محمود کو شکست دے دی تو کامیاب ہم نہیں بلکہ اسلام کے دشمن ہوں گے"

مریم ہنس پڑی۔ اُس کی ہنسی میں طنز تھی۔ اُس نے کہا— "تم اسلام اسلام کی رٹ لگاتی مر جاؤ گی اور میں سلطنتِ غزنی کی ملکہ ہوں گی۔ تم کسی بوڑھے سالار کی بیوی بنو گی.... لیکن نہیں میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ میں تمہاری شادی کسی تم جیسے خوبصورت مرد کے ساتھ کراؤں گی جس کے پاس دولت بھی

ہوگی اور جس کا حکم چلے گا۔"

"اور اسرائیل سلجوقی بادشاہ ہوگا"۔ عنبرین نے طنزیہ کہا۔

"ہاں"۔ مریم بولی ۔"وہ ہے ہی بادشاہ ۔ اسے وہ تخت و تاج چاہیئے جس پر سلطان محمود بیٹھا ہے۔"

"تم خواب دیکھ رہی ہو مریم!"

"تم ٹھیک کہتی ہو"۔ مریم نے کہا۔"میں خواب دیکھ رہی ہوں۔ اسرائیل میرے خوابوں کی تعبیر بن کے آیا ہے۔ میں یہ خواب بچپن سے دیکھ رہی ہوں۔ مجھے ملکہ بننا ہے۔ سر پر تاج رکھنے کے لیے میں اپنا سب کچھ قربان کر دوں گی۔"

"ہاں اسرائیل!"۔ ایلک خان نے اسرائیل کی درخواست سن کر کہا ۔"مریم کے باپ نے مجھے اجازت دے دی ہے کہ میں مریم کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دے دوں، لیکن وعدہ کرو کہ تم سلطان محمود سے میری شکست کا انتقام لوگے۔ مجھے عمر نے اور اپنے دوستوں نے دھوکہ دیا ہے۔ میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ دوستوں نے میدانِ جنگ میں ہی ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ میں نے تو سوچا تھا کہ سلطان محمود کے ساتھ رشتے ناطے جوڑ کر باقی عمر آرام سے گزاروں گا لیکن تم امید کی ایک کرن بن کر آئے ہو۔ تم میری خواہش پوری کر سکو گے.... مریم کے ساتھ مجھے بہت پیار ہے۔ اکثر کہا کرتی ہے کہ وہ ملکہ بننے کے لیے پیدا ہوئی ہے۔ تم اُسے ملکہ بنا سکتے ہو۔"

"میں آپ کی یہ خواہش کہ سلطان محمود کو شکست دی جائے اور مریم کی یہ خواہش کہ وہ ملکہ بنے، پوری کر دوں گا"۔ اسرائیل نے کہا۔"میں ابھی سلطان محمود کے آمنے سامنے نہیں آیا۔ اگر میں پہلی بار اس کے سامنے جم نہ سکا تو پیچھے ہٹ آؤں گا۔ دوسری بار بھی اُسے شکست نہ دے سکا تو میں دوسرا حربہ استعمال کروں گا۔ آپ مطمئن رہیں۔ محمود آپ کی زندگی میں ختم

ہو گا۔ اُسے میرے ہاتھوں ختم ہونا ہے۔"
اسرائیل سلجوقی نے پُرعزم باتوں سے ایلک خان کے دل سے شکست کی چوٹ سہلادی اور وہ مریم کو دلہن بنا کے لے گیا۔ اُس کے قبیلے کو پہلے اطلاع مل چکی تھی کہ وہ دلہن لا رہا ہے اور دلہن کوئی عام قسم کی قبائلی لڑکی نہیں ایلک خان جیسے جنگجو کی بھتیجی ہے۔ ایلک خان گو شکست خوردہ تھا لیکن اُن دنوں سلطان محمود کے خلاف لڑنا بہت بڑا اعزاز سمجھا جاتا تھا۔ سلطان محمود کو کوئی دل گردے والا ہی للکار سکتا تھا۔ اس لحاظ سے ایلک خان کی بڑی دھوم تھی۔

سلجوقی ہزاروں کی تعداد میں اکٹھے ہو گئے تھے۔ بکرے اور اونٹ اتنے زیادہ ذبح ہوئے کہ کھالوں کی پہاڑی بن گئی اور خون ندی کی طرح بہہ نکلا۔ ساری رات جشن منایا گیا۔ دوسرے دن اسرائیل نے تمام قبیلے کو ایک جگہ اکٹھا کیا اور مریم کے ساتھ بلند جگہ کھڑے ہو کر قبیلے سے خطاب کیا:

"آج میں تمہیں وہ ملکہ دے رہا ہوں جو محمود کی سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجانے کا عہد کر کے آئی ہے۔ ملکہ مریم جتنی حسین ہے اتنی ہی عزم اور عہد کی پکی ہے۔ سلجوقی شیرو! کیا تمہاری تلواریں غزنی والوں کے خون کی پیاسی نہیں؟"
— قبیلے نے اتنے گرجدار نعرے لگائے کہ پہاڑ کانپنے لگے۔ "ہندوستان کا لٹیرا آج ہمیں آنکھیں دکھا رہا ہے۔ عہد کرو کہ محمود کو ہمیشہ کی نیند سلا کر سوئیں گے۔ اب ہماری منزل غزنی ہوگی۔ مت بھولو کہ ہمارا کوئی ملک نہیں۔ زمین کا کوئی ایسا ٹکڑا نہیں جسے سلجوقی اپنا وطن کہہ سکیں۔ ہم جنگلی جانوروں کی طرح پہاڑوں اور وادیوں میں بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ ہم کمزور نہیں۔ ہم ایک طاقت ہیں۔ ہم ایک فوج ہیں۔ ہم ایک قوم ہیں۔ ہماری طاقت دوسرے استعمال کر رہے ہیں۔ ہم بکھرنا شروع ہو گئے ہیں۔ کئی سلجوقی غزنی کی فوج میں شامل ہو گئے ہیں۔ سلطان محمود نے انہیں ہندوستان سے لوٹی ہوئی دولت سے خرید لیا ہے۔ وہ اسلام کے نام پر سب کو دھوکہ دے رہا ہے۔ اسلام

کے پاسبان ہم ہیں لیکن ہم پہلے سلجوقی، اس کے بعد مسلمان ہیں۔ محمود اسلام کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ وہ اپنے آپ کو بُت شکن کہلاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُس نے اپنے آپ کو ایک بُت بنالیا ہے اور ہم سب سے اپنے آگے سجدے کرانا چاہتا ہے۔ ہم خدا کے سوا کسی کے آگے نہیں جھکیں گے۔ تلواریں تیز کرلو۔ ترکشیں تیروں سے بھر لو۔ تیار ہو جاؤ۔ ہمارا اگلا جشن فتح کا جشن ہوگا۔"

اُسی روز پہاڑی علاقے میں گہما گہمی شروع ہو گئی۔ پھینکنے والی برچھیاں تیار ہونے لگیں۔ کمانیں اور تیر تیار ہونے لگے۔ دور دور سے سلجوقیوں کو اکٹھا کیا جانے لگا ــــ اور ایک مہینے کے قلیل عرصے میں ایک لشکر تیار ہو گیا۔ اسرائیل سلجوقی نے ایلک خان کی بھی کچھ فوج لے لی اور اس فوج کے ساتھ ایلک خان کا بیٹا احمد توغان خان کمانڈر بن کے آیا۔

غزنی کی فوج میں ارباب خان سلجوقی ایک جیش کا عہدیدار تھا۔ ایک روز اُس کا باپ اُسے ملنے آیا۔ ملنے کا مقصد صرف باپ بیٹے کی ملاقات نہیں تھی، بلکہ باپ اپنے بیٹے کو بتانے آیا تھا کہ سلجوقی سلطان محمود کے خلاف لڑنے کی تیاریاں کر رہے ہیں اور سلجوقی درویشوں نے فتویٰ دیا ہے کہ جو سلجوقی غزنی کی فوج میں ہیں وہ واپس اپنے قبیلے میں آجائیں، ورنہ وہ کافروں کی موت مریں گے اور اُن کی لاشیں گدھ اور کتے کھائیں گے۔ ارباب خان نے اپنے باپ سے سلجوقیوں کی تیاریوں کی تفصیل سُنی اور باہر نکل گیا۔ وہ اپنے سالار کے پاس گیا اور اُسے بتایا کہ سلجوقی غزنی پر حملے کی تیاریاں کر رہے ہیں اور یہ اطلاع سلطان تک پہنچنی چاہیئے۔

تھوڑی دیر بعد باپ بیٹا سلطان محمود کے سامنے کھڑے تھے۔

"میں تمہارے بیٹے کی قدر کرتا ہوں کہ اس نے اپنے باپ کو مجرم بنا کر اپنے سلطان کے سامنے کھڑا کر دیا ہے" سلطان محمود نے کہا "میں اسے کیا انعام دوں گا، اسے اصل انعام خدا دے گا۔"

بوڑھا خوف سے کانپنے لگا۔ اُسے بڑی ہی خوفناک سزا نظر آنے لگی تھی۔

"جسے روشنی نہ دکھائی گئی ہو اُس پر کوئی الزام نہیں کہ وہ راستے سے بھٹک گیا ہے"۔۔۔ سلطان محمودؒ نے کہا ۔۔"اب تمہارا بیٹا تمہیں روشنی میں لے آیا ہے۔ مجھے بتاؤ کہ سلجوقی کیسی تیاریاں کر رہے ہیں اور اُن کے ارادے کیا ہیں۔ نہیں بتاؤ گے تو میں تمہیں قید نہیں کروں گا۔ تم ہمارے مہمان ہو اور مسلمان ہو۔ عزّت سے رخصت کروں گا تاکہ تم جان سکو کہ سچّا اسلام کہاں ہے اور خدا کس کے ساتھ ہے .... کیا تم خدا سے ٹکّر لے سکتے ہو؟"

بیٹا بھڑک اٹھا اور بولا ۔۔"گستاخی کی معافی چاہتا ہوں سلطانِ عالی مقام! اگر میرے باپ نے سچ نہ بولا تو میں یہیں اس کا سر کاٹ کر آپ کے قدموں میں رکھ دوں گا"۔

"تم نے گستاخی میری نہیں کی، اپنے باپ کی کی ہے"۔ سلطان محمود نے گرج کر کہا ۔۔"اس نے صرف ایک رُخ دیکھا ہے۔ اسے دوسرا رُخ بھی دیکھنے دو"۔

بوڑھا اتنا متاثر ہوا کہ آگے بڑھ کر سلطان محمود کے آگے دوزانو ہو گیا۔ اُس نے اپنی کمر سے تلوار اتار کر سلطان کے قدموں میں رکھ دی اور اُس نے بتانا شروع کر دیا کہ اُن کے سردار اسرائیل نے ایلک خان کی بھتیجی کے ساتھ شادی کر لی ہے اور ایلک خان کی کچھ فوج کو اپنے ساتھ ملا کر غزنی پر حملے کی تیاری کر رہا ہے۔ سلطان محمود نے اُس سے اپنے مطلب کی بہت سی باتیں پوچھیں اور حکم دیا کہ اس بوڑھے کو شاہی مہمان کی حیثیت سے رکھا جائے۔ اسے بھیج کر سلطان نے ارباب خان سلجوقی کو کچھ انعام دیا اور اُسے کہا کہ وہ اپنے قبیلے میں اسرائیل کا وفادار بن کر چلا جائے اور وہاں کے حالات دیکھ کر چوری چھپے واپس آ جائے۔

ارباب خان پندرہ سولہ دنوں بعد آگیا اور اُس نے سلطان محمود کو

سلجوقیوں کی تمام تر جنگی معلومات دے دیں۔ سلطان محمود کی فوج میں دو کماندار سلجوقی تھے۔ ان کے نائب سالار نے ان کی وفاداری کی بہت تعریف کی۔ سلطان نے دونوں سے کہا کہ وہ اسرائیل سلجوقی کے پاس چلے جائیں اور اُس کی راہنمائی کرکے اُسے لائیں۔ سلطان نے بہت سی ہدایات دے دیں اور اپنے سالاروں کو بلا کر فوج کو بخارا کے پہاڑی علاقے کی سمت کوچ کا حکم دے دیا۔

یہ ۱۸-۱۰۱۷ء کا واقعہ ہے۔ سلجوقی لشکر نے ترمز کے مقام سے دریائے اوکسس عبور کیا۔ یہ جنگجوؤں کا لشکر تھا اور اپنے آگے سب کچھ بہالے جانے والے سیلاب کی طرح آرہا تھا۔ یہ چونکہ قبائلی لوگ تھے، ان کی کوئی باقاعدہ بادشاہی نہیں تھی، اس لیے وہ راستے میں آنے والی بستیوں کو لوٹتے آرہے تھے۔ انہوں نے کھڑی فصل اپنے مویشیوں کو کھلا دیئے۔

ترمز سے تقریباً ساٹھ میل جنوب میں آہنگران کا پہاڑی علاقہ شروع ہوجاتا ہے۔ یہ لشکر اُن دو سلجوقی کمانداروں کی راہنمائی میں آرہا تھا جنہیں سلطان محمود نے بھیجا تھا۔ انہوں نے اس پہاڑی علاقے میں ایک خاص مقام پر لشکر کو پڑاؤ کرایا۔ انہوں نے اسرائیل سے کہا تھا کہ وہ اُسے اُس طرف لے جارہے ہیں جدھر غزنی کی فوج نہیں ہے۔ پڑاؤ کیا گیا۔ سفر کا تھکا ہوا لشکر گہری نیند سو گیا۔

آدھی رات کے قریب خیمہ گاہ میں سے ایک مشعل بلند ہوئی اور دائیں بائیں ہلی۔ اس اشارے کے ساتھ ہی یوں شور اُٹھا جیسے پہاڑیاں سرک کر آگے بڑھ رہی ہوں اور اُن کے پتھر اُوپر سے لڑھکتے نیچے آرہے ہوں۔ سلطان محمود کے بھیجے ہوئے دونوں سلجوقی کمانداروں نے سلجوقی لشکر کے سامان کے ڈھیر کو آگ لگادی، اور اس روشنی میں سلجوقیوں پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ اُن خیموں سے شعلے اُٹھنے لگے جن میں سلجوقی گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ غزنی کی فوج کی نفری سلجوقیوں کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھی لیکن سوئی ہوئی فوج کو تباہ کرنے کے لیے یہی دو سوار دستے کافی تھے۔ یہ کوئی لڑائی نہیں تھی، یہ

سلجوقیوں کا قتلِ عام تھا۔ ان کے لیے بھاگنے یا کٹ مرنے کے سوا کوئی راستہ نہیں رہ گیا تھا۔

دونوں سلجوقی کمانداروں نے اسرائیل سلجوقی اور احمد توغان خان کو پکڑنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ دونوں ہلّہ شروع ہوتے ہی نکل گئے تھے۔ صبح جلی اور سلگتی ہوئی خیمہ گاہ میں بکھری ہوئی سلجوقی لاشوں کو دیکھا گیا۔ اسرائیل اور توغان خان کی لاشیں کہیں نظر نہ آئیں۔

*

اُسی جگہ جہاں اسرائیل نے اپنے قبیلے سے للکار کر کہا تھا کہ تلواریں تیز کر لو، ترکشیں تیروں سے بھر لو، ہمارا اگلا جشن فتح کا جشن ہوگا، وہیں اسرائیل اپنے خیمے میں لیٹا ہُوا تھا۔ مریم نے اپنے ہاتھوں اُسے شراب کا جام پلایا تھا۔ اُن کے پاس ایک درویش صورت آدمی بیٹھا تھا۔

"پہلی شکست آخری شکست نہیں ہُوا کرتی"۔ درویش کہہ رہا تھا ___ "دِل برداشتہ نہ ہو اسرائیل! تم بے خبری میں ہارے ہو۔ آخر فتح تمہاری ہوگی"۔

اسرائیل پر خاموشی طاری تھی۔ وہ جیسے کچھ سُن ہی نہیں رہا تھا۔ مریم نے درویش کو اشارہ کیا تو وہ خیمے سے نکل گیا۔ مریم نے اسرائیل پر اپنے حُسن و جوانی کا جادو طاری کرنا شروع کر دیا اور اُسے وہ عہد یاد دلایا جو اُس نے پہلی ملاقات میں کیا تھا۔ اسرائیل کے جسم میں جان واپس آنے لگی۔

تین چار روز بعد جب اسرائیل اپنے قبیلے کو از سرِ نو منظم کر رہا تھا، اُسے اطلاع ملی کہ ایلک خان مر گیا ہے اور اُس نے مرتے وقت کہا ہے کہ اسرائیل سے کہنا کہ تم نے وعدہ کیا تھا کہ میری زندگی میں تم سلطان محمود کو ختم کر دو گے لیکن تمہاری پسپائی کی تفصیل سُن کر مجھے اتنا صدمہ ہُوا ہے جو میں اس عمر میں برداشت نہیں کر سکا۔ میں اپنے بیٹے احمد توغان خان کو اپنا جانشین مقرر کر کے اس دنیا سے نامراد جا رہا ہوں۔ تم اپنا عہد پُورا کرنا ورنہ میری روح بدروح بن کر تمہیں راتوں کو چین سے سونے بھی نہیں دے گی۔ توغان

خان سے دوستی قائم رکھنا۔ التگین کو بھی ساتھ رکھو۔ تم میں کوئی بھی محمود کو اکیلے شکست نہیں دے سکتا۔ میں التگین کو تمہارے پاس بھیج رہا ہوں۔

ایلک خان نے پیغام التگین کے ہاتھ بھیجا تھا۔ اُس نے کہا تھا:

"التگین کے ساتھ دو لڑکیاں تمہارے پاس آرہی ہیں۔ مریم انہیں اچھی طرح جانتی ہے۔ مرنے سے پہلے تمہیں ایک طریقہ بتاتا ہوں۔ تم نے کہا تھا کہ تم سلطان محمود کو شکست نہ دے سکے تو اُسے کسی اور طریقے سے مارو گے۔ ان دو لڑکیوں کو استعمال کرو۔ بڑی تیز اور ہوشیار لڑکیاں ہیں۔ سلطان محمود کی فوج میں چند ایک کماندار سلجوقی ہیں۔ ان لڑکیوں کو انہیں پھانسنے کے لیے غزنی بھیجو۔ یہ سلجوقی کمانداروں کے ساتھ شادی کرلیں گی، لیکن درپردہ دوسرے سلجوقیوں کو جو محمود کی فوج میں ہیں، اپنے جال میں پھانستی رہیں گی۔ انہیں باہر کے ایک آدمی نے تربیت دی ہے۔ تمہارا بھی اسرائیل ہے لیکن وہ آدمی بنی اسرائیل ہے اس سے تمہیں شک نہ ہو کہ وہ یہودی ہے تو تمہیں نقصان پہنچائے گا۔ اُس کا ہدف سلطان محمود ہے۔ اُس نے وعدہ کیا ہے کہ سلطان کی فوج کے سلجوقیوں کو خریدنے کی ضرورت پڑی تو وہ نقد مدد بھی دے گا۔ اس مہم میں تم خرچ کرنے سے نہ ڈرنا۔ احمد توغان خان تمہیں مالی امداد دے گا۔"

اسرائیل نے دونوں لڑکیوں کو دیکھا تو اُس نے محسوس کیا کہ وہ مریم کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھیں لیکن خوبصورت تھیں۔ ان لڑکیوں نے جب اسرائیل کے ساتھ باتیں شروع کیں اور ناز و انداز دکھائے تو اس کے ذہن سے مریم اُترنے لگی۔ ان دونوں میں کچھ اور ہی کشش تھی۔ کوئی جادو سا تھا جس نے ان لڑکیوں کی شکل و صورت ہی بدل ڈالی تھی۔ اسرائیل یوں اٹھ بیٹھا جیسا اُسے خدا توانائی دیل گئی ہو۔

*

ڈوبنے والے تنکوں کے سہارے ڈھونڈا کرتے ہیں۔ میدان میں شکست کھانے والے زیر زمین چلے جاتے اور سانپ بن جایا کرتے ہیں۔ بڑے بڑے

جری مرد جنہیں کوئی بھی زیر نہ کرسکا کسی حسین وجمیل عورت یا سانپ کے ڈنک سے مرے ہیں۔ عورت نے بادشاہیوں کو ٹکرایا ہے اور عورت نے اپنا آپ قربان کرکے بادشاہی کی گرتی ہوئی عمارت کو تھاما اور استحکام بھی بخشا ہے۔

جہاں یہودیوں کی تربیت یافتہ یہ دو مسلمان لڑکیاں سلطان محمود کے قتل کے لیے آئی تھیں وہاں مریم بھی تھی جو بیداری میں ملکہ بننے کے خواب دیکھا کرتی تھی۔۔۔ اور وہاں ایک عنبرین بھی تھی جو ایلک خان کے خاندان کی ہی بیٹی تھی۔ وہ اسی ماحول کی پروردہ تھی جس میں سلطان محمود غزنوی کا نام حقارت سے لیا جاتا تھا اور جس میں غزنی کی سلطنت کی جڑیں کاٹنے کے منصوبے بنتے رہتے تھے مگر سلطان محمود کی نفرت اس کے لیے عقیدت بن گئی تھی۔ اس نے مریم سے بھی کہا تھا کہ وہ سلطان محمود سے نہیں اسلام سے نفرت کا اظہار کر رہی ہے۔

اب یہ دو لڑکیاں اُس کے سامنے اسرائیل سلجوقی کی طرف بھیجی گئی تھیں۔ وہ ان لڑکیوں کو اچھی طرح جانتی پہچانتی تھی لیکن اُسے معلوم نہ تھا کہ ایک اجنبی صورت آدمی انہیں کمرے میں لے جاکر کیا پڑھاتا اور بند کمرے میں کیا ہوتا ہے۔ عنبرین نے ان سے پوچھا تھا تو انہوں نے بتایا تھا کہ یہ اُن کا اتالیق ہے۔ عنبرین کو افسوس سا ہوا تھا کہ اُسے اتالیق کی شاگردی میں کیوں نہیں بٹھایا جاتا۔ اُسے وجہ معلوم تھی۔ اُس کے خیالات کچھ اور تھے، وہ بات کچھ اور کرتی تھی اور وہ اسلام اسلام کی رٹ لگائے رکھتی تھی۔ وہ اس شاہی خاندان کی دوسری لڑکیوں کی طرح شوخیوں اور کدکڑوں میں شب و روز نہیں گذارتی تھی۔ سب کہتے تھے کہ مخبوط الحواس ہے۔

عنبرین کو صرف دو شوق تھے۔ گھوڑسواری اور تیراندازی۔ یہ تو اُس دور کا دستور تھا کہ لڑکیاں گھوڑسواری، شتر سواری اور تیراندازی سے خوب واقف ہوتی تھیں لیکن عنبرین مردوں کے مقابلے میں گھوڑا دوڑاتی اور دوڑتے گھوڑے سے نشانے پر تیر چلاتی تھی۔ اُس کا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوا تھا۔ وہ اکثر گھوڑا دوڑاتی جنگل میں دُور نکل جایا کرتی تھی۔

سلجوقی نقصان تو بہت اٹھا گئے تھے۔ اُن کے گھوڑے اور اونٹ بھی پیچھے رہ گئے تھے لیکن سلطان محمود کو معلوم تھا کہ اس قبیلے کی تعداد کم نہیں۔ ایلک خان کی فوج بھی سلجوقیوں کی اتحادی تھی۔ وہ کسی بھی روز سرحدوں پر چھیڑ چھاڑ کر سکتے تھے۔ اُن پر نظر رکھنا ضروری تھا۔ چنانچہ سلطان محمود نے حکم دے دیا تھا کہ اپنی فوج کی گشت سرحدوں سے باہر جتنی دُور تک جا سکے چلی جایا کرے۔

عمر یزدانی فوج میں کماندار تھا۔ اس کے ماتحت تین سرحدی چوکیاں تھیں۔ یہ سرحد اُس علاقے سے ملتی تھی جو ایلک خان کا تھا۔ یہ دریائے اوکسس کے پار کا علاقہ تھا۔ سلطان محمود نے دو چوکیاں دریا کے پار بناوی تھیں۔ ان کی نفری کے لیے دریا میں ہر وقت کشتیاں موجود رہتی تھیں۔ عمر یزدانی اسی چوکی میں رہتا تھا۔ ایک روز وہ گشتی سنتریوں کو دیکھنے کے لیے چلا گیا کہ وہ کہیں بیٹھ تو نہیں جاتے۔

اُس نے دُور سے دیکھا کہ گھوڑ سوار سنتری چلے جا رہے تھے۔ وہ انہیں دیکھتا رہا۔ وہ کہیں رُکے نہیں اور آگے جا کر جنگل میں غائب ہو گئے۔ اُدھر جانا عجیب نہیں تھا۔ عمر یزدانی دوسری طرف نکل گیا۔ وہ کماندار تھا۔ اُس کے پاس کمان اور ترکش نہیں ہونی چاہیئے تھی لیکن گشت پر جاتے وہ کمان اور ترکش ساتھ لے جاتا تھا۔ دشمن کے علاوہ اُس علاقے میں ہرن اور خرگوش ہوتے تھے جن کا شکار دلچسپ تھا۔ اُس روز اُسے دُور ہرنوں کا ایک جوڑا نظر آیا۔ عمر یزدانی نے گھوڑے کا رُخ ادھر کو کر لیا اور کمان میں تیر ڈال لیا۔ وہ چھپ چھپ کر ذرا چکر کاٹ کے جا رہا تھا تاکہ ہرنوں کو خبر نہ ہو لیکن ہرن وہاں سے چل پڑے اور دُور ہی دُور ہٹتے گئے۔ عمر یزدانی ہرنوں میں ایسا مگن ہوا کہ دیکھ نہ سکا کہ وہ کتنی دُور نکل گیا ہے۔ آگے علاقہ چٹانی آ گیا تھا۔

ہرن سرپٹ دوڑ پڑے جیسے ڈر گئے ہوں۔ دُور سے دوڑتے گھوڑے کے ٹاپو سنائی دینے لگے جو قریب آ رہے تھے۔ عمر یزدانی رُک گیا۔ اُسے ایک

گھوڑ سوار دکھائی دیا جو سرپٹ دوڑتے گھوڑے سے دائیں اور بائیں تیر چلا رہا تھا۔ گھوڑا ایک طرف مڑ گیا۔ تب عمر یزدانی نے دیکھا کہ گھوڑ سوار عورت ہے اور گھوڑے کے تعاقب میں چار بھیڑیئے ہیں۔ عورت گھوڑے کو دائیں کبھی بائیں کر کے بھیڑیوں پر تیر چلاتی تھی مگر بھیڑیئے اُس کی زد میں نہیں آتے تھے۔

اس علاقے کے بھیڑیئے بڑے ہی طاقتور اور خونخوار ہوا کرتے تھے۔ گھوڑا بھیڑیوں کے ڈر سے بہت تیز دوڑ رہا تھا۔ اُسے آخر تھکنا اور رُکنا تھا۔ عورت کے لیے بھیڑیوں کا مقابلہ اور اُن سے بچنا ناممکن تھا۔ عمر یزدانی نے کمان میں تیر ڈال رکھا تھا۔ اُس کا گھوڑا تازہ دم تھا۔ اُس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ اعلیٰ نسل کا فوجی گھوڑا ہوا ہو گیا۔ چاروں بھیڑیئے اس کے آگے آگے گھوڑ سوار عورت کے پیچھے دوڑے جا رہے تھے۔ وہ گھوڑے تک تقریباً پہنچ گئے تھے۔ ایک نے اُچھل کر گھوڑے کو پنجہ مار بھی دیا تھا اور ایک گھوڑے کے پہلو میں چلا گیا اور اُچھل رہا تھا۔

عمر یزدانی نے تیر نہ چلایا۔ وہ پہلو والے بھیڑیئے کے پیچھے گیا اور گھوڑا اس پر چڑھا دیا۔ یہ بھیڑیا گھوڑے تلے کچلا گیا۔ عمر یزدانی نے گھوڑے کو پیچھے کو موڑا اور دوڑتے گھوڑے سے ایک بھیڑیئے پر تیر چلایا۔ بھیڑیئے نے چیخ ماری اور گھوڑے سے توجہ ہٹا کر دوسری طرف بھاگ اٹھا لیکن دُور نہ جا سکا۔ گِر کر تڑپنے لگا۔ باقی دو بھیڑیئے اپنے دو ساتھیوں کا انجام دیکھ کر بھاگ گئے مگر عورت کا گھوڑا ایسا ڈرا ہُوا تھا کہ بے لگام ہو گیا تھا۔ رُکتا نہیں تھا۔ عمر یزدانی نے اپنا گھوڑا اس کے پہلو میں کر لیا۔ تب اُس نے دیکھا کہ سوار عورت نہیں بلکہ بڑی خوبصورت جوان لڑکی ہے اور وہ کوئی شہزادی معلوم ہوتی ہے۔

عمر یزدانی نے دوڑتے گھوڑے سے جھک کر لڑکی کے بے لگام گھوڑے کے منہ کے قریب سے لگام پکڑ لی اور اُسے اپنے قابو میں لے لیا۔ لڑکی گھبرائی ہوئی نہیں ہانپی ہوئی تھی۔ اُس نے جب شکریہ ادا کیا تو عمر یزدانی نے اس

کا لب ولہجہ سن کر پوچھا۔"ایلک خانی ؟"

"ہاں .... اور آپ ؟"

"غزنی"۔ عمر یزدانی نے کہا۔"میں غزنی کی فوج میں کماندار ہوں۔ ایک ہرن کے پیچھے بہت دور نکل آیا تھا۔ آپ کا گھوڑا اور اس کے تعاقب میں بھیڑیے دیکھے ....."

"کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ اپنی سرحد سے کتنا باہر آ گئے ہیں ؟"۔ لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔"آپ ہماری سرحد میں ہیں اور ہم ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔"

"ایلک خان مر گیا ہے"۔ عمر یزدانی نے کہا۔"زندہ تھا تو بھی مرا ہوا تھا۔ ہم اُس کی جان کبھی کی نکال چکے تھے۔ آپ کون ہیں ؟"

"میرا تعلق ایلک خان کے خاندان سے ہے"۔ لڑکی نے کہا۔"میرا نام عنبرین ہے۔"

"تو آپ شہزادی ہیں"۔ عمر یزدانی نے کہا۔"پھر آپ نے ٹھیک کہا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ اچھا نہیں لگتا کہ میں ایک عورت کے ساتھ طنزیہ یا دھمکی آمیز باتیں کروں .... شہزادی عنبرین ! آپ ابھی اُس عمر کو نہیں پہنچیں جس میں انسان اچھے اور برے، دوست اور دشمن کو پہچان سکتا ہے۔ میں آپ کو ایک نصیحت کرنا چاہتا ہوں۔ اپنے دل سے سلطان محمود کی دشمنی نکال دیں اور اپنے بچوں کو بھی یہی بتائیں کہ ایک مذہب کے دو انسان آپس میں دشمن نہیں ہو سکتے۔"

"مجھے اپنا دشمن نہ سمجھیں"۔ عنبرین نے کہا۔"مجھے آپ کی نصیحت کی ضرورت نہیں۔ میرا خاندان مجھے پاگل کہا کرتا ہے کیونکہ میں غزنی کی نفرت کی نہیں محبّت کی باتیں کیا کرتی ہوں۔ آج خدا نے شاید اسی کا انعام دیا ہے کہ مجھے بھیڑیوں سے بچانے کے لیے ہمارے ایک دشمن کو ہماری سرحد کے اندر بھیج دیا ہے .... اوہ، میرے خدا ! اگر آپ نہ آتے تو یہ بھیڑیئے مجھے چیر پھاڑ کر کھا جاتے۔"

"میرے لیے کیا حکم ہے؟" — عمر یزدانی نے پوچھا — "میں آپ کا دشمن ہوں اور آپ کی سرحد کے اندر آگیا ہوں۔ کیا میں آپ کا قیدی ہوں؟"

"نہیں .... آپ مہمان ہیں" — عنبرین نے کہا — "اگر آپ جلدی میں ہیں تو آپ جا سکتے ہیں۔ مجھے جلدی ہے۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔ وہ مجھے ڈھونڈ نہ رہے ہوں۔"

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ آنکھوں سے آنکھیں اور مسکراہٹ سے مسکراہٹ ٹکرائی۔ عمر یزدانی نے سرگوشی کی "خدا حافظ شہزادی!" — اور اُس نے گھوڑا موڑا۔ گھوڑا چلا ہی تھا کہ اُسے عنبرین کی آواز سنائی دی۔

"ٹھہریئے۔ کل پھر آسکیں گے؟" — عنبرین نے کہا — "میں یہیں آجاؤں گی۔"

"مجھے گرفتار کرنے کتنے آدمی آئیں گے؟" — عمر یزدانی نے پوچھا۔

عنبرین کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ اُس کا چہرہ بجھ گیا۔

"آپ مجھ پر ایسا شک کر سکتے ہیں" — عنبرین نے بڑے ہی اداس لہجے میں کہا — "میں آپ کو یقین نہیں دلا سکتی کہ میں آپ کو دھوکہ نہیں دوں گی۔ آپ کہیں تو میں آپ کی چوکی تک آجاؤں گی۔"

"میں آؤں گا۔"

وہ چلا گیا تو عنبرین اُسے وہیں کھڑی دیکھتی رہی۔

(یزدانی نے خطرہ مول لیا اور اگلے روز وہیں چلا گیا جہاں اسے عنبرین ملی تھی۔ اس ملاقات میں ان میں بے تکلفی پیدا ہو گئی۔ پھر اُن کی ملاقاتیں ہر روز ہونے لگیں۔ پانچ چھ روز بعد کی ایک ملاقات میں عنبرین کچھ گھبرائی گھبرائی سی تھی۔

"مجھے تمہاری محبت لے آئی ہے مگر اب ہم خطرے میں ہیں" — عنبرین نے کہا — "اپنی ایک ملازمہ نے کل مجھے بتایا ہے کہ میرے ہر روز جنگل میں نکل جانے پر شک کیا جانے لگا ہے اور ہو سکتا ہے میرا تعاقب کیا جائے۔ مجھے اپنی پرواہ نہیں۔ میں مرنے کے لیے تیار ہوں۔ مجھے تمہارا فکر ہے۔ ذرا ہوشیار رہنا۔

اگر وہ آ گئے تو میں واپس نہیں جاؤں گی۔ اگر نکل بھاگنے کا موقع مل گیا تو تمہارے ساتھ ہی جاؤں گی۔ کیا تم ساتھ لے چلنے کے لیے تیار ہو؟"

"تو کیا میں تمہارے ساتھ مذاق کر رہا ہوں جو ہر روز سرحد پھلانگ کر اتنی دور خطرے میں آجاتا ہوں؟"— عمریزدانی نے کہا۔

انہیں کچھ اور کہنے اور سوچنے کا موقع نہ ملا۔ انہیں گھوڑوں کے ٹاپ سنائی دیئے۔

"وہ آگئے ہیں"— عنبرین نے کہا۔

"دیکھو"— عمریزدانی نے کہا— "وہ آرہے ہیں"۔

تین گھوڑسوار کچھ دور سے نظر آگئے تھے۔ عمریزدانی اور عنبرین اپنے اپنے گھوڑوں پر تیزی سے سوار ہوئے۔ اُن تین گھوڑسواروں نے ایڑیں لگا دیں۔ عمریزدانی اور عنبرین نے گھوڑے دوڑا دیئے۔ پیچھے سے تین تیر اکٹھے آئے جن میں سے دو عنبرین کے گھوڑے کی پیٹھ میں اُتر گئے۔ گھوڑا بڑی زور سے ہنہنایا۔ عمریزدانی نے دیکھ لیا۔ اُس نے اپنا گھوڑا عنبرین کے گھوڑے کے پہلو میں کر لیا اور ایک بازو عنبرین کی کمر کے گرد لپیٹ کر کہا کہ وہ اُس کے گھوڑے پر آجائے۔ گھوڑوں کی رفتار بہت تیز تھی۔ عنبرین عمریزدانی کے سہارے اس کے گھوڑے پر اس کے آگے آگئی۔ ان کے قریب سے تین تیر گذر گئے۔

عمریزدانی نے گھوڑے کو دائیں بائیں کرنا شروع کر دیا تاکہ تیر انداز اُسے نشانے میں نہ لے سکیں۔ آگے چٹانیں آگئیں۔ عمریزدانی نے گھوڑا ان میں داخل کر دیا اور وہ محفوظ فاصلے پر پہنچ گیا۔ پھر سرحد آگئی اور وہ اپنے علاقے میں داخل ہو گیا۔ تعاقب میں آنے والے جانے کہاں سے واپس چلے گئے تھے۔

یہ ایک سال پہلے کا واقعہ تھا۔ اب سلطان محمود ہندوستان کو جا رہا تھا۔ اب اُس نے اپنے سالاروں اور کمانداروں کو اجازت دے دی تھی کہ وہ

اپنی بیویوں کو ساتھ لے جانا چاہیں تو لے جا سکتے ہیں۔ یہ اجازت اُس نے اس لیے دی تھی کہ اب وہ ہندوستان کے کسی علاقے میں اپنی باقاعدہ حکومت قائم کرنا چاہتا تھا اور وہاں فوج بھی رکھنی تھی۔ اُس کے پیشِ نظر لاہور تھا لیکن اس سے پہلے اُسے مہاراجوں کے سر کچلنے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ خطرناک لاہور کا مہاراجہ ترلوچن پال تھا۔ اُسے اطلاع مل چکی تھی کہ ترلوچن پال اپنی فوج قنوج اور متھرا کے درمیان کہیں لے گیا ہے اور وہی دوسرے مہاراجوں کو متحد کرتا پھر رہا ہے۔

سلطان محمود کی اجازت پر چند ایک سالار وغیرہ اپنی بیویاں ساتھ لے جا رہے تھے۔ عنبرین عمر یزدانی کی بیوی بن چکی تھی۔ عمر یزدانی اُسے ساتھ نہیں لے جانا چاہتا تھا لیکن عنبرین کی ضد اتنی شدید تھی کہ عمر یزدانی کو اسے ساتھ لے جانا پڑا۔ اس ضد میں محبّت کا عمل دخل اتنا نہیں تھا جتنا جذبے کا تھا۔ عنبرین نے عمر یزدانی سے کہا تھا کہ مجھے خدا سے شکوہ ہے کہ مجھے عورت بنا کر پیدا کیا۔ میری روح کفر کے خلاف میدانِ جنگ میں بھٹکتی رہتی ہے۔

"کافر سے زیادہ خطرناک، ایمان فروش ہوتا ہے"۔ عمر یزدانی نے اسے کہا تھا۔ "کافر کو سب جانتے ہیں کہ کافر ہے اور ہمارا دشمن لیکن ایمان فروش کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ بھائی بنا رہتا اور پیٹھ میں چھرا گھونپ کر بھی کہتا ہے کہ میں تمہارا بھائی ہوں.... تم ایمان فروشوں کے خاندان کی لڑکی ہو۔ میں حیران ہوں کہ تمہاری روح کفر کے خلاف کیوں بھڑکی رہتی ہے؟"

"میری ماں کا ایمان فروشوں کے خاندان سے کوئی تعلّق نہیں تھا"۔ عنبرین نے کہا۔ "میرا باپ ایک خانی تھا۔ اُس نے میری ماں کو کہیں سے زبردستی اغوا کیا تھا۔ میں پیدا ہوئی اور جب سے میرا شعور بیدار ہوا ہے ماں مجھے بتا رہی ہے کہ یہ ایلک خانی مسلمان ہو کر اسلام کے لیے سب سے بڑا خطرہ بنے ہوئے ہیں۔ ماں مجھے بچپن سے سلطان محمود کی باتیں سنا رہی ہے۔ میں تصوّر میں اس عظیم سلطان کو دیکھتی رہی ہوں۔ میں ماں باپ کی اکیلی اولاد ہوں۔

ماں کہا کرتی ہے کہ خدا اُسے صرف ایک بیٹا دے دے تو وہ اُس کے ہاتھوں قوم کے ان غدّاروں کو ختم کرائے۔ اُسے خدا نے بیٹا نہ دیا۔ اب یہ میرا فرض ہے کہ ان غدّاروں اور ایمان فروشوں کو ختم نہ کر سکوں تو حق پرستوں کا تو ساتھ دوں.... میں تمہارے ساتھ بیوی کی حیثیت سے نہیں، مجاہدہ کی حیثیت سے جارہی ہوں۔ تم ساتھ نہیں لے چلو گے تو تم جانتے ہو کہ میں گھوڑ سوار ہوں، تیر انداز بھی ہوں، فوج کے پیچھے پیچھے آجاؤں گی۔ مجھے کچھ کرنا ہے عمر! مجھے کچھ کرنے دو۔ عورت تمہارا ایک بازو ہے۔ اسے توڑ کر گھر میں نہ پھینکو"

وہ عمر کے ساتھ جارہی تھی۔ یہ فوجی قافلہ کئی میل لمبا تھا۔ رسد کی گھوڑا گاڑیاں سینکڑوں تھیں۔ پالکیاں بھی ساتھ تھیں جن میں عورتیں تھیں۔ پالکیاں ایک دوسری سے بہت دور دور تھیں۔

*

اور اس فوج کے ساتھ اسی فوج کے دشمن بھی جارہے تھے۔ یہ پچاس ساٹھ سلجوقی تھے جو بہت عرصے سے غزنی کی فوج میں تھے اور ان کی وفاداری پر کسی کو شک نہیں تھا مگر تھوڑے ہی عرصے سے ان کی وفاداری درپردہ مشکوک ہوگئی تھی۔ کسی کو ان کی بدلی ہوئی نیّت کا علم نہ ہو سکا۔ ان میں ایک کمانڈر رجب بائیجان تھا جس نے ڈیڑھ ایک سال پہلے شادی کی تھی۔ ایک اور سلجوقی کی بھی شادی ہوئی تھی۔ ان دونوں کی شادیوں کے بعد غزنی کی فوج کے سلجوقیوں میں یہ تبدیلی آئی تھی کہ وہ اکٹھے رہنے لگے تھے۔

کسی کو معلوم نہیں تھا کہ ان دونوں کو یہ بیویاں انعام کے طور پر ملی تھیں۔ دونوں چند دنوں کی رخصت پر گئے تھے۔ وہاں ایک سفید ریش آدمی تھا اور کچھ اور سرکردہ لوگ بھی تھے۔ سفید ریش نے ایسے الفاظ اور ایسے انداز سے ان دونوں کے ساتھ باتیں کی تھیں کہ دونوں کے خون اُبل پڑے پھر ان کے آنسو نکل آئے تھے۔ انہوں نے کہا تھا کہ وہ غزنی کی فوج میں واپس نہیں جائیں گے۔

"یہ بزدلی ہے" — سفید ریش نے کہا تھا — "تمہیں انتقام لینا ہے۔ سلجوقیوں

کی ذلت کا انتقام تمہیں لینا ہے۔ اچھا ہے کہ تم غزنی کی فوج میں ہو۔"

"ہم سلطان محمود کو قتل کر دیں گے۔" رجب بائیجان نے کہا۔

"اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا"۔ وہاں بیٹھے ہوئے ایک اور آدمی نے کہا ۔"وہ ہم تمہیں بتائیں گے کہ تمہیں کیا کرنا ہے .... پہلا کام یہ ہے کہ غزنی کی فوج میں جتنے سلجوقی ہیں انہیں درپردہ اپنے ساتھ ملا لو۔ ان پر جب تمہیں اعتماد پیدا ہو جائے تو انہیں بتانا کہ کیا کرنا ہے۔ تم کماندار ہو۔ جنگی امور کو سمجھتے ہو۔ سلطان محمود کو ہندوستان میں میدانِ جنگ میں دھوکہ دینا ہے۔ وہ خواہ زندہ رہے، اس کی فوج کو تباہ کرنا ہے۔ وہ کسی نہ کسی وقت ہندوستان پر فوج کشی کرے گا۔ تم ساتھ ہو گے۔ تم دشمن کے ساتھ مل کر اس کی فوج کے پہلو پر یا عقب سے حملہ کرا سکتے ہو۔"

"لیکن وہاں دشمن کے ساتھ رابطہ کیسے ہوگا"۔ رجب بائیجان نے کہا۔"ہم وہاں کی زبان نہیں جانتے۔"

"تمہارے پاس ذریعہ موجود ہے"۔ سفید ریش نے کہا۔"اور یہ ذریعہ غزنی میں جگہ جگہ موجود ہے۔ یہ وہ ہندو ہیں جنہیں غزنی کی فوج ہر حملے کے بعد جنگی قیدیوں کی حیثیت سے ساتھ لاتی رہی ہے۔ محمود نے ان میں سے وفادار منتخب کر کے ان کے دو دستے تیار کر لیے ہیں۔ باقی ہزاروں قیدی سرکاری ملازم ہیں اور ان میں سے زیادہ تعداد لوگوں نے خرید لی تھی۔ وہ اب ان کے ذاتی ملازم ہیں۔ ہم تمہیں ایسے چار پانچ ہندو دیں گے جو مسلمانوں کے بہروپ میں تمہارے ملازم ہوں گے یا گارڈی بان بن کر ساتھ جائیں گے۔ وہ ہندوستان میں تمہارے راہنما ہوں گے۔ دشمن سے تمہارے رابطے کا ذریعہ بنیں گے۔ ہم انہیں اتنی دولت دیں گے جو انہوں نے کبھی خواب میں نہیں دیکھی۔ انہیں سب سے بڑا انعام یہ ملے گا کہ انہیں آزادی مل جائے گی اور وہ ہندوستان میں رہ جائیں گے۔ میدانِ جنگ میں ایسے حالات تم پیدا کرو گے کہ غزنی کی فوج کے پورے پورے دستے دشمن کی زد میں آجائیں۔"

"تم سلطان محمود کی جنگی چالوں کو اچھی طرح سمجھتے ہو"۔ ایک اور آدمی نے کہا ——"وہ وسیع پیمانے پر گھات لگاتا ہے اور وہ تھوڑی سی نفری سے سامنے سے حملہ کرتا اور زیادہ تر نفری کو دائیں بائیں تقسیم کر کے پہلوؤں سے اور عقب سے حملہ کراتا ہے۔ وہ دشمن کو آگے گھسیٹ لاتا ہے۔ اس کے چھاپہ مار دشمن کو رات کو بھی چین نہیں لینے دیتے۔ تم دھیان رکھنا۔ اُس کی چال سے تم دشمن کو قبل از وقت خبردار کر دو۔ محمود کہیں گھات لگائے تو دشمن کو بتا دو۔ تم جانتے ہو کہ سالار جو ساتھ جائے گا وہ کتنا تجربہ کار اور گھاگھ ہے۔ ابو عبداللہ محمد الطائی سلطان محمود کا دایاں بازو ہے۔ اس سالار نے تاریخ میں اپنا نام لکھ دیا ہے۔ آنے والی نسلیں جہاں سلطان محمود کو یاد کیا کریں گی، وہاں وہ ابو عبداللہ محمد الطائی کا نام بھی لیا کریں گی۔ میدانِ جنگ میں اگر موقع دیکھو تو اُسے قتل کر دو۔ دور سے تیر چلا سکتے ہو لیکن پکڑے نہ جانا۔ پکڑے جانے کی صورت میں ہمارا سارا منصوبہ خاک میں مل جائے گا۔"

"اسی لیے ہم سلطان محمود کے قتل کی بات نہیں کرتے"۔ سفید ریش نے کہا ——"اُسے ہم غزنی سے ہزاروں میل دور ہندوستان کے وسط میں ہندوؤں کے ہاتھوں شکست دلانا چاہتے ہیں اور اس کی ایسی حالت کرانا چاہتے ہیں کہ غزنی کی فوج تباہ اور قید ہو جائے اور محمود پاگلوں کی سی حالت میں ہندوؤں کا قیدی ہو جائے"—— سفید ریش نے جوشِ جذبات سے کہا——"پھر بادشاہی سلجوق کی ہو گی۔ سلجوق ایک طاقت کا نام ہے۔ سلجوقی اسلام کی طاقت بنیں گے پھر سلطنتِ سلجوق وسیع ہوتی جائے گی۔"

"اور تم اُس کی فوج کے نائب سالار اور سالار ہو گے"۔ ایک اور آدمی نے کہا——"ہم تم دونوں کو وہ بیویاں دے رہے ہیں جو صرف بادشاہوں کے ہاں نظر آتی ہیں اور ایک خزانہ تمہارے لیے وقف کر دیا ہے۔"

ایک تو انہیں جذبات سے مغلوب کیا گیا، دوسرے انہیں جو حسین لڑکیاں دی گئیں، ان کے حسن نے ان کی عقل پر قبضہ کر لیا اور جو خزانہ ان کے

آگے رکھا گیا، اس نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ اس کے ساتھ آزاد سلطنت سلجوق کی سالاری کا وعدہ ایسا انعام تھا جو ان دونوں سلجوقیوں کے تصوروں کے احاطے سے باہر تھا۔ دونوں لڑکیوں کو الگ تربیت دی گئی تھی۔ انہیں ان دونوں کی لگامیں اپنے ہاتھ میں رکھنی تھیں اور انہیں ہندوستان جا کر غزنی کی فوج کے اہم کمانداروں اور نائب سالاروں کو اپنے جال میں پھانسنا اور دھوکے سے مروانا تھا۔

تھوڑے سے عرصے میں رجب بانجیبان اور اس کے ساتھ فرید سمرقند نے غزنی کی فوج کے سلجوقیوں کو سلطان محمود کے خلاف بھڑکا لیا۔ انہیں کچھ نقد دیا، کچھ سبز باغ دکھائے اور ان دونوں سلجوقی کمانداروں کی بیویوں نے انہیں اپنی جھلک دکھائی اور اکیلے اکیلے سلجوقی کو اپنے گھر بلا کر سلجوقیوں کی مظلومیت اور ان کو غزنی کی فوج کا ظلم و تشدد ایسے انداز سے سنایا کہ بیتھر بھی جیسے اشکبار ہو گئے تھے۔ اگر کوئی عورت کسی مرد کو بھڑکائے تو وہ سمجھتا ہے کہ ایک عورت نے اس کی مردانگی کو للکارا ہے۔ وہ فوراً بھڑک اٹھتا ہے۔ بھڑکانے والی دو بڑی خوبصورت لڑکیاں تھیں۔ انہوں نے اپنا جادو چلا لیا۔

*

اب ۱۰۲۰-۲۱ء کے موسم سرما کے آغاز میں جب سلطان محمود ہندوستان کی طرف آ رہا تھا تو اس کی آستین میں بہت سے سانپ بھی ساتھ آ رہے تھے۔ آٹھ دس ہندو بھی گاڑی بانوں اور سائیسوں کے بہروپ میں ساتھ تھے۔ وہ گنگا اور جمنا کے درمیانی علاقے کے رہنے والے تھے۔ انہیں اچھی طرح سمجھا دیا گیا تھا کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ غزنی کی فوج جب ہندوستان میں داخل ہوئی تو ان ہندوؤں کے جسموں میں یوں جان آگئی جیسے پانی سے نکالی ہوئی مچھلی کو پانی میں پھینک دیا جائے۔ ان کے دماغ اور تیز ہو گئے۔

ہندوستان میں حالات تیزی سے سلطان کے خلاف ہو رہے تھے۔ باری میں مہاراجہ قنوج راجیپال ایک لڑکی کے ہاتھوں قتل ہو گیا تھا جو ہندوستان

کے تین مہاراجوں کی سازش کا نتیجہ تھا۔ راجیاپال کا بیٹا لچھمن پال بھی باری میں تھا۔ باری قنوج سے دُور ایک قصبہ تھا جہاں راجیاپال نے قنوج کے غزنوی قلعہ دار سالار ابوالقدر سلجوقی کی منظوری سے اپنی نئی راجدھانی آباد کر لی تھی اور اُس نے کچھ فوج بھی رکھ لی تھی، لیکن اس فوج پر غزنی کی فوج کے افسروں کی نگرانی تھی۔ مہاراجہ راجیاپال کا بیٹا لچھمن پال پیچ و تاب کھاتا رہتا تھا مگر بے بس تھا۔

راجیاپال ایک سازش کے تحت قتل ہو گیا تو وہاں غزنی کی فوج کے جو افسر تھے، انہوں نے پکڑ دھکڑ شروع کر دی مگر یہی کارروائی بغاوت کا باعث بن گئی۔ غزنی کی فوج کی تو وہاں کوئی نفری نہیں تھی۔ چند ایک کماندار اور عہدیدار تھے۔ لچھمن پال نے درپردہ اپنی مختصر سی فوج کو تیار کر لیا اور اگلی رات اس فوج نے غزنی کے ان افسروں کو پکڑ لیا۔ ان میں سے صرف ایک کسی طرح بچ گیا۔ وہ قنوج کی طرف دوڑا۔ فوج کی کچھ نفری وہاں موجود تھی مگر وہ راستے میں پکڑا گیا۔ تب پتہ چلا کہ قنوج اور باری کے راستے میں ایک فوج موجود ہے جس نے قنوج اور باری کا رشتہ توڑ رکھا ہے۔

یہ ایک متحدہ فوج تھی جس میں تین ریاستوں کی فوج شامل تھی۔ ایک کالنجر کے مہاراجہ گنڈہ کی، دوسری گوالیار کے مہاراجہ ارجن کی اور تیسری لاہور کے مہاراجہ ترلوچن پال کی۔ ترلوچن پال نے اپنی فوج کہیں دُور رکھی ہوئی تھی۔ اس متحدہ فوج میں قنوج کی شکست خوردہ فوج کے بھگوڑے بھی شامل ہو گئے تھے اور اس میں باری کی فوج کی نفری بھی شامل تھی۔

اس کے علاوہ ایک فوج اور تھی جس کا ذکر تاریخ میں ملتا ہے لیکن اس کی تعداد کسی نے نہیں لکھی۔ یہ ہندوستان کے شہریوں کی فوج تھی یعنی رضاکار فوج۔ جس قوم کے دیوتاؤں کے بت توڑے گئے اور مُورتیاں پھاڑ کر باہر پھینکی گئی تھیں اور جن کا کعبہ جیسا مقدس مقام متھرا مسلمانوں نے بتوں سمیت تباہ کر دیا تھا، وہ قوم چین سے نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ اس قوم کا بچہ بچہ بچھو کی طرح ڈنک مارنے

کو تیار تھا۔ ہندو عورتوں نے اپنے زیورات مندروں کے حوالے کر دیئے تھے۔ پنڈتوں نے دہشت پھیلا رکھی تھی کہ دیوتاؤں کا قہر پوری ہندو قوم کو بھسم کر دے گا۔ ہندو یہ نہیں دیکھتے تھے کہ اُن کے پنڈت اُس روز سے انہیں ڈرا رہے تھے جس روز محمود غزنوی نے ہندوستان کے پہلے مندر کے بُت توڑے اور ہندوؤں سے کہا تھا کہ یہ ہے تمہارا دیوتا۔ اسے کہو کہ اپنے ٹکڑے جوڑ کر مجھے اپنی توہین کی سزا دے۔

سلطان محمود نے ہندوستان میں پہلا بُت بیس سال پہلے ۱۰۰۱ء میں توڑا تھا، پھر اُس نے تھانیسر اور متھرا تک کے بُت توڑ کر باہر پھینکے اور ان کے ٹکڑوں پر اپنی فوج گزاری تھی۔ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق مہابھارت کی سلامتی انہی بُتوں کی بدولت تھی۔ یہ نہ ہوئے تو ایک بھی ہندو زندہ نہیں رہے گا لیکن بیس برسوں میں کسی بھی ٹوٹے ہوئے دیوتا نے اور ہری کرشن نے اور ہر ہر مہادیو نے اور چار ہاتھوں والی دیوی نے کسی رَدِّعمل اور غصّے کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن توہم پرست قوم کو فریب کار پنڈتوں نے ایسی زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا کہ تیز ہوا چلتی تھی تو وہ ہاتھ جوڑ کر بھجن گانے لگتے تھے کہ آیا دیوتاؤں کا قہر۔ نقدی اور زیورات کی قربانی کو تو وہ معمولی سمجھتے تھے۔ وہ اپنی کنواری بیٹیوں کو پنڈتوں کے حوالے کر دیا کرتے تھے۔ اُن کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف جو کدورت، نفرت اور انتقام کی آگ بھری گئی تھی، وہ آج بھی اُسی شدّت سے موجود ہے جیسی ایک صدی پہلے تھی۔

اب سلطان محمود غزنوی کی ایک اور پیشقدمی کی خبر پھیلی تو ہندوؤں نے اپنا تن، من، دھن قربان کر دیا۔ جوان آدمی جو گھوڑ سواری، نیزہ بازی، تیغ زنی اور تیر اندازی کی سوجھ بوجھ رکھتے تھے، فوجوں میں چلے گئے۔ جوان لڑکیاں بھی لڑنے کو تیار ہو گئیں۔ مندروں کے سنکھ چیخنے لگے اور گھنٹیاں واویلا پا کرنے لگیں۔ غزنی کی فوج ہندوؤں کے لیے دہشت بنی ہوئی تھی لیکن اُس دَور کے ہندو ایسے گئے گزرے نہیں تھے۔ اُن پر مذہب کا جنون طاری تھا۔ ہندو

راجپوت مرنے کے لیے لڑتے تھے۔ دلیری سے لڑتے تھے۔ جان کی قربانی کو وہ کوئی غیر معمولی قربانی نہیں سمجھتے تھے۔

یہ ایک الگ فوج تھی جو چٹانوں کی طرح غزنی والوں کے راستے میں کھڑی ہوگئی تھی۔ باقاعدہ فوج جو مہاراجوں نے اکٹھی کرلی تھی، اس کی تعداد ایک لاکھ پینتالیس ہزار پیادہ، چھتیس ہزار گھوڑ سوار اور چھ سو چالیس جنگی ہاتھیوں پر مشتمل تھی۔ (فرخی نے ہاتھیوں کی تعداد نو سو لکھی ہے)۔

سلطان محمود کو پشاور سے آگے نکلتے ہی اطلاعیں ملنی شروع ہوگئی تھیں کہ دشمن کی فوج کتنی ہے اور کہاں کہاں ہے۔ وہ دریائے چناب عبور کر رہا تھا جب اُسے یہ اطلاع ملی کہ باری میں لچھمن پال کی فوج نے غزنی کے چند ایک کمانداروں اور عہدیداروں کو قید کرلیا ہے اور خطرہ ہے کہ قنوج کے قلعے کا محاصرہ ہو جائے گا۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک اور جاسوس آیا جس نے سلطان کو بتایا کہ قنوج کے محاصرے کا کوئی امکان نہیں کیونکہ مہاراجہ گنڈہ اور مہاراجہ ارجن اپنی جنگی قوت کی افراط سے کھلے میدان میں لڑنے کو تیار ہیں۔

اس جاسوس نے سلطان کے ساتھ غزنی کی فوج کا جائزہ لیا تو اُس نے کہا کہ ہندوؤں کی افواج کے مقابلے میں یہ فوج تھوڑی ہے۔

"لاہور کی فوج کہاں ہے؟" — سلطان محمود نے پوچھا۔

"جمنا کے کنارے کسی جنگل میں ہے" — جاسوس نے جواب دیا — "اُس کی صحیح خیمہ گاہ کا پتہ نہیں چلایا جا سکا۔ کوشش جاری ہے۔ خطرہ اسی کا زیادہ ہے"۔

"ہاں" — سلطان نے کہا — "مَیں اسی خطرے سے چوکنا رہنا چاہتا ہوں"۔

***

اُس دَور کے کسی وقائع نگار کا حوالہ دیتے ہوئے انگریز تاریخ نویس سمتھ لکھتا ہے — "محمود غزنوی نے پانچ دریا اور وہ عبور کیے اور باری کے مضافات میں پہنچ گیا"۔

سلطان محمود کی پیش قدمی صحیح معنوں میں برق رفتار ہوا کرتی تھی۔ اب کے تو وہ اور زیادہ تیزی سے باری پہنچا کیونکہ باری میں اُس کے کمانڈار اور عہدیدار ہندوؤں کی قید میں تھے اور وہاں دشمن کی فوج جمع ہو رہی تھی۔ اُس کے ساتھ ہندو گائیڈ تھے۔ اُس نے آرام کیے بغیر باری پر ہلہ بول دیا اور فوج کو حکم دیا کہ اس شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے۔ باری میں فوج کوئی ایسی زیادہ نہیں تھی۔ اس نے جلدی ہی ہتھیار ڈال دیئے۔ سلطان محمود باری کو شاید تباہ نہ کرتا لیکن اُسے اطلاع ملی کہ ہندوؤں نے غزنی کے قید کیے ہوئے افسروں کو قتل کر دیا ہے۔ سلطان نے حکم دیا کہ اس شہر کو صاف کر دو۔ چنانچہ باری کو اس طرح تباہ کیا گیا کہ کوئی مکان کھڑا نہ رہنے دیا گیا۔ مندر کا ملبہ بھی اُٹھا کر دریا میں پھینک دیا گیا۔

اصل مقابلہ تو مہاراجہ گنڈہ اور مہاراجہ ارجن کے ساتھ تھا۔ سلطان کو ان دونوں مہاراجوں کی افواج کی پوزیشنوں کی اطلاعیں مل رہی تھیں اور وہ سوچ رہا تھا کہ وہ کون سی چال چلے کہ دونو فوجوں کو الگ الگ کر دے یا دونو کا مقابلہ کرے۔

"لیکن سلطانِ محترم!"۔۔۔ اُس کے دستِ راست سالار ابوعبداللہ محمد الطائی نے اُسے کہا۔۔۔ "ابھی تک پتہ نہیں چلا کہ لاہور کی فوج کہاں ہے۔ خطرہ تو اُس سے ہے۔ ہم جب حملہ کریں گے تو لاہور کی فوج ہم پر عقب سے یا پہلوؤں سے آجائے گی"۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ غزنی کی فوج میں شور سا بپا ہو گیا۔ سلطان محمود خیمے سے نکلا اور قاصد کو دوڑایا کہ جا کے معلوم کرے یہ شور کیسا ہے۔ قاصد نے واپس آکر جو اطلاع دی اُس نے سلطان کو پریشان کر دیا۔ اطلاع یہ تھی کہ چار کمانڈار اور چار سپاہی مشکیزوں میں ہوا بھر کر دریا میں اُتر گئے اور دریا پار کر گئے ہیں۔ سلطان اور سالار کو پریشانی یہ تھی کہ یہ آٹھ آدمی بھگوڑے ہو گئے ہیں اور وہ دشمن سے جا ملیں گے۔ ان کا تعاقب آسان نہیں تھا پھر بھی

چند ایک آدمیوں سے کہا گیا کہ وہ مشکیزوں پر دریا کے پار جائیں اور انہیں پکڑنے کی کوشش کریں اور اگر کوئی زیادہ گڑبڑ ہو تو وہیں سے آواز دیں تاکہ اُن کی مدد کو مزید آدمی بھیجے جائیں۔

ایک تو رات کا وقت تھا، دوسرے سردی کا موسم تھا۔ یخ پانی میں تیرنا بہت ہی مشکل تھا لیکن بارہ چودہ رضاکار مشکیزوں پر دریا میں اُتر گئے۔ صرف ایک سہولت تھی۔ موسم سرما کی وجہ سے دریا میں پانی کم تھا اور اس میں برسات کے موسم والا زور نہیں تھا۔ جب یہ کماندار اور سپاہی رضاکارانہ طور پر دریا میں اُترے تو دریا پار سے شور سنائی دینے لگا اور اُس طرف آسمان لال ہونے لگا جیسے کہیں آگ لگی ہو۔

"وہ کماندار کون کون تھے جو پہلے دریا کے پار گئے ہیں؟" سالار محمد الطائی نے پوچھا۔

اُسے نام بتائے گئے۔

"سلطان!" سالار نے سلطان محمود سے کہا۔ "یہ چاروں بھگوڑے نہیں ہو سکتے۔ معاملہ کچھ اور ہے۔ ان چاروں کو میں ذاتی طور پر جانتا ہوں۔ یہ چاروں خطرناک حد تک جوشیلے ہیں۔ انہوں نے دشمن کی کسی خیمہ گاہ پر شبخون مارا ہے۔ مجھے اجازت دیں کہ دو دستے لے کر پار چلا جاؤں"۔

"لیکن کچھ پتہ تو چلے کہ وہاں کون ہے، کیا ہے" سلطان محمود نے کہا۔ "تم دستے تیار کر لو"۔

دریا پار کا شور بڑھتا جا رہا تھا۔ اندازے کے مطابق وہ جگہ کم و بیش تین میل دور تھی۔ رات کی خاموشی میں آوازیں بہت دبی دبی سی تھیں۔

خاصا وقت گزر جانے کے بعد ایک گھوڑ سوار دریا سے نکلا۔ اُس نے گھوڑے کی پیٹھ پر دریا پار کیا تھا۔ اندھیرے میں وہ چلّاتا آ رہا تھا۔ "سلطان کہاں ہیں؟ سالار کہاں ہیں؟ .... تیار ہو جاؤ۔ حملے کے لیے.... سلطان کہاں ہوں گے؟"

اُس کی پکار اور للکار میں ہیجان تھا۔ اُسے روک لیا گیا۔ سلطان اور سالار وہیں تھے۔ سوار اُن کے سامنے آیا تو معلوم ہُوا کہ وہ اُن آٹھ آدمیوں میں سے تھا جو کسی کو بتائے بغیر دریا میں اُتر گئے تھے۔ وہ کمانداری کے عہدے کا آدمی تھا۔ اُس نے جو بات بتائی اُسے سلطان محمود تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا۔ ہُوا یوں تھا کہ ان چار کمانداروں کو ایک جاسوس سے پتہ چلا کہ لاہور کی فوج دریا کے پار، کنارے سے اڑھائی تین میل کے فاصلے پر خیمہ زن ہے اور گہری نیند سوئی ہوئی ہے۔ اس کماندار نے اپنے تین ساتھی کمانداروں کو ساتھ لیا۔ چار سپاہی بھی ساتھ ہو گئے اور وہ جوش میں آکر دریا پار کر گئے۔ انہوں نے جاسوس کو راہنمائی کے لیے ساتھ لے لیا تھا۔ انہوں نے دشمن کے کیمپ پر جا چھاپہ مارا۔

"کچھ نہ سوچیں سلطانِ عالی مقام!" — اُس نے کہا — "فوراً دریا پار کریں۔ دشمن آپ کے قدموں میں پڑا ہے۔"

سلطان محمود نے سالار محمد الطائی کو اجازت دے دی کہ وہ حملہ کرے۔ کماندار نے انہیں بتایا کہ دشمن کی نفری اور کیفیت کیا ہے اور کتنی نفری سے حملہ کیا جائے۔ فوراً تین چار گھوڑ سوار دستے تیار کر کے دریا پار کیا گیا۔ کماندار راہنمائی کر رہا تھا۔ دریا پار کر کے یہ دستے آگے گئے۔ دشمن کی خیمہ گاہ سے شعلے اُٹھ رہے تھے وہاں قیامت کی افراتفری مچی ہوئی تھی۔ گھوڑے شعلوں سے ڈر کر بے قابو ہو رہے تھے۔

اس کیفیت میں سالار ابو عبداللہ محمد الطائی نے سوار دستوں کو حملے کا حکم دے دیا۔ دشمن سوائے بھاگنے کے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا تعاقب کیا گیا لیکن ایک ایک آدمی کا تعاقب ممکن نہیں تھا۔ جو سامنے آیا وہ ہلاک ہُوا۔ کچھ لیٹ یا بیٹھ گئے۔ صبح تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ صبح کے اجالے میں خیمہ گاہ کا منظر بڑا ہی بھیانک نظر آیا۔ جگہ جگہ سے دھواں اُٹھ رہا تھا اور لاشیں ہی لاشیں تھیں اور زخمی بُری طرح کراہ رہے تھے۔ بہت سے ہندو سپاہی ہار کر بیٹھ گئے تھے۔

ان سے پتہ چلا کہ یہ لاہور کی فوج تھی اور مہاراجہ ترلوچن پال یہیں تھا سلطان محمود اسی سے پریشان تھا کہ وہ کہاں ہے۔ وہ شام کے وقت فوج کو کہیں سے لایا اور یہاں خیمہ زن ہوا تھا۔ یہ کسی کو بھی معلوم نہ تھا کہ اُس کا ارادہ اور منصوبہ کیا تھا سلطان محمود کی فوج کے اتنی قریب آنے سے یہی کہا جا سکتا تھا کہ سلطان محمود سامنے کی فوج سے لڑ رہا ہوتا تو ترلوچن پال پیچھے سے حملہ کر دیتا۔

اب ترلوچن پال وہاں نہیں تھا۔ اس کے اعلیٰ کمانڈر بھی بھاگ گئے تھے اور وہ اپنا بیشتر خزانہ پیچھے چھوڑ گیا تھا۔ اُس کی فوج ختم ہو چکی تھی اور یہ خطرہ ختم ہو گیا تھا کہ غزنی کی فوج پر عقب سے حملہ ہو گا۔

یہ واقعہ تقریباً تمام مؤرخوں نے لکھا ہے۔ فرشتہ نے ان آٹھ آدمیوں کے متعلق لکھا ہے کہ وہ سلطان کے باڈی گارڈ تھے لیکن مؤرخوں کی اکثریت نے انہیں باڈی گارڈ نہیں کہا۔ انہیں آٹھ جوشیلے کماندار اور سپاہی کہا ہے۔ انگریز مورخ وی۔ اے سمتھ نے لکھا ہے — "ترلوچن پال دریائے رام گنگا (جو چھوٹا دریا ہے) کے پار پیچھے ہٹ گیا۔ محمود کے آٹھ افسروں نے جوش اور عتاب کے زیر اثر مشکیزوں پر تیر کر دریا پار کیا اور ترلوچن پال کی فوج کو ایسا بکھیرا کہ وہ فوراً اکٹھی ہو کر لڑنے کے قابل نہ رہی۔"

بے شک یہ بے مثال بہادری تھی کہ صرف آٹھ آدمیوں نے کم و بیش بیس ہزار فوج کی خیمہ گاہ پر ایسا شبخون مارا کہ اُسے تباہ و برباد کر دیا مگر سلطان محمود نے انہیں خراجِ تحسین پیش کر کے انہیں سرزنش کی کہ انہوں نے یہ کارروائی کسی کے حکم کے بغیر کی۔ اِن چار کمانداروں نے جو بیان دیا وہ اُس دَور کے کاغذات میں فارسی کے بجھے بجھے الفاظ کی صورت میں محفوظ ہے۔

اُنہوں نے کہا کہ سلطان محمود بار بار لاہور کی فوج کے خطرے کا اظہار کرتا تھا۔ اس کے علاوہ ان میں اس حادثے نے قہر بھر دیا تھا کہ باری میں ہندوؤں نے غزنی کے چند ایک کمانداروں اور عہدیداروں کو قتل کر دیا ہے۔ انہیں ترلوچن پال

کی فریب کاری پر زیادہ غصہ تھا۔ وہ غزنی کا باجگزار ہوتے ہوئے دوسرے مہاراجوں کو غزنی کے خلاف متحد کر رہا تھا اور خود غزنی کی فوج پر عقب سے حملہ کرنے کے لیے اپنی فوج کو جنگل میں چھپائے ہوئے تھا۔

اُس رات یوں ہُوا کہ غزنی کے ایک جاسوس نے پتہ چلا لیا تھا تر لوچن پال کی فوج فلاں جگہ اُسی شام پہنچی ہے۔ قیاس یہی تھا کہ وہ عقب سے غزنی کی فوج پر حملہ کرے گی۔ جاسوس نے دریا تیر کر پار کیا۔ اتفاق سے ایک کماندار جو اس جاسوس کو جانتا تھا، کنارے پر کھڑا تھا۔ جاسوس نے اُسے بڑی خوشی سے بتایا کہ وہ یہ کارنامہ کر کے آیا ہے کہ اُس نے لاہور کی فوج کا پتہ چلا لیا ہے۔ یہ کماندار جل اُٹھا۔ اُس نے اپنے تین ساتھی کمانداروں سے بات کی۔ وہ تیار ہو گئے اور چار سپاہی بھی تیار ہو گئے۔ انہوں نے جاسوس سے کہا کہ وہ اُن کے ساتھ چلے۔ جاسوس کو سلطان محمود کے پاس جانا اور رپورٹ دینی تھی لیکن یہ جوشیلے کماندار اُسے اپنے ساتھ لے گئے۔

چاروں کماندار شب خون مارنے کی مہارت رکھتے تھے۔ وہ تر لوچن پال کی خیمہ گاہ تک پہنچ گئے۔ پہلے انہوں نے دو سنتریوں کو ہلاک کیا، پھر ایک خیمے کو آگ لگائی۔ اس کے شعلوں سے انہوں نے کپڑے جلائے اور کئی خیموں پر پھینک دیئے۔ ان میں سے دو نے سکیم کے مطابق بہت سے گھوڑے کھول دیئے اور چند ایک گھوڑوں کو خنجر مارے۔ یہ گھوڑے بدک کر بھاگے تو دوسرے گھوڑے بھی ڈر کر اِدھر اُدھر بھاگنے دوڑنے لگے۔

خیمہ گاہ گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ فوج ہڑبڑا کر اُٹھی۔ ظاہر ہے فوج کو یہ سمجھنے میں خاصا وقت لگا ہو گا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد خیمہ گاہ میں آگ ہی آگ تھی۔ زیادہ مدد تیز ہوا نے کی۔ خیمے سے خیمہ جلتا گیا۔ خیمے اس لیے قریب قریب لگائے گئے تھے کہ دائیں بائیں چٹانیں تھیں۔ آٹھوں جانباز چٹانوں پر چڑھ گئے۔ اس مقصد کے لیے وہ تیر کمانیں ساتھ لائے تھے۔ انہوں نے اُوپر سے اندھا دھند تیر برسانے شروع کر دیئے۔

ایک کماندار کو خیال آگیا کہ اپنی فوج آجائے تو ترلوچن پال کی فوج کو مکمل طور پر ختم کیا جا سکتا ہے۔ وہ اپنے ساتھیوں کو بتا کر چٹانوں سے اترا۔ وہاں بے شمار گھوڑے اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔ کچھ دُور جا کر کھڑے ہو گئے تھے۔ کماندار نے ایک گھوڑے کو پکڑا اور اس کی ننگی پیٹھ پر سوار ہو کر دریا کی طرف گھوڑے کو دوڑا دیا۔

لاہور کی فوج تو ختم ہو گئی لیکن ترلوچن پال نکل بھاگا۔

*

کالنجر کا مہاراجہ گنڈہ اپنی فوج لے کے کالنجر سے چل پڑا تھا۔ اس کی اطلاع سلطان محمود تک پہنچ گئی۔ اُس نے اپنی فوج کو کوچ کا حکم دے دیا۔ وہ قنوج سے چلا تھا اور اس کا رُخ کالنجر کی طرف تھا۔ راستے میں اُسے اطلاع ملی کہ گنڈہ کی فوج دریائے جمنا پار کر آئی ہے۔ سلطان محمود نے راستے میں دو پڑاؤ کیے اور تقریباً ایک سو میل فاصلہ طے کر گیا۔ اس سے بیس بائیس میل آگے الٰہ آباد ہے جہاں دریائے گنگا اور جمنا مل کر ایک دریا ہو جاتے ہیں۔ گنڈہ کی فوج بڑھی آرہی تھی اور غزنی کی فوج سے تین چار میل دُور رُک گئی۔

یہاں آکر سلطان محمود کا وہ دشمن بیدار ہونے لگا جو اُس کے ساتھ غزنی سے آیا تھا۔ یہ عورتیں تھیں جو فوج کے ساتھ تھیں۔ پہلے وہ اس طرح الگ الگ تھیں کہ کئی عورتیں ایک دوسری کو دیکھ بھی نہ سکیں کہ کون کون ساتھ آئی ہے۔

رات کا وقت تھا۔ عنبرین اپنے خیمے سے نکلی اور ٹہلتے ٹہلتے ذرا پرے نکل گئی۔ اُسے کھسر پھسر سنائی دی۔ رات چاندنی تھی۔ اُسے کچھ شک سا ہُوا۔ وہ دبے پاؤں چھُپ چھُپ کر آگے بڑھی۔ اُسے ایک عورت کی آواز سنائی دینے لگی جو بڑی صاف تھی۔

"اب زیادہ انتظار نہیں کرنا چاہیئے" ۔عورت کہہ رہی تھی ۔"لاہور کی فوج تو دھوکے میں ماری گئی ہے۔ اب تم بتاتے ہو کہ ایک مہاراجہ کی فوج آرہی

ہے۔ ان گاڑی بانوں میں سے دو کو بھیج دو تاکہ مہاراجہ کی فوج کے ساتھ رابطہ ہو جائے۔ باقی کام لڑائی شروع ہوتے ہی کریں گے"۔

"میں نے سب کو خبردار کر دیا ہے"۔۔۔ ایک آدمی نے کہا۔

"میں ہمیشہ کے لیے تمہاری ہوں"۔۔۔ عورت نے کہا۔۔۔"اُسے تو برائے نام خاوند بنا رکھا ہے"۔

کوئی آرہا تھا۔ اس عورت کے ساتھ جو آدمی تھا، وہ جلدی سے کھسک گیا۔ عنبرین بھی وہاں سے ہٹ آئی لیکن اُس نے نظر رکھی کہ وہ عورت کدھر جاتی ہے۔ وہ اِدھر ہی آرہی تھی جہاں عورتوں کے خیمے تھے۔ عنبرین ایک جھاڑی کے پیچھے بیٹھ گئی۔ وہ عورت قریب آئی تو عنبرین اُٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ اس عورت کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"دوشین"؟۔۔۔ عنبرین نے اُسے چاندنی میں پہچانتے ہوئے کہا۔۔۔"شاید مجھے غلطی لگ رہی ہے"۔

"عنبرین ہو تم!"۔۔۔ دوشین نے کہا۔۔۔"تم یہاں؟ کس کے ساتھ آئی ہو؟ اُسی کے ساتھ آئی ہو گی جس کے ساتھ بھاگی تھیں"۔

"تم بھی تو بھاگ کے آئی ہو گی"۔۔۔ عنبرین نے کہا۔۔۔"کسی ایلک خانی لڑکی کا غزنی کی فوج کے ساتھ ہونا حیران کن لگتا ہے۔ کون ہے تمہارا خاوند؟"

"رجب بائیجان!"۔۔۔ دوشین نے کہا۔۔۔"کماندار ہے"۔

"رجب سلجوقی کہو نا!"۔۔۔ عنبرین نے کہا۔۔۔"میں اُسے جانتی ہوں۔ اُسی سے مل کے آرہی ہو؟"

"میں کسی سے بھی مل کے نہیں آرہی"۔۔۔ دوشین نے کہا۔

عنبرین ہنس پڑی اور بولی۔۔۔"میں جانتی ہوں وہ رجب نہیں تھا۔ آج کوئی بھی کماندار ادھر نہیں آسکتا۔ میرا خاوند بھی کماندار ہے۔ وہ بھی نہیں آسکتا .... دوشین! ذرا ہوش سے اور اپنی نیّت ٹھکانے رکھ کے یہاں رہو"۔

روشین نے لپک کر عنبرین کو گلے لگالیا اور ہنسنے لگی۔ پھر بولی —"تم ٹھیک کہتی ہو۔ وہ رجب نہیں تھا۔ وہ اُس کا دوست تھا۔ رجب کا پیغام لایا تھا....
تم مجھ پر کچھ شک کر رہی ہو۔ میں سلطنتِ غزنی کی وفادار ہوں۔ اگر نہ ہوتی تو یہاں کیوں آتی؟ مجھے تم اپنے جیسا سمجھو۔ تم غزنی کی فوج کی سلامتی اور فتح کی دعا کیا کرتی ہونا؟ میں دن رات دعا کرتی ہوں"— اور وہ ہنستی ہوئی چلی گئی۔

عنبرین وہیں کھڑی گہری سوچ میں کھوگئی۔

سلطان محمود مہاراجہ گنڈہ کی فوج کا جائزہ لینے کے لیے خود آگے گیا۔ اُس کے ساتھ سالار محمد الطائی تھا۔ وہ گھوڑے سے اُتر کر ایک اونچے درخت پر چڑھ گیا۔ اُس نے مہاراجہ گنڈہ کی فوج دیکھی تو اُس کی آنکھیں ٹھہر گئیں مورخین جن میں گردیزی، ابن الاثیر اور فرخی قابلِ ذکر ہیں، لکھتے ہیں کہ سلطان محمود نے بلند جگہ سے سامنے دیکھا تو وہ اپنی گھبراہٹ کو چھپا نہ سکا۔ جہاں تک نظر جاتی تھی فوج کے خیمے، گھوڑے، ہاتھی اور ہندو فوجی نظر آتے تھے۔ دور دور تک زمین کھدی ہوئی تھی۔ یہ خندقیں تھیں۔ ابوالقاسم فرشتہ نے بھی سلطان محمود کے اسی ردِّعمل کی گواہی دی ہے۔

انہی مورخوں میں سے بعض نے اُس وقت کی تحریروں کے حوالے سے لکھا ہے کہ محمود غزنوی نے اپنے سالار ابوعبداللہ محمد الطائی سے کہا کہ مجھے دشمن ملک کے اندر اتنی دور تک نہیں آنا چاہیئے تھا۔ کمک کہاں سے آئے گی؟ پسپائی کی صورت میں ہم کہاں جائیں گے؟ دشمن ہمیں واپس قنوج کے قلعے تک نہیں پہنچنے دے گا۔ ہم قلعہ بند ہو کر ہی لڑ سکتے ہیں۔

"میں نے سلطان محمود کی زبان سے 'پسپائی' کا لفظ پہلی بار سنا ہے"— سالار محمد الطائی نے سلطان محمود سے کہا —"دشمن کی طاقت بہت زیادہ ہے۔ پھر بھی ہمیں پسپائی کی نہیں سوچنی چاہیئے"۔

"اتنی ہی فوج گوالیار کی ہے جو ابھی پہنچی نہیں"— سلطان محمود نے کہا —"وہ بھی آگئی تو کیا ہوگا؟"— وہ بولتے بولتے چپ ہوگیا اور سر کو ہلکا سا

جھٹکا دے کر بولا ۔" اللہ مجھے معاف کرے .... اللہ مجھے معاف کرے ....
میں اللہ کی ذات کو بھول گیا تھا ۔"

وہ مشکل کے وقت جس طرح کیا کرتا تھا اسی طرح درخت سے اترا ۔ قبلہ رُو ہو کے دو رکعت نفل ادا کئے ۔ اس کے ساتھ جو سالار اور دیگر افراد تھے، انہوں نے بھی نفل ادا کئے، اور سلطان واپس اپنے کیمپ میں آگیا ۔

مہاراجہ گنڈہ کی فوج کی نفری پچاس ہزار پیادہ چھتیس ہزار گھوڑسوار اور چھ سو چالیس جنگی ہاتھی تھے ۔ اُسے سب سے بڑا یہ فائدہ حاصل تھا کہ وہ اپنے ملک میں تھا اور اُس کی ریاست ایک دن کی مسافت پر تھی ۔ اس ملک کا بچّہ بچّہ اُس کے ساتھ تھا ۔ سلطان محمود کو اپنے اللہ پر بھروسہ تھا ۔

سلطان نے اپنے کیمپ میں جا کر تمام کمانداروں اور ان سے بھی کم عہدیداروں کو اکٹھا کیا اور ان سے کہا ۔" تم نے کسی بھی میدان میں مجھے مایوس نہیں کیا ۔ تم نے انتہائی مشکل حالات میں بھی دشمن کو شکست دی ہے ۔ تم نے دُگنی طاقت کے دشمن سے بھی ہتھیار ڈلوائے ہیں مگر آج ہمارے سامنے پہاڑ آن کھڑے ہوئے ہیں ۔ میں ایسا حکم نہیں دے سکتا کہ ایک آدمی بارہ آدمیوں سے لڑے اور انسان ہاتھیوں سے ٹکرا جائیں ۔ میں تمہیں یہ یاد دلانا چاہتا ہوں کہ تم یہاں کیا مقصد لے کر آئے ہو ۔ میں تمہیں یہ بھی یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ہم اگر ہار گئے تو ہم بھاگ کر کہیں بھی نہیں جا سکیں گے ۔ ہم میں سے بعض مارے جائیں گے اور بعض ہندوؤں کے قیدی ہوں گے ۔ ہندو غزنی کے قیدیوں سے اپنی ہر ایک شکست کا انتقام لے گا ۔ اپنے بُتوں کی توہین کا انتقام لے گا اور سب سے بڑا نقصان اسلام کو پہنچے گا ۔ ہندو مہاراجے غزنی پر چڑھ دوڑیں گے ۔ تم نہ ہوئے تو انہیں روکنے والا کوئی نہ ہوگا ۔ ہمارا ملک ان کا ہوگا ۔ ہماری بیٹیاں ان کی ہونگی اور ہندو سلطنتِ غزنی کو جو اسلام کا مرکز ہے، بُت خانہ بنا دیں گے ۔ آگے یہودی اور نصرانی ہیں جو پہلے ہی ہمارے مسلمان امراء اور حکمرانوں کو در پردہ مدد دے کر ہماری جڑیں کھوکھلی کر رہے ہیں ۔ اگر ہندو ہمارے

ملک میں پہنچ گئے تو تمام کفار متحد ہو کر خانہ کعبہ تک پہنچ جائیں گے، پھر ہم سب اللہ کے حضور رُوسیاہ پیش ہوں گے..... آج تمہیں اللہ کے حکم سے لڑنا ہے۔ اللہ کا نام زبان پر لے کر لڑنا ہے۔"

اس کے بعد سلطان محمود نے دستوں کی تقسیم بتائی اور انہیں بتایا کہ کون سا دستہ کہاں ہوگا اور اسے کیا کرنا ہے۔ اُسے فنِ حرب وضرب اور جنگی چالوں کا کمال دکھانا تھا ورنہ وہ اتنے طاقتور دشمن کو شکست نہیں دے سکتا تھا۔ دائیں طرف دریائے جمنا اور بائیں طرف دریائے گنگا تھا۔ دونوں دریاؤں کے درمیان کہیں فاصلہ بیس میل تھا کہیں چالیس میل سلطان محمود اس کوشش میں تھا کہ گنڈہ کی فوج کو دو حصّوں میں کاٹ دے اور انہیں دریاؤں تک لے جائے لیکن یہ ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ اُس نے بہر حال دستوں کو تقسیم کر کے ضروری ہدایات دے دیں اور انہیں کہا کہ وہ سپاہیوں تک اُس کا پیغام پہنچا دیں۔

*

عنبرین نے دوشین کا خیمہ دیکھ لیا تھا۔ اُسے پختہ شک ہو گیا تھا کہ دوشین صرف اپنے خاوند کو دھوکہ نہیں دے رہی بلکہ سلطان محمود کے لیے دھوکہ بن کر آئی ہے۔ عنبرین کو اُسی روز اس کے خاوند نے بتایا تھا کہ سلطان محمود نے کمانداروں سے کیا کہا ہے اور یہ بھی کہ دشمن کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اُس نے عنبرین سے کہا تھا کہ وہ دعا کرے۔ یہ کہہ کر وہ چلا گیا تھا۔

عنبرین نے اپنے خاوند عمر یزدانی کو نہیں بتایا تھا کہ یہاں ایک ایلک خانی لڑکی ہے جو ایک سلجوقی کماندار کی بیوی بن کر آئی ہے۔ وہ دوشین کو اچھی طرح جانتی تھی۔ اُس کے خیالات سے بھی واقف تھی۔ وہ مان ہی نہیں سکتی تھی کہ دوشین اور اُس کا سلجوقی خاوند غزنی کے وفادار ہو سکتے ہیں۔ دوشین کو خدا نے جتنا حسن دیا تھا، اُس نے اتنی ہی شیطانیت اپنی فطرت میں بھر لی تھی۔ چنانچہ عنبرین اسے چھپ چھپ کر دیکھتی رہتی تھی۔ اُس نے اپنے ملازم سے بھی کہہ دیا تھا کہ وہ اُس لڑکی پر نظر رکھے۔

رات کا وقت تھا۔ عنبرین خیمے میں اکیلی تھی۔ ملازم اندر آیا اور اسے بتایا کہ دوشیزہ کو اُس نے جاتے دیکھا ہے اور اُسی طرف اُس نے دو گاڑی بانوں کو بھی جاتے دیکھا ہے۔ عنبرین خیمے سے نکل گئی اور اُس طرف چل پڑی جدھر ملازم نے بتایا تھا کہ دوشیزہ گئی ہے۔ عنبرین چھپ چھپ کر اور ذرا راستہ بدل کر جارہی تھی۔ اسے بڑی اچھی اوٹ مل گئی۔ اس سے ذرا پرے چار آدمی کھڑے تھے اور ان کے ساتھ نہ صرف دوشیزہ تھی بلکہ ایک اور عورت بھی تھی۔ عنبرین پاؤں کے بل سرکتی اور آگے چلی گئی اور اسے باتیں سنائی دینے لگیں۔ ان کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ جو کچھ کرنا چاہتے ہیں اُس کی بات ہو چکی ہے۔ عنبرین کو آخری بات سنائی دی۔

"کشتی کنارے پر بندھی ہے"— ایک آدمی کہہ رہا تھا— "آواز نکالے بغیر کشتی تک پہنچنا اور کشتی میں سوار ہو کر رسّہ کھول دینا۔ پانی کا بہاؤ اُدھر کو ہی ہے۔ چپّو دور جا کر مارنا۔ سنتری اُدھر بھی چلے جایا کرتے ہیں۔ فاصلہ زیادہ نہیں۔ دو ساعت میں پہنچ جاؤ گے..... پھر سن لو۔ مہاراجہ سے کہنا کہ سوار دستہ ہمارے بائیں پہلو پر لائے۔ تم نے راستہ دیکھ لیا ہے۔ وہ اُسے سمجھا دینا۔ میں اُدھر ہی ہوں گا۔ مہاراجہ سے کہنا کہ وہاں ہماری طرف سے کوئی مقابلہ نہیں ہوگا۔ تمہیں قلب تک راستہ مل جائے گا۔ اگر ہمیں موقعہ مل گیا تو سلطان ہمارے تیر سے مر چکا ہوگا۔ مہاراجہ کو ہمارے پہلو تک کا راستہ اچھی طرح سمجھا دینا اور اُسے بتانا کہ ہماری فوج اُس کی فوج پر حملہ کر کے پیچھے ہٹے گی۔ تم لوگ اسے پسپائی نہ سمجھ لینا اور پیچھے نہ آجانا ورنہ دائیں بائیں سے مارے جاؤ گے۔ ہمارا حملہ آور دستہ پیچھے ہٹے تو تم بھی پیچھے چلے جانا۔ کہیں ہمارے سلطان کے پھندے میں نہ آجانا..... جاؤ نکل جاؤ۔ تمہارا انعام تمہیں معلوم ہے کیا ہے۔"

دو آدمی دریا کی طرف چلے گئے اور باقی دوشیزہ اور دوسری عورت کو ساتھ لے کر کسی اور طرف چلے گئے۔ عنبرین اوٹ سے اٹھی اور تیز قدم لیتے خیمے تک آئی۔ کمان اور ترکش اٹھایا اور خنجر کمر میں اُڑسا۔ اُس نے ملازم

سے کہا کہ وہ برچھی اور تلوار لے کر اُس کے ساتھ چلے۔

*

عنبرین ناتجربہ کار تھی۔ اُس پر جذبات کا غلبہ تھا۔ وہ یہ تو سمجھ گئی تھی کہ سلطان محمود تاریخ کے بہت بڑے دھوکے کا شکار ہو رہا ہے لیکن اُسے صحیح طریقے سے کارروائی کرنے کی سوجھ بوجھ نہیں تھی۔ سلطان محمود سے اس کی عقیدت مندی کا یہ عالم تھا کہ اُس پر دیوانگی طاری ہو گئی اور ملازم کو ساتھ لے کر دریا کی طرف دوڑ پڑی۔ دریا دُور نہیں تھا۔ وہ دیکھ نہ سکی کہ اُس کے تعاقب میں کوئی آ رہا ہے۔ وہ کنارے سے کشتی ہٹنے سے پہلے دریا تک پہنچنے کی کوشش میں تھی۔

وہ پہنچ گئی۔ چاندنی شفاف تھی۔ کشتی کنارے سے ہٹ گئی تھی۔ وہ اور آگے چلی گئی اور ایک گھٹنہ زمین پر رکھ کر اُس نے ایک تیر چلایا۔ فوراً بعد دوسرا چلایا۔ اس کے ساتھ ہی اُسے اپنے پیچھے شور سا سنائی دیا۔ وہ اٹھی اور پیچھے دیکھا۔ اُس کے ملازم پر دو آدمیوں نے حملہ کر دیا تھا۔ ان میں سے ایک آدمی عنبرین کی طرف دوڑتا تو ملازم اسے برچھی سے روکتا تھا۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں تلواریں تھیں۔ ملازم لڑ تو رہا تھا لیکن اس کا مقابلہ دو فوجیوں کے ساتھ تھا۔ ملازم زخمی ہو گیا۔

ان دونوں آدمیوں نے عنبرین اور اُس کے ملازم کو دریا کی طرف جاتے دیکھ لیا تھا۔ وہ انہیں وہیں ختم کرنے کے لیے ان کے پیچھے چلے گئے تھے۔ اُن کے لیے یہ زندگی اور موت کا معرکہ تھا۔

ایک آدمی نے عنبرین پر حملہ کیا۔ وہ تلوار کا وار بچا گئی۔ اس آدمی نے دوسرا وار کیا۔ عنبرین نے یہ وار بھی خطا کر دیا اور اس کے ساتھ ہی اس نے چلّانا شروع کر دیا — "آؤ، آؤ۔ دریا کی طرف آؤ" — اب اس پر حملہ کرنے والا بپھر کر اس پر آیا لیکن عنبرین پیچھے کو اُلٹے پاؤں دوڑی اور اُس نے کمان میں تیر ڈال لیا۔ اس آدمی کو وہ زندہ پکڑوانا چاہتی تھی۔

"کمان سے تیر نکال لے لڑکی!" — اس کے حملہ آور نے کہا۔ "ہم تجھے چھوڑ دیں گے۔"

عنبرین تیر انداز تھی۔ اُس نے کمان اوپر کر کے کھینچی تو وہ آدمی بوکھلا کر دوڑ پڑا۔ عنبرین نے تیر چھوڑ دیا جو اس آدمی کی ران سے پار ہو گیا۔ فاصلہ بہت تھوڑا تھا۔ دوسرا آدمی زخمی ملازم کو مارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ عنبرین نے اُس کی بھی ٹانگوں کا نشانہ لے کر تیر چھوڑ دیا۔ تیر اُس کے کولہے میں اُتر گیا۔

وہ دونوں دوڑے لیکن ٹانگوں میں تیر اُترے ہوئے تھے۔ وہ دور نہ جا سکے۔ عنبرین کے مسلسل شور پر گشت کے سنتری دوڑے آئے۔ عنبرین نے انہیں کہا کہ دریا میں ایک کشتی جا رہی ہے اُسے پکڑو، ہندوؤں کے جاسوس جا رہے ہیں۔ سنتریوں نے بڑی ہی بلند آواز سے کسی کو پکارا۔ ذرا سی دیر میں چار پانچ فوجی آ گئے۔ عنبرین نے انہیں بتایا کہ کشتی میں دونوں آدمی اس کے تیروں سے زخمی ہیں۔

دو سنتری کنارے کنارے دوڑے۔ کشتی کنارے کے ساتھ ساتھ ہی جا رہی تھی۔ کشتی میں بیٹھے ہوئے دونوں آدمیوں کے جسموں میں تیر اُترے ہوئے تھے۔ وہ کشتی کو دور لے جانے کے قابل نہیں تھے۔ سنتری دریا میں اُتر گئے اور کشتی کو کنارے پر لے آئے۔ کشتی میں دونوں آدمی زندہ تھے۔ باہر جو دو آدمی عنبرین کے تیروں سے زخمی ہوئے تھے، انہیں بھی پکڑ لیا گیا۔ سنتری یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ دونوں ان کی اپنی فوج کے کماندار تھے۔

سب کو اُسی وقت سالار محمد الطائی کے پاس لے گئے۔ کشتی میں جو جا رہے تھے وہ ہندو تھے جو اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کر کے سلجوقیوں کے ساتھ آئے تھے۔ سالار محمد الطائی ان سب کو سلطان محمود کے سامنے لے گیا۔ ہندو ابھی زندہ تھے اور ہوش میں تھے۔ دونوں کمانداروں رجب بائیجان اور فریدسمرقند کی ٹانگوں میں تیر اُترے ہوئے تھے۔ سلطان محمود نے کہا کہ جب تک یہ سچ نہ بولیں ان کے جسموں سے تیر نہ نکالے جائیں۔

سب سے پہلے ہندو بولے اور انہوں نے بتا دیا کہ وہ ہندو ہیں اور سلجوقی کماندار انہیں مسلمانوں کے بہروپ میں ساتھ لائے تھے اور اب وہ مہاراجہ گنڈہ کے پاس جا رہے تھے۔ انہوں نے ساری بات بتا دی۔ دونوں سلجوقی کمانداروں نے بھی جرم کا اعتراف کر لیا۔ جب انہوں نے بتایا کہ انہوں نے اسرائیل سلجوقی کے منصوبے پر عمل کیا ہے تو سلطان محمود کے چہرے پر قہر اُتر آیا۔

"اگر ہم خیریت سے واپس چلے گئے تو سب سے پہلے اسرائیل سلجوقی اور اس کے دستِ راست ایلتگین کو ٹھکانے لگاؤں گا"۔ سلطان محمود نے کہا۔

سلطان نے دونوں ہندوؤں اور اُس کی ساتھی لڑکی کو بھی گرفتار کرنے کا حکم دے دیا اور اُن تمام سلجوقیوں سے ہتھیار لے کر انہیں نہتہ کر دیا جو اس کی فوج میں تھے۔ ان سب کو الگ کر کے ان پر پہرہ کھڑا کر دیا گیا۔ اب سلطان کسی سلجوقی پر اعتماد کرنے کو تیار نہیں تھا۔

*

سلطان محمود مہاراجہ گنڈہ کی جنگی طاقت دیکھ کر پہلے ہی پریشان تھا اور سوچ سوچ کر اُس کا سر چکرانے لگا تھا۔ اب اُس پر اس سازش کا انکشاف ہُوا تو بہت ہی بے چین ہو گیا۔ وہ قبلہ رُو ہو کر نفل پڑھنے لگا اور خُدا کے حضور بہت گڑگڑایا۔ مورّخ لکھتے ہیں کہ اُسے قرآنِ پاک سے بہت پیار تھا۔ اُس رات وہ قرآنِ پاک ہاتھ میں لے کر گڑگڑاتا رہا تھا۔ اُسے اچانک ایک روشنی نظر آئی۔ اُس کا دماغ روشن ہو گیا۔ اُسے خیال آیا کہ گنڈہ کی رگوں پر حملہ کیا جائے۔ اُس نے اپنے ایک نائب سالار کو ایلچی کی حیثیت سے مہاراجہ گنڈہ کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا:

"آپ کی نجات اور سلامتی اس میں ہے کہ آپ اسلام قبول کر لیں۔ اگر آپ نے انکار کیا تو آپ تصور میں نہیں لا سکتے کہ آپ، آپ کی فوج اور آپ کی

راجدھانی پر کیسی بھیانک بتاہی آئے گی۔ آپ کا جواب نفی میں آیا تو میں آپ پر حملہ کر دوں گا اور اُدھر آپ کی راجدھانی محاصرے میں آجائے گی۔ میں کافی فوج بھیج چکا ہُوں۔ امید ہے آپ میرے ہاتھوں اپنی فوج کا قتلِ عام نہیں ہونے دیں گے اور کالنجر اور اس کے مندروں کو جلے ہوئے کھنڈر بننے سے بچالیں گے۔"

مہاراجہ گنڈہ نے سلطان کے ایلچی کو عزت سے رخصت کیا لیکن اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اُس پر خوف طاری ہو گیا تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اُس نے غزنی کی فوج کی خیمہ گاہ کی طرف پیشقدمی شروع کر دی۔ اُس نے ہراول دستے روانہ کیے۔ سلطان محمود کے دیکھ بھال کے آدمیوں نے فوراً سلطان کو اطلاع دی۔ سلطان نے سالار محمد الطائی سے کہا کہ وہ ہندوؤں کے ہراول پر ایسا حملہ کرے کہ ان کی ساری فوج پر دہشت طاری ہو جائے۔

سالار محمد الطائی نے میدانِ جنگ میں عمر گزار دی تھی۔ قبل از وقت اطلاع ملنے سے اُس نے اپنے دو سوار دستے سامنے کی بجائے دائیں بائیں تقسیم کر دیئے اور کمان اپنے ہاتھ میں رکھی۔ جب مہاراجہ گنڈہ کا ہراول آگے آیا تو دونوں طرف سے گھوڑ سواروں نے اُس پر حملہ کر دیا۔ سالار محمد الطائی نے بڑا ہی شدید حملہ کرایا۔ گنڈہ کے ہراول کا حال بہت بُرا کر دیا گیا۔ جو ہندو واپس زندہ پہنچ گئے انہوں نے ساری فوج میں دہشت پھیلا دی۔

اُس روز اور کوئی لڑائی نہ ہوئی۔ رات کو سلطان محمود پھر خدا کے حضور رکوع و سجود کرنے لگا۔ اُسے توقع تھی کہ مہاراجہ گنڈہ رات کو حملہ کر دے گا مگر کچھ بھی نہ ہُوا اور صبح ہو گئی۔ سلطان نماز سے فارغ ہُوا تو سالار محمد الطائی نے اُس کے خیمے میں آکر یہ عجیب خبر سنائی کہ مہاراجہ گنڈہ کی فوج ابتری کی حالت میں رات کو جانے کہاں چلی گئی ہے۔ سالار کو دیکھ بھال کرنے والوں نے بتایا تھا۔

"یہ دھوکہ ہے"۔۔۔ سلطان محمود نے کہا۔۔۔ "اتنا طاقتور دشمن بغیر لڑے

بھاگ تو نہیں سکتا۔ مہاراجہ گنڈہ نے ہمیں آگے بڑھنے کا موقعہ دیا ہے۔ اُسے توقع ہے کہ ہم آگے بڑھیں گے تو وہ میری فوج کو پھانس لے گا۔"

یہ دھوکہ نہیں تھا۔ محمد قاسم فرشتہ اور دوسرے تمام مورخوں نے لکھا ہے کہ رات کو مہاراجہ گنڈہ کے دل پر خوف طاری ہوگیا اور وہ محسوس کرنے لگا کہ وہ تباہی کی طرف جا رہا ہے۔ یہ ایک معجزہ تھا اور یہ سلطان محمود کی دعاؤں کا کرشمہ تھا۔ سلطان محمود نے کچھ دستے ساتھ لیے اور مہاراجہ گنڈہ کی خیمہ گاہ تک گیا۔ وہاں خیمے لگے ہوئے تھے اور فوج جا چکی تھی۔ سلطان اسے گھات سمجھتا رہا لیکن کچھ بھی نہ ہُوا۔

سلطان محمود کو اطلاع ملی کہ مہاراجہ گنڈہ کی فوج کالنجر کو جا رہی ہے۔ سلطان محمود نے تعاقب کا حکم دے دیا۔ یہ ایک دلیرانہ حکم تھا لیکن سلطان نے ہراول کو بہت آگے بھیج دیا تھا تاکہ یہ گھات ہو تو پتہ چل جائے مگر کہیں بھی گھات نہیں تھی۔ سلطان محمود دشمن کی فوج تک پہنچ گیا۔ سالار محمد الطائی نے دیکھا کہ سلطان بہت آگے چلا گیا ہے تو وہ تین چار سوار دستے اپنی کمان میں لے کر سلطان کے پیچھے چلا گیا۔

کسی بھی مورخ نے اس سوال کا جواب نہیں دیا کہ مہاراجہ گنڈہ کو کیا ہو گیا تھا اور وہ لڑائی سے کیوں منہ موڑ گیا تھا۔ سلطان محمود کے تعاقب سے وہ بھاگ اُٹھا۔ یہاں تک کہ اس کی فوج سازو سامان پیچھے چھوڑ کر بھاگ گئی۔

وی۔ اے سمتھ اور عطبی نے لکھا ہے کہ مہاراجہ گنڈہ پر غزنی کی فوج کا خوف اتنا زیادہ نہیں تھا۔ اُس پر کوئی پُراسرار سا خوف طاری ہوگیا تھا جیسے اُس پر کسی غیبی قوت کا یا آسیب کا اثر ہوگیا ہو۔ بعض تحریروں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اُس پر ہذیانی کیفیت طاری ہوگئی تھی اور اُس نے ایسی باتیں کی تھیں کہ اُس کے افسر بھاگ اُٹھے۔

اِسے معجزہ ہی کہا جا سکتا ہے۔ مورخوں کے مطابق، جب سلطان محمود واپس

آیا تو مہاراجہ گنڈہ کے چھ سو چالیس ہاتھیوں میں سے پانچ سو اسّی سلطان کے پاس تھے۔

خود سلطان محمود پر کچھ ایسی کیفیّت طاری ہو گئی کہ اُس نے ہندوستان میں اپنی باقاعدہ حکومت قائم کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور غزنی کو واپسی کا حکم دے دیا۔ اُس کی واپسی کی وجہ یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ اُسے غزنی سے اطلاع ملی تھی کہ سلجوقی بہت بڑی طاقت بن گئے ہیں اور ہر لمحہ خطرہ ہے کہ وہ غزنی پر حملہ کر دیں گے۔

قلعے جو نعروں نے سر کئے

سُلطان محمود غزنوی

مہاراجہ گنڈہ کو شکست دے کر جب غزنی پہنچا تو اُس کے ساتھ کم و بیش چھ سو ہاتھی اور ڈیڑھ سو گھوڑے تھے۔ مہاراجوں کی فوجوں کے قیدیوں کی تعداد سات سے دس ہزار تک تھی۔ غزنی کے لوگ اپنے فاتح سُلطان کے استقبال کے لیے شہر سے دُور نکل گئے تھے۔ اُن کے نعروں سے آسمان پھٹا جاتا تھا۔ تھکے ماندے سپاہیوں کے چہروں پر رونق آگئی تھی۔ جب قیدی لوگوں کے سامنے سے گزرے تو لوگوں نے فتح و نصرت کا وہ واویلا بپا کیا کہ فضا لرزنے لگی۔ لوگ ان ہندو قیدیوں پر طعنوں کے تیر برسانے لگے۔ بعض اُن کے قریب جا کر کہتے تھے کہ غزنی میں تمہیں سچّا خدا ملے گا۔ اس کے آگے سجدہ کرنا۔ تمہارے گناہ معاف ہو جائیں گے، مگر ہندو فارسی نہیں سمجھتے تھے۔ وہ خالی خالی نگاہوں سے تماشائیوں کو دیکھتے تھے۔ بعض کے ہونٹوں پر ہاری ہوئی مسکراہٹ اور بعض کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

ان تماشائیوں میں چار آدمی الگ تھلگ کھڑے اپنے سامنے سے گزرتے ہوئے سلطان محمود کو دیکھ رہے تھے۔ وہ کوئی نعرہ نہیں لگا رہے تھے۔ اُن کے چہروں پر سنجیدگی طاری تھی۔ اُن کے سامنے سے سلطان محمود گزر گیا تو وہ فوج کو گہری نظروں سے دیکھنے لگے۔ اب کے چونکہ مہاراجے مقابلے سے مُنہ موڑ گئے تھے اس لیے سلطان محمود کی فوج کا جانی نقصان نہیں ہُوا تھا۔ لگتا تھا جیسے

جتنی فوج ہندوستان کی تھی اس سے زیادہ واپس آئی ہو۔ حالانکہ سلطان محمود کچھ دستے قنوج کے گرد و نواح میں اور لاہور کے قریب بھی چھوڑ آیا تھا۔ یہ علاقے اُس کے باجگزار تھے۔

"سلطان بغیر لڑے واپس آ گیا ہے۔ بہت لوٹ مار کر لایا ہے"۔

"لڑا نہ ہوتا تو یہ جنگی قیدی کہاں سے لے آتا؟ اتنے زیادہ ہاتھی اور گھوڑے کہاں سے آتے؟"

"لوگوں کے اتنے زیادہ ہجوم میں سے اگر میں سلطان پر تیر چلا دوں اور کمان پھینک کر ہجوم میں غائب ہو جاؤں تو میں پکڑا نہیں جاؤں گا اور سلطان کا کام بھی تمام ہو جائے گا"۔

"اکیلے سلطان کو قتل کر دینے سے کیا حاصل ہو گا؟ اس کی سلطنت ہمارے قبضے میں نہیں آ جائے گی۔ اس کے بیٹے جوان ہیں جو جنگی چالوں میں باپ کی طرح دانشمند ہیں"۔

"قتل کی باتیں چھوڑو۔ ہمیں یہ دیکھنے کے لیے بھیجا گیا ہے کہ سلطان محمود کی فوج کو دیکھ کر آؤ کتنی تعداد واپس آ رہی ہے اور اس کی حالت کیا ہے"۔

"اسرائیل سلجوقی دھوکے میں شکست کھا گیا تھا۔ اب ایسا نہیں ہو گا"۔

"اپنے آپ کو دھوکے میں نہ رکھو۔ غزنی کی جنگی طاقت ہم سے زیادہ ہے"۔

"ایک سلجوقی غزنی کے پانچ فوجیوں پر بھاری ہے۔ میں اب بھی کہتا ہوں کہ اکیلے سلطان محمود کو قتل کر دیا جائے تو اُس کی فوج کا حوصلہ ٹوٹ جائے گا"۔

"اور غزنی والوں کی حالت اِس فقیر جیسی ہو جائے گی"۔ اس آدمی نے ایک فقیر کی طرف اشارہ کر کے ہنستے ہوئے کہا اور اُس نے فقیر سے کہا — "او بھکاری! اپنے سلطان سے کہہ کہ جو دولت ہندوستان سے لُوٹ کے لایا ہے، اُس میں سے کچھ تجھے دے دے"۔

فقیر پھٹے پُرانے کپڑے پہنے، داڑھی اور سر پر گرد ڈالے، ایک ہاتھ میں لاٹھی، دوسرے میں کشکول اُٹھائے اِن چاروں کے پاس کھڑا تھا۔

"میں غزنوی نہیں سلجوقی ہوں"۔ بھکاری فقیر نے کہا"غزنی والے سلجوقی فقیروں کو بھیک بھی نہیں دیتے"۔

"اگر تمہاری رگوں میں سلجوقی خون ہوتا تو دریا میں ڈوب کر مر جاتے بھیک نہ مانگتے"۔ ایک نے اُسے کہا۔"فوراً یہاں سے نکلو اور وہاں پہنچو جہاں اسرائیل سلجوقی کی بادشاہی ہے۔ وہاں کوئی بھکاری نہیں۔ سب بادشاہ ہیں"۔

"میں جانتا تھا آپ چاروں سلجوقی ہیں"۔ فقیر نے کہا۔"اِسی لیے آپ کے پاس آن کھڑا ہوا تھا"۔

"لیکن ہم تمہیں بھیک نہیں دیں گے"۔ ایک سلجوقی نے کہا۔"ہم تمہاری یہ عادت پکی نہیں کرنا چاہتے"۔

سلطان محمود غزنوی کھانے سے فارغ ہو چکا تھا۔ اُس نے کھانا فراغت سے نہیں کھایا تھا۔ کھانے کے دوران وہ اپنے وزیر سے اپنی غیر حاضری کے عرصے کی رپورٹیں لیتا رہا تھا۔

"سلجوقیوں کا خطرہ بڑھتا جا رہا ہے"۔ وزیر نے اُسے بتایا تھا۔"سلجوقی ایک جنگی طاقت بن گئے ہیں۔ اسرائیل سلجوقی میں کوئی ایسی کشش ہے کہ بخارا اور کچھ اور علاقوں کے ایسے لوگ بھی اُس کے ساتھ مل گئے ہیں جو سلجوقی نہیں۔ اسرائیل سلجوقی نے اپنے قبیلے کو کرائے کی فوج بنا دیا ہے۔ ایلتگین کے ساتھ اب بھی اُس کا اتحاد اور جنگی معاہدہ ہے"۔

"یہ خطرہ میرے ساتھ ہندوستان میں بھی گیا تھا"۔ سلطان محمود نے کہا اور وزیر کو تفصیل سے سنایا کہ دو سلجوقی کمانداروں نے چند ایک ہندو گاڑی بانوں کے ذریعے مہاراجہ گنڈہ کو غزنی کی فوج کی نقل و حرکت سے آگاہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر عنبرین نام کی ایک لڑکی نے جو کماندار عمر یزدانی کی بیوی ہے، بروقت ان ہندوؤں کو پکڑوا دیا تھا۔

"اور یہ خطرہ یہاں بھی آپ پر منڈلا رہا ہے"۔ وزیر نے کہا۔"آج چار سلجوقی پکڑے گئے ہیں۔ وہ دیکھنے آئے تھے کہ آپ کے ساتھ جو فوج واپس

آئی ہے وہ کتنی ہے اور کس حال میں ہے۔ وہ آپ کے قتل کی باتیں بھی کر رہے تھے۔"

"کیا وہ مان گئے ہیں کہ وہ جاسوسی کرنے آئے تھے اور ان کا ارادہ مجھے قتل کرنے کا بھی تھا؟" سلطان محمود نے پوچھا "وہ کہاں ہیں؟"

"وہ یہیں ہیں"۔۔۔ وزیر نے کہا "حکم فرمائیں تو انہیں آپ کے سامنے لایا جائے۔ اُن سے اگلوا لیا گیا ہے کہ وہ یہاں بہت بُری نیّت سے آئے تھے۔"

چار آدمیوں کو اندر لایا گیا جن کے پاؤں میں بیڑیاں تھیں۔ اُن کے سر ڈول رہے تھے اور اُن سے کھڑا نہیں ہوا جاتا تھا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ اُن پر تشدّد کیا گیا ہے۔ وزیر نے دربان کو کسی کا نام بتا کر کہا کہ اُسے اندر بھیج دو۔

ایک فقیر اندر آیا جس کے کپڑے پھٹے پرانے اور غلیظ تھے۔ اُس کی داڑھی اور سر کے لمبے لمبے بال پسینے اور مٹی سے جُڑے ہوئے تھے۔ اُس کے ایک ہاتھ میں لاٹھی اور دوسرے میں کشکول تھا۔

"سلطان عالی مقام!"۔۔۔ وزیر نے کہا "یہ ہے وہ بھکاری جس نے ان کی باتیں سُنیں پھر ان پر نظر رکھی کہ کہاں جاتے ہیں اور جب یہ اپنے ٹھکانے پر پہنچے تو اس فقیر نے چھاپہ مروا کر انہیں پکڑوا دیا۔ یہ جس کے گھر ٹھہرے تھے وہاں کی تلاشی لی گئی ہے۔ وہ لوگ بھی مشکوک نکلے۔ یہ فقیر محکمہ جاسوسی کا عہدیدار ہے۔ ہم نے جب دیکھا کہ آپ کے استقبال کے لیے لوگ ہجوم در ہجوم باہر نکل آئے ہیں تو ہم نے ان لوگوں میں جاسوس پھیلا دیئے تھے۔ یہ عہدیدار آپ کو بتائے گا کہ اس نے ان پر کیوں شک کیا تھا۔

"میں نے دیکھا کہ لوگ فتح و نصرت کے نعرے لگا رہے تھے"۔۔۔ فقیروں کے بھیس میں اس جاسوس عہدیدار نے بتایا "ہر کوئی ناچنے اور کودنے کی کیفیّت میں تھا لیکن یہ چاروں بڑی سنجیدگی سے آپ کو دیکھ رہے تھے جیسے انہیں افسوس ہو رہا ہو کہ لوگ فاتحانہ نعرے لگا رہے ہیں۔ میں نے

قریب ہو کر اِن کی باتیں سُنیں"۔ اُس کی اِن کے ساتھ جو باتیں ہوئی تھیں وہ اُس نے سلطان کو بتائیں۔

"کیا تم اب اپنے ارادوں کے متعلق مجھے کچھ بتانا چاہو گے؟" سلطان محمُود نے ان سلجوقیوں سے پوچھا "میں نے سنا ہے کہ تم نے تسلیم کر لیا ہے کہ تم مجھے قتل کرنے آئے تھے۔"

"نہیں سلطان محمود!" ــــ ایک سلجوقی نے کہا "ہم میں ایک نے آپ کے قتل کی بات کی تھی لیکن قتل کا ارادہ نہ تھا۔ ہم جب پکڑے گئے تو سب کچھ بتا دیا تھا۔ ہم پر بہت تشدّد کیا گیا ہے۔ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ ہمارے دلوں میں جو کچھ تھا وہ صاف بتا دیا تھا۔ ہم سلجوقی ہیں۔ ہم جھوٹ نہیں بولا کرتے۔ ہم آپ کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ آپ نے ہمیں ایک بار شکست دی ہے۔ ہم اس شکست کا انتقام لیں گے۔ ہم ہندو نہیں مسلمان ہیں۔ ہمارا کوئی ملک نہیں۔ زمین کا کوئی ایسا خطّہ نہیں جسے ہم اپنا وطن کہ سکیں۔ ہم پہاڑیوں میں رہتے ہیں۔ ہم اپنا وطن حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"لیکن تمہاری نظر صرف میری سلطنت پر کیوں جم گئی ہے؟" سلطان محمُود نے پوچھا ــــ "تم کسی کمزور حکمران سے اُس کی زمین چھین سکتے ہو۔"

"کمزور سے کچھ چھیننا بہادروں کا شیوہ نہیں" ــــ ایک سلجوقی نے کہا ــــ "آپ ہم سے زیادہ طاقتور ہیں۔ ہم آپ کی سلطنت کے کسی حصّے کو اپنا وطن بنائیں گے .... ہماری اس بات کو سچ مانیں کہ ہم آپ کو قتل نہیں کرنا چاہتے۔ ہم آپ کی جنگی طاقت کو کمزور کریں گے اور میدانِ جنگ میں آپ کو مارنے کی کوشش کریں گے۔"

"مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے کہ تم بہادر جنگجوؤں کی طرح وہی بات کہہ رہے ہو جو تمہارے دل میں ہے" ــــ سلطان نے کہا ــــ "میں بھی تمہارے ساتھ بہادر جنگجوؤں جیسا سلوک کروں گا۔ تم غزنی کے مہمان ہو" ــــ اُس نے وزیر سے کہا ــــ "ان کی بیڑیاں کھول دو۔"

ان کی بیڑیاں کھلنے لگیں۔ سلطان محمود کہہ رہا تھا۔"غزنی کی فوج کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟"

"بہت طاقتور فوج ہے"۔۔۔ ایک سلجوقی نے کہا۔"ہمارا خیال تھا کہ یہ فوج ہندوستان سے کمزور ہو کر آئے گی لیکن ہاتھیوں اور گھوڑوں کے لحاظ سے یہ اور زیادہ طاقتور ہو کے آئی ہے"۔

"کیا تمہارا سردار اسرائیل سلجوقی ہمارے خلاف لڑے گا؟"

"اِس کا جواب وہی دے سکتا ہے"۔۔۔ سلجوقی نے کہا۔"ہم سے صرف ہمارے متعلق پوچھیں"۔

"میں کچھ نہیں پوچھوں گا"۔۔۔ سلطان محمود نے کہا۔"میں تمہیں کچھ بتاؤں گا۔ اپنے سردار اسرائیل سلجوقی کو میرا سلام کہنا اور اُسے کہنا کہ میں تمہیں پہاڑوں سے نکال کر دریائے جیحون کے پار کا بہت سا علاقہ دے دوں گا۔ تم اپنے تمام قبیلے کو وہاں منتقل کر دو اور اسے اپنا وطن بنالو۔ اُسے کہنا کہ ایک ہی مذہب کی دو فوجیں ایک دوسرے کا خون بہائیں گی تو فائدہ یہودیوں اور نصرانیوں کو پہنچے گا۔ وہ میرے بھی اتنے ہی دشمن ہیں جتنے تمہارے ہیں۔ انہیں موقع مِلا تو ہم دونوں کو نیست و نابود کر دیں گے۔ اُسے یہ بھی کہنا کہ ہر کسی کی موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ فتح اور شکست اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ تم نے اپنے آدمی میرے ساتھ ہندوستان بھیجے کہ وہ ہندوستان کے ایک بہت بڑے طاقتور مہاراجہ کو میرے جنگی راز دے کر مجھے شکست دلائیں مگر وہ ایک ایسی عورت کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچے جو تمہارے دوست ایلک خان کے خاندان کی ہے۔ تم بہادر جنگجو ہوتے تو دو عورتوں سے وہ کام نہ کراتے جو مردوں کو کرنا چاہئے تھا۔ تم نے ہندوؤں کو ساتھ ملا کر مجھے دھوکہ دینا چاہا مگر تم نہیں جانتے کہ ہندو مسلمان کا دوست نہیں ہو سکتا ..... اپنے سردار سے یہ بھی کہنا کہ جس کے ہاتھوں تم نے مجھے شکست دلانے کا انتظام کیا تھا، اُسے خدا نے ایسا مرعوب کیا کہ

وہ لڑے بغیر میدانِ جنگ سے غائب ہو گیا۔ یہ اللہ کی شان ہے۔ تم بھی اللہ کے آگے سر جھکا دو۔ اُسے کہنا کہ مجھے ملے۔ وہ میرے پاس نہ آنا چاہے تو میں اُس کے پاس چلا جاؤں گا۔ میرا پیغام اُس تک پہنچا دینا.... جاؤ، میں تمہیں آزاد کرتا ہوں۔"

*

اس داستان کی پچھلی کڑی میں بتایا جا چکا ہے کہ غز نام کا ایک جنگجو قبیلہ تھا جس کا اپنا کوئی وطن نہیں تھا۔ وہ پہاڑیوں میں خانہ بدوش رہتا تھا۔ اس قبیلے کا ایک سردار لقمان تھا جو اپنے آپ کو سلجوقی کہلاتا تھا۔ وہ قبیلے میں اتنا مقبول تھا کہ اس نے ایک الگ تھلگ سلجوقی قبیلہ بنا لیا۔ غز قبیلے کے بیشتر لوگ اس کی اطاعت میں آ گئے اور سلجوقی کہلانے لگے۔ یہ لوگ آزاد زندگی بسر کرتے تھے۔ اِدھر اُدھر سے مویشی چوری کرلاتے تھے۔ قافلوں کو بھی لُوٹ لیتے تھے۔ وہ پہاڑیوں میں بڑی خوشنما اور سرسبز جگہوں میں رہتے تھے۔ نوجوان لڑکیاں بھی اغوا کر لیتے تھے لیکن ظلم و تشدد نہیں کرتے تھے۔ ان میں آئی ہوئی باہر کی لڑکی خوش رہتی تھی۔

انہوں نے اپنے رہن سہن اور طور طریقوں میں ایسی دلکشی پیدا کر رکھی تھی کہ غیر سلجوقی خانہ بدوش بھی ان میں شامل ہو گئے اور سلجوقی کہلانے لگے۔ ساٹھ ستّر برسوں میں ان کی تعداد باہر کے قبیلوں کی شمولیت اور دو تین نئی نسلیں پیدا ہونے سے کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ یہ چونکہ جنگجو قبیلہ تھا اس لیے اس کی حیثیت ایک فوج کی سی ہو گئی تھی۔ انہیں چھوٹے موٹے مسلمان حکمران ایک دوسرے کے خلاف لڑاتے تھے۔ ترکستانیوں اور سمانیوں کی لڑائیوں میں سلجوقیوں نے سمانیوں کا ساتھ دیا تھا۔ پھر ایک اور حکمران الپتگین نے سلجوقیوں کے ساتھ سلطان محمود کے خلاف جنگی معاہدہ کر لیا تھا اور دونوں نے سلطان محمود سے شکست کھائی تھی۔ شکست کھانے والا اسرائیل سلجوقی تھا جو لقمان سلجوقی کا بیٹا تھا اور اُس کے مرنے کے بعد سلجوقی قبیلے کا سردار بنا تھا۔

اسرائیل سلجوقی کے متعلق بتایا جا چکا ہے کہ وہ بڑا خوبصورت جوان تھا۔ اُس کی شخصیت میں ایسا اثر تھا کہ اُس کے پیروکار اُس کا وہ حکم بھی فوراً مانتے تھے جس میں یقینی موت کا خطرہ ہوتا تھا۔ اُس نے لڑائیوں میں مختلف حکمرانوں کی مدد کر کے اپنا خزانہ بھر لیا تھا اور اُن کی کمزوریوں اور ہوس پرستی سے بھی وہ بہت فائدہ اٹھاتا تھا۔

سلطان محمود ہندوستان سے واپس آیا تو اُس کے وزیر نے اُسے بتایا کہ اسرائیل بہت بڑی طاقت بن گیا ہے اور سلطنتِ غزنی کے لیے ایک ایسا خطرہ جسے فوراً دبا لینا بہت ضروری ہو گیا ہے۔ سلطان کو چار سلجوقی جاسوسوں کی صورت میں اسی وقت ثبوت مل گیا تھا۔ سلطان نے تدبّر سے کام لے کر ان سلجوقیوں کو رہا کر دیا اور ان کے سردار اسرائیل سلجوقی کو پیغام بھی بھیج دیا کہ وہ اُسے ملے۔

"جو شخص آپ کے قتل کے منصوبے بنا رہا ہے اور جو آپ کی سلطنت کے لیے خطرہ بنا ہوا ہے، اُس سے آپ دوستانہ ملاقات کریں گے؟" — وزیر نے حیران سا ہو کے سلطان سے پوچھا۔

"ہاں، میں اُسے دوست بنانے کی کوشش کروں گا" سلطان نے کہا۔ "اسرائیل سلجوقی خواہ نام کا مسلمان ہے، مسلمان تو ہے۔ ہم ایک دوسرے کا بہت خون بہا چکے ہیں۔ ایک میری وہ جرأت ہے کہ میں اپنے ملک سے اتنی دور ہندوستان کے وسط تک چلا جاتا ہوں جہاں کی زمین اور جہاں کا آسمان بھی میرا دشمن ہوتا ہے.... اور یہ بھی ایک جرأت ہوتی ہے کہ اپنے بھائی کی لغزشیں معاف کر دو اور اس کے آگے جھک جاؤ۔ یہ میری بدنصیبی ہے کہ مجھے دو مہمیں ایک ساتھ سر کرنی پڑ رہی ہیں۔ ایک طرف ہندوستان ہے۔ اِس خطّے کو میں محمد بن قاسم کی امانت سمجھتا ہوں۔ یہ دارالاسلام تھا جو بُت خانہ بن گیا ہے اور میں اسلام کو فروغ دینے کے علاوہ ہندوؤں کی اُس جنگی طاقت کو ختم کر رہا ہوں جو ختم نہ ہوئی تو صرف ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے نہیں بلکہ پورے عالمِ اسلام کے لیے بہت بڑا خطرہ بن جائے گی۔ ایک طرف یہودی اور نصرانی ہیں، دوسری طرف ہندو

ہیں۔ یہ وہ پہاڑ ہیں جو ہماری طرف سرک رہے ہیں۔ ہم نے یا جس دور میں بھی مسلمانوں نے ان سے توجہ ہٹالی یا ان کے جھانسے میں آ گئے، مسلمان آپس میں ٹکرا ٹکرا کر ختم ہو جائیں گے .....

"دوسری مہم یہ ہے کہ ہمارے مسلمان بھائی میرے دشمن ہو گئے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کا بہت خون بہا چکے ہیں۔ بادشاہی اور سلطانی کی ہوس نے انہیں اندھا کر رکھا ہے۔ اسرائیل سلجوقی واقعی ایک جنگی طاقت بن گیا ہے۔ میں اس طاقت کو طاقت سے ختم کر سکتا ہوں۔ کفّار کا یہی مقصد ہے میں کفار کا یہ مقصد پورا نہیں ہونے دوں گا۔ میں کوشش کروں گا کہ اسرائیل سلجوقی میری شرائط تسلیم کر لے۔ میں اسے ایک وطن دے دوں گا۔"

*

بیس بائیس روز بعد اسرائیل سلجوقی بخارا کے پہاڑی علاقے میں ایک بڑی ہی حسین اور ٹھنڈی جگہ بیٹھا تھا۔ اس کے پاس اُس کی بیوی مریم بیٹھی تھی اور ان دونوں کے پاس دو ادھیڑ عمر آدمی بیٹھے تھے۔ اسرائیل کے سامنے وہ چار سلجوقی بیٹھے ہوئے تھے جنہیں غزنی میں جاسوسی کے جرم میں پکڑا گیا تھا لیکن سلطان محمود نے انہیں رہا کر دیا تھا۔ وہ اسرائیل سلجوقی کو تفصیل سے سنا چکے تھے کہ وہ کس طرح پکڑے گئے، سلطان محمود نے ان کے ساتھ کیا باتیں کیں اور اسرائیل کے نام کیا پیغام دے کر رہا کر دیا ہے۔

"تم کہتے ہو کہ سلطان محمود نے کہا تھا کہ وہ ہمیں ایک خطّہ دے گا جو ہمارا وطن ہو گا" ــــ اسرائیل سلجوقی نے کہا "کیا اُس نے یہ بات سنجیدگی سے کہی تھی یا ہمیں طعنہ دیا تھا؟ کیا تم بتا سکتے ہو کہ اُس نے یہ بات گھمنڈ میں کہی تھی؟"

"نہیں" ــــ ایک سلجوقی نے جواب دیا "وہ سنجیدہ معلوم ہوتا تھا۔ اگر اُس کے دل میں گھمنڈ ہوتا تو وہ یہ نہ کہتا کہ جہاں آپ اسے ملنا چاہیں گے وہ وہیں آ جائے گا۔"

"اُسے پتہ چل گیا ہے کہ سلجوقی اب اتنے طاقتور ہو گئے ہیں کہ اپنی شرطیں

منوا سکتے ہیں" ـــ اسرائیل سلجوقی کی بیوی مریم نے کہا۔

مریم سلطان محمود کے ایک بدترین دشمن ایلک خان کی بھتیجی تھی۔ وہ بڑی ہی حسین اور جوان لڑکی تھی۔ اُس نے شادی سے پہلے اسرائیل سے کہا تھا ـــ "میں اُس مرد پر اپنا سب کچھ قربان کردوں گی جو سلطان محمود کی سلطنت کو تباہ کر کے اسے بھٹکنے کے لیے ان پہاڑوں میں چھوڑ دے گا" ـــ اُس نے اسرائیل سلجوقی سے یہ بات اس لیے کہی تھی کہ اسرائیل نے ایلک خان سے کہا تھا کہ وہ سلطان محمود کو مروا دے گا۔ اسی وعدے پر مریم نے اسرائیل کے ساتھ شادی کی تھی مگر اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ اسرائیل سلطان محمود کی اس پیش کش پر غور کر رہا ہے کہ وہ سلجوقیوں کو ایک الگ وطن دے گا۔

اسرائیل سلجوقی نے ان چاروں آدمیوں کو اور اُن دو آدمیوں کو بھی جو اُس کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، اٹھا دیا۔ اس کے پاس مریم اکیلی رہ گئی۔

"میں ایسی بات نہیں سننا چاہتی کہ آپ نے سلطان محمود کی پیشکش قبول کر لی ہے" ـــ مریم نے اسرائیل سے کہا ـــ "وہ حالات کچھ اور تھے جو آپ کی شکست کا باعث بنے تھے۔ اب آپ کو کسی سے نہیں ڈرنا چاہیئے ہماری اپنی طاقت کے علاوہ التگین ہمارے ساتھ ہے۔ توغان خان ہمارے ساتھ ہے۔ اپنے دشمن کے لالچ میں نہ آئیں۔ ہم اب اپنا وطن دوسروں سے ملک چھین کر بنا سکتے ہیں"

"سنو مریم!" ـــ اسرائیل سلجوقی نے کہا ـــ "میں جانتا ہوں کہ تمہارے دل میں سلطان محمود کی اتنی نفرت نہیں جتنی یہ خواہش تمہارے دل میں تڑپ رہی ہے کہ تم ایک ملک کی ملکہ بنو۔ میں تمہیں ملکہ بنا دوں گا لیکن ہمیں سب سے پہلے زمین کا ایک ٹکڑا چاہیئے جسے ہم اپنا وطن کہہ سکیں۔ وہاں ہم اپنی فوج کو باقاعدہ تربیت دیں گے۔ وہاں ہمارے قلعے ہوں گے۔ اب ہماری یہ حالت ہے کہ فوج لڑتی ہوئی پیچھے ہٹتی ہے تو ہمیں کہیں پناہ نہیں ملتی۔ ہم قبائلی اور جنگلی کہلاتے ہیں۔ مجھے محمود سے کچھ وصول کر لینے دو"

بات مریم کی سمجھ میں آگئی مگر وہ جو دو آدمی اسرائیل کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، وہ نہیں چاہتے تھے کہ مریم اسرائیل کی یہ بات سمجھے۔ رات کو وہ ایک قدرتی اوٹ میں بیٹھے تھے۔ مریم ان کے ساتھ تھی اور انہیں کہہ رہی تھی۔ "میں نے اس شخص کے ساتھ صرف اس لیے شادی کی تھی کہ یہ سلطان محمود کا کام تمام کردے گا مگر اس کی باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شخص غزنی کے اس سلطان کے جھانسے میں آجائے گا۔ اس نے مجھے یہ تو کہا ہے کہ وہ محمود سے کچھ وصول کرنا چاہتا ہے مگر مجھے اس کی نیت پر شک ہے۔ یہ محمود کا طفیلی بن جائے گا۔"

"تمہاری نظر میں کوئی اور ہے جو سلجوقی قبیلے کی سربراہی کرسکے؟" — دونوں میں سے ایک نے پوچھا۔

"توغان خان!" — مریم نے کہا — "وہ میرا چچازاد ہے۔ میں اس کے ساتھ شادی کرلوں گی۔ وہ مجھے ایسا بری طرح چاہتا ہے کہ میں نے جب اسرائیل کے ساتھ شادی کی تھی تو توغان خان زہر کھانے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ مجھے پتہ چل گیا۔ میں اسے ملی تو اس کی حالت پاگلوں جیسی ہو چکی تھی۔ میں اسے زندہ دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ اپنے باپ کا جانشین تھا، پھر اس کا باپ مر بھی گیا اور وہ باپ کا جانشین بنا لیکن ذہنی طور پر وہ اس قابل نہ تھا۔ میں نے اسے زندگی دی اور زندگی اس طرح دی کہ اسرائیل سے چوری چھپے اس کی بھی بیوی بنی رہی۔ یہ سلسلہ اب تک چل رہا ہے..... مجھے امید ہے کہ اسرائیل کا مرجانا ہمارے لیے بہتر ہوگا۔ توغان خان ہمارا مقصد پورا کردے گا۔"

ایک سایہ سا ان جھاڑیوں کے عقب سے بے آواز گزر گیا جن کی اوٹ میں وہ تینوں بیٹھے تھے۔ دونوں آدمیوں نے اٹھ کر دیکھا۔ بادل کے ایک ٹکڑے کا سایہ رینگتا جارہا تھا۔ یہ ٹکڑا چاند کے آگے سے گزر گیا تھا۔

"کون تھا؟" — مریم نے سرگوشی میں پوچھا۔

"میرا خیال ہے بادل کا ٹکڑا چاند کے آگے سے گزرا ہے۔"

صبح کا اجالا نکھر رہا تھا۔ ایک جگہ چٹانوں نے اوٹ بنا رکھی تھی۔ دائیں، بائیں اور پیچھے تین چٹانیں تھیں۔ ان کے درمیان تنگ سی جگہ خالی تھی۔ تین درخت ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ تھے۔ درمیان والے درخت کے ساتھ مریم یوں کھڑی تھی کہ اس کی پیٹھ تنے کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ ہاتھ پیٹھ پیچھے بندھے تھے اور ایک رسّی اُس کے ٹخنوں اور تنے کے گرد لپٹی ہوئی تھی۔ اسی طرح ساتھ والے درختوں کے ساتھ وہ دونوں آدمی بندھے ہوئے تھے جو رات مریم کے ساتھ تھے۔ ان کے سامنے اسرائیل سلجوقی ٹہل رہا تھا۔ تین تیر انداز کمانوں میں تیر ڈالے آٹھ دس قدم دور کھڑے تھے۔

"میں جانتا تھا تم دونوں یہودی ہو" — اسرائیل سلجوقی نے ان دونوں سے کہا — "اور تم مسلمانوں کو آپس میں لڑانے کے ماہر ہو۔ میں نے تمہارے سپرد یہ کام کیا تھا کہ دو چار لڑکیوں اور دو چار آدمیوں کو تیار کرو جو سلطان محمود کی جڑیں کاٹیں مگر تم مجھے قتل کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ یہودی سانپ ہیں جو اپنے مالک کو بھی ڈس لیتے ہیں ..... اور اس ناگن کو دیکھو" اُس نے اپنی بیوی مریم کی طرف اشارہ کر کے کہا — "بیک وقت دو آدمیوں کی بیوی بنی رہی۔ تم ملکہ بننا چاہتی تھیں ..... ایسی خواہش کہ تمہیں یہ بھی یاد نہ رہا کہ تمہارا خاوند کون ہے"

"میں تمہیں آخری بار کہہ رہی ہوں کہ سلطان محمود کے دھوکے میں نہ آنا" — مریم نے غصّے سے چلّا کر کہا۔

"آج تم جو کچھ بھی کہو گی آخری بار کہو گی" — اسرائیل نے کہا — "اور میں تمہیں آخری بار بتا دیتا ہوں کہ میں تمہارے دھوکے کے باوجود توغان خان کو اپنا دوست اور سلطان محمود کو اپنا دشمن سمجھوں گا اور ایک روز لوگ سلطنتِ غزنی کو بھول جائیں گے اور سلطنتِ سلجوق کو یاد کیا کریں گے" — اُس نے گردن تان کر کہا — "میں سلطان محمود سے ایک خطّہ لے لوں گا اور وہی خطّہ غزنی کی فوج کا، سلطان محمود کا اور سلطنتِ غزنی کے عروج کا قبرستان بنے گا"

"تم جیسے جاہل اور گنوار قبائلی دوسروں کے لیے قبر کھود کر اس میں خود دفن ہُوا کرتے ہیں" ـــ درخت سے بندھے ہُوئے ایک یہودی نے کہا ـــ "سنو اسرائیل! تمہارا نام اسرائیل اس لیے ہے کہ تمہاری رگوں میں یہودی خون ہے۔ اس خون کی لاج رکھتے ہوئے میں تمہیں کام کی باتیں بتاتا ہوں تم نے ٹھیک کہا ہے کہ ہم دونوں یہودی ہیں اور ہم نے اپنے نام اور حُلیے مسلمانوں جیسے رکھے ہُوئے ہیں۔ ہم اسلام کے متعلق اتنا علم رکھتے ہیں جو تمہاری مسجدوں کے امام بھی نہیں رکھتے۔ ہم مسلمانوں کا ایمان خریدنے کے ماہر ہیں۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ ہماری باتیں تمہارے کسی آدمی نے سن لی تھیں اور ہم پکڑے گئے لیکن تم ہماری تعریف نہیں کرتے کہ ہم تمہیں تمہاری بیوی کے ہاتھوں قتل کرا رہے تھے؟ ...... میں تمہیں صاف بتا دیتا ہوں کہ تمہارا انجام قریب آگیا ہے۔ تم سُلطان محمود کو شکست نہیں دے سکتے۔ وہ ایمان کا پکّا ہے۔ ہم وہیں کامیاب ہوتے ہیں جہاں ایمان کچّا ہوتا ہے، اور جہاں ایمان کچّا ہوتا ہے وہاں شکست لازمی ہوتی ہے۔ ہمیں مسلمانوں کے ایمان کی پختگی اور ناپختگی کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں۔ ہمارا کام ہے کہ کچّے اور پکّے کو آپس میں ٹکراتے رہیں۔ شکست کچّے کی ہوتی ہے مگر ہم اُسے یقین دلائے رکھتے ہیں کہ تم سب سے زیادہ پکّے ہو"

"تم ذلیل یہودی!" ـــ اسرائیل نے دانت پیس کر کہا ـــ "مجھے طعنے دے رہے ہو!" ـــ اُس نے ایک طرف ہٹ کر تیراندازوں کو اشارہ کیا۔

تین تیر بیک وقت کمانوں سے نِکلے اور دونوں یہودیوں اور مریم کے سینوں میں اُتر گئے۔

"اور تیر نہ چلانا" ـــ اسرائیل سلجوقی نے کہا ـــ "انہیں یہیں بندھا رہنے دو۔ ان کی لاشیں گِدھ اور بھیڑیئے کھائیں گے"

دو چار مہینے ہی گزرے تھے کہ ہندوستان سے غزنی کی فوج کا ایک

آدمی آیا جو جاسوسی اور سراغ رسانی کے محکمے کا تھا۔ یہ سنایا جا چکا ہے کہ کالنجر کا مہاراجہ گنڈہ کسی پُراسرار خوف کے زیرِ اثر لڑے بغیر میدان چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ کسی بھی مورخ نے اُس کے بھاگ جانے کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں لکھی کہ اُس پر کوئی پُراسرار خوف طاری ہو گیا تھا۔ اس "پُراسرار خوف" کی وضاحت کسی بھی تحریر سے نہیں ملتی۔ بہر حال یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ سلطان محمود کو اتنی آسان فتح کبھی بھی حاصل نہیں ہوئی تھی۔

مہاراجہ گنڈہ کا اتحادی گوالیار کا مہاراجہ ارجن تھا۔ اُسے بھی بھاگنا پڑا تھا۔ سلطان محمود واپس غزنی چلا گیا تھا۔ اس کا ایک قلعہ دار ابوالقدر سلجوقی قنوج کے قلعے میں تھا۔ اُس نے اپنے جاسوس کالنجر اور گوالیار بھیج دیئے تھے۔ انہوں نے ابوالقدر سلجوقی کو جو اطلاعات اور معلومات دی تھی، وہ ایک جاسوس خود سلطان محمود کے پاس لایا تھا۔ یہ جاسوس اسی علاقے کا ایک مسلمان تھا۔ وہ ہندو رِشی کے بہروپ میں کالنجر گیا تھا۔

"مہاراجہ گنڈہ کالنجر پہنچتے ہی ہوش میں آ گیا تھا"۔ جاسوس نے سلطان محمود کو بتایا۔ "وہ جب میدانِ جنگ سے بھاگا تھا تو میں فوراً ہی کالنجر چلا گیا تھا اور اُس بڑے مندر میں جا ڈیرے ڈالے تھے جس میں کبھی کبھی مہاراجہ گنڈہ عبادت کے لیے جایا کرتا ہے۔ اس کی راجدھانی بھی خوف سے کانپ رہی تھی۔ مندروں کے سنکھوں اور گھنٹیوں نے ایسا واویلا بپا کیا تھا کہ سارا کالنجر ہراساں ہو گیا تھا۔ میں خود تو نہیں دیکھ سکا، مجھے بتایا گیا کہ مہاراجہ کو دو راتیں مندر میں رکھا گیا تھا....

"میں نے ایک روز شہر کی ایک گلی میں ایک عورت کو اپنے مکان کی دہلیز پہ بیٹھے بین کرتے دیکھا۔ میں چونکہ رِشی کے بہروپ میں تھا۔ اس لیے میں نے اس عورت سے رونے کی وجہ پوچھی۔ اُس نے دانت پیس کر کہا کہ تم سنت سادھو ہو، میرا بچہ واپس لا دو۔ پتہ چلا کہ پنڈتوں نے اپنا حساب کتاب کر کے مہاراجہ گنڈہ کو بتایا تھا کہ تین ایسے بچوں کی قربانی دینی ہے جن کی عمریں چھ ماہ سے زیادہ نہ

ہوں چنانچہ اُسی روز تین ماؤں کی گودیوں سے بچے اٹھا لیے گئے اور انہیں ذبح کر کے ان کا خون پانی میں ملا کر مہاراجہ گنڈہ کو اس میں نہلایا گیا۔ اس عورت نے مجھے کہا کہ میرے بچے کا خون کرنے والا اس دنیا میں سزا پائے گا....

"میں نے زیادہ وقت مندر میں گزارا۔ پنڈتوں کے ساتھ میرا دوستانہ ہو گیا۔ ان سے مجھے راج محل کی باتوں کا علم ہونے لگا.. سلطانِ غزنی دسمبر..!"

"عابدین!" سلطان محمود نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "یہ بھول جاؤ کہ میں کہاں کا سلطان ہوں، یا میں سلطان ہوں بھی یا نہیں۔ مجھے یوں ساری بات سناؤ جیسے اپنے کسی دوست کے ساتھ باتیں کیا کرتے ہو"

"میں کہہ رہا تھا کہ ہندوؤں کے مندروں کی دنیا کیسی پُراسرار ہے۔ ہم ایک سیدھے سادے مذہب کے لوگ وہاں جا کر چکرا جاتے ہیں۔ عورت کا اس مذہب میں بہت دخل ہے۔ نوجوان لڑکیاں وہاں کی اندھیری غلام گردشوں میں یوں پھرتی ہیں جیسے ویرانوں میں چمگادڑ اُڑتے پھرتے ہیں۔ میں مندر کی ایسی ہی ایک غلام گردش میں جا رہا تھا۔ کوئی میرے ساتھ ٹکرا گیا۔ وہ عورت تھی اور سسک رہی تھی۔ میرے ساتھ لپٹ گئی اور خوفزدگی سے کانپتی ہوئی سرگوشیاں کرنے لگی — مجھے بچا لو۔ میں مہاراجہ کے لیے نہیں مرنا چاہتی۔ مجھے اپنے گھر لے چلو۔ مجھے اپنے پاس رکھ لینا۔ میں مرنا نہیں چاہتی....

"میں سمجھ گیا کہ یہ کسی کی نوجوان اور کنواری بیٹی ہے جسے پنڈت اس کی قربانی دینے کے لیے پکڑ لائے ہوں گے.... آپ مجھے مجرم کہیں گے لیکن سلطانِ عالی مقام! میں نے اپنا وہ فرض نظر انداز کر دیا جس کے لیے میں مندر میں ٹھہرا تھا۔ میں نے اسے اپنا فرض سمجھا کہ ایک انسانی جان کو ایک جھوٹے اور بے بنیاد مذہب پر قتل ہونے سے بچاؤں۔ یہ ایک نیکی تھی اور میرا عقیدہ ہے کہ نیکی کر دو تو جزا اللہ ہے۔ میں نے اپنے اللہ کو پکارا اور عرض کی کہ خدائے ذوالجلال! زندگی اور موت تیرے اختیار میں ہے۔

یہاں انسان بُت بنا کر انسانوں کو ان کے لیے ذبح کر رہے ہیں۔ اگر میں یہ نیکی کر گزروں تو مجھے صرف یہ جزا عطا کر کہ جس مقصد کے لیے یہاں آیا ہوں وہ پورا ہو جائے .....

"اس تاریک غلام گردش میں مجھے امید کی کرن نظر آئی۔ لڑکی کہہ رہی تھی ـــ 'مجھے لے چلو۔ جہاں جی چاہے لے چلو۔ یہاں سے لے چلو۔ یہاں سے نکال لو۔ میں بھاگ آئی ہوں۔ وہ مجھے ڈھونڈ رہے ہوں گے' ـــ اُس کا جسم کانپ رہا تھا جیسے بے لباس ہو کر سرد پانی میں کھڑی ہو۔ مجھے تیز تیز قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے لڑکی سے کہا کہ وہ دل مضبوط کرے اور خاموش ہو جائے۔ اُسے اپنے بازو میں لے کر میں ایک طرف ہو گیا۔ وہاں سے دیوار کٹی ہوئی تھی جیسے غار بنا ہوا تھا۔ وہ ایک کمرہ سا تھا۔ باہر سے آواز آئی ـــ 'یہاں دیکھ لو۔ جا کہاں سکتی ہے' .....

"میں نے رشیوں کا جو لباس پہن رکھا تھا اس کے اندر خنجر تھا جو میں نے نکال لیا۔ باہر شاید دو آدمی تھے۔ ایک وہیں اندر آ گیا جہاں میں لڑکی کو لے کر چھپا تھا۔ گُپ اندھیرا تھا۔ وہ مجھے دروازے میں جس کے کواڑ نہیں تھے، سیاہ بھوت کی طرح نظر آیا۔ بولا ـــ 'اندر کون ہے' ـــ وہ آگے آیا تو میں نے اسے خنجر مارنے کی بجائے پیچھے ہو کر اس کی گردن دبوچ لی۔ باہر سے آواز آئی ـــ 'ہے یا نہیں' ! میں نے جواب دیا ـــ 'نہیں ہے۔ تم باہر کو دوڑو' ـــ مجھے باہر دوڑتے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ وہ جس کی گردن میرے ہاتھوں کے شکنجے میں آگئی تھی، تھوڑی دیر تڑپ کر مر گیا...

"میں نے جلدی جلدی اُس کے کپڑے اتارے اور لڑکی کو پہنا دیئے۔ اُس کا چہرہ مسخ کرنا ضروری تھا۔ اُس کے بال کھلے ہوئے تھے۔ میں فرش کی مٹی پر ہاتھ پھیر پھیر کر اُس کے منہ اور بالوں پر ملتا رہا۔ ایک کپڑا اُس کے سر پر ڈال دیا۔ جسے میں نے مار دیا تھا، اُس کے گلے سے موٹے موتیوں کی مالا اتار کر لڑکی کے گلے میں ڈال دی اور اُسے باہر لے آیا۔ مجھے ان راستوں

کا علم تھا۔ میں اُسے روشن راستے میں لے گیا اور وہاں میں اُسے مندر کے ایسے ویران اور ہیبت ناک حصے میں لے گیا جہاں فرش پر نمی کی وجہ سے سبز کائی جمی ہوئی تھی۔ میں نے کائی پر ہاتھ پھیر کر لڑکی کے چہرے کا رنگ صدیوں پرانی دیواروں اور فرشوں جیسا کر دیا اور اُس کے بالوں میں مٹی ڈال کر اُسے سادھنی بنا دیا.....

"وہ خوبصورت لڑکی تھی اور اس کی عمر چودہ پندرہ سال تھی۔ مندر کے اندر اور باہر اُس کی تلاش میں بھاگ دوڑ شروع ہو چکی تھی۔ پنڈت اور اُن کے چیلے گھبرائے گھبرائے اِدھر اُدھر دوڑتے پھر رہے تھے۔ وہ ہمارے قریب سے بھی گزرے۔ لڑکی کو کوئی بھی نہ پہچان سکا۔ میں اُسے مندر کے احاطے سے نکال کر شہر کے قریب ہی جنگل میں لے گیا۔ لڑکی نے بتایا کہ اُسے ایک دو روز بعد مندر میں ذبح کیا جانا تھا۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ اُس کے ماں باپ اُسے قربانی دینے کے لیے بالکل تیار نہیں تھے۔ اُس کا باپ گنگو کے دربار میں کسی اچھے رُتبے پر تھا۔ اُسے ڈرا کر اور اُسے رُتبے سے محروم کر دینے کی دھمکی دے کر لڑکی کو اُس سے لیا گیا تھا....

"میں نے شام کے بعد اُس کے گھر جا کر اُس کے باپ کو بتایا کہ اُس کی لڑکی جنگل میں ہے۔ وہ بہت ڈرا ہوا تھا۔ اُس نے بتایا کہ اُس کے گھر کی تلاشی ہو چکی ہے باپ بہت پریشان تھا۔ کہتا تھا کہ وہ لڑکی کو اب اپنے گھر نہیں رکھ سکتا کیونکہ پکڑا جائے گا اور مہاراجہ اُسے بڑی اذیّت ناک سزا دے گا۔ وہ اس پر حیران تھا کہ میں رِشی تھا اور لڑکی کو قربانی سے بچا لایا تھا۔ میں نے اُسے بتا دیا کہ میں رشی نہیں ہوں۔ ابھی اُسے یہ نہیں بتایا تھا کہ میں کون ہوں۔ اُس نے رو کر کہا کہ اُس کی ایک بیٹی اور بھی ہے جس کی عمر سترہ سال ہے۔ اُس کے گھر کی تلاشی لینے والے اُسے کہہ گئے ہیں کہ تمہاری وہ بیٹی نہ ملی تو اس بیٹی کی قربانی دی جائے گی۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ پسند کرے تو

میں اُسے بھی محفوظ جگہ پہنچا سکتا ہوں....

"وہ سزا سے بھی ڈرتا تھا۔ بہر حال وہ تیار ہو گیا اور اُس نے پوچھا کہ اُسے کہاں پناہ مل سکتی ہے۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں اُسے قنوّج کے قلعے میں لے جا سکتا ہوں۔ اُسے اپنی بیٹیوں سے بہت پیار تھا، حالانکہ ہندو اپنی جان بچانے کے لیے اپنی عورتوں کو چھوڑ کر بھاگ جایا کرتے ہیں۔ وہ مجھے انعام پیش کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ اپنا انعام بعد میں بتاؤں گا....

"اُس کے خاندان کو میں نے چوری چھپے وہاں سے نکالا۔ وہ بہت بڑے رتبے کا آدمی تھا۔ اُس نے گھوڑا گاڑی کا انتظام کر لیا تھا۔ راستے میں ایک پڑاؤ کیا تو اُس نے بتایا کہ وہ بے شمار سونا اور نقدی ساتھ لایا ہے۔ میں نے اُسے کہا کہ مجھے ان چیزوں کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں۔ میں نے اُسے یہ بھی بتا دیا کہ میں مسلمان ہوں۔ تب اُسے بتایا کہ میرا مقصد کیا ہے۔ اُس نے خوش ہو کر کہا کہ وہ میرا مقصد پورا کر سکتا ہے، کیونکہ وہ مہاراجہ گنڈہ کے اندر کے راز جانتا ہے۔ اُس نے بتایا کہ مہاراجہ گنڈہ میدانِ جنگ سے ایک ایسا خوف لے کر بھاگ آیا تھا جس کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ تم چونکہ ہندوستان کے ہی رہنے والے ہو اس لیے تمہیں معلوم ہو گا کہ ہمارے بعض سادھو، سیناسی، یوگی، جوگی اور پنڈت ایسا علم جانتے ہیں جس کا عمل کسی پر کیا جائے تو اُس کا دماغ کچھ عرصے کے لیے بے کار ہو جاتا ہے۔ یہ علم ہر کوئی حاصل نہیں کر سکتا۔ بعض یوگی ہمالیہ کی اُن بلندیوں پر چلے جاتے ہیں جہاں برف کبھی نہیں پگھلتی۔ یہ لوگ وہاں ننگے رہتے ہیں اور ایسی طاقت حاصل کر لیتے ہیں جو دُور بیٹھے دوسروں پر اثر کرتی ہے....

"مہاراجہ گنڈہ اتنا کمزور آدمی نہیں کہ اتنی زیادہ فوج کے ہوتے ہوئے بغیر لڑے بھاگ آتا۔ وہ جب بھاگ کر آیا تھا تو کالنجر کے لوگوں پر ایسی دہشت طاری ہو گئی تھی کہ لوگ گھروں سے بھاگ جانے کی تیاریاں

کرنے لگے تھے۔ افواہ پھیل گئی تھی کہ غزنی کی فوج کالنجر کی طرف آرہی ہے۔ ایک یوگی نے بتایا کہ مہاراجہ پر کسی نے عمل کر دیا ہے۔ اُس نے اس کا توڑ شروع کر دیا۔ اس کے لیے تین دودھ پیتے بچوں کو قربان کیا گیا۔ عمل کا اثر اُتر گیا۔ پھر یہ بھی پتہ چلا کہ یہ کس نے کیا تھا۔ یہ ایک رانی نے کرایا تھا جو اپنے بیٹے کو مہاراجہ کا جانشین بنانا چاہتی تھی لیکن مہاراجہ نے دوسری رانی کے بیٹے کو راجکمار بنا دیا۔ مہاراجہ نے اس رانی کو اور اُس کے بیٹے کو قتل کرا دیا ہے۔ رانی نے مہاراجہ سے کہا تھا کہ وہ اُسے قتل کر دے اُس کے بیٹے کو زندہ رہنے دے۔ مہاراجہ نے اُسے یہ شرط بتائی کہ وہ اُس یوگی کا سراغ دے دے جس نے اس کے دماغ کو اور اُس کی فوج کو کیل دیا تھا....

" رانی نے بتا دیا۔ وہ یہی یوگی تھا جو اَب اُس عمل کا توڑ کر رہا تھا۔ مہاراجہ وعدے سے پھر گیا۔ اُس نے رانی کو در پردہ قتل کرا کے اُس کے بیٹے کو بھی قتل کرا دیا ہے۔ جب یوگی نے عمل کا اثر ختم کر دیا تو مہاراجہ نے اُسے بھی قتل کرا دیا۔ پھر بڑے پنڈت مہارشی نے اُسے بتایا کہ اب ایک نوجوان کنواری کی قربانی ضروری ہے۔ اُس نے لڑکی کی کچھ نشانیاں بتائیں اور میری چھوٹی بیٹی کی نشاندہی کی کہ یہ ہے وہ لڑکی جو دیوتاؤں نے مانگی ہے۔ بس سمجھتا تھا کہ اُس نے میری بیٹی کی نشاندہی کیوں کی ہے۔ اُس نے ایک بار مجھ سے بڑی بیٹی مانگی تھی۔ میں نے انکار کر دیا تھا۔ تم مسلمان ہو۔ تم نہیں جانتے کہ ہم دیوتاؤں کو ناراض کر دیں تو کچھ نہیں ہوتا۔ اگر پنڈت کو خفا کر دیں تو ہم پر آسمان ٹوٹ پڑتا ہے۔ ہمارا مذہب ہمارے پنڈت کا حکم اور خواہش ہے....

" پھر سلطانِ محترم! اُس نے مجھے بتایا کہ ہوش آتے ہی مہاراجہ گنڈا نے اپنی فوج کو اکٹھا کیا اور بتایا کہ اُسے ایک یوگی نے کیل دیا تھا۔ اُس نے اپنی فوج سے کہا کہ مسلمان خوش ہوں گے کہ انہیں لڑے بغیر فتح ہوئی

ہے۔ اب میں انہیں پھر للکاروں گا اور وہ پہلے والی فتح کے نشے میں بدمست ہو کر آئیں گے اور تم انہیں ہلاک کرو گے، انہیں زندہ پکڑو گے اور یہاں ان گلیوں میں تم انہیں ٹٹوؤں اور گدھوں کی طرح اپنی گاڑیوں اور ہلوں کے آگے جوتو گے۔ ہر ہر مہادیو نے مجھے اشارہ دے دیا ہے کہ اب غزنی کے مسلمان یہاں تباہ ہونے کے لیے آئیں گے ....

"اس نے ایسے الفاظ کہے کہ فوج جوش سے بھر گئی۔ یہاں تک کہ جو جوان آدمی فوج میں نہیں تھے وہ بھی فوج میں شامل ہو گئے۔ پھر وہ گوالیار مہاراجہ ارجن کے پاس چلا گیا۔ بہت دنوں بعد واپس آیا تو اس نے بتایا کہ گوالیار میں بھی وہ وہاں کی فوج اور وہاں کے لوگوں میں ایسی ہی آگ لگا آیا ہے۔ پھر وہ لاہور چلا گیا۔ وہاں سے اسے یہ مایوسی ہوئی کہ مہاراجہ ترلوچن پال نے اس کا اتحادی بن کر لڑنے سے انکار کر دیا لیکن اسے اپنی بہت سی فوج اور سامان دے دیا ہے۔ مہاراجہ ترلوچن پال نے اسے مالی امداد دینے کا بھی وعدہ کیا ہے .....

"سلطان عالی مقام! اس ہندو نے مجھے بتایا کہ لاہور کی فوج دوآبہ گنگا جمنا میں آ گئی ہے اور یہ کالنجر میں آ جائے گی۔ مہاراجہ گنڈہ نے کہا ہے کہ اب وہ غزنی کی فوج کو شکست دے کر سارے ہندوستان میں پھر جائے گا اور نہ کوئی مسجد کھڑی رہنے دے گا نہ کسی مسلمان کو زندہ چھوڑے گا....

"میں نے اس سے پوچھا، کیا مہاراجہ گنڈہ بڑ ہانک رہا ہے یا وہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ کر گزرنے کے قابل ہے؟ اس نے جواب دیا کہ ہاں وہ اس قابل ہو گیا ہے۔ اس نے یہاں تک ارادہ کر رکھا ہے کہ مہاراجہ ارجن کو ساتھ ملا کر لاہور پر بھی قبضہ کر لے گا۔ غزنی کی فوج کے جو چند ایک دستے یہاں قنوج، باری، متھرا، نگر کوٹ، بھیرہ اور ملتان میں ہیں انہیں فوراً ختم کر دیا جائے گا۔ آپ کے اس کے ارادے بڑے خطرناک ہیں۔ اب تو عورتیں بھی لڑنے کی

تیاریاں کر رہی ہیں۔"

*

اس جاسوس نے جس کا نام عابدین تھا، سلطان کو بتایا کہ اس ہندو کو قنوج پہنچا دیا گیا اور اس کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا گیا۔ اُس نے سالار ابوالقدر سلجوقی کو سونا اور نقدی پیش کی اور کہا کہ اس کے عوض وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ اُس کی بیٹیوں کو پریشان نہ کیا جائے۔ اُس سے نہ کسی نے سونا لیا نہ نقدی اور اس کی بیٹیوں کو باعزّت طریقے سے رکھا گیا۔ اُس نے ایسا اثر قبول کیا کہ وہ اپنا مذہب چھوڑنے کے لیے تیار ہو گیا۔ قلعے کے امام نے اُسے اس کے تمام کنبے سمیت مسلمان کر لیا۔

"سلطانِ محترم!"— عابدین نے کہا —"ہم نے اُس کی ہر بات پر یقین نہ کیا، بلکہ اس کی بتائی ہوئی جگہوں پر جا کر دیکھا تو اس کی ہر بات سچ نکلی۔ ہمارے جو آدمی گوالیار میں ہیں، انہوں نے بتایا کہ جنگی تیاریاں زوروں پر ہیں اور ہندوؤں کے ارادے یہ ہیں کہ سب سے پہلے غزنی کے اُن دستوں کو ختم کیا جائے گا جو مختلف جگہوں پر موجود ہیں۔ پھر سارے ملک میں مسلمانوں کے بچّے بچّے کو قتل کر دیا جائے گا۔ اگر کوئی مسلمان ہندو مت قبول کر لے گا تو اُسے بھی زندہ نہیں چھوڑا جائے گا۔ اس کے بعد تمام ملک کی فوج غزنی کی طرف کوچ کرے گی۔ ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ لوگوں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلائی جا رہی ہے۔ مندروں میں مسلمانوں کا ذکر پنڈتوں کی زبان سے یوں ہوتا ہے جیسے مسلمان کا قتل ثواب کا کام ہے۔"

"کیا تم بتا سکتے ہو کہ جنگی تیاریاں کس مرحلے میں ہیں؟"— سلطان محمود نے عابدین سے پوچھا —"کیا تم جنگی انداز سے بات کر سکتے ہو؟"

"یقیناً کر سکتا ہوں"— عابدین نے جواب دیا —"مہاراجوں کی تیاریاں تقریباً آخری مرحلے میں ہیں۔ جو نئے لوگ فوج میں شامل ہوئے ہیں وہ اچھے گھوڑ سوار ہیں، تیر اندازی اور تیغ زنی میں بھی اچھے ہیں لیکن ابھی کچّے ہیں۔

ابھی وہ فوج کی شکل میں لڑنے کے قابل نہیں ہوئے۔ انہیں میدانِ جنگ کی سختیاں برداشت کرنے کی تربیت دی جا رہی ہے۔ سالار ابوالقدر سلجوقی اور دوسری جگہوں کے کمانداروں نے مجھے کہا تھا کہ میں آپ کو مشورہ دوں کہ آپ فوراً کوچ کر آئیں تو ہندوؤں کو سر اٹھانے سے پہلے دبوچا جا سکتا ہے۔ خطرہ یہ ہے کہ ہندو مسلمانوں کو فوراً ہی قتل کرنا شروع نہ کر دیں۔ ہم فوج کو مروا سکتے ہیں لیکن یہ ہماری برداشت سے باہر ہوگا کہ کسی نہتے مسلمان کا خون بہہ جائے۔ ہمیں یہاں مسجدوں اور مسلمانوں کی حفاظت کرنی ہے۔ اگر ہندوؤں نے مسلمانوں پر حملے شروع کر دیئے تو وہ مسلمان خواتین کو اٹھا لے جائیں گے، پھر تاریخ تاقیامت ہم پر لعنت بھیجتی رہے گی۔"

"ہمیں اب لاہور میں اپنی حکومت قائم کرنی پڑے گی۔" سلطان محمود نے کہا۔ "اور ہمیں بہت جلد کوچ کرنا پڑے گا۔"

*

سلطان محمود نے اپنے سالاروں کو کوچ کی وجہ بتائی اور فوری کوچ کے احکام دے کر کہا کہ کوچ بہت تیز ہوگا۔ پڑاؤ بہت کم ہوں گے۔ سوار اور سپاہی چلتے چلتے کچھ کھا لیا کریں گے اور منزل کا نجر ہوگی جہاں کے قلعے کا محاصرہ کر لیا جائے گا۔ محاصرے کے دوران فوج آرام کرے گی۔ سلطان محمود نے سب کو نقشے پر کوچ کا راستہ دکھایا اور وہ جگہیں بتائیں جہاں پڑاؤ کرنے تھے۔

ان سے فارغ ہوا ہی تھا کہ اسرائیل سلجوقی کا پیغام آگیا۔ پیغام لانے والا کوئی ذمہ دار آدمی تھا۔ اس نے اسرائیل کا پیغام زبانی دیا۔ "اگر سلطان میری طاقت سے خائف ہو کر سلجوقیوں کو وطن دے رہے ہیں تو میں ایسا وطن قبول کر لوں گا، اور اگر سلطان کو اپنی جنگی طاقت پر ناز ہے اور مجھے بھیک کے طور پر زمین کا خطہ دے رہے ہیں تو میں ایسا وطن قبول نہیں کروں گا۔ میں غزنی کی سلطنت کا طفیلی یا اتحادی بھی نہیں بنوں گا۔ میں اپنی قوم کے لیے خود ایک وطن حاصل کرنے کی طاقت رکھتا ہوں۔ مجھے سلطان کا جواب چاہیئے کہ آپ مجھ پر

کیوں مہربان ہوئے ہیں۔ میں آپ کو پھر بتا دیتا ہوں کہ میرے پاس غزنی کی فوج کے ساتھ ٹکر لینے کے لیے کافی فوج ہے۔"

سلطان محمود کو ہنسی آ گئی اور بولا۔ "اسرائیل سلجوقی میں جرأت بھی ہے اور طاقت بھی ہے لیکن اس میں عقل کی کمی ہے۔ اُسے کہنا کہ نہ میں اُسے کمزور سمجھتا ہوں نہ اپنے آپ کو۔ میں اس خطے میں امن قائم کرنا چاہتا ہوں ہماری آپس کی لڑائیوں سے کفار فائدہ اٹھا رہے ہیں .... اور اسرائیل سلجوقی کو میرا سلام دے کر کہنا کہ میں ہندوستان جا رہا ہوں۔ میری واپسی کا انتظار کرے۔ میں ان علاقوں میں اس کی حیثیت کو تسلیم کرتا ہوں۔ میری غیر حاضری میں کوئی نقل و حرکت نہ کرے۔"

مؤرخ لکھتے ہیں کہ سلطان محمود کو یہ خدشہ نظر آ رہا تھا کہ اس کی غیر حاضری میں اسرائیل سلجوقی غزنی پر حملہ کر دے گا۔ سلطان کو معلوم تھا کہ سلجوقیوں کی جنگی طاقت بہت زیادہ ہو گئی ہے اور وہ چھوٹے موٹے حکمرانوں سے تلوار کی نوک پر اپنی شرائط منوا سکتے ہیں چنانچہ سلطان محمود نے اسرائیل کے ایلچی کو سبز باغ دکھا کر بتایا کہ وہ سلجوقیوں کی ہر شرط مانے گا۔ ایلچی نے واپس جا کر اسرائیل کو بھی سبز باغ دکھائے۔ اسرائیل مطمئن ہو گیا اور اُس نے کہا کہ وہ سلطان محمود کی واپسی کا انتظار کرے گا۔

*

یہ ۲۳-۱۰۲۲ عیسوی (۱۴۱۴ ھجری) کا واقعہ ہے کہ سلطان محمود غزنوی نے ایک بار پھر وہ برق رفتار پیشقدمی کی جس پر آج کے دور کے جنگی مبصر اور مؤرخ حیران ہیں۔ اگر وہ راستہ دیکھا جائے جس راستے سے وہ کالنجر پہنچا تھا تو یقین نہیں آتا کہ اُس دور میں جب فوج گھوڑوں پر سوار ہوتی اور پیدل بھی چلتی تھی، اتنی زیادہ رکاوٹیں عبور کر کے یہ فوج اتنی تیز رفتاری سے آئی تھی وہ کالنجر جانے کی بجائے پہلے گوالیار گیا جو مہاراجہ گنڈہ کے ایک طاقتور اتحادی مہاراجہ ارجن کی راجدھانی تھی۔ غزنی سے گوالیار تک اُسے کئی ایک

چھوٹے دریا عبور کرنے پڑے۔ صرف بڑے دریا گنے جائیں تو آٹھ بنتے ہیں ۔۔۔ سندھ، جہلم، چناب، راوی، ستلج، گنگا، جمنا اور گمبل ۔۔ دریائے گمبل گوالیار کے قریب سے گذرتا اور آگے جاکر جمنا میں شامل ہو جاتا ہے۔

گوالیار کا قلعہ آج بھی کھڑا ہے۔ یہ بڑی سخت چٹانوں پر تعمیر کیا گیا ہے اور اُس دور میں اسے بجا طور پر ناقابلِ تسخیر سمجھا جاتا تھا۔ مہاراجہ ارجن کو اُس وقت پتہ چلا کہ غزنی کی فوج آگئی ہے جب یہ فوج قلعے کو محاصرے میں لے چکی تھی۔ سلطان محمود بڑے اچھے وقت پہنچا تھا۔ گوالیار اور کالنجر کی فوجوں کو اکٹھے ہو کر سلطان محمود کا مقابلہ کرنا تھا لیکن دونوں فوجیں ابھی اپنی اپنی راجدھانیوں میں تھیں اور لڑنے کے لیے تیار نہیں تھیں۔

سلطان محمود نے دیکھ لیا تھا کہ اس قلعے کو سر کرنا بہت ہی مشکل ہے۔ جن چٹانوں پر یہ قلعہ تھا ان پر پاؤں جما کر ٹھہرنا بہت مشکل تھا۔ اس کے باوجود سلطان محمود نے فوج کو حکم دیا کہ پوری بلند آواز سے نعرے لگائے جائیں اور قلعے پر ہلّہ بول دیا جائے۔ قلعے کی دیواروں سے تیروں کا مینہ برس رہا تھا مگر غزنی کے سپاہی آگے بڑھ بڑھ کر دروازے توڑنے کی کوشش کرتے تھے۔ دو ہاتھیوں کو پہلو بہ پہلو جوت کر ان کے درمیان درختوں کے بہت بڑے بڑے تنے باندھے گئے۔ ہاتھی دوڑتے دروازے کی طرف جاتے اور تنوں کے اگلے سرے دروازے سے ٹکراتے مگر دروازے مضبوط تھے۔

تیراندازوں نے آگے جاکر قلعے کی دیواروں کے اوپر تیر برسائے۔ تکبیر کے نعروں سے زمین و آسمان دہل رہے تھے۔ چار روز تک یہی کیفیت رہی۔ پانچویں دن کا سورج طلوع ہوا تو قلعے پر سفید جھنڈا لہراتا نظر آیا۔ سلطان محمود نے حکم دے دیا کہ لڑائی بند کر دی جائے۔ قلعے کی دیواروں سے اب کوئی تیر نہیں آرہا تھا۔ قلعے کا دروازہ کھلا اور ایک پالکی باہر آئی جسے چار آدمیوں نے کندھوں پر اٹھا رکھا تھا۔ یہ پالکی سلطان محمود کے سامنے اتاری گئی۔ اس میں سے ایک آدمی باہر آیا جو مہاراجہ کے دربار کا معلوم ہوتا تھا۔ وہ ایلچی تھا اور صلح کا پیغام

لایا تھا۔ وہ اپنے ساتھ تحفے کے طور پر پینتیس ہاتھی لایا تھا۔ مہاراجہ ارجن کے اس ایلچی اور سلطان محمود کے درمیان ایک ترجمان کے ذریعے جو باتیں ہوئیں، وہ ایک دستاویز میں محفوظ ہیں۔ یہ شام کی قدیم زبان میں لکھی ہوئی ہے اور اس کا ترجمہ ڈاکٹر اے۔ ایس۔ ٹرائیٹون نے انگریزی میں کیا ہے۔ ڈاکٹر موصوف علی گڑھ یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر رہ چکے ہیں۔ اس کا ترجمہ یوں ہے:

"سلطان محمود غزنوی نے قلعے (گوالیار) پر ایسے طوفانی ہلے بولے کہ چار روز بعد مہاراجہ (ارجن) کا ایک سفیر پالکی میں باہر آیا۔ پالکی چار آدمیوں نے اٹھا رکھی تھی۔ سفیر نے سلطان محمود سے پوچھا کہ آپ کیا چاہتے ہیں اور ہم پر حملے کا مقصد کیا ہے۔ سلطان نے کہا۔ "میں مسلمان ہوں۔ میں آپ کو کافر سمجھ کر دعوت دیتا ہوں کہ بت پرستی ترک کر کے خدا کی عبادت کریں جس طرح ہم کرتے ہیں۔ آپ ہمارا شرعی قانون تسلیم کریں اور گائے کو پوجنے کی بجائے اس کا گوشت کھائیں۔" سفیر نے کہا۔ "ہم گائے کا گوشت نہیں کھا سکتے۔ آپ اپنا کوئی عالم ہمارے پاس بھیجیں جو ہمیں بتائے کہ آپ کا مذہب کیسا ہے۔ اگر یہ ہمارے مذہب سے بہتر ہوا تو ہم اسے قبول کر لیں گے"۔....

"سلطان محمود نے فوج کے ایک امام کو قلعے میں بھیج دیا۔ شام کو امام مہاراجہ کا یہ جواب لے کر باہر آیا کہ ہم آپ کا مذہب قبول نہیں کر سکتے۔ ہم آپ کو تین سو ہاتھی اور کئی من چاندی پیش کرتے ہیں۔ آپ محاصرہ اٹھا لیں"۔ سلطان محمود نے پیغام بھیجا۔ "مجھے منظور ہے لیکن اس شرط پر کہ آپ ہمارا لباس پہنیں اور ہماری طرح کمر کے ساتھ تلوار باندھیں اور ہندوستان کی رسم کے مطابق اپنے ایک ہاتھ کی سب سے چھوٹی انگلی کا اگلا سرا کاٹ کر میرے حوالے کر دیں تاکہ مجھے اعتبار آجائے کہ آپ صلح چاہتے ہیں اور آئندہ میرے خلاف نہیں لڑیں گے"۔....

"سلطان محمود کا جو سفیر (نام نہیں لکھا) پیغام لے کر مہاراجہ ارجن کے پاس گیا، اس کا بیان ہے۔ "میں جب ہندوستان کے اس بادشاہ

(مہاراجہ ارجن) کے پاس گیا تو چاندی کے تخت پر ایک بڑا ہی خوبرو جوان بیٹھا تھا۔ اُس کے نکھرے سانولے رنگ میں بھی حُسن تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ میں وہ لباس لایا ہوں جو آپ کو پہننا ہے اور اپنی انگلی کاٹنی ہے۔ اُس نے مجھے کہا کہ اپنے سلطان سے کہ دینا کہ میں نے آپ کا بھیجا ہوا لباس پہن کر انگلی کاٹی ہے۔ میں نے اُسے کہا کہ میں اپنے سلطان کو دھوکہ نہیں دوں گا۔ آپ کو ہمارا لباس پہننا پڑے گا ....

"اُس نے بادلِ نخواستہ ہمارا لباس پہن لیا اور کمر کے ساتھ ہماری تلوار باندھ لی۔ مجھے اُس کی بے بسی پر ترس آگیا۔ میں اُسے کہنا نہیں چاہتا تھا کہ وہ اپنی انگلی کاٹے۔ اُس نے خود ہی ایک ملازم سے کہا کہ اُسترا لے آؤ۔ اُسترا آیا تو اُس نے اس سے اپنے بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی کے تین حصّوں میں سے اُوپر والا حصّہ بڑے اطمینان سے کاٹ دیا۔ میں نے اُس کے چہرے پر درد کا ہلکا سا تاثر بھی نہ دیکھا۔ اُس نے کٹی ہوئی انگلی ایک دوائی میں ڈال دی پھر اس پر ایک سفوف چھڑک کر پٹی باندھ دی۔ اُس نے انگلی کا کٹا ہوا حصہ ایک کپڑے میں لپیٹ کر مجھے دے دیا اور رسم کے مطابق اُس نے مجھے بیش قیمت کپڑے، چاندی اور دو گھوڑے دیئے۔"

اُس وقت کے ایک اور مورخ سبط ابن الجوزی نے یہی واقعہ لکھا ہے اور اس نے یہ اضافہ کیا ہے کہ سلطان محمود کے پاس کٹی ہوئی انگلیوں کے بہت سے ٹکڑے تھے۔ یہ ہندو مہاراجوں کی رسم تھی کہ جس سے شکست کھاتے اُسے اپنی چھوٹی انگلی کا اُوپر والا حصہ کاٹ کر دے دیتے تھے۔

*

سلطان محمود نے مہاراجہ ارجن کو اپنے تابع کر کے کالنجر کا رُخ کیا۔ کالنجر کا قلعہ بہت وسیع و عریض تھا۔ اس کے اندر کی آبادی پانچ لاکھ سے زیادہ تھی۔ بیس ہزار مویشی اور پانچ سو ہاتھی تھے۔ سلطان محمود نے اس قلعے کا محاصرہ اس طرح کیا کہ قلعے کے اندر جانے والے تمام راستے بند کر دیئے۔

یہ دراصل مضبوط دیواروں کے اندر بہت بڑا شہر تھا۔ سلطان نے مہاراجہ گنڈہ کے لیے پیغام بھیجا جو قلعے کے صدر دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر قاصد نے بلند آواز سے دیا:

"ہم آپ کو خبردار کرتے ہیں کہ قلعے کے اندر ہم کسی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اپنی مخلوق کا قتلِ عام نہ کرائیں۔ ہم آپ کو دعوت دیتے ہیں کہ اسلام قبول کرلیں یا ہماری شرائط پر تاوان اور جزیہ ادا کریں۔"

پہلے چند دن مہاراجہ گنڈہ ڈٹا رہا مگر سلطان محمود کی فوج نے ہلّہ بولا تو مہاراجہ نے صلح کی خواہش ظاہر کر دی لیکن اسلام قبول نہ کیا۔ وہ سالانہ رقم مقرر کر کے غزنی کا باجگزار ہو گیا اور اُس نے تین سو ہاتھی پیش کیے۔ سلطان محمود نے گنڈہ کو بھی غزنی کا لباس بھیجا کہ وہ پہن کر اپنی چھوٹی انگلی کاٹ دے۔ گنڈہ نے یہ شرط قبول کر لی اور اپنی انگلی کاٹ کر بھیج دی۔

یہاں مہاراجہ گنڈہ نے سلطان محمود کے ساتھ ایک مذاق کیا۔ مورخ لکھتے ہیں کہ گنڈہ نے تین سو ہاتھی مہاوتوں کے بغیر قلعے سے نکالے اور سلطان کو پیغام بھیجا کہ اگر آپ کی فوج اتنی بہادر ہے تو ان ہاتھیوں کو پکڑے۔ سلطان محمود مان گیا۔ ہاتھی باہر آئے تو وہ بدمستی میں چیختے چنگھاڑتے اِدھر اُدھر بھاگنے دوڑنے لگے۔ معلوم ہُوا کہ ان ہاتھیوں کو کوئی نشہ پلایا گیا ہے جس سے یہ مستی میں آ گئے ہیں۔ ان تین سو ہاتھیوں نے غزنی کی فوج میں قیامت بپا کر دی۔ سلطان محمود نے حکم دیا کہ بہترین گھوڑسوار ان ہاتھیوں کو خیمہ گاہ سے نکالیں یا انہیں تیروں اور برچھیوں سے ہلاک کر دیں۔

سلطان محمود کی فوج میں ایک تاتاری دستہ بھی تھا (بعض مؤرخوں نے اسے ترک دستہ کہا ہے)۔ اُنہوں نے للکار کر کہا کہ ہم ہندوؤں پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتے کہ ہم ان کے ہاتھی پکڑ نہیں سکتے۔ چنانچہ بہت سے تاتاری (یا ترک) گھوڑوں پر سوار ہُوئے اور بڑی ہی مشکل اور غیر معمولی دلیری سے انہوں نے تمام ہاتھیوں پر قابو پا لیا۔ قلعے کی دیواروں سے ہندوؤں نے داد و تحسین کے نعرے

بلند کیے۔

مہاراجہ گنڈہ سے ہتھیار ڈلوا کر سلطان لاہور پہنچا۔ وہاں کا مہاراجہ ترلوچن پال وہاں سے بھاگ کر اجمیر چلا گیا۔ سلطان محمود نے لاہور میں اپنی حکومت قائم کر دی اور لاہور میں اپنا پہلا گورنر مقرر کیا۔ یہ تھا ایاز جسے سلطان محمود اس لیے بہت چاہتا تھا کہ اُس میں غیر معمولی ذہانت تھی اور سلطان اس کے تدبر سے بہت متاثر تھا۔

سلطان محمود لاہور میں بہت سی فوج چھوڑ کر مارچ، اپریل ۱۰۲۳ء میں غزنی واپس چلا گیا جہاں اسرائیل سلجوقی اُس کی سلطنت کے لیے تشویشناک خطرہ بن چکا تھا۔

سومنات کے دروازے پر

لاہور میں سلطنتِ غزنی کا پہلا گورنر مقرر کر کے جب سلطان محمود غزنوی غزنی پہنچا تو وہ اُس طرح مسرور اور مطمئن نہیں تھا جس طرح وہ ہندوستان پر ہر حملے کے بعد ہُوا کرتا تھا، حالانکہ اب کے اُس نے ہندوستان کے وسط میں جا کر وہاں کے تین بڑے ہی طاقتور مہاراجوں کو شکست دی اور اُس نے اپنے بدترین دشمن مہاراجہ لاہور کی قسمت سربمہر کر کے وہاں اپنا گورنر مقرر کر دیا تھا۔ اس کی یہ کامیابی غیر معمولی تھی مگر وہ خوش نظر نہیں آتا تھا۔

اُس کے دستِ راست، تاریخ ساز سالار ابوعبداللہ محمد الطائیؒ نے اُسے چند دن دیکھا، آخر ایک روز پوچھا کہ وہ کیوں پریشان سا لگ رہا ہے۔ سلطان نے ہلکی سی مسکراہٹ سے وجہ بتائی۔ اُس کی عمر پچپن برس ہو چکی تھی جسے وہ بڑھاپے کی عمر نہیں سمجھتا تھا لیکن وہ جسم میں کمزوری سی محسوس کرنے لگا تھا۔ تھکن بھی جلدی ہو جاتی تھی۔

سالار ابوعبداللہ نے اُسی وقت سلطان کے ذاتی طبیب کو بُلایا۔ طبیب نے سلطان کی نبض دیکھی۔ کچھ پُوچھا۔ دل کی دھڑکن محسوس کی اور کہا کہ طویل آرام کی ضرورت ہے۔ اعصاب بہت تھک گئے ہیں۔ جسم میں بیماریوں کے خلاف مدافعت کی صلاحیت کمزور ہو گئی ہے۔ اگر سلطان نے اعصاب کو آرام نہ دیا تو کسی وقت کوئی معمولی سی بیماری بھی جان لیوا ثابت ہو سکتی ہے۔

"میں آرام کی حالت میں نہیں مرنا چاہتا" — سلطان محمود نے کہا "موت سے میری ملاقات بستر پر نہیں ہونی چاہئیے۔ میں اپنے جسم کو آرام نہیں دے سکتا۔ جسم کو خاک میں مل جانا ہے۔ اس کی طاقت کم ہو گئی تو میں رُوح کی قوّت سے وہ فرض ادا کروں گا جو خدائے ذوالجلال نے مجھے سونپا ہے۔ شیخ الاسفند! مجھے یہ بتائیے کہ میری روح تو علیل نہیں؟"

"نہیں" — طبیب شیخ الاسفند نے جواب دیا — "میں آپ کو صحیح بات بتا دیتا ہوں۔ میں نے آپ کو آپ کی جسمانی کمزوری بہت کم بتائی ہے۔ آپ کا جسم کوچ، محاصروں اور جنگ کے قابل نہیں رہا۔ آپ روحانی قوّت سے لڑ رہے ہیں"

"میرے پیر و مُرشد شیخ ابوالحسن خرقانی اسے ایمان کی قوّت کہا کرتے ہیں" — سلطان محمود نے کہا — "جسم اتنا ہی کمزور ہوتا ہے جتنا انسان سمجھتا ہے۔ کمزوری اور درد ایک احساس کے دو نام ہیں۔ آپ درد کو جتنا شدید سمجھنا چاہتے ہیں درد اتنا ہی شدید ہو گا۔ محترم شیخ! میں آپ کو نہیں بلانا چاہتا تھا۔ ابو عبداللہ نے آپ کو میرے لیے بلایا ہے"

"آپ نے جسمانی کمزوری کا ذکر کیا تھا اس لیے میں نے انہیں بلانا ضروری سمجھا" — ابو عبداللہ نے کہا — "جسمانی کمزوری اچھی نہیں ہوتی"

"میں کچھ اور محسوس کر رہا ہوں" — سلطان محمود نے کہا — "مجھے ایک آخری مہم سر کرنی ہے۔ مجھے اپنی روح سے اشارے مل رہے ہیں کہ مجھے جو کچھ کرنا ہے جلدی جلدی کر لوں۔ ہندوستان کے بُت مجھے راتوں کو للکارتے ہیں۔ ڈرتا ہوں کہ اپنا فرض مکمل کرنے سے پہلے دُنیا سے اُٹھ جاؤں گا۔ مجھے فوجی طاقت چاہئیے۔ ہماری طاقت بکھری ہوئی ہے۔ مجھے ان سرداروں، امیروں اور حکمرانوں کو متحد کرنا ہے جو میری غیر حاضری میں غزنی کے لیے خطرہ بن جاتے ہیں۔ مجھے محسوس ہونے لگا ہے کہ میری عمر تھوڑی رہ گئی ہے اور میں اپنا فرض ادا نہیں کر سکا"

سالار ابو عبداللہ محمد الطائی نے سلطان محمود کو جذبات سے نکال لیا اور دونوں

اس مسئلے پر بات چیت کرنے لگے کہ فوجی طاقت میں کس طرح اضافہ کیا جائے اور سلطنتِ غزنی جن مخالفین میں گھری ہوئی ہے، ان کی سرکوبی کس طرح کی جائے۔ آخر دونوں اس فیصلے پر متفق ہو گئے کہ فوجی طاقت کی نمائش کی جائے اور ان پڑوسیوں کو مجبور کیا جائے کہ وہ غزنی کی اطاعت قبول کریں۔... سب سے زیادہ خطرہ اسرائیل سلجوقی کی طرف سے تھا جو ایک جنگی طاقت بن چکا تھا۔

*

۱۰۲۴ء کے اوائل میں ایک روز سلطان محمود ایک ایسی فوج کے ساتھ بلخ کی طرف جا رہا تھا جس کے نیچے زمین کانپ رہی تھی۔ اس فوج میں کوئی ایک بھی سپاہی پیادہ نہیں تھا۔ سب گھوڑسوار تھے اور ان کی تعداد ۵۴۰۰۰ ہزار تھی اور اس سوار فوج کے ساتھ ۱۳۰۰ جنگی ہاتھی تھے۔ یہ فوج خوبصورت لگتی تھی لیکن دشمن پر دہشت طاری کرتی تھی۔ یہ اُس فوج کے علاوہ تھی جو سلطنتِ غزنی کے بڑے بڑے شہروں، بڑی چوکیوں اور سرحدوں پر موجود تھی۔

اس سوار فوج کے آگے آگے ایلچی جا رہے تھے۔ راستے میں جو چھوٹی چھوٹی ریاستیں آتی تھیں، سلطان کے ایلچی اُن کے امراء کے پاس جا کر سلطان محمود کا یہ پیغام دیتے تھے کہ سلطانِ غزنی چوّن ہزار گھوڑسوار اور تیرہ سو جنگی ہاتھیوں کے ساتھ آ رہا ہے۔ اگر آپ اللہ کے نام پر کفّار کے خلاف جدوجہد کی خاطر غزنی کی اطاعت قبول کر کے غزنی کے ساتھ دوستی کا معاہدہ کریں تو آپ کی ریاست اور جاگیر قائم رہے گی ورنہ آپ غزنی کے قیدی ہوں گے اور آپ کے ساتھ وہ سلوک کیا جائے گا جو سلطانِ غزنی مناسب سمجھے گا۔

تمام مورخین نے لکھا ہے کہ اتنی ہیبت ناک جنگی قوّت دیکھ کر چھوٹے چھوٹے امرا اور والی بیش قیمت تحفے لے کر سلطان محمود کے استقبال کو آ گئے۔ اُس نے ان کے تحفے اور دوستی کو قبول کر کے انہیں کہا کہ وہ انہیں دریائے جیحون کے پار کسی جگہ ایک ضیافت میں مدعو کرے گا اور وہاں بتائے گا کہ اس کا ارادہ کیا ہے اور وہ کیا چاہتا ہے۔

سلطان دریا پار کر گیا۔ خوتوُن کا حکمران قدر خان مشہور جنگجو اور غزنی کا طاقتور دشمن تھا۔ اُس کے پاس جب سلطان محمود کے ایلچی پہنچے تو اُس نے بلاحیل وحجت سلطان کی اطاعت قبول کر لی اور تحفوں سے لدے ہوتے اونٹ لے کر سلطان کے استقبال کو آگیا۔ سلطان نے وہیں جہاں اسے قدر خان ملا تھا، فوج کو خیمہ زن کر دیا۔ وہ سرسبز اور حسین خطّہ تھا۔ سلطان نے اردگرد کے تمام اُمراء، والیان اور حکمرانوں کو وہاں مدعو کیا۔ سلطان کو جن کی طرف سے زیادہ خطرہ تھا وہ بلخ کا حکمران الپتگین تھا اور دوسرا اسرائیل سلجوقی۔ دونوں مل کر سلطان سے لڑ چکے تھے اور انہوں نے شکست کھائی تھی۔

اسرائیل سلجوقی کے متعلق پہلے بتایا جا چکا ہے کہ وہ سلجوقیوں کا بے تاج بادشاہ تھا۔ سلجوقیوں کا کوئی ملک نہیں تھا لیکن ہر حکمران ان سے خائف تھا کیونکہ سلجوقی زبردست جنگجو تھے۔ وہ پہاڑوں اور جنگلوں میں رہتے تھے۔ وہ ایک باقاعدہ جنگی طاقت بن گئے تھے۔ سلطان محمود ہندوستان کے مہاراجہ گنڈہ اور مہاراجہ ارجن کو شکست دینے اور انہیں اپنی اطاعت میں لانے کے لیے گیا تو اسرائیل اور الپتگین نے اُس کے خلاف جنگی تیاریاں مکمل کر لی تھیں۔ سلطان نے ان دونوں کی طرف ایلچی بھیجے اور انہیں ضیافت پر مدعو کیا۔

جب ایلچی نے الپتگین کو سلطان کا پیغام دیا تو اُس نے طنزیہ انداز میں پیغام سُنا۔ اس کے ساتھ اس کی ملکہ بیٹھی تھی۔

"کیا تمہارے سلطان نے درخواست کی ہے کہ ہم اُس کی دعوت قبول کریں؟" ——ملکہ نے پوچھا۔

"ملکۂ عالیہ!" —— ایلچی نے کہا "سلطانِ غزنی نے والئ بلخ وسمرقند الپتگین کو ضیافت میں مدعو کیا ہے۔ انہوں نے آپ کا ذکر نہیں کیا تھا۔"

"تمہارے سلطان کے ارادے کیا ہیں؟" —— الپتگین نے پوچھا۔

"جو سلطان چوّن ہزار بہترین گھوڑ سوار اور ایک ہزار تین سَو جنگی ہاتھی جن کے ہَودوں سے برچھیاں اور تیر برستے ہیں، اپنے ساتھ لایا ہے، اُس کے ارادے

سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہونی چاہیئے" ایلچی نے کہا۔ "آپ کا عزبروست قدر خان سلطان کی اطاعت قبول کر چکا ہے۔ میں یہ امید لے کر آیا ہوں کہ آپ اپنی فوج کا قتلِ عام نہیں کرائیں گے"

"قدر خان بُزدل ہے" حسین ملکہ نے کہا۔ "تمہارے سلطان کا مقابلہ ایک طاقتور بادشاہ کے ساتھ ہے"

"ملکۂ عالیہ!" ایلچی نے کہا۔ "یہ عورتوں کی لڑائی نہیں۔ میں بلخ و سمرقند کے بادشاہ سے مخاطب ہوں۔ مجھے حکم ملا ہے کہ جواب لے کر آؤں کہ آپ سلطان کی دعوت قبول کرتے ہیں یا نہیں"

"ہم آئیں گے" ایلتگین نے دوٹوک لہجے میں جواب دیا۔ "لیکن ہم یہ فیصلہ کر کے نہیں آئیں گے کہ ہم غزنی کی اطاعت قبول کرتے ہیں یا نہیں"

اور وہ سلطان محمود غزنوی کی ضیافت میں آگیا۔ اس کے ساتھ اُس کی ملکہ نہیں تھی۔ وہ چند ایک محافظوں کو اپنے ساتھ لایا تھا۔ محمود غزنوی نے نہایت خوبصورت جنگل میں ضیافت کا انتظام کیا تھا۔ ضیافت کے بعد سلطان نے سب کو الگ بٹھا لیا۔ اُس کے ساتھ اُس کے سالار تھے اور اُس کے ساتھ اس کا ایک اور مشہور سالار ارسلان جاذب بھی تھا جو اُس وقت خوارزم کا گورنر تھا۔ وہ دوٹوک فیصلہ کرنے والا اور دشمن کے خلاف انتہائی قدم اٹھانے والا سالار تھا۔ اُس کا اصول تھا کہ دشمن پر رحم کرنا اپنے آپ کو شکست کے راستے پر ڈالنے کے مترادف ہوتا ہے۔

"میرے دوستو!" دو مؤرخین سبطِ ابن الجوزی اور ابن الاثیر کے مطابق سلطان محمود نے ان سب سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔ "آپ سب نے میری جنگی طاقت دیکھ لی ہے۔ میں تیرہ سو ہاتھی لایا ہوں۔ بارہ سو غزنی میں ہیں۔ گھوڑسواروں کا یہ لشکر اُس کا نصف ہے جو میں نے اپنی سلطنت میں جگہ جگہ رکھا ہُوا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں پیادہ فوج ساتھ نہیں لایا۔ کیا یہ فوج آپ سب کو تہہ تیغ کرنے کے لیے کافی نہیں؟ لیکن میں آپ کو اپنی جنگی طاقت سے نہیں

خدا سے ڈرانے آیا ہوں۔ خدا نے مجھے یہ طاقت صرف اس لیے دی ہے کہ میں اُس کی راہ میں جہاد کر رہا ہوں۔ آپ مجھے ہندوستان کا لٹیرا اور دولت کا پجاری کہتے ہیں۔ اگر میں ایسا ہی ہوتا تو میرے پاس اتنی دولت اور اس قدر ہونا ہے کہ میں باقی عمر آرام سے عیش و عشرت میں گزار سکتا ہوں اور میری تین نسلیں بھی عیش کر سکتی ہیں مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ میرا جہاد مکمل نہیں ہوا۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ میری ساری عمر کوچ اور جنگ کرتے گزری ہے اور میں محل میں نہیں میدانِ جنگ میں مرنا چاہتا ہوں میرے خزانے یہیں رہ جائیں گے اور میری لاش ہندوستان کی مٹی میں مل جائے گی....

"آپ سب میرے خلاف ہیں لیکن آپ کا آپس میں بھی اتحاد نہیں۔ آپ حکمرانی کے شیدائی ہیں۔ کیا آپ چین کی زندگی بسر کر رہے ہیں، اسی لیے آپ سب کے دلوں پر خوف طاری رہتا ہے۔ آپ نے اللہ کے بندوں کو اپنی رعایا اور اپنا غلام بنا رکھا ہے۔ محترم ایلتگین والئی بلخ و سمرقند ہم میں موجود ہیں۔ میں سُن رہا ہوں کہ یہ اپنی رعایا پر ظلم و تشدد کرتے ہیں اور کوئی ایک بھی انسان ان سے خوش نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ حکمرانی دل کو تسکین اور دماغ کو نشہ دیتی ہے۔ آپ میں کچھ ایسے بھی ہیں جو مذہب کا دھوکہ دے کر حکومت کر رہے ہیں۔ ایسے حکمران اپنی رعایا کے سامنے اپنے الفاظ میں زاہد اور پارسا بنے رہتے ہیں لیکن وہ بھول رہے ہیں کہ اُن کے اوپر ایک طاقت ہے جو صرف اُن کا نہیں، ساری دُنیا کا تختہ اُلٹ سکتی ہے۔ یہ دُنیا اُسی طاقت کے حکم سے وجود میں آئی ہے۔ رعایا پر ظلم، رعایا کو انسان نہ سمجھنا، خدا کے بندوں کو خدا کے سچے مذہب کا دھوکہ دینا ایسے گناہ ہیں جو خدا معاف نہیں کرتا .... اور آج خدا نے مجھے آپ کے سر پر بھیج دیا ہے ....

"میں آپ کو بڑے صاف الفاظ میں بتاتا ہوں کہ میں آپ کو اپنا غلام بنانے نہیں آیا۔ میں آپ کی زمینوں پر قبضہ کرنے نہیں آیا۔ میں آپ کو یہ بتانے آیا ہوں کہ یہ زمین اللہ کی ہے اور اس زمین پر ہر انسان کا خواہ وہ کتنا ہی ادنیٰ ہے، اتنا ہی حق ہے جتنا ایک بادشاہ کا، ایک سلطان کا اور ایک امیر کا ہے۔ میں آپ کو اسلام کے نام پر متحد کرنے آیا ہوں۔ میں آپ میں سے کسی کو بھی میدانِ جنگ

ہیں نہیں لے جاؤں گا۔ یہ فرض میں اپنے ذمے رکھتا ہوں۔ مجھے ہندوستان کو اسلامی سلطنت بنانا ہے۔ ہندوستان مسلمانوں کا ہے۔ ہندوستان اُن شہیدوں کا ہے جو محمد بن قاسم کے ساتھ نعرے لگاتے آئے تھے اور شہید ہو گئے۔ آج اُن کی ہڈیوں کی خاک پر بُت خانے تعمیر ہو گئے ہیں۔ وہاں مسجدیں ویران ہو گئی ہیں۔ وہاں اسلام کی بیٹیوں کی عصمتیں لُٹ رہی ہیں۔ وہاں اسلام کا چراغ ٹمٹما رہا ہے . . .

"میرے بھائیو! میں ایک عقیدے کی جنگ لڑ رہا ہوں۔ ذرا دُور آگے مستقبل میں جھانکیں۔ اگر ہم نے ہندو کا ڈنک پُوری طرح نہ مارا اور اس باطل مذہب کو جڑوں سے نہ اکھاڑا تو ہندوستان مسلمانوں کا مذبحہ خانہ بنا رہے گا۔ وہاں کی مسجدیں اصطبل بن جائیں گی . . . .

"آپ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ آج تک آپ نے اپنے کان، اپنی آنکھیں اور اپنے دماغ بند رکھے۔ آج میں انہیں کھولنے آیا ہوں۔ آپ کے سامنے دو راستے ہیں۔ ایک یہ کہ آپ سب اپنی اپنی فوج کا نصف حصہ مجھے دے دیں جو مجھے ہندوستان لے جانا ہے اور آپ سب ایک عہد نامہ کریں کہ آپ میری غیر حاضری میں غزنی کے خلاف ہتھیار نہیں اٹھائیں گے بلکہ غزنی کی پاسبانی کریں گے۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ میں آپ سب کو گرفتار کر لوں اور آپ کی ریاستوں اور جاگیروں کو اپنے قبضے میں لے لوں۔ خدائے ذوالجلال نے مجھے اتنی طاقت دی ہے کہ میں اپنا یہ ارادہ پورا کر سکتا ہوں۔"

سلطان محمود خاموش ہو گیا اور اُس کی نظریں سب پر گھومنے لگیں "جس کسی کو میری شرط منظور نہیں وہ ہاتھ کھڑا کر دے" ـــــ سلطان محمود نے کہا۔

کسی ایک نے بھی ہاتھ نہ اٹھایا۔ سلطان محمود نے سب کو خراجِ تحسین پیش کیا اور کہا کہ کل عہد نامہ تحریر ہو گا اور ہر ایک کی اس پر مہر لگوائی جائے گی۔

*

اگلی صبح سلطان محمود نے نماز سے فارغ ہوتے ہی عہد نامہ تحریر کرایا اور سب کو بلایا۔ اُسے اطلاع دی گئی کہ سمرقند و بلخ کا حکمران ایلتگین غیر حاضر ہے۔ ذرا سا سراغ

یہ ملا کہ سحر کی تاریکی میں چند گھوڑے فلاں سمت جاتے دیکھے گئے تھے۔ سلطان کے حکم سے سوار دوڑا دیئے گئے جنہوں نے اُسے راستے میں جالیا۔ اُس کے ساتھ محافظ تھے۔ اُس نے محافظوں کو مقابلے کا حکم دیا لیکن غزنی کے سواروں کی تعداد زیادہ تھی۔ ان کی للکار پر محافظوں نے مقابلے کی جرأت نہ کی۔ التگین کو واپس لے آئے اور سلطان کے سامنے لا کھڑا کیا۔

"کیا تم خدا کی گرفت سے بھاگ سکتے ہو؟" — سلطان محمود نے کہا "میں اپنی اطاعت کا نہیں خدا کی اطاعت کا پیغام لے کر آیا تھا۔ تمہارے بھاگنے کا سبب کیا ہے"؟

"میں غزنی کی اطاعت قبول نہیں کروں گا" — التگین نے جواب دیا۔

سلطان محمود نے حکم دیا— "اسے اسی وقت زنجیروں میں باندھ کر ہندوستان بھیج دو اور ملتان کے قلعے میں قید کر دو۔ یہ باقی عمر وہیں گزارے گا۔"

اُس کی باقی عمر ملتان کے قلعے کی ایک کوٹھڑی میں گزری۔

باقی سب نے عہد نامے پر دستخط کر دیئے۔ سلطان محمود ابھی اِدھر سے فارغ ہُوا ہی تھا کہ اُسے اطلاع دی گئی کہ اسرائیل سلجوقی آگیا ہے۔ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، وہ سلجوقیوں کا بے تاج بادشاہ تھا۔ اُس کا کوئی ملک نہیں تھا لیکن چھوٹی چھوٹی ریاستوں پر اُس کی دہشت طاری تھی۔ اُس کی فوج کرائے پر لی جاتی تھی۔ سلجوقیوں کے علاوہ کئی اور خانہ بدوش اور جنگلوں میں رہنے والے قبائل اُس کے ساتھ جا ملے تھے۔ اس طرح اُس کے لشکر کی تعداد لاکھوں ہو گئی تھی۔ یہ ساری تعداد جنگجو تھی اور بے حد دلیر۔

اسرائیل سلطان محمود کو اپنی وفاداری پیش کرنے آیا تھا۔ وہ ایک بار سلطان محمود سے شکست کھا چکا تھا اور اُس کی ایک بڑی ہی تباہ کُن زمیں دوز کارروائی ناکام ہو چکی تھی۔ اُس نے دیکھ لیا تھا کہ سلطان محمود اب جو جنگی طاقت لایا ہے، اس کا وہ مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ سلطان محمود کی جنگی چالوں اور اس کی فوج کے قہر سے وہ پہلے ہی واقف تھا۔ وہ آیا تو وفاداری پیش کرنے تھا لیکن اُس دَور کی کتاب "طبقاتِ ناصری"

"وہ (اسرائیل) ترکمانیوں کے ایک دستے کے آگے آگے آرہا تھا۔ اُس نے اپنے سر پر ٹوپی ٹیڑھی رکھی ہوئی تھی جو اُس کی رعونت اور شجاعت کا اظہار کرتی تھی اور اُس کی گردن اکڑی ہوئی تھی جیسے وہ کسی سے ڈرنے والا نہیں"۔

اسی تحریر میں اُس کے متعلق لکھا ہے ۔"وہ جب کسی کے تعاقب میں ہوتا یا کسی کے خلاف لڑ رہا ہوتا تو وہ طوفانی بگولے اور کڑکتی ہوئی گھٹا کی مانند ہوتا تھا۔ اُس کے مقابلے میں جو آتا وہ ہمیشہ کے لیے مِٹ جاتا تھا۔ فضا میں اُڑتا ہُوا کوئی پرندہ اور جنگل میں دوڑتا کوئی ہرن اُس کے تیر سے بچ کر نہیں جا سکتا تھا"۔

وہ سلطان محمود سے مِلا۔ سلطان محمود نے اُس کے ساتھ وہی باتیں کیں جو وہ دوسروں سے کر چکا تھا۔ اسرائیل نے سلطان کی اطاعت قبول کر لی جب سلطان نے اُس سے پوچھا کہ وہ کتنی فوج دے سکتا ہے تو اُس نے جو جواب دیا، وہ لفظ بہ لفظ تاریخ میں محفوظ ہے ۔ مشہور مؤرّخ گبن نے لکھا ہے :

"اسرائیل نے اپنی ترکش سے ایک تیر نکال کر سلطان محمود کو دیا اور کہا ـــ" اگر آپ یہ تیر شمال کی طرف چھوڑ دیں تو پچاس ہزار ترکمانی جنگجو آپ کے پاس آجائیں گے ۔ اگر آپ کو مزید فوج کی ضرورت ہو تو دوسرا تیر کوہ بلخان کی طرف چھوڑ دیں تو پچاس ہزار مزید لشکر گھوڑوں پر سوار ہو کر آپ کے پاس آجائے گا"ـــ سلطان محمود نے اُسے کہا ـــ 'اگر مجھے آپ کی ساری فوج کی ضرورت پڑے تو؟'ـــ اسرائیل نے کہا 'میری کمان اپنے قاصد کے ہاتھ بھیج دیں جو وہ تمام علاقے میں دکھا کر واپس آجائے۔ آپ کے پاس دو لاکھ فوج آجائے گی'ـــ سلطان محمود کو اسرائیل کی نیّت پر کچھ شک ہُوا"۔

دوسرے مؤرّخین جن میں گردیزی، گزیدہ، ابن الاثیر اور ایک کتاب "مجموعۃ الانصاب" قابلِ ذکر ہے، اس واقعہ پر متفق ہیں ۔ ان سے شہادت ملتی ہے کہ سلطان محمود نے اسرائیل کو اُس کے خیمے میں بھیج دیا اور اُس کی خاطر تواضع کا حکم دیا۔ وہ چلا گیا تو سلطان نے اسرائیل کے متعلق مزید معلومات فراہم کیں۔ قدر خان نے بتایا کہ سلجوقی سب کے لیے مصیبت بنے ہوتے ہیں۔ ان سے وفاداری کی توقع نہیں رکھی جا

سکتی۔ سلطان کے اپنے سالار ارسلان جاذب نے بھی سلطان کو بتایا کہ سلجوقی کسی اخلاق اور ضابطے کے پابند نہیں۔

خود سلطان محمود اسرائیل کا انداز اور اس کی ٹیڑھی ٹوپی دیکھ کر شک میں پڑ گیا تھا۔ اُس نے حکم دیا کہ اسرائیل کو گرفتار کر کے کشمیر کے قلعہ کالنجر (موجودہ کوٹلی) میں قید میں ڈال دیا جائے۔ اُسی وقت اسرائیل کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پاؤں میں زنجیریں ڈال کر کشمیر کو روانہ کر دیا گیا۔ مؤرّخوں کے مطابق، وہ سات سال اس قلعے میں رہ کر وہیں مر گیا۔ اُس نے ایک بار فرار کی کوشش کی تھی۔ قلعے سے نکل بھی گیا تھا لیکن برفانی علاقے میں دُور نہ جا سکا اور پکڑا گیا۔

اُسے جب زنجیریں ڈال کر لے جایا جانے لگا تو اُس کے ساتھ ترکمانیوں کا جو دستہ آیا تھا وہ قریب ہی کھڑا تھا۔ اسرائیل سلجوقی نے بلند آواز سے اپنے دستے سے کہا" تمہارا فرض ہے کہ غزنی کی اینٹ سے اینٹ بجا دو۔"

سلطان محمود نے کسی وقت سلجوقیوں سے وعدہ کیا تھا کہ وہ انہیں آزاد زمین دے گا۔ اب اُس نے حکم دیا کہ سلجوقیوں کو دریائے جیحوں اور دریائے زرافشان کے درمیان کا علاقہ دے دیا جائے اور انہیں فوراً یہاں لایا جائے۔ چنانچہ سلجوقیوں کے چار ہزار کُنبے اس خطّے میں آ گئے۔ ان کے آنے تک سلطان محمود وہیں رہا۔ اُس نے ترکمانیوں اور ترکستانیوں کو الگ کر لیا اور انہیں کہا کہ وہ غزنی کی فوج میں آ جائیں۔ مؤرّخ لکھتے ہیں کہ یہ پہلا موقعہ تھا کہ ترکمان اور ترکستان کے لوگوں نے سلطان محمود کو دیکھا اور اس کی باتیں سُنیں۔ سلطان نے اپنی فوج کے بہت سے آدمیوں کو اس کام پر لگا دیا تھا کہ وہ ان لوگوں میں اٹھیں بیٹھیں اور انہیں بتائیں کہ سلطان محمود کا عزم اور ایمان کیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ بہت سے ترکستانی اور ترکمانی غزنی کی فوج میں شامل ہو گئے۔

سلطان محمود کی یہ مُہم کامیاب رہی۔ اب وہ سکون سے ہندوستان کے متعلق سوچ سکتا تھا۔

ہندوستان کے مغربی ساحل پر صوبہ گجرات واقع ہے۔ اس کا ایک مشہور شہر کاٹھیاواڑ بالکل ساحل پر ہے۔ اس کے ستّر میل جنوب میں سومنات کا شہر ہے۔ وہاں بھارتی حکومت نے آزادی کے بعد ایک مندر تعمیر کیا ہے جو ایک بہت بڑے قدیم مندر کے کھنڈرات پر کھڑا ہے۔ سلطان محمود غزنوی کے زمانے میں اس ساحلی علاقے میں بہت سے مسلمان آباد تھے۔ اسی علاقے میں احمد آباد کا شہر ہے جسے آج بھی ہندو چھوٹا پاکستان کہتے ہیں۔ یہاں مسلمانوں کی قتل و غارت ہوتی ہی رہتی ہے۔ ۱۹۶۹ء میں یہاں ہزاروں مسلمانوں کو ہندوؤں نے شہید کر دیا تھا۔ ان کے بچوں کو زندہ جلایا اور مسلمان خواتین کی آبروریزی وسیع پیمانے پر کی تھی۔ احمد آباد مسجدوں کی بدولت زیادہ مشہور رہے۔

کراچی اور اس سے نیچے، تمام ساحلی علاقے میں مسلمان آبادی اکثریت میں رہی ہے۔ ابتدا میں یہ مسلمان عرب سے محمد بن قاسم کے ساتھ آتے تھے۔ ان میں کچھ یہیں آباد ہو گئے۔ سومنات اس زمانے میں اور بہت عرصہ بعد تک مشہور و مقبول بندرگاہ رہی ہے۔ عرب تاجروں کے بحری جہاز اسی بندرگاہ میں لنگر انداز ہوا کرتے تھے۔ ہندوستان سے ان کی تجارت یہیں سے ہوتی تھی۔ آہستہ آہستہ یہاں مسلمانوں کی آبادی بڑھتی گئی۔ سلطان محمود کے زمانے میں بھی یہاں مسلمان آبادی خاصی تھی۔

سومنات بہت بڑا مندر تھا۔ تمام ہندوستان سے ہندو یہاں آتے تھے۔ یہاں کا مہاراجہ کنور رائے تھا جو مسلمانوں پر بہت ظلم کرتا تھا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ ہر صبح ایک مسلمان کو سومنات کے مندر کے دروازے پر ذبح کیا جاتا تھا۔ دو مورخوں نے لکھا ہے کہ ہر روز نہیں بلکہ ہر چاند کی پہلی رات ایک مسلمان کو پکڑ کر سومنات کے دروازے پر قربان کیا جاتا اور اس کے خون سے بتوں کے پاؤں اور مندر کی دہلیز دھوئی جاتی تھی۔

یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سومنات کے متعلق جو تفصیلات مختلف کتابوں میں آتی ہیں، بیان کر دی جائیں۔ یہ دلچسپ بھی ہیں اور ان سے ہندومت کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے بلکہ ان معلومات سے ہندوؤں کا مذہب بے نقاب ہو کر اصل روپ

ہیں سامنے آجاتا ہے۔ یہ سراغ کہیں سے بھی نہیں ملتا کہ سومنات کا مندر کب تعمیر ہُوا اور کس نے تعمیر کیا تھا۔ ہندوؤں کی کتابوں میں یہ روایت ملتی ہے (اور اسے ہندو اپنے مذہب کا حصہ سمجھتے ہیں) کہ چاند دیوتا نے ایک برہمن پرجاپتی کی بیٹیوں کے ساتھ شادی کی۔ بیٹیوں کی تعداد کا کچھ پتہ نہیں۔ ان میں روہنی نام کی بیٹی سب سے زیادہ خوبصورت تھی۔ چاند دیوتا اسی کو زیادہ چاہتا اور اُس کی نظرِ کرم اسی پر تھی۔ پرجاپتی نے چاند دیوتا سے کہا کہ وہ اس کی سب بیٹیوں کے ساتھ ایک جیسا سلوک کرے۔ چاند دیوتا نہ مانا۔ پرجاپتی نے اُسے بددعا دی جس سے چاند دیوتا کوڑھی ہو گیا۔

اس روایت سے یہ ثابت کیا گیا کہ برہمن اتنی اونچی ذات ہے جو دیوتاؤں پر بھی حکم چلا سکتی ہے۔ بہرحال چاند بہت پچھتایا لیکن ایک برہمن کی بددعا واپس نہیں ہو سکتی تھی۔ البتّہ پرجاپتی آدھے چاند دیوتا کو اس کی سزا سے آزاد کر سکتا ہے شرط یہ ہے کہ چاند دیوتا زمین پر ایک جگہ مہادیو کی نشانی کھڑی کرے۔

ہندوؤں کی مذہبی کتابوں میں یہ شرط جس طرح بیان کی گئی ہے وہ اتنی فحش اور اتنی ننگی ہے کہ ہم اسے اشاروں میں بھی بیان نہیں کر سکتے۔ تصوّر فرمایئے کہ یہ تفصیلات ہندوؤں کی مذہبی کتابوں میں لکھی ہیں اور اپنے مذہب کو ہندو "مقدّس" کہتے ہیں یہ ہے اصلیّت ہندوؤں کے سب سے بڑے مندر کی جس کی تفصیل پڑھ کر آپ محسوس کریں گے کہ ہندو اسے کتنا مقدّس سمجھتے تھے۔

روایت کے مطابق چاند دیوتا نے سومنات کے مقام پر مہادیو کی نشانی ایک گول اور اونچی چٹان کی شکل میں کھڑی کر دی۔ اس پر ایک مندر تعمیر کیا گیا جسے سومنات (یا سومناتھ) کا نام دیا گیا۔ سوم کے معنی ہیں چاند اور نات (یا ناتھ) کے معنی ہیں آقا۔ یعنی سومنات کا مطلب ہے "چاند کا آقا"۔

معمولی پڑھے لکھے لوگ بھی جانتے ہیں کہ سمندر میں چاند کے مطابق مدّوجزر پیدا ہوتا ہے۔ اس دوران سمندر ساحل کی طرف لپکتا ہے اور موجیں ساحل سے ٹکراتی ہیں۔ سومنات کا مندر چونکہ سمندر کے کنارے پر تھا اس لیے موجیں مندر کی دیوار سے ٹکراتی تھیں اور پانی اوپر کو اچھل کر دیوار کو جیسے دھوتا رہتا تھا۔ پنڈتوں نے اپنے

ہندوؤں کے دلوں میں یہ عقیدہ بٹھا دیا تھا کہ چاند اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرنے کے لیے اپنے آقا یعنی سومنات کے پاؤں دھوتا رہتا ہے۔

بعض مسلمان وقائع نگاروں نے لکھا ہے کہ سومنات کا بُت کعبہ کا وہی مشہور بُت تھا جسے منات کہتے تھے۔ جب کعبہ سے بُت اُٹھوائے گئے تو بُت پرستوں نے منات کو چھپا لیا کہ اسے کوئی توڑ نہ سکے۔ آخر بُت پرست اسے کاٹھیاواڑ (بھارت) لے آئے اور ایک عبادت گاہ تعمیر کر کے بُت اس میں رکھ دیا گیا۔ اسے سومنات اس لیے کہا جانے لگا کہ کوئی اُسے کعبہ والا بُت نہ سمجھے۔ بہرحال یہ روایت بے بنیاد ہے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ یہ بُت اتنا قدیم تھا کہ کہیں سے بھی سراغ نہیں ملتا کہ یہ کب تراشا گیا اور یہاں رکھا گیا تھا۔ ابنِ خلیقان نے اس کی عمر تیس ہزار سال بتائی ہے جسے تمام مؤرخین نے مبالغہ کہا ہے۔

سومنات کا بُت باقاعدہ تراشا ہوا بُت نہیں تھا۔ یہ ایک قدرتی طور پر گول اور لمبوتری چٹان تھی جسے مہادیو کا عضو تناسل کہتے ہیں اور مقدس سمجھتے ہیں۔ یہ تین گز زمین سے باہر اور دو گز زمین کے اندر تھا۔ اس کی موٹائی ڈیڑھ گز تھی۔ یہ بھی اس کے تقدس کی وجہ تھی کہ اسے قدرت نے بنایا تھا۔ اسے سب سے زیادہ طاقتور بُت سمجھا جاتا تھا۔ ہندوستان کے تمام بُت اس کے غلام تھے۔ اس کے ساتھ یہ عقیدہ وابستہ تھا جسے آج بھی ہندو مانتے ہیں کہ جو کوئی مرتا تھا اس کی روح سومنات چلی جاتی تھی۔ چاند گرہن ہوتا تو دیوتا بعض روحوں کو جسموں میں ڈال کر انہیں نیا جنم دیتے تھے۔

سومنات کا مندر فنِ تعمیر کا شاہکار تھا۔ اس کی بنیادیں سمندری چٹانوں کو تراش کر اٹھائی گئی تھیں۔ اس کے ۵۶ ستون تھے جو ساگوان کی لکڑی کے بنے ہوئے تھے۔ یہ لکڑی افریقہ سے لائی گئی تھی۔ ان میں سکہ بھر کر ستون تیار کئے گئے تھے۔ بُت میں ہیرے اور جواہرات جڑے ہوتے تھے۔ اس کے اردگرد کئی چھوٹے بُت بنا کر رکھے گئے تھے جن میں سے بعض سونے کے اور بعض چاندی کے تھے۔ یہ سومنات کے بُت کے خدمت گار تھے۔ مندر کے جس کمرے میں بُت رکھا یا گاڑا ہوا تھا، وہ تاریک کمرہ تھا جس میں شمع یا دیا نہیں جلایا جاتا تھا پھر بھی یہ کمرہ روشن

رہتا تھا۔ روشنی کا انتظام یہ تھا کہ کمرے کے اردگرد کے کمروں اور برآمدوں میں ہیرے لٹکا دیئے گئے تھے۔ ان پر قندیلوں کی روشنی پڑتی تو منعکس ہو کر بت والے کمرے میں جاتی تھی۔ چونکہ اس روشنی میں ہلکے ہلکے رنگ ہوتے تھے جو ہیروں کے تھے، اس لیے اس روشنی میں طلسماتی سا تاثر تھا۔ اندر جو بھی آتا تھا اس کے ذہن پر ایسا اثر ہوتا کہ وہ بت کو دیوتا سمجھنے لگتا تھا۔

بت کے کمرے میں سونے کی ایک زنجیر تھی جس کا وزن دو سو من تھا لیکن یہ من چالیس سیر کا نہیں بلکہ دو رتل کا تھا۔ دو رتل ایک سیر کے برابر ہوتے تھے۔ اس طرح زنجیر کا وزن دو سو سیر یعنی پانچ من خالص سونا تھا۔ اس کے ساتھ ایک بڑے سائز کی گھنٹی بندھی ہوئی تھی جو خاص خاص موقعوں پر بجائی جاتی تھی۔ بت کے اردگرد کے کمرے میں بھی بت رکھے گئے تھے جن میں ہیرے جڑے ہوئے تھے۔

دروازوں پر بیش قیمت پردے لٹکتے تھے جن کے ساتھ قیمتی موتی سلے ہوئے تھے۔ چاند اور سورج گرہن کے موقع پر ایک لاکھ سے زیادہ ہندو یہاں جمع ہو جاتے تھے۔ مندر کی آمدنی کا ایک ذریعہ تو راجے مہاراجے تھے جو مندر کو بیش قیمت تحائف اور نقد رقم دیتے رہتے تھے۔ دوسرا ذریعہ ایک ہزار گاؤں کا مالیہ تھا جو سارے کا سارا مندر کو دیدیا جاتا تھا۔ دس ہزار پنڈت باری باری ہر لمحہ بت کی پوجا کرتے رہتے تھے۔ ہر روز بت کو گنگا کے پانی سے نہلایا جاتا تھا۔ وہاں سے دریائے گنگا قریب تر ساڑھے سات سو میل دور تھا۔ ہر لمحہ گھوڑ سوار آتے جاتے رہتے تھے اور ہر روز بت کو نہلانے کے لیے گنگا کا پانی آتا رہتا تھا۔ سلطان محمود کے دور کا وقائع نگار اور مبصر البرونی جو سلطان محمود کے ساتھ ہندوستان آیا تھا لکھتا ہے کہ ہر روز بت کے لیے کشمیر سے پھول آیا کرتے تھے۔ یہ قابلِ یقین نہیں لگتا۔ سومنات سے کشمیر کا فاصلہ دیکھیے۔ سواری کا تیز ترین ذریعہ صرف گھوڑا تھا۔ گھوڑا اتنی تیز نہیں دوڑ سکتا تھا کہ کشمیر سے لائے ہوئے پھول سومنات تک پہنچتے تازہ رہتے۔

پانچ سو نہایت خوبصورت اور نوجوان گانے اور ناچنے والی لڑکیاں مندر میں

موجود رہتی تھیں۔ ہر لڑکی جوانی ڈھل جانے تک مندر کے لیے وقف رہتی تھی۔ ان کے لیے تین سو سازندے ہوتے تھے۔ ان کے علاوہ راجے مہاراجے اور امیر کبیر لوگ جو سب سے بڑا اور پنڈتوں کے لیے قابلِ قبول تحفہ لاتے تھے وہ نوجوان رقاصہ ہوتی تھی۔ رقاصہ نہ ہو تو نوجوان اور حسین لڑکی کو بھی بہترین تحفہ سمجھا جاتا تھا۔ یہ تمام لڑکیاں پنڈتوں کی تحویل میں اور ان کے رحم و کرم پر رہتی تھیں اور ان کی عیاشی کا ذریعہ بنتی تھیں۔ چونکہ یہ بُت جنسیت کی علامت بلکہ آلہ تھا اس لیے یہ مندر جائز بدکاری کا اڈہ تھا۔ عورتیں اپنا آپ پنڈتوں کو پیش کر کے خواہش ظاہر کرتیں کہ پنڈت سب کے سامنے ان کے ساتھ جنسی اختلاط کریں۔ پنڈت ان کی یہ خواہش پوری کرتے تھے۔

ہندوستان کے مختلف علاقوں سے جو ہندو یہاں آتے تھے، ان کے لیے سر اور داڑھی کا منڈوانا ضروری ہوتا تھا۔ اس کام کے لیے مندر میں تین سو حجام موجود رہتے تھے۔

سلطان محمود کو ابھی سومنات کے متعلق تفصیل سے کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ اس نے سومنات تک پہنچنے کی سوچی بھی نہیں تھی۔ غزنی سے سومنات کا فضائی فاصلہ نو سو میل ہے۔ وہاں سے سومنات تک کے سفر میں جو دریا آتے ہیں جو پہاڑی علاقے آتے ہیں اور بیکانیر کا جو صحرا آتا ہے، ان سب کو تصور میں لائیے اور یہ بھی ذہن میں رکھئے کہ اس وقت فوجیں گھوڑوں پر اور پیدل کوچ کیا کرتی تھیں۔

*

جن دنوں سلطان محمود ارد گرد کے سرداروں اور حکمرانوں سے اطاعت قبول کرانے میں مصروف تھا، ان دنوں گوالیار کا مہاراجہ ارجن پنڈتوں اور رشیوں کے دروازوں پر گرا رہتا تھا۔ اس نے سلطان محمود سے بہت بری شکست کھائی تھی۔ خود اپنی قوم اس سے نفرت کرنے لگی تھی۔ ایک رشی نے اسے کہا کہ وہ کچھ تحفے لے کر سومنات جائے اور وہاں کے پنڈتوں کے پاؤں میں گر کر اپنی کایا پلٹنے کی پرارتھنا کرے۔ پنڈتوں نے اسے کہا کہ جو تحفہ وہاں کے پنڈتوں کو پسند ہے وہ ہے ایک یا دو نوجوان لڑکیاں جو بہت خوبصورت ہوں۔ اس

۔کے علاوہ وہ کسی جواں سال مسلمان کو بھی ساتھ لے جائے اور اُسے سومنات کے دروازے پر ذبح کرے۔

مہاراجہ ارجن نے مسلمان لڑکی اور مسلمان آدمی کی تلاش شروع کر دی۔ ایک مہاراجہ کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا لیکن اب وہ مہاراجہ نہیں، خانہ بدوش تھا۔ گوالیار اور ارد گرد کے علاقوں میں مسلمان بہت ہی کم تھے۔ زیادہ تر مسلمان بھیرہ، ملتان اور لاہور کے علاقوں میں تھے۔ شرط یہ بھی تھی کہ لڑکی خوبصورت ہو اور آدمی بھی خوبرو اور جوان ہو۔

ایک روز اُس کی ملاقات ایک پنڈت سے ہوگئی جو گوالیار کے مندر میں ہوتا تھا۔ اب وہاں مندر تو تھا لیکن وہ مسلمانوں کے قبضے میں تھا اور وہاں کوئی بُت نہیں تھا، کوئی مورتی نہیں تھی۔ وہاں اب نہ سنکھ بجتے تھے نہ گھنٹیوں کی آوازیں آتی تھیں۔ وہاں کے دیوتا خاموش تھے اور اس خاموشی سے دن میں پانچ وقت اذان کی مقدس صدا اُبھرتی اور باطل پر لرزہ طاری کرتی تھی۔ مہاراجہ ارجن نے پنڈت سے پوچھا کہ وہ اب کہاں ہوتا ہے۔

"جنگل میں"۔۔۔ پنڈت نے جواب دیا "مندر اُجڑ جانے سے دیوتا کہیں بھاگ تو نہیں جاتے۔ مندر نہ رہے تو پوجا پاٹھ سے تو کوئی نہیں روک سکتا۔ ہم نے جنگل میں جاکر ایک گُفا میں مندر بنالیا ہے۔ آپ دیکھ لینا ان مسلمانوں پر کیسی بِتا آئے گی۔ یہ پلید لوگ جنگی طاقت کے گھمنڈ میں ہری کرشن اور مہادیو اور وشنو دیو کو شکست دینے آئے ہیں۔ یہ لوگ زندہ جل کر راکھ ہوں گے"

"ابھی تو ہم راکھ ہو رہے ہیں پنڈت جی مہاراج!"۔۔۔ مہاراجہ ارجن نے کہا۔۔۔ "کیا آپ ابھی تک نہیں سمجھے کہ ہری کرشن، مہادیو، اور وشنو دیو ہم سے ناراض ہیں؟"

"یہ پاپ آپ کا ہے جن کے پاس فوج تھی"۔۔۔ پنڈت نے کہا۔

"مجھے گنڈہ اور ترلوچن پال نے دھوکہ دیا"۔۔۔ مہاراجہ ارجن نے کہا۔۔۔ "ورنہ غزنی کا ایک بھی سپاہی زندہ واپس نہ جاتا اور محمود ہمارا قیدی ہوتا۔ میں نے قسم کھائی تھی کہ غزنی کے اس سلطان کو زندہ پکڑوں گا اور ہر روز اس سے مندر میں جھاڑو

دلوایا کروں گا اور وہ مندر میں پوجا کے لیے آنے والوں کی جوتیاں سیدھی کیا کرے گا..... لیکن اب ان باتوں سے کیا حاصل! مجھے بتایا گیا ہے کہ ایک خوبصورت مسلمان لڑکی اور ایک جوان مسلمان کو ساتھ لے کر سومنات جاؤ۔ لڑکی مندر کو پیش کر دو اور مسلمان کو مندر کے دروازے پر ذبح کر دو اور دو چاند شِودیو کے قدموں میں ماتھا رگڑو۔ بھگوان راج واپس کر دیں گے۔"

"آپ نے میرے دل کی بات کہہ دی ہے"۔ پنڈت نے کہا۔ "لیکن مجھ میں اتنی ہمت نہیں۔ آپ یہ کام کر سکتے ہیں۔"

"کر تو سکتا ہوں"۔ مہاراجہ ارجن نے کہا۔ "لیکن مسلمان لڑکی اور آدمی کہاں سے لاؤں۔"

"کیا آپ کنگال ہو گئے ہیں؟"۔ پنڈت نے کہا۔ "آپ کے پاس کچھ تو ہو گا، شکار مل جائے گا۔"

"بہت کچھ ہے"۔ مہاراجہ ارجن نے کہا۔ "میرا صرف راج نہیں رہا۔ آپ بتائیں شکار کہاں ہے اور وہ میرے قبضے میں کس طرح آسکتا ہے۔"

"کیا آپ کی راجکماریاں دریا پر نہانے نہیں جایا کرتی تھیں؟"۔ پنڈت نے کہا۔ "اب کبھی کبھی غزنی کی شہزادیاں دریا پر جایا کرتی ہیں۔"

"غزنی کی شہزادیاں؟"۔ مہاراجہ ارجن نے پوچھا۔ "سلطان محمود تو غزنی میں ہے۔"

"میں غزنی کے اُن فوجیوں کی بیویوں اور بہو بیٹیوں کی بات کر رہا ہوں جو قلعے میں ہیں"۔ پنڈت نے کہا۔ "کبھی کبھی تین چار بڑی خوبصورت لڑکیاں تین چار محافظوں کے ساتھ دریا پر آیا کرتی ہیں۔ آپ انعام نکالیں جو میں اپنے آدمیوں کو دے کر دو لڑکیاں اور ایک یا دو محافظ اغوا کرا لوں گا۔ دریا پندرہ کوس دور ہے۔ جتنی دیر میں گوالیار کے قلعے تک خبر پہنچتی ہے ہم بہت دور نکل جائیں گے۔"

"کیا آپ سومنات کے راستے سے واقف ہیں؟"

"مہاراج! آپ کہاں حکومت کرتے رہے ہیں؟"۔ پنڈت نے کہا۔ "ہر روز یہاں قریب سے وہ سوداگر گزرتے ہیں جو سومنات کے غسل کے لیے گنگا ماتا کا پانی لے جاتے ہیں۔ وہ بہت تیز چلتے ہیں۔ آپ گھوڑوں کا انتظام تو کر سکتے ہیں نا!....

کم از کم چھ گھوڑے درکار ہوں گے۔"

"گھوڑے جتنے چاہو مِل جائیں گے"۔ مہاراجہ ارجن نے کہا۔ "مجھے بروقت اطلاع دے دینا۔"

غزنی کے وہ سالار، نائب سالار اور کماندار وغیرہ جو ہندوستان کے فتح کیے ہوئے قلعوں میں رہتے تھے، ان کی بیوی بچے بھی غزنی سے آ گئے تھے۔ گوالیار کے قلعے میں بھی فوجی سرداروں کے کنبے آ گئے تھے۔ گوالیار سے دریا پندرہ بیس میل دور تھا۔ کچھ لڑکیاں چند ایک محافظوں کو ساتھ لے کر دریا کی سیر اور کشتی رانی کے لیے کبھی کبھی جایا کرتی تھیں۔ ایک روز چار جوان عورتیں دریا پہ گئیں۔ ان میں ایک نوجوان لڑکی تھی جو ایک پرانے کماندار کی بیٹی تھی۔ اس کا نام شگفتہ تھا۔ اُس کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ ان کے ساتھ چار محافظ تھے۔ ان کے اور عورتوں کے گھوڑوں کی تعداد آٹھ تھی۔

ایک جگہ دریا کے کنارے جنگل گھنا، ہرے سرکنڈے اور جھاڑیاں بھی تھیں عورتیں اس گھنی ہریالی کی اوٹ میں ہو گئیں۔ وہ نہانا چاہتی تھیں۔ چاروں محافظ گھوڑوں سے اُتر کر کچھ دور جا کر بیٹھ گئے۔ ایک آدمی جو دیہاتی لگتا تھا، گھبراہٹ کے عالم میں محافظوں کے پاس دوڑتا آیا اور خوف سے کانپتی ہوئی آواز میں کہنے لگا کہ تین آدمی اُس کی بیوی کو اُس سے چھین کر لے گئے ہیں۔ اُنہوں نے مجھے مار پیٹ کر بھگا دیا ہے۔ وہ قریب ہی ہیں اور میری بیوی کو ننگا کر کے اُسے زبردستی شراب پلا رہے ہیں۔

"آپ مسلمان ہیں مہاراج"۔ اس آدمی نے کانپتے ہوئے کہا۔ "ہماری عزت کے رکھوالے آپ ہیں۔"

چاروں محافظ اُٹھ دوڑے۔ وہ ذرا دور چلے گئے تو پانچ چھ آدمی جن کے چہرے صافوں میں چھپے ہوئے تھے مسلمان عورتوں پر ٹوٹ پڑے۔ انھوں نے کماندار کی بیٹی کو اُٹھا لیا۔ عورتوں نے چیخ و پکار کی تو محافظ واپس دوڑے۔ جب وہ گھنے سرکنڈوں اور جھاڑیوں میں آئے تو گھات میں چھپے ہوئے ہندوؤں نے تین

کے پہلوؤں میں برچھیاں اتار دیں اور ایک کو دبوچ لیا۔

ذرا سی دیر بعد آٹھ گھوڑے سرپٹ دوڑتے جنگل میں دور نکل گئے۔ ایک گھوڑے پر مہاراجہ ارجن شگفتہ کو آگے بٹھائے سوار تھا۔ ایک پر ایک جواں سال محافظ ناصرالدولہ بندھا ہوا تھا۔ ایک گھوڑے پر پنڈت سوار تھا اور باقی پانچ پر پنڈت اور مہاراجہ ارجن کے وہ آدمی سوار تھے جنہوں نے شگفتہ اور ناصرالدولہ کو اغوا کیا اور تین محافظوں کو قتل کیا تھا۔ ان پانچ آدمیوں کو نقد انعام پیش کیا گیا تھا لیکن انہوں نے یہ کہہ کر انعام قبول نہیں کیا تھا کہ وہ بھی سومنات کی پوجا کے لیے مہاراجہ ارجن کے خروج پر جائیں گے۔

گوالیار قلعے میں باقی تین عورتیں پندرہ بیس میل پیدل چل کر پہنچیں۔ اس وقت تک مہاراجہ ارجن بہت دور نکل گیا تھا۔ قلعے میں کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ مہاراجہ ارجن اتنی سنگین واردات کر گیا ہے۔ اس نے دو روز پہلے قلعے کے سالار قلعہ دار کو بتایا تھا کہ وہ سومنات کی پوجا کے لیے جا رہا ہے۔ سالار نے اُسے اجازت دے دی تھی۔ اس کے متعلق سب کو یہی معلوم تھا کہ دو روز ہوئے وہ سومنات کے سفر پر روانہ ہو چکا ہے۔

شام تک پنڈت کی راہنمائی میں وہ اس راستے پر پہنچ گئے جس راستے سومنات کو گنگا کا پانی جایا کرتا تھا۔ انہیں پانی لے جانے والے سوار مل گئے۔ دوسرے دن شگفتہ اور ناصر کو کھول کر مہاراجہ ارجن نے بتایا کہ ان کا تڑپنا بیکار ہے اور وہ خاموشی اور اطمینان سے ان کے ساتھ رہیں۔ ان دونوں کے پوچھنے پر بھی انہیں نہ بتایا گیا کہ انہیں کہاں لے جایا جا رہا ہے۔

بیس روز بعد وہ سومنات پہنچ گئے۔ مہاراجہ ارجن اور پنڈت نے ناصر اور شگفتہ کو مندر کے بڑے پنڈت کے سامنے کھڑا کر کے اس کے پاؤں چھوئے اور اُسے بتایا کہ وہ اس لڑکی کو مندر کے لیے اور اس آدمی کو شیو دیو کی قربانی کے لیے لائے ہیں۔

ناصران لوگوں کی زبان سمجھتا تھا۔ شگفتہ نہیں سمجھتی تھی۔ اُس نے فارسی زبان میں ناصر سے پوچھا کہ یہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں۔ ناصر نے اُسے بتا دیا۔ شگفتہ خوفزدہ ہونے کی بجائے فارسی میں بڑے غصے میں بولنے لگی۔ بڑے پنڈت نے ناصر سے پوچھا کہ یہ لڑکی کیا کہہ رہی ہے۔

"یہ کہہ رہی ہے کہ میں تمہارے شیو دیوپر اللہ کی لعنت بھیجتی ہوں"۔ ناصر نے جواب دیا۔ "اور یہ کہہ رہی ہے کہ ہم نے تمہارے بہت سے دیوا پنے پاؤں تلے مسل ڈالے ہیں اور یہ کہہ رہی ہے کہ تمہارے بہت سے دیوتاؤں کے بتوں کو ہم نے غزنی میں لے جا کر توڑا تھا اور ان کے ٹکڑے گھوڑ دوڑ کے میدان میں بکھیر دیئے تھے۔ یہ تمہارے مندر میں نہیں رہنا چاہتی"۔

"اِسے کہو کہ ہمارے مذہب کی توہین نہ کرے"۔۔۔ بڑے پنڈت نے کہا۔ "ورنہ شیو دیوا اپنی توہین کا انتقام غزنی کو تباہ کر کے لیں گے"۔

"تمہارے پتھر کے دیوتا ہمارے خُدا کا مقابلہ کریں گے؟"۔ ناصر نے کہا ۔۔۔ "ہم دونوں تمہارے قیدی ہیں۔ ہم بے بس ہیں۔ ہمارا خدا بے بس نہیں۔ وہ پتھر کا بت نہیں۔ اُس کے انتقام سے بچو پنڈت!"

شگفتہ بے تاب ہو کے ناصر سے پوچھتی تھی کہ کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ ناصر نے اُسے بتایا تو وہ اس قدر غصے سے بولنے لگی کہ اُس کے مُنہ سے تھوک اڑ اڑ کر پنڈت کے منہ پر پڑنے لگا۔ وہ اُن پر لعنتیں بھیج رہی تھی۔

"ارجن مہاراج!"۔ پنڈت نے مہاراجہ ارجن سے کہا "یہ دونوں ڈرنے کی بجائے ہم پر برس رہے ہیں۔ کیا انہیں یہ امید ہے کہ ہم ان سے ڈر کر انہیں چھوڑ دیں گے؟"

"ہم صرف خدا سے ڈرتے ہیں پنڈت!"۔ ناصر نے کہا "موت سے ہم ڈرنے والے ہوتے تو غزنی میں ہی بیٹھے رہتے۔ ہم اپنے اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام سنانے اور اس پیغام پر اپنی جان قربان کرنے کے لیے آئے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ہم یہاں بے بس ہیں۔ کچھ نہیں کر سکتے لیکن ہم خوش

ہیں کہ ہم اللہ کی راہ میں قربان ہو رہے ہیں۔ میری جان کی قربانی سے آپ کو کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ میری قربانی اللہ کے حضور جائیگی۔"

"انہیں بتادو کہ اس مندر میں بھی وہی تباہی آئے گی جو ہندوستان کے بہت سے مندروں میں آئی ہے"۔ شگفتہ نے ناصر سے کہا۔ "انہیں خبردار کردو کہ میرے پاک جسم کی توہین کا انتقام میرا خدا ضرور لے گا۔"

ناصر نے پنڈت کو بتایا کہ شگفتہ نے کیا کہا ہے تو پنڈت نے عجیب سی ہنسی ہنس کر کہا۔ "تم اُسے پوجتے ہو جو تمہیں نظر نہیں آتا۔ تم اندھے ہو۔ اندھیرے میں جی رہے ہو۔ تم نہیں جانتے یہ مندر کس کا ہے۔ جسے تم پتھر کہہ رہے ہو، یہ شیودیو ہے۔ یہاں تمہارے جسم سے جان نکالی بھی جاسکتی ہے اور مردہ جسم میں جان ڈالی بھی جاسکتی ہے۔"

"مجھے یقین ہے کہ تم پتھر کے دیوتا کا یہ کمال مجھے نہیں دکھا سکتے"۔ ناصر نے کہا۔ "اور یہ میرا عقیدہ ہے کہ اس لڑکی نے اس مندر کی تباہی کی جو پیشین گوئی کی ہے وہ پوری ہو کے رہے گی۔"

"مہاراج!"۔ گوالیار کے پنڈت نے سومنات کے پنڈت سے کہا۔ "کیا ان کے ساتھ اتنی باتیں کرنا ضروری ہے؟ نہ آپ ان کا مذہب بدل سکتے ہیں نہ یہ ہمارا مذہب بدل سکتے ہیں۔"

"ہاں"۔ پنڈت نے کہا۔ "ان کے ساتھ اتنی باتیں بیکار ہیں۔ انہیں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس آدمی کو نئے چاند کی پہلی رات قربان کیا جائے گا اور اس کا خون شیودیو کے قدموں میں انڈیلا جائے گا۔ اسے بتانا اس لیے ضروری ہے کہ ہم کسی کو دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتے۔ اسے معلوم ہونا چاہیے کہ سومنات نے اسے قربانی کے لیے پسند کیا ہے۔ یہ خوش قسمت انسان ہے۔"

"آپ اپنے دیوتاؤں کو دھوکہ نہیں دینا چاہتے"۔ ناصر نے کہا۔ "کیا تمہارے شیودیو کو معلوم نہیں کہ ہم دونوں کو دھوکے میں اغوا کیا گیا ہے اور ہمارے تین ساتھیوں کو قتل کیا گیا ہے؟ کیا تمہارا مذہب اتنے بڑے جرم کی اجازت دیتا

ہے؟"

بڑے پنڈت نے اپنے بالکوں کو بلایا اور انہیں کہا کہ اِن دونوں کو لے جاؤ۔

"سنو شگفتہ!"۔۔ ناصر نے بڑی تیزی سے بولتے ہوئے کہا "غزنی کی بیٹیوں کی طرح اپنی آبرو پر قربان ہو جانا۔ میں نکلنے کی کوشش کروں گا"۔

دونوں کو مندر کے ایک ایسے حصّے میں لے گئے جو ایک فراخ صحن تھا شگفتہ کو الگ کر لیا گیا اور ناصر کو دوسری طرف لے جانے لگے۔ ان کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے نہیں تھے۔ دونوں کے ساتھ دو دو آدمی تھے۔ اچانک ناصر کو شگفتہ کی بڑی بلند آواز سنائی دی "ناصر خدا حافظ"۔ اس کے ساتھ ہی شور اٹھا "پکڑ لو۔ پکڑ لو"۔

ناصر نے اُدھر دیکھا۔ وہاں ایک کنواں تھا۔ اُسے شگفتہ کنوئیں کے چبوترہ نما منڈیر پر کھڑی نظر آئی اور وہ کنوئیں میں کود گئی۔ ناصر کے ساتھ جو دو آدمی تھے، وہ بھی کنوئیں کی طرف دوڑے۔ ان کے شور پر بہت سے آدمی آ گئے۔ شام گہری ہو چکی تھی۔ صحن میں صرف ایک مشعل جل رہی تھی۔ سب آدمی شگفتہ کو کنوئیں سے نکالنے کے لیے بھاگ دوڑ رہے تھے۔ رسہ کنوئیں میں پھینکا گیا اور ایک آدمی رسّے سے اتر گیا۔ کچھ دیر بعد کنوئیں میں سے اُس کی آواز سنائی دی "مر گئی ہے"۔

اس ہڑبونگ میں کسی کو ناصر کا خیال نہ رہا۔ اس کے ساتھ جو دو آدمی تھے، وہ گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ انہیں ناصر نظر نہ آیا۔

ناصر مندر سے دور نکل گیا تھا۔ یہ خدائی مدد تھی کہ اُسے ایک دریچہ سا نظر آ گیا تھا۔ اس میں سے وہ نکلا تو آگے کھلا میدان تھا اور تاریکی۔ اُسے ایک طرف سمندر نظر آیا۔ وہ دوسری سمت چل پڑا۔ اس علاقے میں وہ اجنبی تھا۔ چلتے چلتے آگے دریا آ گیا۔ یہ دریائے سرسوتی تھا جو سومنات سے تین میل کے فاصلے پر تھا۔ وہ دریا پار کر گیا۔ اُسے کسی مسلمان گھرانے میں ہی پناہ مل سکتی تھی لیکن اسے

معلوم نہیں تھا کہ اس علاقے میں مسلمان ہیں بھی یا نہیں ۔ وہ چلتا گیا۔ وہ رات بھر چلنا چاہتا تھا۔

دو چار ں اور گیا ہو گا کہ اُسے روشنی دکھائی دی۔ یہ کوئی گاؤں تھا۔ وہ اُدھر چل پڑا۔ جب گاؤں کے قریب پہنچا تو اُسے ایک مکان نظر آیا جس پر مینار سے تھے ۔ اُسے شک ہُوا جیسے یہ مسجد ہو لیکن اُسے یقین نہیں تھا کہ اس علاقے میں مسجد ہو سکتی ہے ۔ پھر بھی وہ دروازے کی طرف چلا گیا۔ دروازہ کھلا تھا۔ آگے چھوٹا سا صحن اور آگے برآمدہ سا تھا۔ وہاں دیا جل رہا تھا جس کے پاس ایک سفید ریشں آدمی بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ ناصر اندر جانے سے ڈر رہا تھا۔ وہ دروازے کے ساتھ لگا کھڑا رہا۔

"السّلام علیکم" — اُسے اپنے قریب آواز سنائی دی ۔

"وعلیکم السّلام" — اُس نے جواب دیا۔

سلام کرنے والے نے ایسی زبان میں بات کی جو ناصر نہ سمجھ سکا لیکن اسلام کے رشتے نے سب خوف اور شک دُور کر دیئے تھے ۔

"مسلمان" — ناصر نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا "غزنی .... عساکرِ سلطان محمود"

اُس نے کچھ اشارے کئے تو وہ آدمی اُسے اندر لے گیا۔ وہ مسجد تھی اور پیش امام کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ یہ لوگ اِس علاقے کے رہنے والے تھے۔ ان کی زبان ہندوستانی سے مختلف تھی ۔ ناصر نے اشاروں سے انہیں یہ سمجھا دیا کہ وہ سومنات سے بھاگا ہے اور اُسے پناہ کی ضرورت ہے ۔ پیش امام نے ایک اور آدمی کو بلوایا۔ وہ ہندوستان کی وہ زبان جانتا تھا جو ناصر سمجھ اور بول سکتا تھا۔ اس کی وساطت سے پیش امام کو پتہ چلا کہ ناصر کون ہے ، اس پر کیا گزری ہے اور اب اسے یہاں سے نکالنا ہے ۔

یہاں کے لوگوں کو سلطان محمود غزنوی سے کوئی واقفیت نہیں تھی۔ انہوں نے بتایا کہ انہوں نے اُڑتی اُڑتی سُنی ہے کہ شمال مغرب سے ایک بڑا ہی ظالم اور لٹیرا بادشاہ آتا ہے جو کسی نہ کسی مندر کے بُت توڑ کر وہاں سے زر و جواہرات اپنے ساتھ

لے جاتا ہے۔ یہ بات انھوں نے اُن ہندوؤں سے سنی تھی جو ہندوستان سے سومنات کی پوجا کے لیے آتے رہتے تھے۔ ناصرالدّولہ نے انہیں بتایا کہ وہ کوئی لٹیرا بادشاہ نہیں بلکہ مسلمان سلطان ہے جو ہندوستان میں محمد بن قاسم کے دَور کو زندہ کر رہا ہے اور وہ یہاں اسلام کو فروغ دینے کے لیے بت توڑتا اور مندروں کو اجاڑتا ہے۔

"ہم عربی النسل کے لوگ ہیں" ــ پیش امام نے اُسے بتایا ــ "ہمارا شجرۂ نسب اُن مجاہدین سے ملتا ہے جو محمد بن قاسم کے ساتھ آئے تھے۔ ہمارے آباؤ اجداد نے دیبل سے دور نیچے پُل آدم تک کے ساحلی علاقے میں اسلام پھیلا دیا تھا۔ اس سومنات کی اُس وقت کوئی اہمیت نہیں تھی۔ یہ محمد بن قاسم کے دَور کے بعد اتنا مقبول ہوا ہے۔ برہمنوں نے اس کے ساتھ ایسی ایسی روائتیں وابستہ کر رکھی ہیں کہ راجے مہاراجے بھی یہاں آتے ہیں۔ اگر سلطان محمود واقعی بُت شکن ہے اور اسلام کا علمبردار ہے تو اُسے شاید معلوم نہیں کہ سومنات کا مندر کتنی اہم ہے جسے ہندو اتنا ہی مقدس سمجھتے ہیں جتنا ہمارے لیے خانہ کعبہ ہے۔"

"اگر آپ لوگ مجھے ایک گھوڑا دے دیں تو میں گوالیار واپس جانے کی بجائے سیدھا غزنی جاؤں گا" ــ ناصر نے کہا ــ "اور سلطان سومنات پر حملے کی ترغیب دوں گا۔"

"تم شاید اپنا انتقام لینا چاہتے ہو" ــ پیش امام نے کہا ــ "اور تم اس مسلمان لڑکی کے خون کا بدلہ لینا چاہتے جو اپنی عصمت پر کنوئیں میں کود کر قربان ہو گئی ہے۔ ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ یہاں کیا ہوتا ہے۔ ہم تمہیں گھوڑا دے کر یہاں سے نکال دیں گے اور ہم تمہیں غزنی تک کا چھوٹا راستہ بھی سمجھا دیں گے۔ اپنے سلطان کو بتانا کہ سومنات وہ مندر ہے جو اسلام کو للکار رہا ہے اور اسلام کا منہ چڑا رہا ہے۔ اس مندر میں نہ معلوم کتنی مسلمان لڑکیاں لائی جا چکی ہیں جنہیں بتوں کے آگے پنڈتوں کی موجودگی میں مادر زاد عریاں کر کے نچایا جاتا ہے اور کبھی کبھی یہاں اکر مسلمان کو ذبح کیا جاتا ہے۔ ہمارے گھروں میں کوئی بچی خوب صورت نکلتی

ہے تو ہم اُسے کہیں دُور بھیج دیتے ہیں یا وہ پورا کنبہ کہیں دُور چلا جاتا ہے۔ جس طرح تمہیں یہاں لایا گیا ہے، اس طرح اکثر یہاں ہندوستان سے بڑے خوب صُورت نوجوان مسلمانوں کو لا کر ذبح کیا جاتا ہے۔ یہ مندر ایک جنسی عقیدے پر کھڑا ہے اور یہاں کے پنڈت دن رات ہوس کاری میں بدمست رہتے ہیں۔"

پیش امام نے ناصر الدّولہ کو پوری تفصیل سے سومنات کی تاریخ سنائی اور اُسے بتایا کہ اس کے ساتھ کون سی روایتیں وابستہ ہیں۔

"اپنے سلطان سے کہنا کہ ہندوستان کے ساحل سے اسلام آگ کے قریب رکھّے ہوئے موم کی طرح پگھلتا اور غائب ہوتا جا رہا ہے"۔ پیش امام نے کہا ـــ "یہاں کے مُسلمان خوف وہراس کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور آہستہ آہستہ یہاں سے ہندوستان کے اندرونی علاقوں کو ہجرت کر رہے ہیں یا واپس عرب جا رہے ہیں اور یہاں ہندوؤں کے باطل عقیدے پھیلتے جا رہے ہیں"۔

"سُلطان آئے گا"۔ ناصر الدّولہ نے کہا ـــ "ہم آئیں گے اور انشاء اللہ آپ دیکھیں گے کہ ہندوؤں کے اس سب سے زیادہ طاقتور دیوتا کے ٹکڑے کس طرح اُڑتے اور خاک ہوتے ہیں۔ آپ مجھے گھوڑا اور کچھ زادِ راہ دے دیں اور راستہ سمجھا دیں"۔

مندر کے ارد گرد ناصر کو تلاش کیا جا رہا تھا لیکن مندر کے پنڈتوں کو اس کا کوئی غم نہیں تھا۔ غم صرف مہاراجہ ارجن اور اُس کے ساتھ آئے ہُوئے پنڈت کو تھا۔ اُن کی دونوں قربانیاں ہاتھ سے نکل گئی تھیں۔

اُس وقت ناصر چند میل دُور ایک مسجد میں بیٹھا تھا۔ پیش امام نے اُسے پیٹ بھر کے کھانا کھلایا تھا اور گاؤں کے ایک بہت ہی بوڑھے آدمی کو بلا لیا تھا جو دور دراز علاقوں کے راستوں اور سمتّوں سے واقف تھا۔

"گھوڑا نہیں اسے اونٹ دے دو"۔ بوڑھے نے کہا۔ "راستے میں بڑا ہی وسیع صحرا ہے۔ گھوڑا بغیر پانی کے مر جائے گا اور ناصر بھی زندہ نہیں رہے گا"ـــ بوڑھے نے ناصر کو سمجھایا کہ وہ دوپہر تک سُورج کو دائیں ہاتھ اور دوپہر کے بعد بائیں

ہاتھ رکھے۔ رات کو قطبی ستارے کو اپنی ناک اور دائیں کندھے کے درمیان رکھے۔ علاقہ پہاڑی ہو تو اُسے گھومنا مڑنا پڑے گا۔ وہ کتنا ہی مڑے دن کو سورج اور رات کو قطبی ستارے کو اُسی زاویے پر رکھے جو اُسے بتایا گیا ہے۔

اگلی رات کے اندھیرے میں ناصرالدّولہ ایک بڑی اچھی نسل کے تنومند اونٹ پر سوار ایسے سفر پر روانہ ہو گیا جس میں دریا بھی تھے، بڑے ظالم صحرا بھی، پہاڑ اور جنگل بھی تھے۔ اُسے بہت جلدی غزنی پہنچنا تھا۔

*

یہاں ایک اور روایت کا بیان بھی ضروری ہے۔ راوی ایک شاعر شیخ دین ہے جس نے اپنی ایک کتاب میں سومنات پر سلطان محمُود غزنوی کے حملے کا منظوم ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب ۱۸۰۱ء میں لکھی گئی تھی اور اس کا ترجمہ ایک انگریز میجر جے۔ ڈبلیو۔ واٹسن نے کیا تھا۔ یہ روایت مختصراً یوں ہے کہ سومنات کے علاقے میں مسلمان خاصی تعداد میں آباد تھے۔ وہاں کا مہاراجہ کنور رائے انہیں اپنا غلام سمجھتا تھا۔ ہر روز ایک مُسلمان کو سومنات کے مندر کی دہلیز پر ذبح کیا جاتا تھا۔ وہاں کے مُسلمان اپنے خُدا سے آہ وزاری کرتے رہتے تھے۔ مکّہ معظّمہ میں ایک بزرگ حاجی محمد تھے۔ ایک رات انہیں خواب میں رسُول اکرم صلعم کی زیارت ہوئی۔ حضورؐ نے حاجی محمد سے فرمایا کہ ہندوستان کے علاقہ سومنات میں جاؤ اور مُسلمانوں کی نجات کا بندوبست کرو۔

حاجی محمد اپنی رُوحانی قوّت سے سومنات آئے اور اس قوّت سے مہاراجہ کنور رائے کی توجہ اپنی طرف کر لی۔ ایک روز حاجی محمد نے ایک بوڑھی عورت کو دیکھا جو آہ وزاری کر رہی تھی۔ اس سے آہ وزاری کا سبب پُوچھا تو معلُوم ہوا کہ اگلے روز بڑھیا کے جوان اور اکلوتے بیٹے کو مندر میں ذبح کیا جا رہا ہے۔ حاجی محمد نے مہاراجہ کنور رائے تک اپنا یہ پیغام پہنچایا کہ اِس جوان آدمی کی جگہ اپنے آپ کو قربانی کے لیے پیش کرتے ہیں۔

مہاراجہ نے اِسے اپنی توہین سمجھا۔ کسی طرح مہاراجہ کو پتہ چل گیا تھا کہ حاجی محمد

کے پاس کوئی ایسی طاقت ہے کہ انہیں سامنے آکر جان سے نہیں مارا جاسکے گا۔ مہاراجہ نے سوچا کہ انہیں بے خبری میں مارا جائے۔ مہاراجہ نے انہیں پیغام بھیجا کہ انہیں ذبح نہیں کیا جائے گا بلکہ مہاراجہ انہیں اپنے ساتھ معزز مہمان کی طرح مندر میں لے جاکر مندر کی شان و شوکت دکھائے گا چنانچہ مہاراجہ حاجی محمد کو مندر میں لے گیا۔ اُس کے ساتھ اپنے محافظ تھے جنہیں اُس نے سمجھا دیا تھا کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ مندر میں گھُماتے پھراتے مہاراجہ کنور رائے نے اپنے محافظوں کو اشارہ کیا کہ وہ پیچھے سے تلوار کے وار کر کے حاجی محمد کو قتل کر دیں، لیکن محافظ جہاں کھڑے تھے، وہاں سے ہل ہی نہ سکے، جیسے زمین نے انہیں جکڑ لیا ہو۔ مہاراجہ اتنا خوفزدہ ہُوا کہ حاجی محمد سے معافی مانگی اور انہیں عزت سے رخصت کیا۔

حاجی محمد غزنی چلے گئے اور سلطان محمود سے کہا کہ انہوں نے رسول اللہ کے حکم سے اُسے منتخب کیا ہے کہ سومنات کا بُت توڑے اور اس مندر کو تباہ و برباد کرے جو ہزاروں مسلمانوں کا خون پی چکا ہے۔ سلطان محمود فوج لے کر فوراً چل پڑا۔ اُس نے سومنات کے مہاراجہ کنور رائے کو شکست دی۔ مہاراجہ نے صُلح اور دوستی کی درخواست کی۔ سلطان محمُود نے اُسے اسلام قبول کرنے کو کہا مگر مہاراجہ نے انکار کر دیا اور آخر دم تک لڑنے کے لیے قلعہ بند ہو گیا۔

اس دوران حاجی محمد فوت ہو گئے۔ وہ سلطان محمود کے ساتھ سومنات آئے تھے۔ سلطان محمود نے قلعے کا محاصرہ کیا مگر قلعہ سر نہ ہو سکا۔ محاصرہ بارہ سال جاری رہا۔ قلعہ سر نہ ہو سکا۔ وزیر نے سلطان محمُود سے کہا کہ حاجی محمد اُس سے ناراض ہو کے فوت ہوتے ہیں، کیونکہ وہ اُن کی بیمار پُرسی کے لیے نہیں گیا تھا۔ سلطان محمود اُسی وقت حاجی محمد کی قبر پر گیا اور کوتاہی کی معافی مانگی۔ سلطان کو ایک اشارہ ملا اُس نے اس پر عمل کیا اور دو دنوں میں قلعہ فتح ہو گیا۔

یہ روایت قارئین کی دلچسپی کے لیے سنائی گئی ہے۔ یہ بالکل بے بنیاد روایت ہے۔ صحیح صرف یہ ہے کہ ۱۰۲۵ء تک سُلطان محمود کو سومنات کے متعلق کوئی زیادہ علم نہیں تھا۔

اونٹ ناصر کو پیٹھ پر اُٹھائے چلا جا رہا تھا۔ ناصر اُسے دوڑا رہا تھا۔ اونٹ رَن کچھ اور حیدر آباد کا ریگستان پار کر گیا۔ ناصر اُس کی پیٹھ پر ہی اُونگھ لیتا تھا اور اونٹ کو بہت تھوڑا آرام دیتا تھا۔

سلطان محمود اپنے پڑوسیوں اور دُشمنوں کو ایک معاہدے کا پابند کر کے اور ہر ایک سے فوج کی کچھ نفری لے کر غزنی پہنچ گیا تھا۔ دو چار روز بعد اُسے اطلاع دی گئی کہ ہندوستان سے غزنی کی فوج کا ایک محافظ (باڈی گارڈ) ناصر الدولہ آیا ہے۔ سلطان نے اُسے فوراً پیش کرنے کو کہا۔

ناصر کو اندر لے جایا گیا۔ دو آدمیوں نے اُسے سہارا دے رکھا تھا۔ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ اُس کا سر ڈول رہا تھا چہرہ لاش کی طرح ہو چکا تھا سلطان کے حکم سے اُسے سلطان کے پلنگ پر لٹا دیا گیا اور طبیب کو بلایا گیا۔ طبیب نے اُس کے منہ میں کوئی دوائی ڈالی اور اُس نے کہا کہ اس پر غشی بھی طاری ہے اور نیند بھی۔ اسے جگایا نہ جائے۔ طبیب اپنے ہاتھ سے اُس کے منہ میں شہد ڈالتا رہا۔

کئی گھنٹوں بعد ناصر ہوش میں آیا اور بیدار ہُوا۔ اُسے کچھ کھلایا پلایا گیا تو وہ بولنے کے قابل ہُوا۔ اُس نے سلطان کو بتایا کہ اُسے اور شگفتہ کو کس طرح اغوا کر کے سومنات تک لے جایا گیا اور وہ کس طرح وہاں سے فرار ہُوا اور اُونٹ پر یہاں پہنچا ہے۔ اُس نے سومنات کے متعلق سلطان کو تفصیلات سنائیں اور کہا کہ وہاں کے مسلمان اُس مجاہد کی راہ دیکھ رہے ہیں جو اُنہیں ہندوؤں کی درندگی سے نجات دلائے گا۔ ناصر نے سلطان کو چھوٹی سی مسجد کے پیش امام کا پیغام دیا۔

"یہ ہے وہ مہم جس کے اشارے مجھے میری رُوح دے رہی تھی" ___ سلطان محمود نے کہا اور اُس نے ہندوستان کا نقشہ اپنے سامنے رکھ لیا۔ دیبل کے مقام پر انگلی رکھ کر اُس نے

کہا ــــ "محمد بن قاسم نے پہلا معرکہ یہاں لڑا
تھا .... اور یہ ہے سومنات" ــــ اُس نے
اُسی وقت اپنے سالار ابو عبداللہ محمد الطائی کو بلا لیا۔

"ابو عبداللہ!" ــــ سلطان محمود نے کہا ــــ "مجھے ایسے محسوس ہو رہا ہے جیسے یہ میری آخری جنگی مہم ہو گی۔ نقشہ دیکھو۔ بڑا ہی لمبا سفر ہے اور بڑا ہی دشوار لیکن ہمیں اس سفر پر روانہ ہونا ہے۔ اگر میں وہاں تک زندہ پہنچ گیا تو میں تاریخ میں ایسے باب کا اضافہ کر جاؤں گا جو میری تمام فتوحات پر غالب آئے گا اور آنے والی نسلیں میرے نام کے ساتھ سومنات کا نام ضرور لیا کریں گی"۔

ابو عبداللہ نقشے کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ پہاڑوں میں بھی لڑا تھا، جنگلوں، میدانوں اور صحراؤں میں بھی لڑا تھا۔ اُس نے دریائی معرکے بھی لڑے تھے لیکن نقشے پر سومنات پر نظریں جما کر وہ گہری سوچ میں کھو گیا کہ وہ اپنی فوج وہاں تک پہنچا سکیں گے؟"

"جانتے ہو محمد بن قاسم کہاں سے آیا تھا؟" ــــ سلطان محمود نے کہا ــــ "میں اس کی تاریخ اور روایت کو زندہ کرنا چاہتا ہوں"۔

"لاہور ہمارا اپنا ہے" ــــ ابو عبداللہ نے کہا ــــ "وہاں سے ہم رسد وغیرہ لے سکتے ہیں۔ اس سے آگے ملتان ہمارا اپنا ہے۔ وہاں سے اونٹ لینے پڑیں گے۔ آگے بڑا وسیع صحرا ہے"۔

"سب کچھ ہے میرے رفیق!" ــــ سلطان محمود نے کہا ــــ "آؤ۔ بیٹھو۔ ایمان اور ارادہ مضبوط ہو تو کٹھن سفر بھی سہل ہو جایا کرتے ہیں"۔

دونوں نقشے پر جھک گئے اور بہت دیر منصوبہ بناتے رہے۔

سلطان محمود کو شاید احساس نہیں تھا کہ وہ ایسی مہم سر کرنے جا رہا ہے جو سر ہو گئی تو یہ اسلام کی ہندومت پر سب سے بڑی فتح ہو گی اور خود ہندوؤں کو اپنے عقیدوں پر شک ہونے لگے گا۔

غزنی سے سلطان محمود کے کوچ کی تاریخ اور سال کے متعلق مورخوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اُس وقت کی تحریروں سے شہادت ملتی ہے کہ سلطان محمود نے ۱۸ اکتوبر ۱۰۲۵ء (۲۲ شعبان ۴۱۶ھ) غزنی سے کوچ کیا تھا۔ کسی بھی مورخ نے نہیں لکھا کہ اُس کی فوج کی تعداد کیا تھی۔ ہر ایک نے تیس ہزار گھوڑ سوار لکھے ہیں۔ بعض نے تیس ہزار رضاکار لکھے ہیں جنہوں نے سلطان سے کہا تھا کہ وہ باقاعدہ فوج کی طرح تنخواہ نہیں لیں گے۔ یہ صحیح ہے کہ تیس ہزار رضاکار تھے اور وہ ترکستانی تھے۔

سُلطان محمود جب ہندوستان کی سرحد میں داخل ہُوا تو اُس نے لاہور کو ذہن سے نکال دیا۔ اُس نے ملتان کا رخ کر لیا۔ اتنی بڑی فوج دیکھ کر یہاں کے لوگوں میں تجسّس کی لہر دوڑ گئی کہ سلطان اتنی زیادہ فوج لے کر کیوں آیا ہے۔

فوج ۱۵ رمضان المبارک (۹ نومبر ۱۰۲۵ء) کے روز ملتان پہنچی۔ سلطان محمود نے سومنات کے متعلق ناصرالدولہ کی اطلاع پر فوراً کوچ کا حکم اس وجہ سے بھی دے دیا تھا کہ سردیوں کے موسم کا آغاز تھا اور یہی موسم برق رفتار پیش قدمی کے لیے موزوں تھا، ورنہ ملتان اور بہاول پور سے آگے جو ریگزار تھا وہ اُس کی فوج کا دم خم توڑ دیتا اور فوج جنگ کے لیے بے کار ہو جاتی۔

سلطان محمود کی ملتان میں آمد تیز و تند طوفان کی آمد تھی۔ اُس نے ملتان میں مقیم اپنے حُکام کو اکٹھا کر کے کہا کہ فوراً اسے سومنات تک کے راستے کی دشواریوں اور دشمن کی رکاوٹوں کے متعلق مکمل معلومات دی جائیں اور یہ خاص انتظام کیا جائے کہ دشمن کے جاسوسوں کو یہ نہ پتہ چلے کہ غزنی کی فوج کا کیا ارادہ ہے۔

اتنی بڑی فوج کی اچانک آمد اور اُس کے کوچ کو پوشیدہ رکھنا ممکن نہ تھا۔ ملتان میں جاسوس موجود تھے۔ وہاں ہندو بھی آباد تھے بلکہ ہندوؤں کی آبادی زیادہ تھی۔ ملتان میں غزنی کی جو فوج اور انتظامیہ موجود تھی، اس میں ایمان فروش بھی موجود تھے۔ ہندوؤں نے اپنی خوب صورت بیٹیوں اور زروجواہرات کا جادو چلا رکھا تھا۔ انہیں ایک ہی دن میں معلوم ہو گیا کہ سلطان محمود سومنات جا رہا ہے۔ ہندوؤں

کاشیودیو سومنات میں تھا۔ شیودیو اُن کے دیوی دیوتاؤں کا دیوتا تھا۔ سومنات کی تباہی تو دُور کی بات ہے، اس کی صرف توہین کو ہی ہندو اپنی تباہی سمجھتے تھے۔ اُنہیں جب پتہ چلا کہ سلطان سومنات جارہا ہے تو وہ کانپ اُٹھے۔ اُنہوں نے اپنی نوجوان بیٹیوں کی عصمت اور نقدی کی تھیلیوں کے عوض یہ راز حاصل کیا اور اُسی وقت دَر پردہ قاصد دوڑا دیئے۔

اُن کے قاصد اُن چھوٹے چھوٹے راجوں اور اُن بڑے مہاراجوں تک پہنچے جن کے ساتھ ابھی سلطان محمود کی ٹکر نہیں ہوئی تھی۔ ہندوؤں نے سومنات کو بھی قاصد بھیج دیئے کہ مہاراجہ کنور رائے کو خبردار کر دیں اور وہ غزنی کی فوج کو سومنات سے دُور ہی روک لے۔

اِدھر سلطان محمود اونٹوں اور پانی کا انتظام کر رہا تھا۔ اس دوران اُسے ملتان کے ایک صُوفی بزرگ ملے جنہوں نے اُسے کہا کہ اے سلطان! سومنات کو اُن قلعوں جیسا قلعہ نہ سمجھنا جو تم نے اَب تک سر کیے ہیں، اور سومنات کو اُن مندروں جیسا مندر نہ سمجھنا جو تم نے اب تک تباہ کیے ہیں۔ سومنات پر حملہ ایسے ہی ہے جیسے ہندو خانہ کعبہ پر حملہ کر دیں۔ کیا ساری دُنیا کے مسلمان نہیں مر مٹیں گے؟ سومنات میں تمہارا مقابلہ بڑا ہی سخت ہوگا، اور ذہن میں رکھو کہ یہ ایک قلعے یا ایک مندر کی نہیں، یہ اسلام اور ہندو مذہب کی جنگ ہوگی۔ یہ دو عقیدوں کا تصادم ہوگا۔ یہ صحیح معنوں میں حق اور باطل کا مقابلہ ہوگا۔ اگر تم ہار گئے تو سمجھ لو کہ اسلام ہار گیا۔ ہندوؤں کا یہ عقیدہ جڑ پکڑ جائے گا کہ اُن کا شیودیو سچّا ہے اور اُس کی طاقت کے آگے کوئی ٹھہر نہیں سکتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ساحلی علاقوں کے مسلمان ہندو ہو جائیں گے یا انہیں ہندو بنا لیا جائے گا۔

"معلوم ہوتا ہے میں بہت بڑا خطرہ مول لے رہا ہوں"، سلطان محمود نے کہا۔ "زندگی کا اور اپنی جنگوں کی تاریخ کا سب سے بڑا خطرہ"! بزرگ نے کہا۔ "جنگی امور کو تم اچھی طرح سمجھتے ہو۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں صرف یہ بتا سکتا ہوں کہ دُشمن تم سے بے خبر نہیں۔ اپنی چارپائی کے نیچے لاٹھی پھیرو۔ اپنی آستین میں جھانکو۔ تمہارے

چراغ کے نیچے اندھیرا ہے۔"

"کیا آپ مجھے کوئی ٹھوس بات بتا سکتے ہیں؟" — سلطان محمود نے پوچھا۔
"میرے شاگردوں نے تمہارے ایک حاکم کے متعلق بتایا ہے کہ وہ اپنا ایمان ہندوؤں کے ہاتھوں فروخت کر چکا ہے"۔ بزرگ نے کہا — "یہ حاکم شروع سے ملتان میں ہے۔ آج رات یا کسی رات جب رات آدھی گزر جائے تو اُس کے گھر پر نظر رکھنا۔ اُس کے گھر کوئی آئے گا یا وہ کسی کے گھر جائے گا۔"

*

اُسی رات سلطان محمود کو اُس نائب سالار نے جسے سلطان نے اس حاکم کے گھر پر نظر رکھنے پر مامور کیا تھا اطلاع دی کہ وہ حاکم ایک لمبا چغہ پہن کر اور سر پر کپڑا ڈال کر گھر سے نکلا اور ایک ہندو کی حویلی میں چلا گیا ہے۔
سُلطان محمود نے حکم دیا کہ اُس مکان کو محاصرے میں لے کر کسی طرح اوپر چڑھا جائے اور اوپر سے کود کر اندر جایا جائے تاکہ اُس حاکم کو جُرم کی حالت میں پکڑا جائے۔

حکم کی تعمیل بلا تاخیر ہوئی۔ حویلی کے دروازے پر اس لیے دستک نہ دی گئی کہ اندر کے لوگ اِدھر اُدھر ہو جائیں گے۔ حویلی کے آگے اور پیچھے آدمی کھڑے کر دیئے گئے۔ ساتھ والے مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ جونہی دروازہ کھلا غزنی کے فوجی اندر چلے گئے اور گھر کے مکینوں سے پوچھ کر کہ ساتھ والی حویلی میں کس طرح اترا جا سکتا ہے، اوپر چلے گئے۔ نیچے اُترنے کا راستہ بند تھا منڈیر سے رسّہ لٹکا کر ایک آدمی نیچے اُترا۔

اُسے کسی نے للکارا۔ اُسے شاید ڈاکو سمجھا گیا تھا۔ اوپر سے آواز آئی — "تم جہاں ہو وہیں کھڑے رہو ورنہ تیر آتا ہے۔ ہم ڈاکو نہیں ہیں۔"
دس بارہ آدمی رسّے سے نیچے اُتر گئے اور للکارنے والے آدمی سے پوچھا کہ غزنی کا حاکم کون سے کمرے میں ہے۔ دو کمروں کے دروازے بیک وقت کھلے۔ گھبرائے ہوئے دو تین آدمی باہر آئے اور وہ پھر اندر چلے گئے۔ غزنی کے فوجی دوڑتے

اندر گئے۔ بزرگ نے جس حاکم کی نشاندہی کی تھی وہ ایک کمرے میں تھا۔ وہ ایک میز کی طرف لپکا۔ چھاپہ مارنے والے ایک آدمی نے تلوار کی نوک اُس کے پہلو کے ساتھ لگا کر کہا۔ "ہاتھ پیچھے رکھو"۔ حاکم رُک گیا۔ میز پر ایک کاغذ پڑا تھا۔ دیکھا کہ اس پر پنسل سے ایک نقشہ بنا ہوا تھا۔ وہ اُٹھا لیا گیا۔

کمرے میں تین لڑکیاں تھیں جن کے حُسن میں اور جسموں کی ساخت میں طلسماتی اثر تھا۔ فانوس کی روشنی کے کئی رنگ تھے۔ اس روشنی میں ان کا سراپا دیکھنے والوں کو مخمور کر رہا تھا۔ وہ نیم برہنہ تھیں۔ دوسرے کمرے سے چار ہندوؤں کو پکڑا گیا۔ سب نے شراب پی رکھی تھی۔ ہندوؤں نے چھاپہ مارنے والوں کے آگے سونے کی اشرفیوں سے بھری ہوئی تھیلیاں رکھ دیں اور انہیں لڑکیاں پیش کیں اور کہا کہ وہ اُن جیسی جتنی لڑکیاں چاہیں حاضر کی جائیں گی۔ ہندوؤں نے انہیں کہا کہ وہ واپس اپنے سلطان کے پاس نہ جائیں۔ انہیں ہمیشہ کے لیے ایک محل میں جو بڑی ہی خوبصورت جگہ ہے شہزادوں کی طرح رکھا جائے گا۔ یہ لڑکیاں اُن کے ساتھ رہیں گی۔

سلطان حاکم پر سکتہ طاری تھا۔ شراب اور ہوس پرستی کا نشہ اُتر چکا تھا۔ ان سب کو گھسیٹ کر لے جایا گیا۔ سلطان محمود جاگ رہا تھا۔

*

سلطان محمود نے لڑکیوں کو، اشرفیوں کی تھیلیوں کو اور شراب کی صراحیوں کو دیکھا، اور اُس نے اپنے حاکم کو دیکھا جو چھ برس سے ملتان میں تھا۔ اُس کے مُنہ سے شراب کی بُو آ رہی تھی۔ سلطان کو وہ کاغذ دیا گیا جس پر نقشہ بنا ہوا تھا۔

"اگر تم بچے ہوتے، کمسن اور نادان ہوتے تو میں تمہیں بتاتا کہ تم نے جو کچھ کیا یہ گناہ کبیرہ ہے"۔ سلطان محمود نے اپنے حاکم سے کہا۔ "تم جانتے ہو تم کیا کر رہے تھے۔ اب میں تم سے توقع رکھوں گا کہ مجھے سب کچھ بتا دو۔ تمہارا جرم میرے سامنے کھل چکا ہے کہ تم مجھے نہیں، سلطنتِ غزنی کو بھی نہیں، اسلام کو دھوکہ دے رہے تھے۔ اس کی سزا تم جانتے ہو۔ اب تم نے اپنا ایمان نیلام کر کے ان کفار کے لیے جو کچھ کیا ہے وہ بتا دو۔ خدا تمہیں بخش دے گا۔ اگر نہیں بتاؤ گے

تو تم جانتے ہو کہ تم جیسوں کی زبان کس طرح کھلوائی جاتی ہے۔ ان ہندوؤں میں اتنی طاقت نہیں کہ تمہیں مجھ سے اور اپنے جرم کی سزا سے بچا سکیں۔ ان پریوں جیسی دل کش لڑکیوں میں، اس شراب میں اور ان کھٹیلیوں میں اتنی طاقت نہیں کہ تمہیں خدا کے قہر سے بچا سکیں .... بولو"۔

حاکم سلطان کے قدموں میں گر پڑا اور سر اُس کے پاؤں میں رکھ دیا۔

"پیچھے رہو"۔۔۔ سلطان اُچھل کر پیچھے ہٹا اور گرجا۔۔ "اپنا ناپاک ہاتھ میرے پاؤں سے نہ لگانا۔ میں وضو سے ہوں۔ مجھے روزہ رکھنا ہے"۔۔۔ اُس نے ہندوؤں کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں عتاب تھا۔ اُس نے کہا۔۔ "تم بولو اور فوراً بولنا شروع کردو"۔۔۔ اُس نے لڑکیوں کی طرف دیکھا اور حکم دیا۔۔۔ "اُن تینوں کو ایک ہی کوٹھڑی میں بند کردو اور انہیں تا مرگ اسی کوٹھڑی میں رکھو"۔

ایک ہندو ہاتھ جوڑ کر آگے ہو گیا اور سلطان سے التجا کی "سلطان مہاراج! ان میں ایک میری بیٹی ہے۔ دوسری دو بھی معزز گھرانوں کی ہیں۔ ان کا کوئی قصور نہیں"۔

سلطان نے لڑکیوں سے پوچھا۔۔ "کیا تمہیں زبردستی اس کمرے میں لے جایا گیا تھا؟ کیا تمہیں معلوم نہیں تھا کہ تم سے کیا کام لیا جائے گا؟"

"معلوم تھا"۔۔ ایک لڑکی نے بڑی دلیری سے جواب دیا۔ "ہمیں زبردستی نہیں لے جایا گیا تھا۔ آپ یہ نہ سمجھنا کہ جسم بیچنا ہمارا پیشہ ہے۔ ہم معزز خاندانوں کی لڑکیاں ہیں۔ ہم اپنے دھرم کی داسیاں ہیں۔ ہم نے جو کچھ کیا اپنا فرض سمجھ کر کیا۔ ہم اپنے اُن مندروں کا انتقام لے رہی ہیں جنہیں آپ نے ناپاک اور تباہ کیا ہے"۔

سلطان محمود کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔ اُس نے اپنے مجرم حاکم سے طنزیہ کہا۔ "میں نے اِس پوری قوم کو شکست دی ہے۔ میرے اللہ کے سپاہیوں نے اس قوم کے دیوتاؤں کو شکست دی ہے مگر تم سے ان لڑکیوں نے ہتھیار ڈلوا لیے ہیں اور تم اپنی پوری فوج کو شکست دلوانے کا اہتمام کر رہے تھے"۔

"ہم اُس قوم کی بیٹیاں ہیں"۔۔۔ دوسری ہندو لڑکی نے کہا۔ "جس کی عورتیں اپنے مرے ہوئے خاوندوں کے ساتھ زندہ جل جایا کرتی ہیں۔ اپنے دھرم اور

دیس کے لیے ہم فخر سے اپنا جسم استعمال کرتی ہیں۔"
"اس دھرتی پر اسلام نہیں رہے گا"۔ تیسری لڑکی نے کہا۔ "ہمیں ہمارے مذہبی پیشواؤں نے سبق دیا ہے کہ اپنے حُسن اور جسم کو میٹھا زہر سمجھو اور اس سے اپنے دھرم کے دشمن کو مارو..... ہم آپ سے صرف یہ عرض کرتی ہیں کہ ہمیں فوراً ہلاک کر دیا جائے۔ اذیت دے کر نہ مارا جائے۔"

"میں تمہیں خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں"۔ سلطان نے جو ترجمان کی وساطت سے لڑکیوں سے باتیں کر رہا تھا کہا۔ "جس دھرم کی بنیاد عورت اور ریاکاری پر رکھی گئی ہو اُس کی عورتیں تمہاری طرح فخر سے بدی کا ارتکاب کیا کرتی ہیں۔ میں تمہاری خواہش پوری کروں گا۔ تمہیں فوراً ہلاک کر دیا جائے گا..... لے جاؤ انہیں"۔

*

مجرم حاکم اور اس کے ہندو ساتھیوں نے بتا دیا کہ وہ کیا کر رہے تھے۔ اس حاکم کو ہندوؤں نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ اَب انہی نے انہیں بتایا تھا کہ سلطان محمود سومنات کو تباہ کرنے کے لیے جا رہا ہے اور اُس کے حکم سے آگے کے علاقے دیکھنے کے لیے آدمی چلے گئے ہیں۔ اس ٹولے نے پہلا کام یہ کیا کہ راجوں مہاراجوں کو اطلاع دینے کے لیے قاصد دوڑا دیئے اور سومنات والوں کو بھی خبردار کرنے کے لیے آدمی بھیج دیئے تھے۔ مسلمان حاکم نے ان قاصدوں سے یہ کہا تھا کہ وہ راجوں وغیرہ سے کہیں کہ جب غزنی کی فوج بہاول پور سے آگے بیکانیر کے صحرا میں سے گزر رہی ہو تو اس پر شب خون ماریں اور زیادہ تر تیر استعمال کریں۔ پانی اونٹوں پر ساتھ جا رہا تھا۔ اونٹوں پر لدے ہوئے مشکیزے تیروں سے چھلنی کرتے رہیں۔

ان کی سکیم یہ تھی کہ تمام راستے غزنی کی فوج کو پریشان رکھا جائے اور اسے پانی سے محروم کیا جائے۔ زیادہ سے زیادہ اونٹ مارے جائیں اور دُور آگے جا کر وہاں کے مقامی آدمیوں کے بھیس میں کچھ آدمی سلطان کو ملیں اور کہیں کہ وہ اس کی فوج کو قریبی اور آسان راستے سے کاٹھیاواڑ تک پہنچا دیں گے۔ یہ سلطان کو گمراہ کرنے

کا اہتمام تھا۔ جو نقشہ ہندوؤں کی حویلی سے برآمد ہوا تھا، اس میں وہ مقام اور علاقے بنے ہوئے تھے جہاں غزنی کی فوج پر شب خون مارنے تھے اور جہاں سے سلطان کو غلط راستے پر ڈالنا تھا۔

سلطان محمود نے ان سے سب کچھ اگلوا لیا تو اپنا فیصلہ سنایا۔ "ان ہندوؤں سے ان کے تمام ساتھیوں کی نشاندہی کراؤ اور ان سب کو گرفتار کرو۔ میرے پاس لانے کی ضرورت نہیں۔ ان سب کو کوٹھڑیوں میں بند کر دو تا آنکہ یہ سب مر جائیں۔ سب کی لاشیں باہر پھینک دینا۔ ان کے جو مسلمان ساتھی ہیں، وہ کال کوٹھڑیوں میں مر جائیں تو اُن کی لاشیں بھی ان کے ساتھ پھینک دینا۔ دفن نہ کرنا۔ یہ روزِ قیامت ان کافروں کے ساتھ اٹھائے جائیں گے"۔ مجرم حاکم کے متعلق اس نے حکم دیا ۔۔۔ "جب فوج سومنات کو کوچ کرے، اس غدّار کے پاؤں باندھ کر اُسے ایک گھوڑے سے پیچھے باندھ دیا جائے۔ جہاں یہ مر جائے اس کی لاش وہیں پھینک دی جائے۔"

فرخی سلطان محمود کا درباری شاعر تھا۔ اُس نے سلطان کے سومنات پر حملے کی پیش قدمی، راستے کی دشواریوں اور سومنات کی فتح کی منظوم داستان لکھی تھی۔ اس کی صورت ایک قصیدے کی ہے۔ اس میں ایمان فروشوں کی غدّاری کا ذکر ہے۔ اس کا مختصر سا ذکر "تاریخ فخر الدین مبارک شاہ" میں بھی ملتا ہے اور اس میں یہ بھی تحریر ہے کہ جب غدّاری بے نقاب ہو گئی تو اُس رات تراویح کے بعد سلطان محمود دیر تک شکرانے کے نوافل پڑھتا رہا۔ صبح اُس نے اپنے رفیقوں سے کہا کہ میرے اللہ کو مجھ سے کوئی بڑا ہی عظیم فرض ادا کرانا ہے۔ اسی لیے اس ذاتِ باری نے مجھے تاریکی میں روشنی دکھائی ہے، ورنہ اندھیرے میں یہ سانپ مجھے ڈس لیتے۔

جو پارٹی آگے کے علاقے دیکھنے گئی تھی، اُس نے بتایا کہ سب سے بڑی دشواری صحرا پیدا کرے گا۔ پانی کا دُور دُور تک نشان نہیں۔ سلطان محمود نے پانی کا یہ انتظام کرا لیا تھا کہ تیس ہزار اونٹ جمع کر لیے جن پر پانی کے مشکیزے لادے گئے تھے۔ گھوڑوں کو بھی پانی پلانا تھا۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ ہر گھوڑ سوار کو پانی سے لدے

ہوئے دو دو اونٹ دیئے گئے تھے۔ دو مؤرخین نے اونٹوں کی تعداد بیس ہزار لکھی ہے لیکن اکثریت نے تعداد تیس ہزار بتائی ہے جو صحیح معلوم ہوتی ہے۔ اونٹوں کے علاوہ ہر پیادہ سپاہی اور سوار کو حکم تھا کہ وہ جتنا پانی چھوٹے مشکیزوں میں اُٹھا سکتا ہے، ساتھ رکھے۔

سلطان محمود نے خدا کا شکر اس لیے ادا کیا تھا کہ اُسے پہلے ہی پتہ چل گیا تھا کہ راجوں مہاراجوں نے اُسے راستے میں پریشان کرنے کا انتظام کر رکھا ہے۔ دشمن کے شبخونوں سے دوسرے نقصان کے علاوہ ایک نقصان یہ بھی متوقع تھا کہ کوچ کی رفتار بہت سست ہو جائے گی۔ اگر اُسے یہ اطلاع نہ ملتی تو اُس نے فوج کو قافلے کی صورت میں لے جانے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ اب اُس نے کوچ کی ترتیب بدل دی۔ سب سے پہلے اُس نے راستے کا تعین کیا۔

اُس نے ہراول کو یوں تقسیم کیا کہ دیکھ بھال کی پارٹیاں الگ کر دیں جنہیں بکھر کر بہت آگے آگے جانا تھا۔ دائیں اور بائیں کے لیے لڑاکا جیش الگ کیے جنہیں فوج اور دیکھ بھال پارٹی کے درمیان جانا تھا لیکن دائیں اور بائیں دور دور رہ کر، تاکہ دشمن کی چھاپہ مار پارٹیوں کو فوج سے دور ہی اُلجھا لیا جائے۔ پڑاؤ کی صورت میں اور رات کو کوچ کے دوران اِن جیشوں کو باری باری ساری رات جاگنا اور چوکنّا رہنا تھا۔ رسد اور پانی والے اونٹوں کی حفاظت کا یہ انتظام کیا گیا کہ سوار دستوں کو ان کے دائیں اور بائیں رہنا تھا۔

غزنی کی فوج کی ایک خوبی تو یہ تھی کہ اس کا کمانڈر سلطان محمود تھا جس نے جنگی چالوں میں تاریخ میں نام پیدا کیا ہے۔ دوسری خوبی یہ کہ اس کے چھاپہ مار جیش صحیح معنوں میں جانباز اور ذہین تھے۔ سلطان محمود ان کی تقسیم اور ان کا استعمال دانشمندی سے کرتا تھا۔ تیسری خوبی یہ کہ ہر سپاہی اپنے سلطان کے لیے نہیں بلکہ اپنے مذہبی عقیدے اور نظریئے کے لیے لڑتا تھا۔ یہ سلطان محمود کی تربیت کا اثر تھا۔ سب سے بڑی خوبی تیز رفتاری تھی۔ جنگ کے دوران دستوں تک احکام اور ہدایات پہنچانے کا انتظام بہت تیز تھا اور جونہی کسی بڑے یا چھوٹے کمانڈر کو کوئی

حکم پہنچتا تھا، اس پر نہایت تیزی سے عمل ہوتا تھا۔ جنگ کے دوران دستوں کی نقل وحرکت اتنی تیز ہوتی تھی کہ دشمن بوکھلا جاتا تھا۔

۱۲ شوال ۱۶ ۴۱ھ (۲۶ نومبر ۱۰۲۵ء) عیدالفطر کے دو روز بعد سلطان محمود نے ملتان سے کوچ کا حکم دیا۔ عیدالفطر کے روز اُس نے خطبے سے پہلے تمام فوج سے خطاب کیا:

"آپ سب کو عید مبارک ہو۔ یہ خیال ذہن سے نکال دیں کہ ہم وطن سے دور عید منا رہے ہیں۔ جس زمین پر شہیدوں کا خون بہہ جاتا ہے، وہ مجاہدینِ اسلام کا وطن بن جاتا ہے۔ جہاں مردِ مجاہد کی اذان گونجتی ہے وہ اُس کا وطن ہے۔ ہندوستان تمہارا ہے..... یہ عید ہم میں سے کئی ایک کی آخری عید ہوگی۔ ہم ایک ایسی مہم پر جا رہے ہیں جو ہماری زندگی کا سب سے زیادہ کڑا امتحان ہے۔ ہندو کہتے ہیں کہ مسلمان تباہ ہونے کے لیے سومنات جا رہے ہیں۔ آپ کو اب جو بُت توڑنا ہے اُسے ہندو طاقت کا دیوتا کہتے ہیں۔ آپ کو یہ ثابت کرنا ہے کہ طاقت اللہ کے پاس ہے۔ پتھر کا بُت ٹوٹنے میں سخت ہو سکتا ہے، طاقتور نہیں ہو سکتا۔ آپ کو ہندوؤں کے اس عقیدے کو توڑنا ہے۔"

سلطان نے اپنی فوج کو بتایا کہ محمد بن قاسم کتنی دور سے کتنی مشکلات اور دشواریوں میں سے گذر کر ہندوستان میں آیا تھا۔ سلطان نے کہا کہ سومنات کے مندر میں آپ جیسے مسلمان جوان آدمیوں کو ذبح کیا جاتا ہے اور تمہاری بہنوں اور بیٹیوں جیسی مسلمان لڑکیوں کو ہندو اغوا کر کے مندر کے پنڈتوں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ انہیں عریاں کر کے نچایا جاتا ہے اور تم سمجھ سکتے ہو کہ ان کے ساتھ اور کیا سلوک ہوتا ہوگا۔ کیا تمہاری غیرت یہ گوارا کر سکتی ہے؟

سلطان نے فوج کو ناصر اور شگفتہ کا واقعہ سنایا اور کہا— "اس کنواری مسلمان بیٹی کی لاش کنوئیں سے نکال کر کہیں باہر پھینک دی گئی ہوگی۔ اُس نے اپنی عزت پر جان قربان کی ہے۔ اُس کی روح مجھے راتوں کو بے چین رکھتی ہے۔ ہمیں قوم کی اس بیٹی کا انتقام لینا ہے۔"

سلطان محمود کا یہ خطاب اس قدر جذباتی اور اشتعال انگیز تھا کہ فوج بے چین ہو گئی اور نعروں سے سپاہیوں کے سینے پھٹنے لگے۔ یہی سلطان کا مقصد تھا۔ اس نے فوج کو راستے کی دشواریوں اور خطروں سے آگاہ کیا اور انہیں جذباتی اور ذہنی طور پر ہر خطرے کے لیے تیار کر لیا۔

*

مؤرخوں نے لکھا ہے کہ فوج کو ایسی ترتیب سے کُوچ کرایا گیا کہ سب سے آگے والے آدمی اور سب سے پیچھے والے آدمی کے درمیان ایک سَو میل کا فاصلہ تھا۔ فوج ایسے صحرا میں داخل ہو گئی جس کے متعلق سلطان نے معلومات لے لی تھیں مگر صحرا میں اور آگے جا کر اسے احساس ہُوا کہ اُسے کچھ بھی نہیں بتایا گیا تھا۔

یہاں ایک غلط فہمی دُور کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ متعدد تاریخوں میں لکھا ہے کہ سلطان محمود ملتان سے اجمیر گیا جہاں مہاراجہ اجمیر سے اُس کی لڑائی ہوئی اور سلطان نے مہاراجہ کو شکست دی۔ یہ غلط ہے۔ اجمیر اس راستے سے بہت ہی دُور ہے جس سے سلطان گیا تھا۔ دوسرے یہ کہ اُس وقت اجمیر کا وُجود ہی نہیں تھا۔ اجمیر کا سنگِ بنیاد ۱۱۰۰ء میں یعنی سومنات کی تباہی کے ۷۵ برس بعد رکھا گیا تھا۔ ایک انگریز تاریخ دان سر ڈبلیو ہیگ نے لکھا ہے کہ یہ اجمیر نہیں سانبھر نام کا ایک مقام تھا جو چوہان خاندان کا دارالحکومت تھا۔ اُس دَور کا نقشہ دیکھیں تو آپ کو اجمیر کہیں بھی نظر نہیں آئے گا۔

فوج جب بیکانیر کے صحرا میں داخل ہوئی تو رسد اور پانی کے اونٹوں کے دائیں اور بائیں جو سوار دستے تھے، اُن پر رات کو حملہ ہُوا جس کی صورت شبخون کی تھی لیکن ہندوؤں کو معلوم نہیں تھا کہ اونٹوں کی حفاظت کا انتظام موجود ہے۔ سواروں کے درمیان وسیع شگاف تھا۔ چھاپہ مار اس میں سے گذرے لیکن اونٹوں تک پہنچنے سے پہلے ہی سواروں کے گھیرے میں آ گئے اور مارے گئے۔

دوسرا حملہ دن کے وقت ایسے علاقے میں ہُوا جس میں صحرائی ٹیلے اور چٹانیں تھیں۔ ہندو تیر انداز ٹیلوں میں چھپے ہُوئے تھے۔ اُن کے تیروں کی پہلی بوچھاڑ نے

کچھ نقصان کیا۔ چار پانچ اونٹوں کے جسموں میں تیر لگے۔ وہ بے مہار ہو کر بھاگ اٹھے۔ ہندو چھاپہ ماروں کو یہ خوش فہمی تھی کہ اُن کے عقب میں کچھ بھی نہیں لیکن عقب سے رسالے کا آدھا دستہ آگیا اور چھاپہ مار کچھ مارے گئے اور کچھ پکڑے گئے۔ جو پکڑے گئے ان سے معلوم کر لیا گیا کہ اُن کے باقی چھاپہ مار کہاں کہاں ہیں۔ اس کے مطابق سلطان نے پیش بندی کر لی۔

اگر صرف صحرا کا حساب کیا جائے جو سلطان محمود کی فوج کو عبور کرنا پڑا تو یہ کم و بیش پانچ سو میل تھا۔ آگے دریا بھی تھے۔ صحرا میں گھاس کی پتی بھی نظر نہیں آتی تھی۔ گھوڑوں کو خشک دانہ اور خشک گھاس کھلائی جاتی تھی جس سے انہیں پیاس زیادہ لگتی تھی۔ اونٹ تو صحرائی جانور تھے، آسانی سے چلتے تھے، گھوڑے جلدی تھک جاتے تھے۔ سب سے زیادہ مصیبت پیادہ فوج کے لیے تھی۔ سپاہیوں کے پاؤں ریت میں دھنستے تھے۔

سب سے پہلی بڑی لڑائی لدراوہ (موجودہ لدوروا) کے مقام پر ہوئی جہاں دشمن لڑائی کے لیے تیار تھا کیونکہ اُسے قبل از وقت اطلاع مل چکی تھی۔ یہ بارہ دروازوں کا خاصا بڑا شہر تھا۔ سلطان نے شہر کو محاصرے میں لے کر ایسے ہلّے بولے کہ دشمن گھبرا گیا اور شہر کے دروازے کھل گئے۔ سلطان نے شہر سے پانی اور رسد کا ذخیرہ پورا کیا اور آگے چل پڑا۔

صحرا میں اُسے دشمن سے کئی اور جگہوں پر جھڑپیں لڑنی پڑیں۔ اُس کی ترتیب اور فوج کا پھیلاؤ ایسا تھا کہ معمولی نقصان اُٹھا کر دشمن کو بہت زیادہ نقصان پہنچایا گیا۔ دسمبر کے آخر میں یعنی ایک مہینہ صحرا میں گذار کر سلطان پٹن کے مقام پر پہنچا۔ وہاں ہندوؤں کی کم و بیش بیس ہزار فوج نے سلطان کا راستہ روک لیا۔ ہندوؤں کو سلطان کے ارادوں کا علم تھا اس لیے وہ سومنات کو بچانے کے لیے بے جگری سے لڑے مگر شکست کھا گئے۔ سلطان کو خاصا نقصان اُٹھانا پڑا۔ اس سے پہلے اودھے پور کے مقام پر بھی لڑائی ہوئی تھی۔

اب سلطان محمود کی فوج آج کے احمد آباد کے علاقے میں داخل ہو چکی تھی۔

سلطان کو اُس کے دیکھ بھال کے دستوں اور جاسوسوں نے بتایا کہ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے سومنات کے مہاراجہ کو اِدھر اُدھر سے کمک مل رہی ہے اور سومنات تک پہنچنا آسان نہیں ہوگا۔ غزنی کی فوج کا یہ عالم تھا کہ تھک کر چُور ہو چکی تھی۔ صحرا کی صعوبتوں کے علاوہ لڑائیاں بھی لڑنی پڑی تھیں۔ ہندوؤں کی فوج تازہ دم تھی اور دفاعی جنگ لڑنے کے لیے تیار۔ خود سلطان محمود اور اس کے سالارِ اعلیٰ ابوعبداللہ محمد الطائی کی جسمانی حالت دگرگوں ہوئی جا رہی تھی۔ وہ دونوں فوج کا دماغ تھے اس لیے اُن کے سر بھی سوچ سوچ کر دُکھ رہے تھے۔ فرخی نے منظوم داستان میں فوج کی حالت ان الفاظ میں بیان کی ہے:

"قوم کے بہادر تھک کر ایک دوسرے کا حوصلہ بڑھاتے اور ایک دوسرے کا سہارا بنتے تھے۔ اُن کی رفتار کم ہوگئی مگر معرکے میں وہ بہت تیز تھے۔"

سلطان محمود کو جب اطلاع ملی کہ ہندوستان سے سومنات کے دفاع کے لیے کمک آرہی ہے تو اُس نے گائیڈوں سے کمک کے متوقع راستے معلوم کر کے سوار دستے ان راستوں پر بھیج دیئے تاکہ وہ منزل کی طرف پیشقدمی بھی جاری رکھیں اور کمک کو بھی روکیں۔ اب سواروں کا کام قدرے آسان ہوگیا تھا کیونکہ صحرا ختم ہو چکا تھا۔ موسم سرد تھا۔

*

سلطان محمود ۶ جنوری ۱۰۲۶ء (۱۴ ذی القعد ۴۱۶ھ) بروز جمعرات سومنات کے قریب اُس مقام پر پہنچ گیا جہاں اُسے اپنی فوج اکٹھی کر کے سومنات کو محاصرے میں لینا تھا مگر دشمن اسے سومنات کے باہر ہی روکنے کے لیے تیار تھا۔ سلطان محمود نے کچھ اپنی آنکھوں سے اور زیادہ تر جاسوسوں کے ذریعے دشمن کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ سومنات کا شہر قلعے کے اندر تھا اور یہ بہت بڑا شہر تھا۔ اس کے تین طرف سمندر تھا اور سامنے ایک وسیع اور گہری خندق تھی۔

سلطان کو پتہ چلا کہ یہاں دو راجوں کی فوج پہنچی ہوئی ہے جو قلعے سے باہر

تیار رہے۔ شہر کی دیواروں پر فوج کے علاوہ ہندو شہری بھی تیر کمانیں سنبھالے کھڑے تھے۔ یہ شہری غزنی کی فوج کا مذاق اڑا رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ پنڈتوں نے یہ مشہور کر رکھا ہے کہ سلطان محمود ہندوستان میں اتنے مندر تباہ کرنے اور بڑے بڑے طاقتور مہاراجوں کو اس لیے شکست دینے میں کامیاب رہا ہے کہ سومنات کا بت شِو دیوا اُن سے ناراض تھا۔ اب شِو دیو مسلمانوں کو گھسیٹ کر اپنے گھر لے آیا ہے اور انہیں تباہ و برباد کر دے گا۔ جب شہر کا محاصرہ کیا گیا تو دیواروں سے ہندو کہتے تھے "مسلمانو! تم یہاں تباہ ہونے کے لیے آتے ہو۔ سومنات تم سے اپنی توہین کا انتقام لے گا۔"

مندر کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ دس ہزار پنڈت پوجا میں مسلسل مصروف تھے۔ نوجوان اور حسین داسیاں بھجن گا رہی تھیں اور ناچ بھی رہی تھیں۔ سارے شہر کی عورتیں مندر میں جمع ہوگئی تھیں۔ سومنات کا مہاراجہ کنور رائے قلعے کی دیواروں پر، گلیوں اور بازاروں میں گھوم پھر کر فوج اور شہریوں کو جوش دلا رہا تھا۔ کسی جگہ کا راجہ پرم دیوا اپنی فوج اور اپنا خزانہ لے کر آگیا تھا۔

سلطان محمود نے ہندوؤں کا یہ جوش و خروش دیکھا تو وہ گہری سوچ میں کھو گیا۔ اُس نے اپنے آپ کو بہت بڑے امتحان میں ڈال دیا تھا۔ وہ شہر کو جلد از جلد فتح کرنے کی سکیم بنانے لگا۔

"ابوعبداللہ!" — اُس نے اپنے سالار سے کہا — "کل جمعتہ المبارک ہے میں کل علی الصبح حملہ کرنا چاہتا ہوں۔ فوج تیار رہے" — اور اُس نے سالارِ اعلیٰ کو اپنی سکیم تفصیل سے بتائی۔

ابوعبداللہ محمد الطائی کے چہرے پر ایسا تاثر تھا جیسے حالات اُن کے خلاف ہیں۔ اُس کا خدشہ غلط نہیں تھا۔

یہ ستارہ بھی ٹوٹ گیا

نو سو پچپن سال

پہلے سومنات کے قلعے کی دیواریں لرز رہی تھیں۔ اندر "ہر ہر مہادیو" کے جے کارے تھے، باہر اللہ اکبر کے نعرے تھے۔ سارا ہندوستان نعروں اور جیکاروں کے تصادم سے ہل رہا تھا۔ سلطان محمود غزنوی نے شام کے بعد اپنے سالاروں کو جمع کر رکھا تھا۔ اُس نے سب کے چہروں پر نظریں دوڑائیں۔

"آپ جو محسوس کر رہے ہیں وہ آپ کے چہروں پر لکھا ہے"۔ سلطان محمود نے کہا۔ "میرا احساس آپ سے مختلف نہیں۔ کیا آپ نے یہ بھی محسوس کیا ہے کہ ہم ایسا کیوں محسوس کر رہے ہیں جیسے یہ ہماری زندگی کا شاید آخری معرکہ ہو گا؟... اس لیے کہ اس سے پہلے ہم قلعے فتح کرتے رہے ہیں۔ ہم مہاراجوں کے خلاف لڑتے رہے ہیں مگر سومنات نہ اُن قلعوں جیسا قلعہ ہے جو آپ نے آج تک فتح کیے ہیں، نہ یہ اُن مہاراجوں جیسے کسی مہاراجے کی جنگ ہے جنہیں آج تک آپ نے شکست دی ہے۔ آج آپ ایک مذہب اور ایک عقیدے کو سَر کرنے آئے ہیں۔ مذہب باطل ہے تو بھی اس کے پیروکار اس کی آن پر مر مٹتے ہیں۔ سومنات ہندوؤں کا قبلہ و کعبہ ہے۔ آپ نے قلعے کی دیواروں پر ان کا ہجوم اور ان کا جوش و خروش دیکھ لیا ہے۔ وہ زندگی اور موت کا معرکہ لڑنے کے لیے تیار ہیں ....

"یہاں ہمیں کسی جاسوس کی راہنمائی حاصل نہیں۔ مجھے کچھ خبر نہیں کہ قلعے کے اندر کیا ہے اور جب ہم، اللہ کو منظور ہوا، قلعے کے اندر چلے گئے تو ہمیں بتانے والا کوئی نہ ہو گا کہ ہمارا مقابلہ کرنے کتنا ہجوم آئے گا اور کدھر کدھر سے آئے گا۔ ہمیں صرف باہر

کی خبریں مِل سکتی ہیں اور مِل رہی ہیں وہ مہاراجوں کی فوجیں ہمارا محاصرہ توڑنے کے لیے آرہی ہیں۔ وہ ہم پر عقب سے حملہ کریں گی۔ میں آپ کو اپنی فوج کی تقسیم بتا چکا ہُوں۔ میں آپ کو دوسرے خطروں اور دشواریوں سے آگاہ کرنا چاہتا ہُوں۔ آپ ناتجربہ کار نہیں ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ جو فوج اپنے وطن سے اتنی دُور لڑنے جاتی ہے، اُسے دشمن تیروں اور تلواروں سے مارنے کی بجائے بھوکا اور پیاسا مار سکتا ہے۔ یہاں کی ہوائیں بھی ہماری دشمن ہیں۔ ہمیں کہیں سے بھی رسد نہیں مِل سکتی۔ تیر جو کمانوں سے نکِل جائیں گے، وہ واپس نہیں آئیں گے....

"ہمیں کہیں سے بھی کمک نہیں مل سکتی۔ اگر محاصرہ طول پکڑ گیا تو رسد اور فوج کی کمی ہمیں پسپا ہونے پر مجبور کر دے گی۔ میں آپ کو خبردار کرتا ہوں کہ ہم ناکام ہو کر پسپا ہُوئے تو فوج بددِل ہو جائے گی۔ دشمن ہمیں پسپا نہیں ہونے دے گا۔ ہم میں سے کوئی خوش قسمت ہی پسپائی کی صورت میں زندہ نکِل کر جائے گا۔ اُس صحرا کو ذہن میں لائیں جس سے گزرتے ہمیں اتنا عرصہ لگا ہے کہ ایک چاند ڈوبا اور ایک اُبھرا۔ اُس وقت فوج تازہ دم تھی۔ لمبے محاصرے اور ناکامی کے بعد فوج اس صحرا میں سے گزرنے کے قابل نہیں ہوگی۔ یہاں سے غزنی تک کا فاصلہ آپ کے سامنے ہے....

"میں جانتا ہوں آپ سمجھ رہے ہیں کہ مجھے اپنے وطن سے اتنی دُور ایسے شہر کو سَر کرنے کے لیے نہیں آنا چاہئیے تھا۔ مجھے آپ سے اتفاق ہے لیکن آپ کو میرے ساتھ اتفاق ہوگا کہ عمر طویل نہیں، کام ادھورا رہ گیا ہے۔ آپ میرے مقصد کو سمجھتے ہیں۔ میں سومنات کو تباہ کر کے اسے سمندر میں ڈبو دینے کی قسم کھا چکا ہُوں"۔

ایک نائب سالار نے کہا "دخل اندازی کی معافی چاہتا ہُوں۔ کیا میں یہ پوچھنے کی جرأت کر سکتا ہُوں کہ ہم کیا سارے ہندوستان کے بُت توڑ چکے ہیں کہ سومنات ہی رہ گیا تھا؟ اس ایک بُت کو توڑ کر اور یہاں کے مندر کو تباہ کر کے کیا سارا ہندوستان مسلمان ہو جائے گا؟ میں کہنا چاہتا ہوں کہ ہمیں اتنی دُور آنے کا خطرہ مُول نہیں لینا چاہئیے تھا"۔

سالار ابوعبداللہ محمد الطائی بول پڑا۔ اس نائب سالار سے مخاطب ہو کر اُس

نے کہا۔ "مجھے امید ہے کہ آپ یہ تو نہیں کہنا چاہتے کہ آپ دشمن کے خوف کے تحت بات کر رہے ہیں"۔

"بالکل نہیں"۔ نائب سالار نے جواب دیا۔ "اگر طارق بن زیاد نے سمندر پار کر کے ایک اجنبی اور دشمن ساحل پر اپنی کشتیاں جلا ڈالی تھیں تو ہم میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہ ہوگا کہ پسپائی کا خیال یا خوف دل میں لائے"۔

"مجھے بہت دیر بعد پتہ چلا ہے کہ سومنات کے بت کو ہندوؤں کے تمام بتوں کا آقا سمجھا جاتا ہے"۔ سلطان محمود نے کہا۔ "اگر مجھے اس روز معلوم ہو جاتا جس روز میں نے ہندوستان پر پہلی فوج کشی کی تھی تو میں بسم اللہ سومنات کے بت سے کرتا"۔ سلطان محمود نے تفصیل سے بتایا کہ سومنات میں کیا ہے اور ہندوؤں نے یہاں کے بت کے ساتھ کیسی کیسی ناقابل یقین روایتیں اور حکایتیں منسوب کر رکھی ہیں۔ پھر اس نے کہا "ہم اس مقام پر آ گئے ہیں جہاں سے واپسی ناممکن ہے۔ اگر ہم اپنے اس عظیم فرض کو بھول جائیں جو خدا نے ہمیں سونپا ہے تو ہمیں اپنی زندگی کے لیے لڑنا پڑے گا لیکن آپ سب سالار ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ جو سالار اپنی زندگی کے لیے لڑا کرتے ہیں وہ آگے نہیں پیچھے دیکھا کرتے ہیں اور وہ زندہ واپس نہیں جایا کرتے ....

"میں سومنات کو تباہ کر کے اپنے پیچھے یہ روایت چھوڑ جانا چاہتا ہوں کہ حق کی آواز پہنچانے کے لیے اور رسول ﷺ عربی کا پیغام پہنچانے کے لیے دنیا کا کوئی خطہ دور نہیں اور کوئی راستہ اتنا دشوار گزار نہیں کہ اللہ کا سپاہی اس سے گزر نہ سکے۔ ہو سکتا ہے ہماری موت کے بعد کوئی اور محمود ہماری بجھی ہوئی مشعل کو اٹھا کر جلا لے اور ہندوستان کے بت خانے مسجدوں اور درس گاہوں میں تبدیل کر دے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو اس ملک میں اسلام اور ہندومت ٹکراتے رہیں گے اور ہند محمد بن قاسم اور محمود کا انتقام مسلمانوں سے لیتے رہیں گے ....

"کل جمعتہ المبارک ہے۔ صبح کی روشنی پھیلنے سے پہلے محاصرہ مکمل ہو جانا چاہیے لیکن آپ کو بتایا جا چکا ہے کہ یہ محاصرہ مکمل نہیں ہوگا۔ شہر کے پیچھے تین اطراف سمندر

ہے۔ سامنے خندق ہے۔ آپ کو قلعے پر یلغار کرنی پڑے گی۔ خندق کو ہم عبور کرلیں گے۔ اصل کام تیراندازوں کو کرنا ہے۔ وہ قلعے کی دیواروں اور برجوں پر تیروں کا مینہ برسائے رکھیں گے۔ سیڑھیاں تیار کی جا چکی ہیں۔ ان سے دیواروں پر چڑھا جائے گا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ خودکشی کی کوشش ہوگی لیکن یہ قلعہ بند شہر فتح کرنے کا اور کوئی طریقہ نہیں۔"

یہ ۶ اور ۷ جنوری ۱۰۲۶ء (جمعرات اور جمعہ) کی درمیانی رات تھی۔ سلطان محمود نے چند لمحے بھی آرام نہیں کیا تھا۔ اس کی سکیم کے مطابق فوجوں کی جو تقسیم ہوئی تھی اس پر عمل ہو رہا تھا۔ دستے نقل و حرکت کر رہے تھے۔ انہیں احکام کے مطابق صبح کی روشنی سے پہلے اپنی اپنی پوزیشن پر پہنچنا تھا۔ سب سے زیادہ مشکل کام اُن دستوں کا تھا جنہیں شہر کی دیوار اور دروازوں پر یلغار کرنی تھی۔

سُلطان محمود نے اپنے سالاروں کو اپنی سکیم ایک بار پھر بتا دی اور کہا۔ "اب ہندو اپنی بیٹیوں کو ہماری صفوں میں میٹھے زہر کے طور پر استعمال نہیں کرسکیں گے۔"

اُس نے سالاروں وغیرہ کو رخصت کر دیا۔

یہ تاریخی حقیقت ہے کہ ہندوؤں نے غزنی کی فوج کے سالاروں اور کمانداروں کو گمراہ کرنے اور معلومات حاصل کرنے کے لیے اپنی حسین اور جوان لڑکیوں سے بہت کام لیا تھا لیکن سومنات والوں کو اُس وقت پتہ چلا کہ غزنی کی فوج آرہی ہے جب یہ فوج سومنات سے ایک دن سے بھی کم مسافت جتنی دور رہ گئی تھی۔ ہندو مہاراجے کنور رائے کو مہلت ہی نہ ملی کہ وہ لڑکیوں والا حربہ استعمال کرسکتا یا غزنی کی فوج میں کوئی اور زہر پھیلا سکتا۔ ہندو جاسوس بھی بے کار ہو گئے تھے۔

❋

جس وقت سلطان محمود اپنے سالاروں کے خون کو گرما رہا تھا، اُس وقت سومنات کے مندر میں جیسے رات آئی ہی نہیں تھی۔ دس ہزار پنڈت شیو دیو کے بُت کے آگے اس کیفیت میں عبادت کر رہے تھے جیسے ماتم ہو رہا ہو۔ وہ رو رو کر بھجن گا رہے تھے۔ سینکڑوں حسین اور نیم عریاں جوان لڑکیاں مسلسل رقص میں تھرک رہی تھیں۔

ایک ٹولی تھکتی تھی تو دوسری ناچنے لگتی تھی۔ شہری دوڑتے ہوئے مندر میں داخل ہوتے، پنڈتوں کے ہجوم کو چیرتے ہوئے بُت تک پہنچتے اور رو رو کر بُت کے قدموں میں ماتھے رگڑتے تھے۔ پنڈت، لڑکیاں اور شہری شِودیو کا قہر بیدار کرنے کے جتن کر رہے تھے مگر ان کے انداز میں خوف و ہراس نہیں تھا۔ ولولہ تھا، جوش تھا اور اپنے مذہب پر مٹنے کا عزم تھا۔ مورّخ لکھتے ہیں کہ ہندو قہر اور غضب سے پاگل ہوئے جا رہے تھے۔ وہ غزنی کی فوج کو کچا چبا جانے کا عہد کر چکے تھے اور انہوں نے یہ عہد شِودیو کے بُت کے قدموں میں ماتھا رکھ کر کیا تھا۔ کوئی ہندو نہتّہ نہیں تھا۔ وہ تلواروں، برچھیوں، تیرکشوں اور کمانوں سے لیس تھے۔ وہ اپنے گھروں کو اور اپنی بہو بیٹیوں کو بھول گئے تھے۔ پنڈتوں نے انہیں یقین دلا رکھا تھا کہ غزنی کی فوج کو شِودیو خود گھسیٹ کر یہاں تک لائے ہیں اور مسلمانوں کو تباہ ہونا ہے۔ ہندوؤں کے جنون کا یہ عالم تھا کہ ایک رقاصہ دوڑتی ہوئی بُت کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اُس کے ہاتھ میں خنجر تھا۔ اُس نے اعلان کیا "میں شِودیو کے قدموں میں دل کا نذرانہ پیش کرتی ہوں" ــــ وہ پہلے ہی نیم عریاں تھی۔ اُس نے جس ریشمی کپڑے سے ستر ڈھانپ رکھا تھا وہ بھی اتار پھینکا۔ مندر کے اندر سنّاٹا طاری ہو گیا۔ کسی نے اس لڑکی کو نہ روکا۔ وہ جوان تھی اور بہت ہی حسین۔ اُس نے خنجر کی نوک اپنی آخری پسلی کے نیچے رکھی۔ نوک کو دبایا، خنجر کو بائیں سے دائیں زور سے جھٹکا دیا۔ اُس کا پیٹ چاک ہو گیا۔ اُس کا مرمریں جسم خون سے لال ہو گیا۔ وہ گری نہیں۔

اُس نے اپنا ہاتھ پیٹ کے اندر کیا۔ تب اُس نے چلّا کر کہا "کہاں ہے میرا دل .... مجھے بتاؤ دل کہاں ہوتا ہے"۔ وہ اپنے پیٹ کے اتنے بڑے زخم میں ہاتھ ڈال کر دل ٹٹول رہی تھی۔

ایک پنڈت دوڑتا ہوا اُس تک پہنچا۔ لڑکی کا سر ڈولا اور وہ گھٹنوں کے بل گری۔ پنڈت نے اُس کے پیچھے بیٹھ کر اس کی پیٹھ اپنے سینے سے لگا لی اور اس کے پھٹے ہوئے پیٹ میں ہاتھ ڈال کر ہاتھ اوپر سینے میں لے گیا۔ اُس نے خنجر جو

لڑکی کے ہاتھ سے گر پڑا تھا، اٹھا لیا اور اس سے لڑکی کا دل کاٹ کر سب کو دکھایا۔ پھر اُس نے دل بُت کے دل کے مقام پر پھیر کر دل بُت کے قدموں میں رکھ دیا۔

"میں نے ایک نرتکی کا بلیدان شوِدیو کے چرنوں میں رکھ دیا ہے"۔ پنڈت نے بلند آواز سے اعلان کیا۔ "یہ نہ سمجھیں کہ نرتکی مر گئی ہے۔ اِسے شوِدیو دوسرا جنم دیں گے"۔

پنڈت رقاصہ کی لاش اٹھا کر کسی اور کمرے میں لے گئے۔

ایسی ہی حسین اور جوان ایک اور رقاصہ دوڑتی بُت کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اُس نے بھی اپنے آپ کو ننگا کر دیا۔ خنجر ابھی پنڈت کے ہاتھ میں تھا۔ رقاصہ نے خنجر اُس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا اور اسی طرح اپنا پیٹ چاک کر کے پنڈت سے کہا کہ اُس کا دل شوِدیو کے قدموں میں رکھ دیا جائے۔ وہ ابھی زندہ ہی تھی کہ پنڈت نے اُس کا دل نکال کر بُت کے دل کے مقام پر پھیرا اور اُس کے قدموں میں رکھ دیا۔

اس کے بعد باقی داسیوں نے جو رقص کیا وہ جنّات کا رقص معلوم ہوتا تھا۔ اس میں موسیقی تو تھی لیکن ناچنے والیوں کا رقص ایسا پُراسرار اور ہولناک تھا جیسے یہ ان کی زندگی کا آخری ناچ ہو۔ شہنائیاں جیسے کسی کی موت پر چیخ چلّا کر بین کر رہی ہوں۔ دف جیسے سینہ کوبی کر رہے ہوں۔ ناچنے والیاں جیسے پاگل ہو گئی ہوں۔ ان کے کپڑے اُترتے جا رہے تھے یا وہ خود اُتار رہی تھیں حتیٰ کہ وہ مادر زاد ننگی ہو گئیں مگر اُن کے رقص کی تال اور سازوں کی سنگت میں ذرا سی بھی لغزش نہیں آرہی تھی۔

دوسرے کمروں میں پنڈتوں کی کھڑتالوں اور بھجنوں کے واویلے نے سومنات کی رات پر دہشت طاری کر رکھی تھی۔ ذرا سی دیر میں یہ خبر مندر سے باہر نکل گئی کہ ناچنے والی دو لڑکیوں نے اپنے ہاتھوں اپنے دل نکال کر شوِدیو کے قدموں میں رکھ

دیتے ہیں۔ عورتوں نے مندر پر دھاوا بول دیا۔ وہ دونوں لاشوں کے خون میں انگلیاں ڈبو کر اپنے ماتھوں پر تلک لگانے لگیں۔ خون کے تلک جب اُن کے مردوں نے دیکھے تو اُن کے جوش و خروش میں قہر پیدا ہو گیا۔ وہ تو پہلے ہی پھنکار رہے تھے۔

سومنات کی گلیوں میں وہ خبریں جو شہر کی دیواروں کے اُوپر سے آتی تھیں، اعلان کے انداز میں سارے شہر کو سنائی جا رہی تھیں اور بہت سی آوازیں گھٹاؤں کی طرح مسلسل گرج رہی تھیں "مسلمانوں کو موت یہاں لے آئی ہے ... بھارت ماتا میں کوئی مسلمان زندہ نہیں رہے گا.... شیو دیو کے پجاریو! مسلمانوں کی بوٹیاں سمندر میں بہا دو.... خبردار.... ہوشیار... لڑائی میں جو لڑتا ہوا مارا جائے گا اُسے شیو دیو دوسرا جنم دیں گے۔"

*

انگریزوں کے دَورِ حکومت میں ہندوستان کے سکولوں میں وہ تاریخ پڑھائی جاتی رہی ہے جو ہندوؤں نے لکھی تھی اور جسے انگریزوں نے منظور کیا تھا۔ ان درسی کتابوں میں سُلطان محمود غزنوی کے سترہ حملوں میں سومنات کو آخری حملہ لکھا گیا تھا اور اسے ایک عام سی قسم کا حملہ ثابت کر کے یہ بھی لکھا گیا کہ سومنات کا بُت اندر سے کھوکھلا تھا اور اس میں ہیرے جواہرات بھرے ہوتے تھے جو محمود غزنوی نکال کر چلتا بنا۔ انگریز بھی یہی چاہتے تھے کہ ہندوستان کے مسلمان بچوں کو سومنات کے معرکے کے پس منظر اور سلطان محمود کے جذبے سے بے خبر رکھا جائے۔ انگریز ہمیشہ مسلمان سے خائف رہا ہے۔ ہندو کو تو انگریز نے یہاں آتے ہی جسمانی طور پر نہیں بلکہ روحانی طور پر اپنا غلام بنا لیا تھا اور دونوں نے مل کر مسلمانوں کی روایت شکنی اور کردار کُشی کی تھی۔

سومنات کی جنگ کے وہ حالات اور احوال و کوائف جو عینی شاہدوں نے تحریر کیے اور جنہیں اُس دَور کے مورخ، مفکر اور وقائع نگار البرونی نے قلمبند کیا اور جو فرشتہ اور دیگر بہت سے مؤرخوں نے محفوظ کیے ہیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ سومنات پر سلطان محمود کی فوج کشی اس قدر بڑا اور خطرناک اقدام تھا جو کوئی ایسا بادشاہ کر سکتا تھا

جس کا دماغ چل گیا ہو، یا وہ خوش فہمیوں میں مبتلا ہو یا جنگی قیادت (جنرل شپ) میں غیر معمولی مہارت اور جرأت رکھتا ہو۔ آج کے جنگی مبصر بھی جب سومنات کا ذکر کرتے ہیں تو وہ اسے روس پر نپولین کی فوج کشی سے تشبیہہ دیتے ہیں۔ نپولین روس میں جا کر تباہ و برباد ہو گیا تھا۔ سلطان محمود بھی بظاہر تباہ و برباد ہونے کے لیے سومنات گیا تھا۔ مؤرخوں کے مطابق، خود سلطان محمود نے سومنات پہنچ کر محسوس کر لیا تھا کہ اس کے حساب کتاب میں اُسے غلطی لگی ہے، وہ غلط جگہ آ گیا ہے۔ اسی لیے اُس نے اپنے سالاروں سے کہا تھا کہ ہم اس مقام پر آ گئے ہیں جہاں سے واپسی ناممکن ہے۔ ہم سومنات کی فتح کے لیے نہ لڑے تو ہمیں زندہ پسپا ہونے کے لیے بڑی خوفناک لڑائی لڑنی پڑے گی، پھر کیوں نہ ہم اُس مقصد کے لیے لڑیں جس کے لیے آئے ہیں۔

محمد قاسم فرشتہ نے البرونی اور اُس دَور کے دو وقائع نگاروں کے حوالے سے جن میں ایک امام عابدین یونس جو فوج کے امام کی حیثیت سے سومنات آئے تھے، لکھا ہے کہ مسلمانوں کی فوج ایک جذبہ لے کر آئی تھی اور یہ جذبہ لُوٹ مار نہیں تھا۔ جذبے کے ساتھ اسے جو قیادت ملی تھی وہ اسے بڑے بڑے دشوار حالات اور خطروں سے بچانے کی اہلیت رکھتی تھی۔ ان وقائع نگاروں نے لکھا ہے کہ سومنات پر فوج کشی جنگی لحاظ سے اور سیاسی لحاظ سے اور مذہبی لحاظ سے ایک حیران کُن اقدام تھا جو ایک عظیم مقصد کا حامل تھا۔

انہی مؤرخوں اور وقائع نگاروں نے لکھا ہے کہ محمد بن قاسم ہندوستان میں عرب کے قیدیوں کو جنہیں مہاراجہ داہر نے اپنے قید خانے میں ڈال دیا تھا، چھڑانے آیا تھا۔ بعد میں اُس نے یہاں اسلامی حکومت قائم کرنے کی سوچی لیکن سلطان محمود غزنوی صرف اسلام کا پیام لے کر آیا اور یہ عزم کہ سومنات کا بُت توڑ کر وہ ثابت کرے گا کہ اُن کے "چاند کے آقا" کی کوئی حیثیت نہیں اور یہ محض ڈھونگ اور سوانگ ہے۔

مؤرخ اس پر بھی متفق ہیں کہ سلطان محمود اور اُس کا دستِ راست سالار ابو عبداللہ محمد الطائی بالکل بے خبر تھے کہ سومنات کے اندر ہندوؤں کے بچے بھی مرنے مارنے

کے لیے تیار ہیں اور سومنات کا دفاع اس سے کہیں زیادہ مستحکم اور خطرناک ہے جتنا وہ سمجھے تھے۔ سلطان خدا کی مدد کا محتاج تو رہتا ہی تھا لیکن یہاں آ کر اُس نے محسوس کیا کہ اُسے کامیابی یا کامیاب پسپائی خدا ہی عطا کر سکتا ہے۔ اتفاق سے وہ جمعرات کے روز سومنات پہنچا تھا۔ فوج کو آرام کی ضرورت تھی لیکن اُس نے جمعہ کے روز حملہ کرنے کا فیصلہ کیا کیونکہ یہ مبارک دن تھا۔ اُس نے اپنے سالاروں کو صرف ایک رات کی مہلت دی کہ وہ اپنے اپنے دستے تقسیم کے مطابق پوزیشنوں پر لے جائیں اور رسد کو اس طرح محفوظ کیا جاتے کہ دشمن کے چھاپہ مار اس تک نہ پہنچ سکیں۔ غزنی کی فوج کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ اسے رسد اور کمک ملنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔

صحیح الفاظ میں یوں کہنا چاہیئے کہ سومنات کا معرکہ اسلام اور ہندومت کا سب سے بڑا معرکہ تھا اور یہ دو مذہبوں کا ہی معرکہ تھا۔ اگر سلطان محمود کو علاقہ فتح کرنا ہوتا اور اُس کا مقصد اپنی سلطنت کی توسیع ہوتا تو وہ اتنی دور نہ آتا۔ شمالی اور وسطی ہند کے کئی علاقوں کو وہ فتح کر چکا تھا۔ انہی کو مستقر بنا کر وہ ان سے ملحق علاقے اپنی سلطنت میں شامل کر سکتا تھا۔

*

بروز جمعہ ۷ جنوری ۱۰۲۶ء (۱۵ ذیقعد ۴۱۶ ہجری) غزنی کی فوج میں اذان کی صدائے مقدس گونجی اور احکام کے مطابق تمام فوج نے باجماعت نماز پڑھی۔ سلطان محمود بھی فوج کی کسی صف میں کھڑا تھا۔ امام نے گڑگڑا کر فتح کی دعا مانگی اور اس کے فوراً بعد فوج نے سومنات کا محاصرہ کر لیا۔ اس محاصرے میں سب سے نمایاں چیز جو تمام مورخوں نے لکھی ہے وہ غزنی کی فوج کے نعرے تھے جو اس قدر گرجدار تھے کہ خوف کا تاثر پیدا کرتے تھے۔ اس کے جواب میں قلعے کی دیوار پر ہندوؤں کا جو ہجوم تھا، وہ اپنے نعرے لگا رہا تھا۔

سلطان محمود کسی ایک جگہ کھڑا ہو کر احکام نہیں دے رہا تھا۔ وہ مسلسل حرکت میں تھا۔ اُس کے قاصد اور محافظ اس کے ساتھ بھاگ دوڑ رہے تھے۔ سب سے

پہلا کام خندق کو عبور کرنا تھا۔ دیواروں کے اوپر سے اور برجوں سے ہندوؤں نے تیروں کا مینہ برسا دیا۔ سلطان محمود نے اپنے ہزاروں تیر اندازوں کو خندق کے کنارے کھڑا کئے دیواروں اور برجوں پر بلارُکے تیر چلاتے رہنے کا حکم دیا۔ غزنی والوں کی کمانیں بڑی تھیں اور سخت بھی۔ ان کے چھوڑے ہوئے تیر ہندوؤں کے تیروں کی نسبت دور مار کر سکتے تھے۔

تیر اندازوں نے آنِ واحد میں خندق کے کنارے کھڑے ہو کر تیر چلانے شروع کر دیئے۔ ان سے ہندوؤں کے سر پیچھے ہو گئے اور ان کی تیر اندازی میں کمی آ گئی۔ غزنی والوں کی تیر اندازی شدید اور تیز تر ہو گئی۔ اس کے سائے میں سلطان محمود کی فوج نے جگہ جگہ سے خندق میں اونٹوں پر لاد کر لاتے ہوئے پتھر اور مٹی پھینکنی شروع کر دی۔ یہ عمل ایسا تھا جیسے ایک جگہ سے زمین اکھاڑ کر دوسری جگہ ڈالی جا رہی ہو۔

ہندوؤں نے دیکھا کہ خندق بھرتی جا رہی ہے تو انہوں نے دیواروں پر اپنے آپ کو مسلمانوں کے تیروں کے سامنے کر دیا اور خندق بھرنے والوں پر تیر برسانے لگے۔ وہ مسلمانوں کے تیروں کا نشانہ بن رہے تھے، گر رہے تھے مگر جو گرتا تھا اُس کی جگہ ایک اور ہندو آ جاتا تھا۔ انہوں نے مسلمانوں کو خاصا نقصان پہنچایا۔ خندق ابھی آدھی بھری تھی کہ مسلمان تیر انداز اپنے ساتھیوں کو تیروں سے زخمی ہوتا دیکھ کر جوش میں آ گئے۔ وہ خندق میں کود گئے اور ایک دوسرے کی مدد سے خندق سے اوپر چلے گئے۔ وہ دیوار کے اتنی قریب چلے گئے جہاں سے وہ دیوار کے اُوپر کھڑے ہندوؤں کو دیکھ سکتے تھے۔ وہاں سے انہوں نے تیر اندازی شروع کر دی۔

یہ نعرۂ اللہ اکبر کا کرشمہ تھا کہ ان تیر اندازوں نے اپنے آپ کو یقینی موت کے خطرے میں ڈال دیا۔ اوپر کے تیر ان پر موسلا دھار بارش کی طرح آ رہے تھے۔ غزنی کے مجاہد تیر کھا کر بھی تیر چلاتے تھے۔ یہ تیروں کا معرکہ تھا۔ خندق بھر جانے کے بعد قلعے کے دروازوں اور دیواروں پر ہلّہ بولنا تھا۔

خندق اتنی بھر گئی کہ فوج گزر سکتی تھی۔ چار گھوڑ سواروں نے ہاتھوں میں کلہاڑے لیے گھوڑے سرپٹ دوڑا دیئے۔ ان کا رُخ ایک دروازے کی طرف تھا۔ ان کا ارادہ تھا کہ دروازے تک پہنچ جائیں تو کلہاڑوں سے دروازہ توڑ دیں گے مگر دو تو راستے میں ہی تیروں کا نشانہ بن گئے۔ ان پر اتنے تیر آئے کہ گھوڑوں کے جسموں میں بھی تیر اُتر گئے۔ دو دروازے تک پہنچ گئے مگر دروازے کے دائیں بائیں دیواروں میں چوڑے سوراخ تھے جن میں دروازے کی حفاظت کے لیے تیر انداز بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے دونوں سواروں کو ختم کر دیا۔

غزنی کی فوج بند توڑ کر نکل جانے والے سیلاب کی طرح بڑھی۔ ان دستوں کے پاس بڑی مضبوط سیڑھیاں تھیں جن کی لمبائی دیواروں کی بلندی جتنی تھی۔ عقب سے تیر اندازوں نے دیوار کے اوپر اور برجوں پر تیر اور تیزی سے پھینکنے شروع کر دیئے تاکہ اوپر والوں کے سر نیچے رہیں لیکن ہندوؤں نے جان کی بازی لگا رکھی تھی۔ انہوں نے سر نیچے نہ کیے اور اُن مسلمانوں پر تیر برسانے شروع کر دیئے جنہوں نے سیڑھیاں اٹھا رکھی تھیں۔

دروازے تک پہنچنا ناممکن نظر آرہا تھا، پھر بھی کچھ جانباز ایسی پوزیشنوں تک پہنچ گئے جہاں سے وہ دروازے کے ساتھ والے سوراخوں میں تیر چلا سکتے تھے۔ ان میں بعض مارے گئے لیکن غزنی والوں کا جوش اور جذبہ پہلے سے زیادہ بڑھ گیا تھا۔ سیڑھیاں دیواروں کے ساتھ لگا دی گئیں مگر اُن پر جو بھی چڑھا وہ جسم میں دو تین تیر لیے ہوئے گرا۔

اِدھر دیواروں پر چڑھنے کی کوشش ہو رہی تھی، اُدھر سمندر کی طرف ایک معرکہ لڑا جا رہا تھا۔ قلعے کا تمام تر پچھواڑہ سمندر میں تھا۔ ایک نائب سالار نے یہ دلیرانہ حکم دیا کہ سمندر میں کشتیاں ڈال کر دیوار تک پہنچا جائے اور دیوار پر چڑھنے کی کوشش کی جائے۔ غزنی کی فوج کے پاس اپنی کشتیاں نہیں تھی۔ سمندر کا کنارہ کشتیوں سے بھرا پڑا تھا۔ یہ سومنات کی فوج کی کشتیاں تھیں۔ ایک جیش کشتیوں میں سوار ہو گیا۔ یہ جنوری کا مہینہ تھا، اس لیے سمندر میں جوش نہیں تھا۔ کشتیوں کے ملاح ہندو تھے۔ انہیں

کہا گیا کہ وہ کشتیاں دیوار تک لے چلیں۔ کشتیوں میں سیڑھیاں بھی رکھ لی گئی تھیں۔ یہ کوشش بھی ناکام ہو گئی کیونکہ دیوار کے اوپر سے تیر آنے لگے۔ ہندو ملاح سمندر میں کود گئے۔ غزنی کے مجاہدوں نے خود چپّو مارے لیکن دیوار تک پہنچنا خودکشی کے برابر تھا۔

جمعہ کی نماز کا وقت ہو گیا۔ خندق کو ابھی تک بھرا جا رہا تھا تاکہ آگے پیچھے ہونے کی رفتار تیز کی جا سکے۔ دونوں فوجوں کا خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ سلطان محمود نے (مورخوں کے مطابق) گھوڑے پر ہی دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے اور دعا ختم کر کے اس نے شدید ہلّہ بولنے کا حکم دے دیا۔ وہ خود پیچھے کھڑا نہ رہا۔ بہت آگے چلا گیا۔ وہ فوج کا حوصلہ بڑھانے کے لیے چیخ چلّا رہا تھا۔

یہ ہلّہ اس حد تک کامیاب رہا کہ دروازے کے بالکل اوپر اور دروازے کے ساتھ دائیں اور بائیں جو مورچہ نما بُرج بنے ہوئے تھے، انہیں صاف کر دیا گیا اور غزنی کے سپاہی اس طرح اِن کم بلندی والے مورچوں میں کھڑے ہو گئے کہ اندر سے کوئی ان میں آ کر تیر نہیں چلا سکتا تھا۔

ہندوؤں نے دلیری کا یہ مظاہرہ کیا کہ قلعے کا ایک دروازہ کھول دیا۔ اندر سے گھوڑ سوار ہاتھوں میں برچھیاں لیے تیز رفتار سے آئے اور ایسا ہلّہ بولا کہ خود تو مارے گئے لیکن غزنی والوں کو پیچھے دھکیل دیا۔ سلطان محمود نے حکم دیا کہ کھلے ہوئے دروازے میں گھس جاؤ۔ ایک ہی بار بہت سے سواروں نے گھوڑوں کو ایڑ لگا دی مگر اندر سے اتنے ہی گھوڑے سرپٹ دوڑتے آئے۔ ان کا ٹکراؤ دروازے میں ہوا۔

اندر سے مزید سوار آئے۔ انہوں نے غزنی کے سواروں کو دروازے کے اندر نہ ہونے دیا۔ مؤرخ لکھتے ہیں کہ دونوں طرف کے سپاہی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے نظر آتے تھے۔ غزنی والوں نے تو جیسے عہد کر لیا تھا —— "فتح یا موت" —— وہ سراپا قہر بن گئے تھے اور ہندو اس قہر کو اپنے سینوں پر روک رہے تھے۔

یہ اطلاع اندر پہنچ گئی کہ غزنی کی فوج نے دروازہ کھول لیا ہے۔ اوپر والے ہندو تیر انداز ایسی جگہ آگئے جہاں سے وہ دروازے پر تیر چلا سکتے تھے۔ انہوں نے تیر برسانے شروع کر دیئے۔ دیوار پر یہ غلط اطلاع بھی پہنچی کہ غزنی کی فوج قلعے میں داخل ہوگئی ہے۔ اوپر والے مسلمانوں کو روکنے کے لئے قلعے کے اندر اُتر گئے۔ مسلمانوں کی قیادت بڑی تیز اور ذہین تھی۔ انہوں نے فوراً دیوار کے ساتھ سیڑھیاں لگالیں اور سپاہی ایک دوسرے کے پیچھے اوپر چڑھ گئے۔ ان کے پیچھے فوج چڑھی جا رہی تھی۔ اگلے لمحے دیوار کے اوپر دست بدست لڑائی شروع ہوگئی۔

مندر تک خبر پہنچ گئی کہ مسلمان اندر آگئے ہیں۔ تمام پنڈت جو عبادت میں مصروف تھے، اس طرح سجدے میں چلے گئے کہ پیٹ کے بل لیٹ کر ماتھے فرش پر رگڑنے لگے۔ چونکہ دروازہ ابھی کھلا تھا اس لیے غزنی کے اللہ اکبر کے نعرے مندر کے اندر تک سنائی دے رہے تھے۔ پنڈت اور دیگر پجاری سپاہی نہیں تھے۔ وہ لڑنا نہیں جانتے تھے۔ سلطان محمود نے اپنا اصول بنا رکھا تھا کہ وہ بت توڑ دیتا، مندر کو اجاڑ دیتا مگر کسی پنڈت اور پجاری پر ہاتھ نہیں اٹھاتا تھا۔

سومنات کے مندر میں پنڈتوں کو پتہ چلا کہ دروازہ کھل گیا ہے اور مسلمان اندر آگئے تو وہ بت کے آگے لیٹ گئے، اور جب اللہ اکبر کے نعروں کی گرج اُن کے کانوں تک پہنچی تو چند ایک پنڈت اٹھ کھڑے ہوئے۔ دو یورپی مؤرخوں ہیگ اور سمتھ، نے لکھا ہے کہ مندر میں سینکڑوں نیم عریاں رقاصائیں موجود تھیں۔ اُن کا رقص رُک گیا تھا۔ وہ شاید سمجھ گئی تھیں کہ ان کا دیوتا ہار گیا ہے۔ ان کے چہروں پر گھبراہٹ تھی۔ چند ایک پنڈت اٹھے اور یہ سمجھ کر اُن کی زندگی کا آخری وقت آ گیا ہے، ایک ایک رقاصہ کو پکڑا اور مندر سے ملحقہ کمروں میں لے گئے۔ اس طرح مندر میں بدکاری شروع ہوگئی۔ شہری اس سے بے خبر تھے۔

شہریوں پر خوف و ہراس نہیں تھا۔ مردوں کے ساتھ عورتیں بھی ہتھیاروں سے لیس ہو کر نکل آئی تھیں۔ بوڑھی عورتیں مندر میں اکٹھی ہو کر عبادت میں مصروف ہوگئی تھیں۔

دروازہ کھولنے کی چال سومنات کے مہاراجہ کنور رائے کی تھی۔ وہ غزنی کی فوج کو نقصان پہنچانے میں خاصی حد تک کامیاب تھا مگر اُس کا مقابلہ غزنی کے جس جرنیل سے تھا، وہ اُس سے زیادہ دانش مند تھا اور وہ ہر موقع سے فائدہ اُٹھانے کی اہلیت رکھتا تھا۔ سلطان محمود اور اُس کے سالارِ اعلیٰ ابوعبداللہ نے دروازہ کھلنے سے یہ فائدہ اٹھایا کہ اپنی فوج کے بہت سے آدمی دروازے کے درمیان والے برجوں اور مورچوں میں کھڑے کر دیئے جہاں سے انہوں نے بڑی کارگر تیر اندازی کی۔ اُدھر فوج دیواروں پر چڑھتی جا رہی تھی۔

مہاراجہ کنور رائے نے یہ صورتِ حال دیکھی تو اندر سے ایسا حملہ کرایا کہ ہندو گھوڑسوار غزنی والوں کو دھکیلتے ہوئے باہر لے گئے اور اُن کے پیچھے دروازہ بند ہو گیا۔ ہندو سواروں نے اپنا آپ سومنات پر قربان کر دیا۔ وہ اندر نہیں جا سکتے تھے۔ دروازہ بند ہو چکا تھا۔ وہ مسلمانوں کے ہاتھوں کٹ گئے۔ جو مسلمان برجوں پر قابض ہو گئے تھے اُن پر ہندو ٹوٹ پڑے۔ وہ سب لڑتے ہوئے کام آئے۔ اس کے ساتھ ہی سومنات کی فوج نے سیڑھیوں کے ذریعے اوپر آنے والے مسلمانوں پر اس قدر تیر برسائے کہ مسلمان ایک دوسرے کے اوپر گرے، اور جو اوپر چلے گئے تھے ان میں سے شاید ہی کوئی زندہ رہا ہو گا۔

دیوار کے اوپر سے اب تیروں کے ساتھ برچھیاں بھی برسنے لگیں۔ سلطان محمود نے دیکھا کہ سورج قلعے کے پیچھے چلا گیا ہے اور فوج تھک گئی ہے اور زخمیوں کی تعداد بھی بڑھتی جا رہی ہے تو اُس نے پیچھے ہٹ آنے کا حکم دے دیا۔

وہ رات بھر سویا نہیں۔ سالاروں کو احکام دیتا رہا۔ اُس نے زخمیوں کی عیادت بھی کی اور وہ اُن دستوں کو دیکھنے بھی گیا جو باہر سے آنے والی ہندو فوجوں کے انتظار میں تھے۔ وہ کچھ فکر مند بھی تھا۔ اُسے کامیابی مخدوش نظر آ رہی تھی لیکن وہ ہار ماننے والا آدمی نہیں تھا۔

اگلی صبح طلوع ہوتے ہی اُس نے جوش و خروش سے قلعے پر ہلہ بولا۔ سپاہیوں نے دیواروں کے ساتھ سیڑھیاں لگا لیں مگر ہندوؤں نے انہیں اوپر نہ جانے

دیا۔ سارا دن یہ عمل جاری رہا لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ شام کو اُس نے دستے پیچھے ہٹا لیے۔

*

۹ جنوری ۱۰۲۶ء بروز اتوار، مہاراجہ کنور رائے نے ایک دلیرانہ چال چلی۔ اُس نے صبح کی روشنی صاف ہونے سے پہلے قلعے کا دروازہ کھول دیا۔ اندر سے کچھ دستے باہر آئے جنہوں نے غزنی کی فوج کے کیمپ پر ہلّہ بول دیا۔ ہندوؤں کا خیال ہوگا کہ غزنی کی فوج ابھی سوئی ہوئی ہوگی یا ابھی تیار نہیں ہوگی، لیکن وہ نماز کا وقت تھا اور فوج ابھی ابھی نماز سے فارغ ہوئی تھی۔ ہندو فوج گھوڑسوار تھی۔ غزنی کی فوج کو گھوڑوں کی تیاری کی مہلت نہ ملی۔ سلطان محمود نے فوری طور پر دائیں اور بائیں اس حکم کے ساتھ قاصد دوڑا دیئے کہ ہندوؤں کی فوج کو گھیرے میں لے لو۔ ہندو بڑی دلیری سے آئے تھے مگر وہ دیکھ نہ سکے کہ انہیں گھیرے میں لیا جا رہا ہے۔

غزنی کے ایک دستے نے یہ حملہ کیمپ سے دور روک لیا اور اس کے ساتھ ہی ہندو دستوں پر دائیں اور بائیں سے حملہ ہوگیا۔ ہندوؤں کو یہ چال بہت مہنگی پڑی مگر معرکہ اتنا شدید اور صبر آزما تھا کہ سلطان محمود کی فوج کا بھی دم خم توڑ گیا۔ کچھ ہندو سوار گھیرے سے نکل گئے اور قلعے کی طرف بھاگے۔ اُن کے لیے دروازہ کھُل گیا۔ غزنی کے بہت سے مجاہد اُن کے تعاقب میں گئے مگر سلطان محمود نے انہیں روک لیا۔ قلعے کا کھُلا ہُوا دروازہ اُن کے لیے موت کا پھندہ ثابت ہوسکتا تھا۔

ہندو ایسی دلیری کے مظاہرے کر رہے تھے جنہوں نے سلطان محمود کو اپنی سکیم پر نظرِ ثانی پر مجبور کر دیا۔ ہندوؤں کے ساتھ اس کا یہ معرکہ نیا نہیں تھا لیکن یہاں ہندوؤں کے لڑنے کا انداز نیا بلکہ حیرت میں ڈال دینے والا تھا۔ سلطان سوچ ہی رہا تھا کہ اُسے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے کہ ایک طرف سے شور اُٹھا۔ ایسے شور سے وہ اچھی طرح واقف تھا۔ قلعے کا دوسرا دروازہ کھُل گیا اور سومنات کے دو سوار اور ایک پیادہ دستے نے باہر آکر برق رفتار حملہ کر دیا مگر اب غزنی والوں کی یہ چال بے کار ہوتی

نظر آرہی تھی کہ دشمن پر دائیں اور بائیں سے حملہ کریں کیونکہ دیواروں کے اوپر اور برجوں میں تیراندازوں کا ایک ہجوم تھا جو اپنے حملہ آور دستوں کو پہلوؤں سے تیروں کی بارش سے محفوظ کیے ہوئے تھا۔

سالار ابوعبداللہ نے یہ چال چلی کہ اپنے دستوں کو یعنی محاصرے کو پیچھے ہٹ آنے کا حکم دیا۔ اسے توقع تھی کہ ہندو سوار آگے آجائیں گے اور انہیں ایک تو گھیرے میں لیا جا سکے گا، دوسرے یہ کہ قلعے کا دروازہ توڑنے یا دھکیلنے کا موقع مل جائے گا، مگر مہاراجہ کنور رائے کا دماغ پوری طرح کام کر رہا تھا اور وہ غیر معمولی جنگی ذہانت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اُس نے اپنے دستوں کو ذہن نشین کرا دیا تھا کہ قلعے کی دیوار سے اتنے فاصلے سے آگے نہ جائیں خواہ کچھ ہی ہو جائے۔ انہوں نے ابوعبداللہ کی چال بے کار کر دی۔ وہ آگے نہیں آرہے تھے۔

ہندوؤں کی دلیری کا یہ عالم تھا کہ وہ آگے آنے کی بجائے دائیں بائیں کُھل گئے اور انہوں نے محاصرے پر جگہ جگہ حملے شروع کر دیئے۔ وہ محاصرہ توڑنے کی اور غزنی والوں کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان پر جنونی کیفیت طاری تھی جیسے کوئی نشہ پی کر آئے ہوں۔ یہ مذہب کا جنون تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اُن کا جنون باؤلاپن بن گیا جس کا باعث یہ ہُوا کہ قلعے کی دیواروں سے جہاں سے تیروں کا مینہ برس رہا تھا، نسوانی آوازیں آنے لگیں۔ یہ عورتوں کی للکار تھی۔ وہ اپنے سپاہیوں کو طرح طرح کے نعروں سے گرما رہی تھی۔ ان میں ایک آواز یہ تھی ـــ "تمہاری ماؤں بہنوں کو مسلمان اٹھا لے جائیں گے"۔ـــ عورتوں کی چیخ و پکار ایسی تھی جیسے وہ کسی ظالم اور درندے کے چنگل میں آگئی ہوں۔

صورتِ حال اس قدر خونریز اور غزنی والوں کے لیے اس قدر مخدوش ہو گئی، کہ (محمد قاسم فرشتہ اور البرونی کے مطابق) سلطان محمود نے اپنا مرکز اپنے مشیروں وغیرہ کے حوالے کر کے ایک منتخب دستے کی قیادت سنبھال لی اور ہندوؤں پر جوابی حملہ کیا۔ سب سے بڑی مشکل اوپر سے آنے والے تیروں اور برچھیوں نے پیدا کر رکھی تھی۔ سلطان محمود نے اپنے آپ کو ایک ہولناک خطرے میں ڈال دیا تھا۔ غزنی کی فوج کو پسپا کرنے

کے لیے اب صرف ایک تیر کی ضرورت تھی جو سلطان محمود کو لگتا اور جنگ ختم ہو جاتی۔

ابوعبداللہ محمد الطائی نے سلطان کی یہ دلیری اور یہ جذبہ دیکھا تو اُس نے ایک تیر انداز دستے کو حکم دیا کہ وہ دیوار کے اتنی قریب چلا جائے جہاں سے اوپر کے تیرانداز نظر آتے رہیں اور تیروں کا نشانہ بھی بن سکیں۔ اس دستے نے دیکھ لیا تھا کہ سلطان قلب سے آ کر ایک دستے کی قیادت کر رہا ہے۔ اِس دستے کے تیراندازوں نے جان کی بازی لگا دی۔ اب صورت یہ پیدا ہو گئی کہ دونوں طرفوں کے تیر ہوا میں ٹکرا رہے تھے۔ غزنی کے تیر انداز اوپر سے آتی ہوئی برچھیوں سے مر رہے تھے مگر انہوں نے تیر اندازی میں سُستی پیدا نہ کی۔

ابوعبداللہ کی اس چال کا یہ فائدہ ہُوا کہ اوپر کے تیر اندازوں کا رُخ سلطان محمود کے دستے سے ہٹ کر دوسری طرف ہو گیا۔ ایک اور فائدہ یہ ہُوا کہ غزنی کے دوسرے دستوں نے اپنے تیر اندازوں کی یہ جانبازی دیکھی تو اُن میں نیا ہی جوش بلکہ قہر پیدا ہو گیا۔ وہ احکام کے بغیر آگے چلے گئے اور اس قدر تیر برسائے کہ دیوار سے ہندو تیر انداز باہر کی طرف بھی گرنے لگے۔

جو ہندو دستے باہر آئے تھے، وہ جانبازی سے لڑ رہے تھے لیکن وہ اُس حفاظت سے محروم ہو گئے جو دیوار کے اُوپر سے انہیں تیر انداز دے رہے تھے۔ سالار ابوعبداللہ کی نظر سلطان محمود پر تھی۔ سلطان پر جیسے دیوانگی طاری ہو گئی تھی لیکن وہ دماغ کو اپنے قابو میں رکھے ہوئے تھا۔ اُس نے ایسی چال چلی کہ ہندو دستے بکھرنے پر مجبور ہو گئے۔ ابوعبداللہ نے دشمن کو بکھرتے دیکھا تو ایک سوار دستہ قلعے کی دیوار کی طرف سے ہندوؤں پر حملے کے لیے بھیج دیا۔ سینکڑوں گھوڑے سرپٹ دوڑے۔ ہندو بوکھلا گئے۔ انہوں نے غزنی والوں کا بہت نقصان کیا تھا لیکن وہ خود بھی تیزی سے ختم ہو رہے تھے۔

ان میں جو بچ گئے تھے وہ دروازے کی طرف بھاگنے کی کوشش کرنے لگے لیکن مہاراجہ کنور رائے ایسا احمق نہیں تھا کہ اُن کے لیے دروازہ کھول دیتا۔ وہ بُرج میں کھڑا دیکھ رہا تھا کہ غزنی کی فوج ایسی پوزیشن میں آگئی ہے کہ دروازہ کھلا

اور یہ سیلاب کی طرح اندر آجائے گی۔ اُس نے اپنے ان دستوں پر لکیر کھینچ دی۔ ان میں سے کوئی بھی اندر نہ جاسکا نہ کوئی زندہ رہا سلطان محمود کا اصول کچھ اور تھا لیکن سالار ابوعبداللہ نے کانوں کان اپنے نائبین کو اور ان کی معرفت تمام کمانداروں سے کہہ دیا تھا کہ کوئی جنگی قیدی نہیں چاہیئے ہلاک کردو۔ دشمن کا کوئی آدمی کسی بھی حالت میں سامنے آئے، ہلاک کردو"۔ اب تو جنگ کی صورت ایسی ہو گئی تھی کہ لڑنا اور مرنا تھا۔ جنگی قیدیوں کو کہاں سنبھالتے۔ البتہ دشمن کے تندرست گھوڑے اور ہتھیار جمع کرنے کا حکم دے دیا گیا تھا۔ وہاں قیدیوں کی نسبت گھوڑوں اور ہتھیاروں کی ضرورت زیادہ تھی۔

*

"کیا آپ نے ہندوؤں کو پہلے کہیں اس طرح لڑتے دیکھا تھا؟"۔ رات کو سلطان محمود نے اپنے سالاروں، ان کے نائبین اور کمانداروں سے کہا۔ اُس نے چھوٹے درجے کے عہدیداروں اور کمانداروں کو بھی بلا رکھا تھا۔ اُس نے کہا "اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس جگہ کو ہندو کتنا مقدس سمجھتے ہیں۔ میں نے آپ سب کو اس لیے بلایا ہے کہ اپنے سپاہیوں کو بتاؤ کہ ہندوؤں کا مذہبی جنون دیکھو اور یہی جنون اپنے آپ میں پیدا کرو..... انہیں میری طرف سے خراجِ تحسین پیش کرنا۔ انہوں نے آج احکام کے بغیر جو مظاہرے کیے ہیں، ان کا صلہ انہیں خدا دے گا۔ اِس جذبے میں فرق نہ آنے پائے۔ میں کوئی پیش گوئی نہیں کرسکتا کہ کل کیا ہوگا اور اس جنگ کا انجام کیا ہوگا۔ میں اپنی فوج کے مجاہدوں کو یہ پیغام دینا چاہتا ہوں کہ اگر ہم یہاں ہار گئے تو آنے والی نسلیں بھی کہیں گی کہ ہندوؤں کا شیودیو سچا تھا اور انسانوں کی زندگی اور موت اسی کے ہاتھ میں تھی اور اسلام کوئی مذہب نہیں۔ ہمارے بعد آنے والے لوگ ہمیں لٹیرا اور قاتل کہیں گے۔ ہمیں اسلام کی عظمت اور صداقت کا ثبوت دینا ہے یا ہمیں ختم ہونا ہے۔ اس جنگ کو آپ عام قسم کی جنگ نہ سمجھ لینا۔ کل کا دن آج کے دن سے زیادہ جاں لیوا اور ہمت آزما ہوگا۔ آپ کو تاریخ میں ایک نقش چھوڑنا ہے تاکہ قیامت تک جو غزنی کا نام لے سومنات کا نام بھی ضرور

لے اور کہے کہ سومنات غزنی کے قدموں میں پڑا ہے۔"

سلطان محمود نے انہیں جنگی نوعیت کی ہدایات دیں اور انہیں کہا کہ یہ جنگ بہت جلدی ختم کرنی ہے کیونکہ نفری کم ہو رہی ہے، اور رسد میں بھی تیزی سے کمی آرہی ہے اور یہ کمی پوری کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ ہمارا دشمن عقل مند اور دلیر ہے لیکن وہ یہ طریقہ نہیں سوچ سکا کہ ہم پر حملہ کرنے کی بجائے دفاع میں لڑ رہا ہے اور محاصرہ طویل ہو جائے تاکہ ہم اپنی رسد ختم کر دیں۔ وہ ہمیں تیروں سے نہیں بھوک سے مار سکتا ہے، پیشتر اس کے کہ دشمن یہی چال چل جائے ہمیں شہر میں داخل ہونا ہے۔ میں بھوکی اور زخمی بلی کی طرح نہیں، شیر کی طرح شہر میں داخل ہونا چاہتا ہوں۔"

غزنی والوں نے یہ رات بھی جاگتے گزار دی۔

*

سلطان محمود نے ان لوگوں کو رخصت کیا تو اُسے اطلاع دی گئی کہ ایک ہندو رشی جو بہت بوڑھا ہے ایک نوجوان لڑکی کو ساتھ لایا ہے۔ وہ سلطان سے ملنے آیا تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ وہ قلعے میں سے آیا ہے۔ اُس کی اور لڑکی کی جامہ تلاشی لے لی گئی تھی۔ سلطان نے اس خیال سے انہیں بلا لیا کہ مہاراجہ کنور رائے کا کوئی پیغام ہو گا جو صلح کا بھی ہو سکتا تھا، دھمکی کا بھی اور کسی سودا بازی کا بھی۔

وہ بوڑھا سر سے پاؤں تک جوگیا لباس میں تھا۔ اُس کے بال عورتوں کی طرح لمبے اور اس کی داڑھی بھی لمبی تھی۔ وہ بوڑھا تھا اور اس کے بال زیادہ تر سفید تھے لیکن اس کی آنکھوں میں جوانی کی چمک اور چہرے پر ایسی رونق تھی جو ہندوؤں کے چہروں پر کم ہی ہوا کرتی تھی۔ سلطان محمود اس سے متاثر ہوا۔ اس بوڑھے کے ساتھ جو لڑکی تھی، وہ چادر میں تھی۔ اس کا سر اور آدھا چہرہ بھی ڈھانپا ہوا تھا۔ بوڑھے نے اُس کے سر سے چادر اتار دی۔ سلطان محمود نے چونک کر لڑکی کو دیکھا۔ اُس نے اتنی دل کش لڑکی کبھی نہیں دیکھی تھی، یا اُس نے کسی عورت کو کبھی غور اور دلچسپی سے نہیں دیکھا تھا۔ اِس لڑکی نے اُس کی نظروں کو گرفتار کر لیا۔

"آپ کیوں آئے ہیں؟" ـــ سلطان محمود نے بوڑھے سے پوچھا۔ "کیا آپ کو سومنات کے مہاراجہ نے بھیجا ہے"؟ ـــ اُس نے دونوں کو بٹھا لیا۔ وہ اس بوڑھے کے ساتھ اسی علاقے کے ایک مسلمان کے ذریعے بات کر رہا تھا۔

"میں مہاراجہ کی طرف سے کوئی پیغام نہیں لایا" ـــ بوڑھے نے کہا۔ اُس کے لب و لہجے میں ایک تاثر تھا جو سلطان نے محسوس کیا اور وہ سمجھ گیا کہ یہ بوڑھا معمولی آدمی نہیں۔ بوڑھا کہہ رہا تھا۔ "میں مہاراجہ کی اجازت سے آیا ہوں۔ اُس نے مجھے چار گھوڑ سواروں کے ساتھ قلعے سے نکال کر راستہ دکھایا تھا۔ میں اپنا پیغام لایا ہوں۔ میں سومنات کا پنڈت نہیں۔ میں یہاں ہر سال پندرہ بیس دنوں کے لیے آیا کرتا ہوں۔ میرا ٹھکانہ ہمالیہ کے دامن میں ہے جہاں برف جمی رہتی ہے۔ اب بھی یہاں چند دنوں کے لیے عبادت کرنے آیا تھا کہ آپ آگئے۔ آپ نے تین دنوں میں دیکھ لیا ہے کہ سومنات کے رہنے والے کس طرح قہر بنے ہوئے ہیں۔ اپنے نقصان کو دیکھیں۔ آپ پر جو قہر برسا ہے وہ سومنات کے انسانوں کا نہیں، یہ اُس دیوتا کا قہر ہے جس کے پاؤں سمندر میں اور سر آسمانوں میں ہے۔ میں اُس کا خاص پجاری ہوں"۔

"کیا آپ مجھے اپنے دیوتا سے ڈرانے آئے ہیں؟" ـــ سلطان محمود نے مسکراتے ہوئے پوچھا ـــ "اور اس لڑکی کو آپ ہندوؤں کے رواج کے مطابق تحفے کے طور پر لائے ہیں؟"

"اپنے آپ کو گمراہ نہ ہونے دیں سلطان!" ـــ بوڑھے رشی نے کہا۔ "میں نہ ڈرانے آیا ہوں نہ کوئی تحفہ لایا ہوں۔ میں آپ کے فائدے اور آپ کی نجات کے لیے آیا ہوں۔ میں آپ کو ایک پیشکش کرنے آیا ہوں۔ شیو دیو کی طاقت سے آپ واقف نہیں۔ اس طاقت کا صرف ایک ذرّہ شیو دیو نے مجھے دیا ہے۔ یہ ذرہ ایسا ہی ہے جیسے صحرا میں ریت کا ایک ذرّہ یا سمندر میں پانی کا ایک قطرہ۔ اس ایک ذرّے اور ایک قطرے کی طاقت دیکھنی ہے تو دکھا دوں گا۔ اس سے آپ اس دیوتا کی طاقت کا اندازہ کر سکیں گے"۔

"اور یہ لڑکی؟"

"یہ زندہ نہیں، ایک رُوح ہے"۔ بوڑھے نے کہا"آپ کو شاید کسی نے بتایا نہیں کہ جو مر جاتا ہے اُس کی روح سومنات میں آجاتی ہے۔ یہ رُوح بڑی دُور سے آئی تھی۔ میں نے آج اسے حاضر کیا اور اسے اپنے ساتھ لے آیا۔ اگر یقین نہ آئے تو میں اسے ہوا میں معلق کر کے دکھا سکتا ہوں"۔

اُس نے لڑکی کا سر اپنے ہاتھوں کے پیالے میں لے لیا اور اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سرگوشیوں میں کچھ کہا۔ لڑکی کا سر ڈولنے لگا۔ بوڑھے نے اُسے بازوؤں پر اٹھا لیا اور اُسے کہا"تم پلنگ پر ہو۔ ٹانگیں اور سر سیدھا کر لو"۔ لڑکی کا جسم یوں سیدھا ہو کر اکڑ گیا جیسے پلنگ پر لاش پڑی ہو لیکن وہ بوڑھے کے بازوؤں پر تھی۔ بوڑھے نے اپنے بازو اُس کے نیچے سے نکال لیے۔ لڑکی اکڑی ہوئی ہوا میں معلق رہی۔ بوڑھے نے لڑکی کی چادر اُس پر اس طرح ڈال دی کہ وہ سر سے پاؤں تک چادر میں چھپ گئی۔

سلطان کے دو محافظ خیمے کے دروازے میں اندر کھڑے تھے۔ بوڑھے رشی نے ایک محافظ سے کہا"تلوار نکالو اور اس لڑکی کے پیٹ پر اتنی طاقت سے وار کرو کہ اس کا جسم دو حصّوں میں کٹ جائے"۔

محافظ نے سلطان کی طرف دیکھا۔ وہ بغیر اجازت کوئی حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ سلطان نے اُسے اشارہ کیا کہ بوڑھے نے جو کہا ہے وہ کرو۔ محافظ نے تلوار نکالی اور پوری طاقت سے لڑکی کے پیٹ پر وار کیا مگر وہاں کسی کا پیٹ نہیں تھا جو کٹ جاتا۔ صرف چادر تھی جو تلوار کے ساتھ لپٹ کر زمین پر جا پڑی۔ لڑکی غائب تھی۔

حیرت سے محافظ کا رنگ پیلا پڑ گیا لیکن سلطان محمود مسکرا رہا تھا۔

"یہ جسم نہیں تھا"۔ بوڑھے نے کہا"تلوار سے آپ جسم کو کاٹ سکتے ہیں، روح کو نہیں۔ اگر آپ حکم دیں تو میں آپ کو تھوڑی سی دیر کے لیے اُس دنیا میں بھیج سکتا ہوں جہاں سے یہ روح آئی تھی"۔

دو وقائع نگاروں، ابنِ ظفیر اور سبط ابن الجوزی نے اُس دَور کی ایک تحریر

کا حوالہ دے کر یہ واقعہ کچھ اختصار سے بیان کیا ہے۔ ایک بار سلطان محمود کے پیرو مرشد شیخ ابوالحسن خرقانی نے اُسے کہا تھا کہ ہندوستان جادوگروں اور شعبدہ بازوں کی حسین سرزمین ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم یا تمہارے سالار یا انتظامی شعبوں کے وہ حکام جو ہندوستان کے مفتوحہ علاقوں میں رہتے ہیں، اس جادو اور شعبدہ بازی کے اسیر ہو جائیں۔ ہندو وہ قوم ہے جو یہودیوں اور نصرانیوں کی طرح اپنی خوبصورت بیٹیوں کے ذریعے اپنے دشمن کو اُسی طرح پھانس کر چوس لیتی ہے جس طرح مکڑی مکھی کو اپنے جالے میں پھانس لیتی ہے۔ شیخ خرقانی نے سلطان کو تفصیل سے بتایا تھا کہ ہندوستان میں کیسی کیسی شعبدہ بازیاں ہوتی ہیں۔

سلطان محمود خود بھی عالم تھا اور اُسے علم و دانش سے گہری دلچسپی تھی۔ اُس نے ہندوستان کے متعلق بہت کچھ پڑھا اور سنا تھا۔ وہ ہزار ہا جنگی قیدیوں کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ ان میں علم و فضل والے لوگ بھی تھے۔ ان سے اُس نے بہت کچھ حاصل کیا تھا۔ بعض باتیں سُن کر وہ حیران رہ جاتا تھا اور بعض شعبدے دیکھ کر اُسے یقین نہیں آتا تھا کہ کسی انسان میں ایسی شعبدہ بازی کی طاقت ہوتی ہے۔ اُس نے ہمالیہ میں زندگی بسر کرنے والے یوگیوں کے قصے بھی سُنے تھے جن میں سے بعض نے ایسی طاقت حاصل کر رکھی تھی کہ نصف گھنٹے سے بھی زیادہ دیر تک نہ صرف اپنی سانس روک سکتے تھے بلکہ اپنے دل کی حرکت تک ساکن کر لیتے تھے۔ نبضیں رک جاتی تھیں اور کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ شخص زندہ ہے مگر وہ دل کی حرکت خود ہی رواں کر کے زندہ ہو جاتے تھے۔ یوگا تین ساڑھے تین ہزار سال پرانا علم یا طریقہ تھا جس میں مہارت حاصل کر کے یوگی تندرست کو مریض اور مریض کو تندرست کر لیا کرتے تھے۔

یوگ (یوگا) کو آج کے سائنسدان اور ماہرینِ طب و نفسیات اہمیت دے رہے ہیں۔ اس میں اپنے آپ کو اور دوسروں کو ہپناٹائز کرنے کے طریقے خاص طور پر شامل ہیں، اور اس میں ٹیلی پیتھی بھی شامل ہے جسے جدید علمِ نفسیات اپنی اختراع سمجھتا ہے۔ یہ دراصل ہزاروں سال پہلے کے یوگیوں کے

ایجاد کئے ہوئے طریقے تھے۔
یہ بوڑھا رشی لڑکی کو غائب کر کے سلطان محمود کی طرف یہ کہتا ہوا آہستہ آہستہ بڑھا کہ وہ سلطان کو بھی تھوڑی سی دیر کے لیے عالم ارواح میں پہنچا دے گا۔ سلطان نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور مسکرا کر اُسے روک دیا۔ وہ نہ رکا تو ایک محافظ نے اُسے بازو سے پکڑ کر روک لیا۔ ترجمان نے اُسے اُس کی زبان میں کہا کہ سلطان کے اشارے کی خلاف ورزی نہ کرے۔

"اور اسے کہو کہ یہ مجھے تھوڑی سی دیر کے لیے روحوں کے دیس میں پہنچا سکتا ہے اور میں اسے اُس دیس میں ہمیشہ کے لیے پہنچا سکتا ہوں" ۔ سلطان محمود نے کہا ۔"اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میری تلوار اس کی گردن کاٹ دے گی تو لڑکی خود بخود سب کو نظر آنے لگے گی ۔ اسے کہو کہ لڑکی کو فوراً میرے سامنے لائے اور اسے کہو کہ میں یہاں شعبدہ بازی دیکھنے نہیں آیا"۔

بوڑھے رشی نے لڑکی کی چادر دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر جھٹکا دیا اور اپنے بازو آگے کو پھیلا دیئے ۔ چادر تن گئی اور لڑکی اس چادر میں سے برآمد ہوئی ۔ لڑکی پر غنودگی سی طاری تھی ۔ سلطان محمود نے محافظوں سے کہا کہ اس بوڑھے کو باہر لے جائیں ۔ اُسے لے گئے تو سلطان نے لڑکی سے کہا کہ وہ بتا دے کہ یہ بوڑھا جادوگر کس ارادے سے یہاں آیا تھا۔ اگر وہ نہیں بتائے گی تو اُسے بہت بُری موت مرنا پڑے گا ۔ ان کے درمیان ترجمان موجود تھا۔

لڑکی کچھ دیر سلطان کو دیکھتی رہی ۔ اُس کے چہرے پر حیرت کا تاثر تھا ۔ اس نے کہا ۔"مجھے بتایا گیا تھا کہ آپ مسلمانوں کے بادشاہ ہیں .... آپ کیسے بادشاہ ہیں جو مجھے موت کے حوالے کرنا چاہتے ہیں ؟ .... میں وہ کھلونا نہیں جسے کوئی بادشاہ اور کوئی مہاراجہ کسی دوسرے بادشاہ اور مہاراجہ کو نہیں دینا چاہتا ۔ میں اپنی قدر و قیمت سے واقف ہوں"۔

"اور میں اُس مقصد سے واقف ہوں جس کے لیے یہاں آیا ہوں" ۔ سلطان محمود نے کہا ۔"میں تم سے پوچھ رہا ہوں کہ اس شعبدہ باز کو مہاراجہ نے بھیجا ہے یا یہ خود آیا

ہے! مجھے تمہارے جسم اور تمہارے حسن کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں۔ میں تمہیں عزت سے رخصت کروں گا اور مجھے یہ بھی بتاؤ کہ اندر کیا ہو رہا ہے"

لڑکی نے ترجمان کی طرف دیکھا اور اُسے کہا "تم باہر چلے جاؤ"

ترجمان نے سلطان کو بتایا کہ لڑکی اُسے باہر جانے کو کہہ رہی ہے۔ سلطان نے لڑکی کو خشمگیں نگاہوں سے دیکھا اور بڑی دھیمی آواز میں کہا "اگر تم یہاں مرنے کے لیے آئی ہو تو میں تمہاری موت کا انتظام فوراً کر دوں گا لیکن تمہاری موت تلوار کے ایک وار سے نہیں ہوگی۔ تمہیں ٹخنوں سے باندھ کر رسّی گھوڑے کے پیچھے باندھ دی جائے گی اور گھوڑا شہر کے دروازے کی طرف دوڑا دیا جائے گا۔ وہاں تک تمہاری صرف ہڈیاں رہ جائیں گی"

لڑکی نے بتا دیا کہ اُسے مندر کے سب سے بڑے پنڈت اور مہاراجہ نے اپنے پاس بلا کر کہا تھا کہ اس بوڑھے کے ساتھ جاؤ۔ اگر اسے سلطان تک جانے کی اجازت مل گئی تو یہ اپنا کام کرے گا اور اس کے بعد لڑکی اپنا کام کرے گی۔ لڑکی کو سلطان پر اپنے حسن اور نوجوانی کا طلسم طاری کرنا تھا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ سلطان انسان ہے۔ وہ اس کے جال میں آجائے گا، اور شراب ضرور پیتا ہو گا۔ لڑکی نے ایک انگوٹھی پہن رکھی تھی۔ اُس نے انگوٹھی کا اوپر کا حصہ انگوٹھی سے الگ کر دیا اور بتایا کہ اُسے یہ زہر دیا گیا تھا جو اُسے سلطان پر اپنا طلسم طاری کر کے اُسے شراب یا مشروب میں پلانا تھا۔

لڑکی نے انگوٹھی کو اُلٹا کیا تو اس میں سے تھوڑا سا سفوف زمین پر گرا۔ لڑکی نے اس پر پاؤں مار کر اسے مٹی میں ملا دیا۔ اُس نے اندر کی حالت یہ بتائی کہ ایک طرف تو پنڈت بُت کے آگے لیٹ لیٹ کر اور ماتھے رگڑ رگڑ کر رو رہے ہیں، اور دوسری طرف وہ ناچنے والیوں کو اندھیرے کمروں میں لے جا کر بدی میں مصروف ہیں۔ انہیں کہا جا رہا ہے کہ شیودیوتا عصمتوں کی قربانی مانگ رہا ہے۔ لڑکی نے شہر کی کیفیت بھی بتائی اور کہا کہ ہر شہری سومنات کو بچانے کے لیے اپنی جان تک قربان کرنے کو تیار ہے لیکن اُن پر خوف بھی طاری ہے۔

"میں اس مندر کی داسی ہوں" ـــ لڑکی نے کہا "ہندو مجھے اور مجھ جیسی لڑکیوں کو پاک اور مقدس سمجھتے ہیں مگر ہم اس مندر اور اس شیو دیو کی حقیقت سے آگاہ ہیں ۔ نہ ہم پاک ہیں نہ پنڈت اور پروہت پاک ہیں ۔ میرا کوئی مذہب نہیں ۔ مجھے آپ اپنی داسی بنالیں ۔ یہی میرا مذہب ہے"

سلطان محمود نے زیادہ باتیں نہ کیں ۔ بوڑھے رشی کو اندر بلایا ۔

"مجھے ہندوستان میں آتے پچیس برس گذر گئے ہیں" ـــ سلطان نے بوڑھے سے کہا "کیا تم میرے پاس یہ سمجھ کر آئے ہو کہ مجھے ہندوستان کی ان شعبدہ بازیوں کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں ؟ کیا میں یوگیوں کی حیران کن طاقتوں سے واقف نہیں ؟ میں ایک سچے مذہب کا پرستار ہوں یوگی مہاراج ! میں اُس مذہب کا پرستار ہوں جس کی بیٹیوں کی عصمت پر ہم جانیں قربان کر دیا کرتے ہیں ۔ ہم ہندوؤں ، یہودیوں اور نصرانیوں کی طرح اپنی بیٹیوں کو ننگا نہیں نچایا کرتے اور انہیں دشمن کے خیموں میں نہیں بھیجا کرتے ۔"

"میں اس بحث کے لیے نہیں آیا کہ مذہب کس کا سچا ہے" ـــ بوڑھے نے ایسی باوقار آواز میں کہا جیسے وہ سلطان محمود کو چھوٹا سا آدمی سمجھتا ہو "اپنے وطن اور اپنے مذہب کی خاطر ہماری بیٹیاں اپنا آپ اور اپنی عزت قربان کر دیا کرتی ہیں ۔ یہ ہمارے مذہب کا حکم ہے ۔ آپ کی عمر مجھ سے بہت کم ہے سلطان ! آپ اپنی بیٹیوں کی عصمتوں کی حفاظت کے لیے ہمیشہ زندہ نہیں رہیں گے ۔ ہماری بیٹیاں آپ کے مردوں کو عصمتوں کے شیدائی اور سوداگر بنانے کے لیے زندہ رہیں گی ۔ میں نے آپ کی بات پوری نہیں ہونے دی تھی ۔ مجھے معلوم ہے آپ کیا کہنا چاہتے ہیں ۔ وہ میں کہہ دیتا ہوں تاکہ آپ کا وقت ضائع نہ ہو ۔ یہ ہمارا فرض ہے کہ اپنی بیٹیوں کو یہ سبق دیں کہ اپنے دشمن کو کس طرح بیکار کر سکتی ہیں ۔ میں آپ کو راز کی بات اس لیے بتا رہا ہوں کہ میری چال ناکام ہو گئی ہے ۔ آپ میرے قتل کا حکم دے دیں ۔ اس لڑکی کو بھی مار دیں یا اسے مالِ غنیمت سمجھ کر اپنے پاس رکھ لیں لیکن میں آپ کو یہ بتا دیتا ہوں کہ ہماری لڑکیاں مسلمانوں کے مذہب اور

ایمان کو خرید لیں گی۔ بھارت ماتا میں اسلام نہیں رہے گا"

سلطان محمود بوڑھے کی باتیں بڑی غور سے سن رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر نہ غصے کا تاثر تھا نہ اکتاہٹ کا۔ لطیف سا تبسم تھا جو اُس کے ہونٹوں کو ذرا سا خم دیتے ہوئے تھا۔

"قتل ہونے سے پہلے میں آپ کو مہاراجہ کنور رائے کی طرف سے ایک پیشکش کرنا چاہتا ہوں"۔ بوڑھے نے کہا۔ "آپ جتنی دولت اور جس قدر زر و جواہرات مانگیں گے آپ کے خیمے میں پہنچا دیئے جائیں گے۔ اس عمر اور اس حسن کی آپ جتنی لڑکیاں مانگیں گے آپ کو پیش کر دی جائیں گی۔ آپ واپس چلے جائیں۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ واپسی کے دوران کوئی فوج آپ کو پریشان نہیں کرے گی۔ اگر آپ کو یہ پیش کش قبول نہیں تو میں آپ کو خبردار کر دیتا ہوں کہ کم از کم تین مہاراجوں کی فوجیں کل شام تک پہنچ جائیں گی، اور آپ پر عقب سے ایسا حملہ ہو گا کہ آپ ہندوستان کی جنگی طاقت اور سومنات کی دیواروں کے درمیان پس جائیں گے۔ آپ کا کوئی ایک بھی سپاہی واپس جا کر یہ بتانے کے لیے زندہ نہیں رہے گا کہ غزنی کی فوج کا انجام کیا ہوا ہے"

خیمے میں ایک محافظ کی آواز گرجی۔ "خاموش ..... سگِ ہند" اور اُس نے تلوار نکال لی۔

سلطان محمود نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے روک دیا اور کہا۔ "یہ ہمارا قیدی نہیں مہمان ہے۔ اپنے مہاراجہ کا ایلچی ہے"۔ سلطان نے بوڑھے سے کہا۔ "میں معافی چاہتا ہوں میرے محافظ نے آپ کو ہندوستان کا کتا کہا ہے"

"اگر یہ کسی مہاراجہ کے دربار میں ایسی گستاخی کرتا تو اسے اسی وقت قتل کر دیا جاتا"۔ بوڑھے نے کہا۔

"ہم سب اس وقت خدا کے دربار میں ہیں"۔ سلطان محمود نے کہا۔ "خدا کے دربار میں کوئی کسی کو قتل نہیں کر سکتا۔ یہ لوگ میرے حکم سے نہیں، خدا کے حکم سے یہاں آئے ہیں۔ مجھے ان کی صرف قیادت کا فرض سونپا گیا ہے۔

میں ان کے جذبات، ان کے غصے اور ان کے قہقہوں کو زنجیریں نہیں ڈال سکتا"
سلطان بولتے بولتے اُٹھ کھڑا ہوا اور اُس نے محافظ سے کہا — "اس بزرگ کو اور اس لڑکی کو اپنی حفاظت میں عزّت سے قلعے کے دروازے تک چھوڑ آؤ" — اُس نے بوڑھے سے کہا — "اپنے مہاراجہ سے کہنا کہ تم سومنات کو ایک بوڑھے یوگی، ایک آبرو باختہ حسین لڑکی اور ذرا سے زہر کے ذریعے نہیں بچا سکتے۔ ہم یہاں سے زندہ نکل جانے کی خواہش لے کر نہیں آتے۔ جائیے یوگی مہاراج! اس لڑکی کو ساتھ لے جائیے"
بوڑھا رِشی سلطان کو کچھ دیر دیکھتا رہا، پھر وہ بے اختیار ہو کر آگے بڑھا اور سلطان کا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چوما اور بولا — "مجھے صاف نظر آنے لگا ہے کہ فتح سلطان کی ہوگی" — اور وہ لڑکی کو ساتھ لے کر محافظ کے ساتھ خیمے سے نکل گیا۔

*

اگر سومنات کی جنگ کا حال لمحہ بہ لمحہ لکھا جائے تو ایک ہزار صفحوں کی کتاب بن جاتے۔ ہندوؤں نے غزنی کی فوج اور سلطان محمود کو ذہنی طور پر بیکار کرنے کے لیے زمین دوز حربے استعمال کئے تھے۔ فوج کی نفری نے انفرادی طور پر جس شجاعت اور فرض شناسی کے مظاہرے کئے وہ بڑی لمبی داستان ہے۔ اس جنگ کا شمار تاریخ کی چند ایک مشہور جنگوں میں ہوتا ہے۔ تاریخ اسلام کا تو یہ بہت بڑا معرکہ تھا جسے ہندو مورخوں نے دو چار صفحوں میں بیان کر کے اس کی اہمیت پر پردہ ڈال دیا ہے۔
اُس رات نے جس رات بوڑھا رِشی سلطان کے پاس آیا تھا، ایسی صبح کو جنم دیا جو ہندوستان اور غزنی کی تاریخوں میں اور خصوصاً اسلام کی تاریخ میں کبھی فراموش نہیں کی جائے گی۔ سلطان محمود شہر کی دیواروں اور دروازوں پر نئے انداز سے حملہ کرنے کے احکام دے رہا تھا۔ اسے اطلاع ملی کہ عقب میں دشمن کی دو فوجیں نیم دائرے میں آگئی ہیں اور وہ غزنی کی فوج کو گھیرے میں لے رہی ہیں۔
سلطان نے اس صورتِ حال سے نمٹنے کا بندوبست کر رکھا تھا مگر وہ حیران رہ گیا کہ یہ فوجیں اتنی خاموشی سے کس طرح آگئی ہیں۔ اُس نے سالارِ اعلیٰ ابو عبداللہ

کو محاصرے کی قیادت کے لیے وہیں چھوڑا اور ہدایت دی کہ ابھی حملہ نہ کیا جائے بلکہ تیاری کی حالت میں رہا جائے۔ وہ دشمن کی چال سمجھ گیا تھا۔ اُس نے سالارِ اعلیٰ سے کہا — "پیچھے سے ہم پر حملہ ہوتے ہی شہر کے دروازے کھلیں گے اور اندر کی فوج باہر آکر ہم پر حملہ کرے گی۔ پہلوؤں کو پھیلا دو۔ دشمن جب آگے آجائے تو پہلوؤں سے نکل کر شہر میں داخل ہونے کی کوشش کرنا"

پیچھے سے آنی والی ایک فوج راجہ پرم دیو کی تھی جسے بعض مورخوں نے برہم دیو لکھا ہے اور دوسری فوج راجہ دیو آسرم کی تھی۔ سلطان محمود نے جو دستے عقب کا حملہ روکنے کے لیے پیچھے رکھے تھے، ان کا کمانڈر سالار ابوالحسن تھا۔ سلطان گھوڑا سرپٹ دوڑاتا وہاں پہنچا۔ صورتِ حال مخدوش تھی۔ اُس نے جاتے ہی تیزی سے صورتِ حال کا جائزہ لیا اور حکم دیا کہ آمنے سامنے کی ٹکر نہ لی جائے۔ دونوں پہلوؤں سے حملہ کر دیا جائے۔ سلطان خود ایک بلند جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ گھوڑے دوڑ پڑے اور اللہ اکبر کے نعروں سے زمین و آسمان ہلنے لگے۔

اُدھر شہر کے دونوں دروازے کھلے اور سومنات کی فوج بہت تیزی سے باہر آئی اور پھیل کر بڑی خطرناک ترتیب میں ہو کے محاصرے پر حملہ آور ہوئی۔ اب غزنی کی فوج محاصرے میں تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد سلطان محمود کے چہرے پر پریشانی نظر آنے لگی۔ دونوں راجوں کی فوجیں پہلوؤں پر حملے کو روکنے کے لیے تیار تھیں۔ انہوں نے فوراً اپنی ترتیب بدل لی۔

یہ لڑائی تہس نہس قہر تھا۔ بڑی تیز لڑائی تھی اور بڑی تیزی سے دونوں فریقوں کی نفری کٹ کٹ کر گر رہی تھی۔ اِدھر سالارِ اعلیٰ ابوعبداللہ بڑی کامیابی سے سومنات کی فوج کو روکے ہوئے تھا مگر ہندو زندگی اور موت کا معرکہ لڑ رہے تھے۔

آدھا دن گذر گیا۔ مورخ لکھتے ہیں کہ غزنی والوں کو اپنی شکست صاف نظر آنے لگی تھی۔ اس جنگ پر دو مستند کتابوں کا ملاتُ التواریخ" اور "تاریخِ الخی" میں لکھا ہے کہ راجوں کی فوج کو تازہ دم کمک مل رہی تھی۔ محمد قاسم فرشتہ لکھتا ہے:

"سلطان محمود نے جب دیکھا کہ اس کی کوئی چال کامیاب نہیں ہو رہی تو وہ گھوڑے

سے کود کر اُترا اور قبلہ رُو ہو کر دو نفل پڑھے، پھر دعا مانگی۔ وہ اکثر معرکوں کے دوران ایسے ہی کیا کرتا تھا اور نہ صرف اُس میں بلکہ پوری فوج میں نیا جوش اور تازگی پیدا ہو جاتی تھی.... سالار ابوالحسن اس کے قریب کھڑا تھا۔ سلطان نے ابوالحسن کا ہاتھ پکڑا اور کہا۔ "ابوالحسن! فتح ہماری ہے"۔ اُس نے سالار کو گھوڑے پر سوار ہونے کو کہا، خود بھی سوار ہُوا۔ اُس نے اپنا جھنڈا اونچا کرنے کو کہا اور سپاہیوں کی طرح میدانِ جنگ میں شامل ہو گیا۔ ہر طرف اعلان ہونے لگے "سلطان لڑ رہے ہیں.... غزنی کے مجاہدو! سلطان تمہارے ساتھ ہے"۔

اس کا فوج پر وہی اثر ہُوا جو اس سے پہلے کئی معرکوں میں دیکھنے میں آیا تھا۔ پروفیسر محمد حبیب نے کچھ مؤرخوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ جب سلطان محمود خود لڑائی میں شریک ہُوا اُس وقت اُس کے ہاتھ میں اپنے مُرشد شیخ ابوالحسن خرقانی کا چغہ تھا جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا اور اسے اُس نے عقیدت کے طور پر اپنے گھوڑے کے ساتھ باندھ رکھا تھا۔

فرشتہ کے مطابق، سلطان کا یہ حملہ اتنا دہشت ناک تھا کہ دونوں راجوں کی فوجوں کا رابطہ ٹوٹ گیا، پھر ان کی مرکزیت ٹوٹی۔ غزنی کے چند ایک جانبازوں نے دونوں راجوں کے قلب پر حملہ کر کے اُن کے جھنڈے گرا دیئے اور راجے میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اس کے بعد راجوں کی فوج کا قتلِ عام شروع ہو گیا۔ فرشتہ نے لکھا ہے کہ تھوڑی سی دیر میں کم و بیش پانچ ہزار ہندو فوجیوں کی لاشیں غزنی کے گھوڑوں کے قدموں میں کچلی جا رہی تھیں۔ راجوں کے بچے کھچے سپاہی بھاگے لیکن غزنی کے گھوڑسواروں نے انہیں بھاگنے نہ دیا۔

*

سلطان محمود کو سومنات کی فوج اور اپنے سالارِ اعلیٰ ابوعبداللہ کے معرکے کی رپورٹیں ملیں۔ اُس نے سالارِ اعلیٰ کو پیغام بھیجا کہ لڑتے لڑتے پیچھے ہٹنے کی کوشش کرو۔ سالارِ اعلیٰ نے اس حکم پر عمل کیا تو سومنات کی فوج آگے آ گئی۔ شہر کے دروازے بند تھے۔ سلطان محمود نے سالار ابوالحسن سے کہا کہ وہ سومنات کی فوج کے پیچھے

اُس پر حملہ کرے۔

جب پیچھے سے حملہ کیا گیا تو ہندوؤں کو پتہ چلا کہ اُن کی مدد کے لیے جو فوجیں آئی تھیں وہ ختم ہو چکی ہیں اور وہ اب گھیرے میں آ گئے ہیں۔ وہ دفاعی لڑائی لڑنے لگے اور پیچھے نکل کر شہر کے اندر جانے کی کوشش کرنے لگے مگر وہ نکل نہ سکے۔ غزنی کا ایک جیش جو دروازے اور دیواریں توڑنے کے لیے تربیت یافتہ تھا، دروازے توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔

دیواروں کے اوپر جو ہندو کھڑے تھے، انہوں نے شہر میں خبر پھیلا دی کہ اُن کی فوج کٹ گئی ہے۔ یہ خبر بالکل صحیح تھی۔ ابن الاثیر اور ابنِ ظفر لکھتے ہیں کہ ہندو سپاہی مذہبی جنون سے لڑ رہے تھے لیکن جو مذہبی جذبہ مسلمانوں میں تھا اور جو قیادت مسلمانوں کی تھی، اس کے آگے ہندوؤں کا مذہبی جنون ختم ہو گیا اور وہ جانیں بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔ شہر میں خبر پھیلی تو بہت سے ہندو فوجی پچھلے دروازے سے جو سمندر میں کھلتا تھا، باہر نکلے۔ وہاں سینکڑوں کشتیاں موجود تھیں۔

اس کی اطلاع سلطان کو مل گئی۔ اُس نے حکم دیا کہ اُدھر کے دستے کشتیوں پر قبضہ کر کے اُدھر والے دروازے سے اندر جائیں۔ اس دستے نے فوراً وہاں پہنچ کر بہت سی کشتیوں پر قبضہ کر لیا اور بھاگتے ہوئے ہندو فوجیوں پر تیر برساتے ہوئے کشتیوں میں دروازے تک پہنچ گئے۔ دروازہ کھلا تھا۔ وہاں کوئی مزاحمت نہیں تھی۔

اِدھر دونوں دروازے کھول لیے گئے۔ بعض مؤرخ کہتے ہیں کہ ہندوؤں نے دروازے خود کھولے تھے۔ اُن کا مقصد غالباً یہ تھا کہ غزنی کی فوج کو شہر کی گلیوں کی بھول بھلیوں میں لڑایا جائے۔ غزنی کی فوج شہر میں داخل ہو گئی۔ شہریوں نے مقابلہ کرنے کی کوشش کی۔ وہ گروہ در گروہ مقابلے کے لیے آئے اور کٹ کٹ کر گرے۔ انہوں نے چھتوں سے تیر برسائے۔ ہندو عورتوں نے اوپر سے پتھر مارے جو انہوں نے اسی مقصد کے لیے گھروں میں جمع کر رکھے تھے۔ غزنی والوں نے چند ایک مکانوں کو آگ لگا دی۔ اس کے ساتھ ہی شہر میں یہ خبر پھیل گئی کہ سومنات کی

فوج ایک طرف تو کٹ گئی ہے اور جو اندر تھی وہ پچھلے دروازے سے سمندر کے راستے بھاگ گئی ہے۔ اس سے شہریوں کے حوصلے ٹوٹ گئے اور سومنات کی جنگ ختم ہو گئی۔

اس جنگ میں سومنات کے جو شہری، باہر سے آئے ہوئے زائرین اور جو ہندو فوجی مارے گئے تھے ان کی تعداد پچاس ہزار تھی۔ سمندر کے راستے جو فوجی بھاگے تھے، اُن کی تعداد چار ہزار تھی لیکن یہ سب بھاگ نہ سکے۔ ان میں سے بہت سے غزنی والوں کے تیروں کا نشانہ بن گئے تھے۔ کچھ سمندر میں کُودے اور ڈوب کر مر گئے۔ چند ایک کشتیاں اُلٹ بھی گئی تھیں۔

سومنات کا مندر سلطان محمود کے قدموں میں پڑا تھا۔ یہ ۹ جنوری ۱۰۲۶ء (۱۶ ذی القعدہ، ۱۴۱۶ھ) کا دن تھا۔

*

سلطان محمود نے جب مندر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ یہ فنِ تعمیر کا شاہکار تھا۔ مندر کی سیڑھیوں پر پنڈتوں کا ہجوم کھڑا تھا۔ سب نے ہاتھ جوڑے ہوئے تھے۔ اُن کے چہروں پر خوف تھا۔ سلطان محمود کے متعلق تاریخوں میں آیا ہے کہ وہ پنڈتوں اور پجاریوں کو نہ قید کرتا تھا نہ انہیں کوئی اور سزا دیتا تھا۔ اُس نے سومنات کے پنڈتوں کو ہاتھ جوڑے اپنے سامنے کھڑے دیکھا تو حکم دیا کہ انہیں کہو ہاتھ نیچے کر لیں، میں سومنات کا بُت نہیں ہوں، اور انہیں کہہ دو کہ انہیں کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔

سلطان سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔ یہ فتح اُسے بہت مہنگی پڑی تھی۔ اُس نے اپنے ایک محافظ سے جنگی کلہاڑا لیا اور اُس چبوترے پر چڑھ کر جس پر شو دیو کا بُت کھڑا تھا، کلہاڑے سے بُت کی ناک توڑ دی اور حکم دیا کہ اس بُت کو توڑ دیا جائے۔ بڑا پنڈت اور چند دوسرے پنڈت سلطان کے قدموں میں گر پڑے اور التجا کی کہ وہ سلطان کو سومنات کی تمام دولت دے دیں گے وہ بُت نہ توڑے اور مندر کو اسی طرح کھڑا رہنے دے۔ سلطان نے انہیں کہا کہ وہ اتنی دُور سے یہاں غزنی کی ہزاروں ماؤں کے بیٹے مروانے کے لیے نہیں آیا تھا۔

بعض مؤرخوں نے لکھا ہے کہ دو سالاروں نے اور سلطان کے اپنے بیٹے مسعود نے جو اُس کے ساتھ تھا، سلطان سے کہا کہ ان کی پیش کش مان لی جائے (سلطان محمود کے تین بیٹے، عبدالرشید، مسعود اور محمد اس کے ساتھ آئے تھے)۔ سلطان محمود نے مسکرا کر اور تھکے تھکے سے لہجے میں کہا۔ "کیا تم لوگ میری عاقبت خراب کرنا چاہتے ہو؟ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ روزِ قیامت اللہ تعالیٰ یوں پکارے کہ کہاں ہے وہ محمود جس نے سب سے بڑا بُت توڑا تھا۔ میں ڈرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ یوں نہ کہیں کہ لاؤ ہمارے سامنے غزنی کے محمود کو جس نے زر و جواہرات کے عوض بُت پرستوں کو بُت بخش دیا تھا..... کیا یہ میرے لیے بہتر نہیں کہ تاریخ مجھے بُت فروش نہ کہے بُت شکن کہے؟"

سلطان نے حکم دیا۔ "اس بُت کے دو ٹکڑے غزنی جائیں گے۔ ایک میرے گھر کے باہر دروازے میں رکھا جائے گا اور دوسرا غزنی کی جامع مسجد کے دروازے کے باہر جہاں یہ ہر کسی کے پاؤں تلے آئے۔ اس کا ایک ٹکڑا مدینہ منورّہ اور دوسرا مکّہ معظمہ بھیج دیا جائے۔"

فرشتہ نے اور بہت سے دوسرے مؤرخوں نے لکھا ہے کہ آج بھی اس بُت کا ایک ایک ٹکڑا غزنی میں سلطان کے محل کے بیرونی دروازے میں، دوسرا جامع مسجد کے دروازے میں، تیسرا مدینہ منورّہ اور چوتھا مکّہ معظمہ میں موجود ہے۔

مندر کی عمارت ساگوان کے ۵۶ ستونوں پر کھڑی تھی۔ سلطان نے شِو دیو کا بُت تڑوا کر باہر پھینک دیا اور مندر سے تمام خزانہ نکال کر ستونوں کو آگ لگا دی۔ تھوڑی دیر بعد ہندوستان کا سب سے بڑا بُت خانہ جس میں "چاند کے آقا" کا بُت تھا اور جو مرے ہوئے انسانوں کو دوسرا جنم دیتا تھا" ہیبت ناک گڑگڑاہٹ سے ملبے کا ڈھیر بن گیا۔ غزنی کی فوج نے ملبہ سمندر میں پھینک دیا۔ پیچھے مندر کی صرف بنیادیں رہ گئیں۔

تمام مؤرخوں نے لکھا ہے کہ ہندوؤں کا یہ الزام غلط اور بے بنیاد ہے کہ سومنات کا بُت اندر سے کھوکھلا تھا اور ہیرے جواہرات سے بھرا پڑا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کوئی باقاعدہ تراشا ہوا بُت نہیں تھا۔ یہ ایک چٹان کا لمبوترا ٹکڑا تھا جس کے

خدوخال انسانوں جیسے تھے اور اسے مرد کے جنسی جذبے کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ ہندو مذہب جنسیّت کی بنیادوں پر کھڑا ہے۔

سومنات کا مہاراجہ کنور رائے لاپتہ تھا۔ سلطان محمود نے وہاں سے جو زروجواہرات سمیٹے اُن کی مالیّت آج کے اربوں روپوں جتنی تھی۔

جب مندر کے اندر آگ لگی ہوئی تھی، سلطان محمود شہر کی دیوار پر کھڑا دیکھ رہا تھا۔ شہر میں کہیں کہیں سے جلتے ہوئے مکانوں کا دھوآں اُٹھ رہا تھا۔ لوگ شہر خالی کر رہے تھے۔ سلطان نے باہر دیکھا منظر ہولناک تھا۔ زمین دور دور تک لال تھی اور لاشوں پر لاشیں پڑی تھیں۔ زخمی اٹھنے اور چلنے کی کوشش کر رہے تھے بعض اٹھتے تھے اور گر پڑتے تھے۔ وہ ہندو تھے۔ انہیں اُٹھانے والا کوئی نہ تھا، کوئی پانی پلانے والا نہ تھا۔ شہر کے لوگ دروازوں سے نکل کر جا رہے تھے۔ وہ اپنے زخمیوں کو دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔

غزنی کے سپاہی اپنے ساتھیوں کی لاشیں اُٹھا رہے تھے اور زخمیوں کو بھی اٹھا اٹھا کر لے جا رہے تھے۔ سلطان محمود کی نظریں میدانِ جنگ میں گھوم رہی تھیں اور اس پر سنجیدگی طاری تھی۔ کوئی نہیں بتا سکتا کہ وہ کیا سوچ رہا تھا۔ اُس نے قلعے کے سامنے والے دونوں دروازوں کو دیکھا۔ اُسے شہر سے جانے والے ہندوؤں میں عورتیں اور بچّے نظر آئے۔ اُس نے اپنے ساتھ کھڑے کسی آدمی سے کہا کہ نیچے جا کر شہر کے لوگوں سے کہو کہ وہ ہمارے ڈر سے اپنے گھروں سے نہ بھاگیں۔ انہیں غزنی کی فوج کی طرف سے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔

"کیا یہ لوگ اب بھی نہیں سمجھیں گے کہ فتح اور شکست، زندگی اور موت پتّھر کے ایک ٹکڑے کے ہاتھ میں نہیں، خدا کے ہاتھ میں ہے؟" — سلطان محمود نے کہا۔

اُسے کوئی جواب نہ ملا۔

*

سلطان محمود کے محکمہ جاسوسی نے وہاں کے چند ایک مقامی آدمیوں کو اپنے محکمے میں شامل کر لیا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ جن راجوں کی فوجوں نے غزنی کی فوج

پر پیچھے سے حملہ کیا تھا، وہ راجہ پرم دیو نے کرایا تھا۔ اس حملے میں غزنی کے تین ہزار سپاہی مارے گئے تھے۔ سلطان کو بتایا گیا کہ پرم دیو سومنات کے شمال میں ایک سو بیس میل دور گنداوی کے مقام پر ہے اور یہ مقام چاروں طرف سے سمندر میں گھرا ہوا ہے۔

سلطان محمود اس قدر غصے میں تھا کہ اُس نے گنداوی کی طرف پیشقدمی کا حکم دے دیا۔ جب سلطان وہاں پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ قلعے تک پہنچنا ممکن نہیں کیونکہ چاروں طرف سمندر تھا۔ ایک طرف پانی کم تھا۔ یہ بھی پتہ چلا کہ پرم دیو نے اپنے آپ کو قلعے میں قید کر رکھا ہے۔ محمد قاسم فرشتہ لکھتا ہے کہ ایک رات سلطان محمود نے قرآن کی تلاوت کی۔ کچھ خاص آیات پڑھیں اور رو کر خدا سے راہنمائی اور مدد کی دعا کی۔ اگلی صبح اُس نے دیکھا کہ سمندر کا پانی پیچھے چلا گیا ہے۔ جدھر سے پانی کم ہوا تھا وہاں دلدل تھی۔ سلطان نے دلدل میں ہی گھوڑے ڈال دیئے اور قلعے تک جا پہنچا۔

غزنی کی فوج نے قلعے پر حملہ کیا اور تھوڑی ہی دیر میں قلعے کا دروازہ کھل گیا۔ پتہ چلا کہ راجہ پرم دیو سمندر کے راستے نکل بھاگا ہے۔ اُس کی فوج سومنات کے میدان میں مسلمانوں سے شکست کھا کر آئی تھی۔ اس نے ہتھیار ڈال دیئے۔ سلطان محمود نے حکم دیا کہ گنداوی کو اجاڑ دیا جائے۔

سلطان محمود کچھ دن وہیں ٹھہرا۔ یہ گجرات کا علاقہ تھا جس کی آب و ہوا سلطان کو اتنی اچھی لگی کہ اُس نے گجرات میں سلطنتِ غزنی کا دارالحکومت بنانے کا فیصلہ کر لیا اور اپنے بیٹے مسعود سے کہا کہ وہ غزنی چلا جائے اور وہاں کی سلطنت سنبھال لے۔

"کیا سلجوقی اور خراسانی یہ نہیں کہیں گے کہ سلطان محمود میدان چھوڑ کر بھاگ گیا ہے؟" مسعود نے کہا۔ "ہم نے خراسان کا علاقہ بڑے جوان مروا کر فتح کیا تھا۔"

"آپ یہاں کسی مقامی راجہ کو اپنا امیر مقرر کر دیں" — ایک مشیر نے کہا — "غزنی ایسا مرکز ہے جو آپ کی غیر حاضری میں اپنی مرکزیت اور اہمیت کھو بیٹھے گا۔"

سلطان محمود مان گیا۔ وہ سومنات واپس چلا گیا اور بہت سوچ بچار کے بعد راجہ دیو آسرم کو سومنات کا گورنر مقرر کر دیا اور غزنی واپس جانے کی تیاری کرنے لگا۔ اُس نے دیو آسرم سے کہا کہ وہ اب ملتان کے راستے واپس نہیں جانا چاہتا

اور کسی اور راستے سے اُسے واقفیت نہیں۔ دیوآہرم نے سلطان کو وہ راستہ بتایا جو رَن کچھ میں سے گذر کر بلوچستان کو جاتا تھا۔ بلوچستان سے سلطان آسانی سے غزنی پہنچ سکتا تھا۔

"ہم سلطان کو ایسے آدمی دیں گے جو اُن کی راہنمائی کریں گے" ۔۔ راجہ دیوآہرم کی رانی بھی موجود تھی۔ کہنے لگی۔ "رَن کچھ اور اس سے آگے کے صحرا میں پانی اُن ہی لوگوں کو مل سکتا ہے جو اس صحرا سے واقف ہیں"۔

*

غزنی کی فوج فاتحانہ انداز سے واپس جا رہی تھی۔ اس کی نفری اب خاصی کم تھی۔ لاشیں سومنات کے ایک میدان میں دفن کر دی گئی تھیں۔ زخمی ساتھ تھے اور بے شمار اونٹ اُس خزانے سے لدے ہوئے تھے جو اس جنگ کا مالِ غنیمت تھا۔ اب فوج اللہ اکبر کے نعرے نہیں لگا رہی تھی، سپاہی مل کر جنگی ترانے گاتے جا رہے تھے۔ وہ سومنات کو جاتے ہوئے بھی صحرا سے گذرے تھے۔ اس ظالم صحرا کو وہ ساری عمر نہیں بھولے ہوں گے۔ اب بھی اُن کے سامنے ویسا ہی اجنبی اور بے رحم صحرا تھا مگر اب ان کے تاثرات اور جذبات کی کیفیت ایسی تھی جیسے اُن کی پیاس ہمیشہ کے لیے بجھ گئی ہو۔ ان کی روحیں فتح سے سرشار اور تروتازہ تھیں۔

فوج صحرا میں داخل ہو گئی۔ پھر تین چار دن گذر گئے۔ پانی کا کہیں نشان نظر نہ آیا۔ گھوڑوں کو پانی پلانا تھا۔ انسان اپنے لیے جو پانی ساتھ لائے تھے وہ ختم ہو چکا تھا۔ اب سلطان محمود نے ایسا حکم نہیں دیا تھا کہ مشکیزے پانی سے بھر کر اونٹوں پر لاد لیے جائیں کیونکہ گائیڈوں نے اُسے یقین دلایا تھا کہ وہ اُسے ایسے راستے سے لے جائیں گے جہاں پانی کی بہتات ہے۔ اب گائیڈوں سے پوچھا گیا کہ پانی کہاں ہے تو وہ کہتے رہے کہ آگے ہے۔ اس طرح انہوں نے ایک دن اور گذار دیا۔

اگلے دن جب فوج میں بے چینی پھیلی گئی، سپاہی پیاس سے نڈھال ہو

گئے اور گھوڑوں میں چلنے کی سکت نہ رہی تو سلطان محمود نے اپنے سالاروں ابو عبداللہ محمد الطلائی اور ابوالحسن سے کہا کہ اُسے کچھ شک ہو رہا ہے۔ دونوں گائیڈوں کو بلاؤ۔

گائیڈ آئے تو وہ اچھی طرح چلنے کے قابل نہیں تھے۔ ان کے سر ڈول رہے تھے۔

"کیا تم پیاس سے مر نہیں رہے ہو؟" سلطان محمود نے اُن سے پوچھا۔

"مر رہے ہیں سلطان!" ایک گائیڈ نے جواب دیا۔

"تم کہتے تھے کہ اس صحرا میں پانی کی افراط ہے" سلطان محمود نے کہا۔

"ہاں سلطان! اس صحرا میں پانی کی کمی نہیں"

"کہاں ہے پانی؟"

"جہاں تک آپ زندہ نہیں پہنچ سکیں گے" گائیڈ نے جواب دیا۔

"کیا تم دانستہ ہمیں پانی سے دور لے آئے ہو؟"

"دانستہ" گائیڈ نے کہا "ہم اپنا کام کر چکے ہیں"

"کیا تم ہمیں گمراہ کرنے کے لیے ساتھ آئے تھے؟" سلطان نے غصے سے پوچھا "کیا تم جانتے نہیں تھے کہ تم قتل ہو جاؤ گے؟"

"سب کچھ جانتے تھے سلطان!" گائیڈ نے کہا "ہم اپنی جانیں شیودیو کے حوالے کر کے سومنات سے آپ کے ساتھ چلے تھے۔ آپ کو یاد نہیں جب راجہ دلیو آسرم آپ کو راستہ سمجھا رہا تھا تو اُس کی رانی نے کہا تھا کہ وہ آپ کو راہنما دے گی جو آپ کو اُس راستے سے لے جائیں گے جہاں پانی کی کوئی کمی نہیں۔ اُس نے ہمیں بتایا تھا کہ اُس نے آپ سے یہ وعدہ کیا ہے۔ وہ آپ کو دھوکہ نہیں دینا چاہتی تھی سلطان! جب آپ سومنات کو تباہ برباد کر رہے تھے اُس وقت ہم دونوں یہاں نہیں تھے۔ ہم آئے تو تباہی مکمل ہو چکی تھی۔ ہم اتنی راتیں سو بھی نہ سکے۔ ہم نے بہت ترکیبیں سوچیں کہ آپ کو قتل کیا جائے مگر کوئی صورت نظر نہیں آئی۔ ہمیں پتہ چلا کہ آپ کو راہنماؤں کی ضرورت ہے تو ہم دونوں نے

اپنے آپ کو پیش کیا۔ ہم اس صحرا سے واقف ہیں۔ ہم خوش ہوئے کہ صرف آپ سے نہیں، غزنی کی پوری فوج سے انتقام لیں گے۔ ہم آپ کو پانی سے بہت دور لے آئے ہیں۔ ہم کل مر جائیں گے۔ ہم نے شیودیو کی توہین کا انتقام لے لیا ہے۔ اب ہمیں زندہ رہنے کی خواہش نہیں۔ اگر آپ ہمیں قتل کر دیں گے تو یہ آپ کا ہم پر کرم ہو گا۔ ہم پیاس کی اذیت سے بچ جائیں گے''

سلطان نے حکم دیا کہ انہیں قتل کر دیا جائے۔

*

فوج کی حالت ویسی ہی ہو رہی تھی جیسی ان دو گائیڈوں کی تھی۔ گائیڈوں نے غلط نہیں کہا تھا کہ وہ کل تک مر جائیں گے۔ انہوں نے بڑا ہی خوفناک انتقام لیا تھا۔ سومنات کا شیودیو سچا معلوم ہوتا تھا۔ اُسی رات (محمد قاسم فرشتہ، فرخی اور "مجموعہ الانصاب" کے مطابق) سلطان محمود نے عشاء کی نماز کے بعد خیمے سے باہر چند نوافل پڑھے۔ اُس کی فوج کے گھوڑے پیاس سے ہنہنا رہے تھے۔ کچھ سپاہی کراہ بھی رہے تھے۔ صحرا کی بے رحمی انتہا کو پہنچ رہی تھی۔ سلطان کو نوافل کے دوران جانوروں اور انسانوں کی پیاسی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ سلطان ان آوازوں کو سمجھتا تھا اور یہ بھی سمجھتا تھا کہ اُس کی فوج میں سے بیشتر سپاہی کل رات اُس کے ساتھ نہیں ہوں گے۔ ظالم ریگزار اُن کے جسموں سے نمی کا آخری قطرہ بھی چوس لے گا۔

سلطان نے دُعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور وہ ایسا رویا کہ اُس کی زبان سے کوئی لفظ نہ نکلا۔ خدا جانتا ہے اُس کے بندوں کے دلوں میں کیا ہے اور خدا یہ بھی جانتا تھا کہ یہ فوج اُس کے نام کے نعرے لگا کر باطل پر ٹوٹی تھی۔ آسمان میں ایک ستارہ ٹوٹا جو شہابِ ثاقب تھا۔ ایک شعلہ ایک سمت کو اُٹھا اور صحرا کے تاریک افق پر روپوش ہو گیا۔ فرشتہ نے اسے ایک "پُراسرار روشنی" لکھا ہے لیکن دوسرے مؤرخوں نے اسے شہابِ ثاقب کہا ہے جو زیادہ صحیح ہے۔

سلطان محمود کے دل سے آواز اُٹھی کہ جدھر شہابِ ثاقب گیا ہے، اُسے اُسی

سمت جانا چاہیئے۔ اسے وہ خدا کا اشارہ سمجھا اور اس نے اٹھ کر بہ بانگ بلند اعلان کیا۔ "خدا نے اشارہ دے دیا ہے۔ کل ہم انشاء اللہ پانی پر ہوں گے۔"

انہی تاریخ نویسوں نے لکھا ہے کہ اس صحرا میں کبھی پرندہ نظر نہیں آیا تھا۔ یہ رات گذری اور صبح طلوع ہوئی تو سلطان محمود کو اوپر فضا میں پرندوں کی آوازیں سنائی دیں۔ اس نے اوپر دیکھا اور بے اختیار بولا۔ "یہ پانی کے پرندے ہیں"۔ وہ اس غول کو دیکھتا رہا۔ غول دور جاکر نیچے چلا گیا۔ یہ وہی سمت تھی جدھر رات کو شہابِ ثاقب گیا تھا۔ سلطان نے اس سمت کو کوچ کا حکم دے دیا۔

دوپہر کے کچھ دیر بعد جب فوج کا دم خم ٹوٹ چکا تھا اور کئی سپاہی ہذیانی حالت میں مبتلا ہو گئے تھے، پانی نظر آ گیا۔ یہ تھوڑا سا پانی نہیں تھا بلکہ وسیع جھیل تھی۔ گھوڑے پانی کی مشک پا کر بے قابو ہو گئے اور دوڑ پڑے۔ انسان بھی بے قابو ہو گئے اور پانی پی کر وہ تازہ دم ہو گئے۔

*

ابھی ان کی آزمائش باقی تھی۔ فوج گائیڈ کے بغیر جا رہی تھی۔ اب رات کو ستارے اس کی راہنمائی کرتے تھے اور دن کو سورج۔ مورخوں میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ سلطان محمود نے کونسا راستہ اختیار کیا تھا۔ اکثر ہیچ ندا اور امرکوٹ کا نام لیتے ہیں لیکن یہ سب نے لکھا ہے کہ غزنی کی فوج کا واپسی کا سفر بڑا ہی اذیت ناک اور غیر یقینی تھا۔ بہت آگے جاکر ایک مقامی آدمی کو گائیڈ کے طور پر ساتھ لے لیا گیا۔ وہ فوج کو دریائے سندھ کے کنارے لے گیا۔ وہاں دریا کا پاٹ بہت چوڑا تھا۔

گائیڈ فوج کو دریا کے ساتھ ساتھ کسی اور سمت لے گیا اور رات آ گئی۔ پڑاؤ کیا گیا۔ آدھی رات کے وقت فوج میں بھگدڑ مچ گئی۔ اس کے ساتھ عجیب سی چیخ نما آوازیں سنائی دینے لگیں۔ گھوڑے دوڑ رہے تھے۔ سلطان نے گائیڈ کو بلایا مگر گائیڈ لاپتہ تھا۔ تھوڑی دیر بعد پتہ چل گیا کہ کیمپ کے ایک حصے پر حملہ ہو گیا ہے۔ حملہ آوروں کے کچھ آدمی گرا لیے گئے تھے۔ ان سے پتہ چلا کہ یہ علاقہ ہندو جاٹوں کا

ہے جو جنگجو ہیں اور لوٹ مار بھی کرتے ہیں اور ان کی باقاعدہ ریاست ہے۔ وہ خاصا نقصان کر گئے تھے۔

اس پھندے میں غزنی والوں کو وہ گائیڈ لے گیا تھا جو حملے سے پہلے غائب ہو گیا تھا۔ زخمی جاٹوں نے بتایا کہ اُن کے راجہ کو پتہ چل چکا تھا کہ غزنی کی فوج سومنات کو تباہ کر کے وہاں کا تمام خزانہ لا رہی ہے۔ یہ گائیڈ راجہ کا بھیجا ہوا تھا۔

دوسرے دن فوج نے کوچ کیا تو پچھلے حصّے پر جاٹوں نے پھر حملہ کر دیا اور غائب ہو گئے۔ سلطان محمود نے فوج کو وہیں روک لیا اور زخمی جاٹوں سے جنہیں قیدی بنا کر ساتھ رکھ لیا گیا تھا پوچھا کہ ان کا دارالحکومت کہاں ہے۔ قیدیوں نے بتایا کہ وہاں جا کر سلطان پشیمان ہو گا۔ جاٹوں کا کوئی ایک ٹھکانہ نہیں۔

سلطان کے سالاروں نے اُسے مشورہ دیا کہ فوج جم کر لڑنے کے قابل نہیں۔ اس کے علاوہ اس دشمن اور اس علاقے سے ہمیں ذرا سی بھی واقفیت حاصل نہیں، اس کے خلاف لڑائی معلوم نہیں کیسا نقصان پہنچائے۔ زخمی قیدیوں پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ سلطان نے یہ مشورہ قبول کر لیا لیکن کئی جگہوں پر جاٹوں نے غزنی کی فوج پر کبھی رات کو کیمپ پر اور کبھی دن کو پچھلے حصّے پر حملے کیے اور گھوڑے سرپٹ دوڑاتے غائب ہو گئے۔

جاٹوں نے غزنی کی فوج کا بہت نقصان کیا لیکن یہ نقصان جانی تھا۔ وہ سومنات کے خزانے تک نہ پہنچ سکے۔ سلطان محمود دانت پیستا رہ گیا۔ فوج کی نفری اور کم ہو گئی۔

*

یہاں ایک اختلاف اور ایک دلچسپ کہانی سنانا ضروری ہے۔ زیادہ تر مؤرخوں نے لکھا ہے کہ سلطان محمود نے راجہ دیو آسرم کو سومنات کا گورنر مقرر کیا تھا جس کے فرائض یہ تھے کہ یہاں سے مالیہ جمع کر کے اس کا کچھ حصّہ غزنی بھیجا کرے، اور یہاں ہندو دوبارہ مندر تعمیر نہ کریں۔ عبادت کے لیے کہیں اور مندر کھڑا کر لیں، اور اس علاقے میں جو مسلمان رہتے ہیں انہیں ہندو پریشان نہ کریں۔ کوئی

ہندو کسی مسلمان پر ہاتھ اُٹھائے تو اُسے سزائے موت دی جائے۔

ایک روایت یہ ہے کہ سلطان محمود نے دیو آسرم کو نہیں بلکہ ایک مسلمان کو جس کا نام میٹھا خان تھا، گورنر مقرر کیا تھا۔ اس روایت کا خالق ایک انگریز مصنف میجر واٹسن ہے۔ یہ صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ میٹھا خان پنجابی نام ہے۔ یہ نام غزنی کا معلوم نہیں ہوتا۔

دلچسپ کہانی یہ ہے کہ سومنات کی تباہی کے بعد جب سلطان محمود غزنی چلا گیا تو تھوڑا ہی عرصہ بعد سومنات سے دور ایک پنڈت مشہور ہو گیا۔ اُس نے اعلان کیا تھا کہ سلطان محمود نے شیو دیو کا بُت توڑا نہیں بلکہ اسے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ پنڈت نے لوگوں سے کہا کہ سلطان محمود بُت کو راستے میں کہیں زمین میں دفن کر گیا تھا۔ پنڈت کو خواب میں شیو دیو نے بتایا ہے کہ اپنی گائے کے بچھڑے کو فلاں علاقے میں کھلا چھوڑ دو۔ وہ جہاں رُک کر زمین پر کھُر مارے وہاں سے زمین کھودو۔ وہاں شیو دیو کا بُت دفن ہوگا۔ اُسے نکالو اور سومنات کے کھنڈروں میں وہیں جا کے رکھو جہاں سے اسے اٹھایا گیا تھا۔

پنڈت نے لوگوں کو ایک روز اکٹھا کر لیا اور اپنے بچھڑے کو ایک کھُلے علاقے میں جا کر چھوڑ دیا۔ بچھڑا دوڑ پڑا اور ایک جگہ رُک کر زمین پر کھُر مارنے لگا۔ پنڈت نے لوگوں سے کہا کہ یہاں سے کھودو۔ لوگوں نے کھدائی کی تو وہاں سے شیو دیو کا بُت نکلا۔ سیدھے سادے لوگوں نے شیو دیو کی جے کے نعرے لگائے اور وہیں بُت کی پوجا شروع کر دی۔ پنڈت، مہاراج بن گیا۔

لوگوں نے فیصلہ کیا کہ بُت کو اُٹھا کر سومنات کے مندر میں رکھا جائے۔ چنانچہ بُت کو بڑی مشکل سے اُٹھا کر سومنات لے جایا گیا۔ سومنات کے پنڈتوں کے سامنے بُت توڑا گیا تھا۔ انہوں نے بُت کو دیکھا تو اس پنڈت کو پکڑ کر راجہ دیو آسرم کے سامنے لے گئے۔ پنڈت نے تسلیم کر لیا کہ اُس نے کوئی ایک مہینہ صرف کر کے اپنے بچھڑے کو سدھایا تھا کہ اس جگہ پہنچ کر کھُر مارے۔ یہ بُت اُس نے دو آدمیوں کو ساتھ ملا کر تیار کیا تھا۔ اس بُت کو سمندر میں پھینک دیا گیا۔

سلطان محمود جب غزنی پہنچا تو شہر میں داخل ہونے سے پہلے اس نے گھوڑے سے اتر کر شکرانے کے دو نفل پڑھے۔ اس نے خدا کا شکر فتح کا نہیں بلکہ خیریت سے غزنی پہنچ جانے کا ادا کیا تھا۔ وہ جس راستے سے آیا تھا اس کی صعوبتوں اور دیگر دشواریوں سے پہلے واقف نہیں تھا۔ وہ ۲/اپریل ۱۰۲۶ء (۱۰صفر ۴۱۷ھ) غزنی پہنچا تھا۔

غزنی کی ساری آبادی اُمڈ کے باہر آگئی تھی۔ عورتیں جنگی ترانے گا رہی تھیں اور دور سے فوج کی بلائیں لے رہی تھیں۔ لوگ ناچ رہے تھے۔ لوگ رات کو بھی نہ سوئے۔ جوں جوں لوگوں کو پتہ چلتا جاتا تھا کہ اب کے کیا فتح حاصل کی گئی ہے، اُن کی مسرّت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

رات کو سلطان محمود غزنوی غیر معمولی تھکان محسوس کر رہا تھا۔ تھکان تو وہ محسوس کیا ہی کرتا تھا لیکن اب وہ صاف طور پر محسوس کرنے لگا تھا کہ اس کے اندر کوئی کمزوری پیدا ہو گئی ہے۔ ہر جنگی مہم کے بعد جب سلطان گھر آتا تھا تو اُس کا طبیب اس کا پورا جسمانی معائنہ کرتا تھا۔ اب بھی رات کو طبیب آگیا۔ اس نے نبض پر ہاتھ رکھا، پھر دل پر ہاتھ رکھا اور سلطان سے بہت کچھ پوچھا۔ طبیب کے چہرے پر تشویش کے آثار آگئے۔

"سلطانِ محترم!" طبیب نے کہا "جتنی تشویش مجھے آپ کی صحت کے متعلق ہے، اتنی آپ کو بھی ہو تو آپ صحت یاب ہو سکتے ہیں۔ آپ بیمار ہیں سلطان! آپ کو کم از کم ایک سال کے آرام کی ضرورت ہے۔"

"کیا بیماری ہے مجھے؟" سلطان نے پوچھا "کیا آپ کو معلوم نہیں کہ میں کہاں سے آ رہا ہوں اور کیا کر کے آ رہا ہوں اور میں نے کتنی کٹھن مسافت طے کی ہے؟ اسے آپ بیماری کہہ رہے ہیں؟"

"جی ہاں سلطانِ محترم!" طبیب نے کہا "جو میں جانتا ہوں وہ آپ نہیں جانتے۔ جس طرح آپ گھوڑے اور اونٹ کے فرق کو جانتے ہیں اسی طرح میں تھکن اور بیماری کے فرق کو پہچانتا ہوں۔"

سلطان کی بیوی اور ایک بیٹی بھی وہاں موجود تھیں۔ انہوں نے گھبرا کر پوچھا کہ سلطان کو کیا بیماری ہے۔ طبیب نے انہیں ٹال دیا۔ سلطان نے انہیں کہا کہ وہ چلی جائیں، یہ صرف تھکن ہے۔

اُن کے جانے کے بعد سلطان نے طبیب سے پوچھا کہ اُسے کیا بیماری ہے۔

"آپ کے جسم میں بیماریوں کے خلاف قوّتِ مدافعت ختم ہو چکی ہے"۔ طبیب نے کہا۔ "میں آپ کو پہلے بھی خبردار کر چکا ہوں۔ کیا آپ محسوس نہیں کرتے کہ آپ کا سانس پھُول جاتا ہے؟ ..... میں آپ کو ڈرانا نہیں چاہتا لیکن نہ بتانا بھی خطرناک ہے ..... آپ کو سِل کا مرض لاحق ہو چکا ہے۔ ابھی ابتدا ہے"۔

"سِل میرا کیا بگاڑ لے گا؟"

"سلطانِ عالی مقام!" طبیب شیخ الاسفند نے جواب دیا۔ "اسے آپ دیمک سمجھ لیں جس طرح دیمک لکڑی کو کھا جاتی ہے اسی طرح سِل جسم کو اندر سے کھوکھلا کرتا رہتا ہے۔ اگر آپ طویل آرام کریں اور ذہن سے تفکّرات اور مسائل اُتار دیں تو میں اس مرض کو اسی مرحلے میں روک لوں گا۔ آپ کے اعصاب ختم ہو چکے ہیں"۔

"کیا آپ روحانی قوّت میں یقین رکھتے ہیں شیخ الاسفند؟"

"لیکن روح کب تک ساتھ دے گی؟" طبیب نے جواب دیا۔ "جب جسم رُوح کو اپنے اندر رکھنے کے قابل نہیں رہتا تو روح اس کی قید سے آزاد ہو جاتی ہے"۔

"میں نے ہندوستان کے یوگی دیکھے ہیں"۔ سلطان محمود نے کہا۔ "انہوں نے اپنے آپ میں ایسی قوتیں پیدا کر رکھی ہیں جو مافوق الفطرت لگتی ہیں لیکن وہ کہتے ہیں کہ ایسی قوت ہر انسان اپنے آپ میں پیدا کر سکتا ہے۔ کیا میں ایسی قوّت سے محروم ہوں؟"

"میں پھر بھی جسم کی بات کروں گا"۔ طبیب نے کہا۔ "اگر جسم کو سِل کی دیمک

"میں نے سومنات اسی قوّت کے بل بوتے پر فتح کیا ہے شیخ الاسفندا!"۔ سلطان محمود نے کہا۔ "مجھے یاد ہے، ہندوستان کی طرف کوچ سے پہلے آپ نے مجھے خبردار کیا تھا لیکن آپ میری نبض سے پتہ نہیں چلا سکے تھے کہ یہ بیماری اُس وقت بھی مجھے کھا رہی تھی۔ آپ نے مجھے اس کا نام بتا دیا ہے۔ میں اسے صرف بیماری کہتا تھا.... شیخ الاسفند! میں آپ سے ایک وعدہ لینا چاہتا ہوں۔ کسی کو پتہ نہ چلنے دیں کہ میں سِل میں مبتلا ہوں۔"

"میں اسے سِل کہہ رہا ہوں"۔ طبیب نے کہا۔ "لیکن مجھے شک ہے کہ یہ انتڑیوں کا دق ہے۔ اگر آپ نے آرام اور پرہیز نہ کیا تو تھوڑے ہی عرصے بعد پتہ چل جائے گا کہ یہ سِل ہے یا دق ہے"۔ طبیب نے التجا کے لہجے میں کہا۔ "اس سے پہلے کہ یہ ظاہر ہو کہ یہ سِل ہے یا دِق آپ علاج، آرام اور پرہیز کی طرف توجہ دیں۔"

"میرے مر جانے سے کیا فرق پڑے گا؟"۔ سلطان نے کہا۔ "میرے بیٹے اس قابل ہیں کہ سلطنتِ غزنی کو سنبھال لیں گے۔"

"اس خاندان میں سلطان بہت پیدا ہوں گے"۔ طبیب نے کہا۔ "آپ کے بیٹوں کے بیٹے بھی سلطان ہوں گے مگر ایک اور محمود پیدا نہیں ہوگا۔ کوئی بُت شکن پیدا نہیں ہوگا۔ اللہ اور رسولؐ کا نام تو سب لیں گے مگر ان ناموں پر اپنا آپ قربان کر دینے والا کوئی نہیں ہوگا۔ ہندوستان سے پتھروں کے خداؤں کے ٹکڑے غزنی کی مسجدوں کے آگے پھینکنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ میں آپ کو آپ کے لیے نہیں، آپ کے خاندان کے لیے نہیں، آپ کی سلطنت کے لیے نہیں، اسلام کے لیے اور عالمِ اسلام کی عظمت کے لیے کچھ عرصہ اور زندہ دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"زندگی اور موت آپ کے اختیار میں نہیں شیخ الاسفندا!"۔ سلطان نے کہا۔ "مجھے دنیا میں ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ عالمِ اسلام کی طرف کچھ سانپ رینگتے چلے آرہے ہیں۔ مجھے ان کے سر کچلنے ہیں۔ مجھے ہندوستان کے ناگ کو مارنا ہے۔ وہ میری اتنی زیادہ ضربوں سے ابھی مرا نہیں۔ مجھے ہندوستان کے مسلمانوں

کو محفوظ کرنا ہے۔ مجھے سومنات جاکر معلوم ہُوا کہ وہاں کے ساحلی علاقوں میں محمد بن قاسم کے وقتوں کے مسلمان رہتے ہیں۔ وہ سومنات کے مہاراجہ کے ظلم کا نشانہ بنے ہوتے تھے۔ اُن کی عظمت دیکھئے کہ وہ ابھی تک عربی زبان بولتے ہیں۔ مجھے سومنات پر حملے کی ترغیب دینے والوں میں یہ مسلمان بھی تھے۔ مجھے ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ میرا فرض ابھی پورا نہیں ہُوا۔"

"اور اگر میں نے اپنا فرض پورا نہ کیا تو اسلام کے پاسبان اور علمبردار کا خون میری گردن پر ہو گا"۔ طبیب نے کہا ۔"میں خدا کو کیا جواب دوں گا؟"

"خدا دیکھ رہا ہے"۔ سلطان نے کہا ۔"خدا سُن رہا ہے۔ آپ نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ آپ صرف یہ کرم کریں کہ کسی کو پتہ نہ چلنے دیں کہ میرے جسم کو ایسی دیمک لگ چکی ہے جو اسے تیزی سے کھا رہی ہے۔ اگر یہ خبر میرے دشمنوں تک پہنچ گئی تو وہ میری موت کے انتظار میں دبک کر بیٹھ جائیں گے اور اُس وقت اٹھیں گے جب میرا جنازہ اُٹھ جائے گا۔ شاید میرے بیٹے اُنہیں دبا نہ سکیں۔ کیا آپ دیکھ نہیں رہے کہ سلجوقی پھر سر اُٹھا رہے ہیں اور وہ سلطنتِ غزنی کے لیے کتنا بڑا خطرہ بن گئے ہیں؟"

"میں سب کچھ دیکھ رہا ہوں سلطان!"

"اور مجھے ہندوستان ایک بار پھر جانا ہے"۔ سلطان محمود نے طبیب کی سُنی اَن سُنی کرتے ہوتے کہا ۔"میں جب سومنات سے واپس آرہا تھا تو راستے میں ہندوؤں کی جاٹ قوم نے میری فوج کو بہت نقصان پہنچایا۔ میری فوج وہاں جم کر لڑ نہیں سکتی تھی لیکن جاٹ چھاپہ مار جنگ لڑ رہے تھے۔ میں نے اس قوم کے جنگی قیدیوں سے معلوم کیا ہے کہ یہ کیسی قوم ہے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ یہ سومنات کے شِودیو کی پجاری قوم ہے اور یہ بہت طاقتور ہے۔ اتنی طاقتور کہ کسی وقت اِردگرد کے مہاراجوں کو ختم کر دے گی اور یہ قوم مسلمانوں کی جانی دشمن ہے .... مجھے اس قوم کی سرکوبی کے لیے جانا ہے۔ اگر اس قوم کا دم خم نہ توڑا گیا تو سومنات کے شِودیو کا بت کہیں اور کھڑا کر لیا جائے گا اور اس کے قدموں میں مسلمانوں کو ذبح کیا جائے گا"۔

"آپ آرام کرلیں"۔ طبیب نے کہا۔"میں دوائی دوں گا۔"

"دعا بھی دیں شیخ الاسفند!"۔ سلطان نے کہا۔"مجھے اب دعاؤں کی زیادہ ضرورت ہے۔"

*

طبیب چلا گیا تو سلطان کی بیوی اور بیٹی آگئیں۔

"وہ کیا بتا گئے ہیں؟"۔ بیوی نے پوچھا۔"آپ نے ہمیں باہر کیوں نکال دیا تھا؟"

"طبیب کہتا ہے آرام کرو"۔ سلطان نے کہا۔"اور اپنے فرائض کو بھول جاؤ۔"

"تو اس کی کوئی وجہ ہوگی نا!"۔ بیٹی نے کہا۔

"کہتا ہے میرے جسم میں کچھ کمزوری پیدا ہوگئی ہے"۔ سلطان نے کہا۔

"آپ آرام کریں جیسے شیخ الاسفند کہہ گئے ہیں"۔ بیوی نے کہا۔"میری کوکھ سے جن بیٹوں نے جنم لیا ہے وہ آپ کے فرائض پورے کردیں گے۔"

"وہ سلجوقیوں کو نہیں دبا سکیں گے"۔ سلطان نے کہا۔"وہ ہندوستان کے جاٹوں کا سر نہیں کچل سکیں گے۔ میں یہ دونوں کام کرکے مروں گا۔"

البیرونی نے لکھا ہے کہ سلطان محمود کا چہرہ بجھا ہُوا تھا۔ اُس کی شوخی ماند پڑ گئی تھی۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ اندرونی کشمکش میں مبتلا ہے۔ طبیب اُسے آرام کے لیے کہہ گیا تھا لیکن سلطان نے اُسی وقت متعلقہ حکام کو بلایا اور انہیں احکام دینے لگا۔ احکام یہ تھے کہ کل وہ دیکھنا چاہتا ہے کہ سومنات کے بُت کا ایک ٹکڑا میرے دروازے کے آگے اور ایک ٹکڑا جامع مسجد کے دروازے کے آگے اس طرح رکھا ہُوا ہے کہ اندر آنے اور جانے والوں کے پاؤں اِن ٹکڑوں پر پڑتے ہیں۔ مدینہ منوّرہ اور مکّہ معظمہ کے ٹکڑے صبح ہوتے ہی خلیفہ کو روانہ کردیئے جائیں۔

اگلے روز اُس کے محل اور مسجد کے آگے ٹکڑے زمین میں اس طرح رکھے گئے کہ اُوپر سے ننگے تھے۔ لوگ انہیں دیکھنے کے لیے جمع ہوگئے اور ان پر پاؤں

رکھ کر گذرنے لگے۔

*

سلطان محمود نے اگلے ہی روز ہندوستان پر ایک اور فوج کشی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اُس نے اُسی روز لاہور کے گورنر ایاز اور ملتان کے حاکم کے نام پیغام روانہ کر دیئے کہ وہ جاٹوں کے متعلق ہر ایک ضروری اطلاع فراہم کریں۔ ان کی تعداد، ان کا علاقہ، ان کے لڑنے کا طریقہ اور ہر وہ اطلاع جو کام آ سکے۔

سلطان کی فوج خاصی کم ہو گئی تھی۔ اُس نے نئی بھرتی کا حکم دے دیا اور ساتھ یہ حکم بھی دیا کہ چھاپہ ماروں کی تربیت اور مشقیں تیز کر دی جائیں اور ہر سپاہی کو چھاپہ مار جنگ کی اور گھوم پھر کر لڑنے کی تربیت دی جائے۔

سلطان محمود نے طبیب کی تشویش ناک باتوں کو ذہن سے اتار دیا تھا۔ اُس نے آرام کی پروا نہ کی۔ پرہیز کی طرف توجہ نہ دی اور فوج کی ٹریننگ اور سلطنت کے انتظامی کاموں میں مصروف ہو گیا۔

اور وقت بہت تیزی سے گذرتا گیا۔ تین چار ماہ بعد اُسے ملتان اور لاہور سے جاٹوں کے متعلق رپورٹیں ملنے لگیں۔ یہ قوم سندھ کے علاقے میں پھیلی ہوئی تھی۔ تعداد خاصی زیادہ تھی۔ ان کے لڑنے کے طریقوں میں ایک تو شبخون تھے اور دوسرا طریقہ دریائی جنگ تھا۔ وہ کشتیوں میں لڑتے تھے۔ دریائے سندھ نے بہت رُخ بدلے ہیں۔ اُس دور میں جاٹوں کے علاقے میں سندھ کا پاٹ اتنا چوڑا تھا کہ اس میں جزیرے بنے ہوتے تھے جن میں جنگل تھے۔ جاٹ ان جزیروں میں چلے جاتے تھے یا ان کی کچھ تعداد سندھ کے اُن دلدلی جنگلوں میں چلی جاتی تھی جنہیں انگریزوں کے دورِ حکومت میں حُروں نے انگریزوں کے خلاف استعمال کیا تھا۔

سلطان محمود کو لاہور اور ملتان سے تفصیلی اطلاعیں ملیں کہ جاٹ مسلمانوں کے لیے خصوصاً بہت بڑا خطرہ بن گئے ہیں اور وہ سومنات کی تباہی کا انتقام ہندوستان کے مسلمانوں سے لیں گے۔ اُس وقت سلطان محمود لاہور، ملتان اور بھیرہ (تقریباً آج کے تمام تر پنجاب کو) اپنی سلطنت میں شامل کر چکا تھا اور کشمیر سے قنوج تک

کے راجے مہاراجے اُس کے باجگزار تھے اس لیے کوئی خطرہ قبول نہیں کیا جاسکتا تھا۔ تاریخوں میں آیا ہے کہ سلطان محمود جاٹوں کو سزا دینا چاہتا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی سلطنت کے ہندوستانی علاقوں اور ہندوستان کے مسلمانوں کا تحفظ چاہتا تھا اور یہ بھی کہ سومنات کا مندر دوبارہ تعمیر نہ ہو اور ہندو اُس شِو دیو کو پھر سے زندہ نہ کرسکیں جس کے متعلق ہندوؤں کا باطل عقیدہ تھا کہ وہ انسانوں کو دوسرا جنم دیتا ہے۔

اگست، ستمبر ۱۰۲۶ء میں ملتان سے اطلاع گئی کہ جاٹ جنگی تیاریاں کر رہے ہیں۔ اس کا پس منظر یہ بیان کیا گیا کہ ملتان کا ایک مقامی مسلمان جو وہاں جاسوسی کرنے گیا تھا، پکڑا گیا تھا اور وہ کچھ دنوں بعد وہاں سے فرار بھی ہو آیا تھا۔ اُس پر نیم دیوانگی طاری تھی۔ وہ جاٹوں کے علاقے میں ایک بھٹکے ہوئے مسافر کے بھیس میں گیا اور اُس نے وہاں جاکر دلیری یا حماقت یہ کی کہ جاٹوں کے جزیروں کو قریب سے دیکھنے کے لیے چھوٹی سی ایک کشتی چُرالی مگر کشتی رانی نہیں جانتا تھا۔ وہ ساون کی موسلادھار بارشوں کا مہینہ تھا۔ دریا میں طغیانی تھی۔ چھوٹی سی کشتی کو دریا اپنے ساتھ ہی لے گیا، پھر کشتی اُلٹ گئی اور وہ تیرتا ہوا اس حالت میں ایک جزیرے سے جالگا کہ خشکی پر پہنچتے ہی بے ہوش ہو گیا۔

ہوش میں آیا تو وہ جاٹوں کی ایک جُھگی میں پڑا تھا اور دو عورتیں اُس کے قریب بیٹھی تھیں۔ ان میں ایک جوان تھی۔ اُس نے اس آدمی سے پوچھا کہ وہ کہاں کا رہنے والا ہے اور دریا میں کس طرح گر پڑا تھا۔ اُس نے غلط بیانی کی لیکن دو جاٹوں نے آکر اُس کے ساتھ باتیں کیں تو انہیں اس پر شک ہُوا۔ اس کی حالت بہت بُری تھی۔ جاٹوں نے اُسے اٹھالیا اور کہا کہ اسے وہ دریا میں پھینک دیں گے۔ اس نے جان کے ڈر سے بتادیا کہ وہ مسلمان ہے، ملتان سے آیا ہے اور وہ جاسوس ہے۔ جاٹوں نے اُسے اور زیادہ پریشان کیا تو اُس نے بتادیا کہ غزنی کی فوج اُن پر حملہ کرنے اور انہیں ختم کرنے آرہی ہے۔ اُسے جو کچھ معلوم تھا وہ اُس نے بتادیا، لیکن جاٹ اُسے رہا نہیں کر رہے تھے۔

جاٹ اُس سے پوچھتے تھے کہ غزنی کی فوج کا لڑنے کا طریقہ کیا ہے۔ وہ بتاتا رہا اور ان پر اعتماد پیدا کرنے کے لیے اُن کا مشیر اور مُخبر بن گیا۔ وہ بڑا نڈر اور خوبصورت جوان تھا۔ وہ جوان عورت جو پہلے روز اُس نے اپنے پاس بیٹھی دیکھی تھی، اُس میں کچھ اور ہی دلچسپی لے رہی تھی۔ اس عورت نے ایک روز اسے بتایا کہ اس کا خاوند قبیلے کے سرداروں میں سے ہے اور بوڑھا ہے، اس لیے وہ یہاں سے بھاگنا چاہتی ہے۔ ملتان کے مسلمان جاسوس نے اُسے کہا کہ وہ یہاں سے نکلنے کا انتظام کرے تو وہ اُسے ملتان لے جائے گا جہاں وہ جنگلی عورت کی طرح نہیں رہے گی بلکہ اُسے رانی بنا کر رکھا جائے گا۔

اس عورت نے اُسے بتایا کہ اس سے پہلے بھی ایک جاسوس پکڑا گیا تھا جس سے جاٹوں نے معلوم کر لیا تھا کہ غزنی کی فوج ان پر حملہ کرنے آئے گی لیکن یہ معلوم کر کے بھی جاٹوں نے اُسے قتل کر دیا تھا۔ اُس روز سے جاٹ لڑائی کی کشتیاں تیار کر رہے تھے۔

ایک رات جب طغیانی ذرا کم تھی، یہ عورت جاسوس کے پاس آگئی اور اسے کہا کہ فوراً اٹھو۔ وہ اُٹھا۔ عورت اُسے دریا کے کنارے لے گئی اور اُسے ایک کشتی میں بٹھایا۔ خود بھی بیٹھی اور دونوں چپّو مارنے لگے۔ ابھی زیادہ دُور نہیں گئے تھے کہ دریا کے کنارے مشعلیں بھاگتی دوڑتی دکھائی دینے لگیں۔ جاٹ انہیں رُک جانے کو للکار رہے تھے۔ چاندنی میں انہیں کشتی نظر آ رہی تھی۔ چار پانچ تیر آئے۔ عورت کی چیخ نکل گئی۔ ایک تیر اُس کے پہلو میں اُتر گیا تھا۔ جاسوس محفوظ رہا۔ وہ کشتی میں لیٹ گیا اور کشتی کو دریا کے حوالے کر دیا۔ اُسے سنائی دیتا رہا کہ کشتی میں تیر لگ رہے ہیں۔

جزیرہ چھوٹا تھا اور دریا تیز۔ کشتی جلدی خطرے سے نکل گئی۔ جاسوس نے چپّو مارنے شروع کیے۔ عورت مر چکی تھی۔ کشتی بہت دُور جا کر کنارے سے لگی۔ جاسوس کا جسم شل ہو چکا تھا، مگر وہ کہیں گرا اور رُکا نہیں۔ وہ جب بہت دنوں بعد ملتان پہنچا تو اُس سے بولا بھی نہیں جاتا تھا۔ اُس نے جو کچھ جاٹوں کو بتایا تھا

اور جاٹوں کے متعلق اُسے جو کچھ پتہ چلا تھا، وہ اُس نے بتا دیا۔

جب یہ رپورٹ سلطان محمود کے پاس پہنچی تو اُس نے اپنے سالاروں سے مشورہ کر کے ملتان کے حاکم کو پیغام بھیجا کہ جس قدر جلدی ممکن ہو سکے کشتیوں کا ایک بیڑہ تیار کیا جائے۔ ہر کشتی بیس سپاہیوں کے لیے کافی ہو۔ سلطان محمود ایک بار دریائے جیحون میں خوارزم شاہ کی فوج کے خلاف کشتیوں کی جنگ لڑ چکا تھا۔ اس تجربے کے بعد اُس نے خاص قسم کی جنگی کشتیاں بنوائی تھیں۔ اب اس نے انہی کشتی سازوں اور چند ایک تجربہ کار ملاحوں کو ملتان بھیج دیا تاکہ وہ جنگی ضروریات کے مطابق کشتیاں تیار کر لیں۔

*

دسمبر ۱۰۲۷ء کے آخری ہفتے میں سلطان محمود کو ملتان سے اطلاع ملی کہ ایک ہزار کشتیاں تیار ہو چکی ہیں۔ دوسری اطلاع طویل تھی جو جاٹوں کی جنگی تیاریوں سے تعلق رکھتی تھی۔

سلطان محمود پر ایک الزام یہ عائد کیا جاتا ہے کہ وہ لوٹ مار کے لیے ہندوستان میں آتا تھا اور خزانے سمیٹ کر چلا جاتا تھا۔ اس الزام کی تردید میں اس جنگ کا ذکر ضروری ہے جو اس نے جاٹوں کے خلاف لڑی تھی۔ جاٹوں کی کوئی ریاست نہیں تھی اور اُن کا کوئی خزانہ بھی نہیں تھا وہ سلجوقیوں کی طرح جنگی قوم تھی جو مذہب کے رشتے سے مہاراجوں کے کام کی جنگی طاقت بنتی جا رہی تھی۔ اس قوم کو رہزن اور ڈاکو کہا جاتے تو زیادہ موزوں ہوگا۔ سلطان محمود کے دل میں جاٹوں کے خلاف یہ عداوت تھی کہ جاٹ شیو دیو کے پجاری تھے اور مسلمانوں کے بدترین دشمن۔ وہ مسلمانوں کو قتل و غارت سے ختم کرنا چاہتے تھے۔ لہٰذا سلطان کے عزم کے پس منظر میں ہندوستان میں اسلام کا احیا تھا۔

مارچ ۱۰۲۷ء (۴۱۸ھ) کے آخری دنوں میں سلطان محمود نے غزنی سے کوچ کیا۔ وہ جب ملتان پہنچا تو اُسے بتایا گیا کہ ایک ہزار چار سو کشتیاں تیار ہو چکی ہیں۔ سلطان نے آرام کیے بغیر کشتیوں کا معائنہ کیا۔ ایک کشتی میں خود بیٹھ کر دریا میں گیا۔ کشتی

چلانے والوں کی مہارت دیکھی اور پھر ہر کشتی میں بیس بیس تیر انداز اور برچھی باز سپاہی بٹھا کر پورے بیڑے کو دریا میں اتارا اور کشتیوں کو تیزی سے گھمانے پھرانے کے احکام دیئے۔ اُس نے سپاہیوں کی پھُرتی کا جائزہ لیا اور انہیں اکٹھا کر کے مزید ہدایات دیں۔

جس روز سلطان ملتان پہنچا، اُسی روز جاسوس جاٹوں کے علاقے میں بھیج دیئے گئے لیکن سلطان کی تیاریاں بھی پوشیدہ نہیں تھیں۔ ملتان میں اگر جاٹوں کے جاسوس نہیں تھے تو مسلمانوں کے دشمن موجود تھے۔ بعد کی اطلاعوں کے مطابق جاٹوں کو سلطان کی تیاری اور کوچ کا پتہ چل گیا تھا۔ اس کی پہلی تصدیق جاسوسوں نے واپس آ کر کر دی۔ انہوں نے بتایا کہ جاٹوں نے کم و بیش چار ہزار کشتیاں تیار کر لی ہیں اور وہ دریائی جنگ لڑیں گے، یا غالباً ان کا منصوبہ یہ تھا کہ غزنی والے کشتیوں پر آ رہے ہیں اور یہاں خشکی پر لڑیں گے اس لیے انہوں نے غزنی والوں کو دریا میں ہی روک لینے اور دریا میں ڈبو دینے کا انتظام کیا تھا۔

جاسوسوں نے یہ بھی بتایا کہ تمام جاٹ اپنی عورتوں اور بچوں کو ساتھ لے کر دریا کے جزیروں میں چلے گئے ہیں۔ خشکی پر یعنی جزیروں کے سوا اور کہیں کوئی جاٹ نہیں ملے گا۔ ان اطلاعوں کے مطابق سلطان محمود نے دریائی جنگ کی تیاری مکمل کر لی اور اپنے سالاروں کو اُس نے بتا دیا کہ اب کچھ بھی ہو جائے، دریا میں ہی لڑا جائے گا۔

جو تاریخیں ہندوستان میں لکھی گئی ہیں، ان میں اس جنگ کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی۔ بعض غیر ہندوستانی مسلمان مصنفوں نے بھی اس کا ذکر سرسری کیا ہے لیکن وقائع نگاروں اور گہری تحقیق کرنے والوں کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ جنگ غزنی والوں کی کلاسیکی بحری جنگ تھی جس میں سلطان محمود اور اس کے سالاروں نے بے مثال جنگی بصیرت کا مظاہرہ کیا۔

وہ مقام کسی نے بھی نہیں لکھا جہاں یہ لڑائی لڑی گئی تھی۔ ایک انگریز جان برگس نے جس نے محمد قاسم فرشتہ کی کتابوں کا ترجمہ انگریزی میں کیا ہے، حاشیے

میں لکھا ہے کہ یہ اتفاق کی بات ہے کہ سلطان محمودؒ نے اس مقام پر یہ جنگ لڑی جہاں تیرہ صدیاں پہلے سکندرِ اعظم نے کشتیوں کا بیڑہ تیار کر کے دریا میں اتارا تھا۔ نقشے پر دیکھیں۔ ملتان دریائے چناب کے کنارے پر ہے۔ وہاں دریائے جہلم، راوی اور چناب ایک دریا بن جاتے ہیں۔ آگے جا کر دریائے ستلج بھی اس میں مل جاتا ہے اور کچھ اور آگے، اُچ سے بھی آگے یہ دریا دریائے سندھ میں مل جاتے ہیں۔ وہاں پنجاب کے تمام دریا مل کر دریائے سندھ بن جاتے ہیں۔ آگے جا کر دو چھوٹے دریا بھی دریائے سندھ میں گرتے ہیں۔ اُس دَور میں کسی بھی دریا سے نہریں نہیں نکالی گئی تھیں، نہ کسی دریا پر کوئی ڈیم یا بیراج تھا۔ تمام تر پانی بلا روک ٹوک بہتا تھا۔ تصوّر کیا جاسکتا ہے کہ اتنے سارے دریا مل کر جب دریائے سندھ بنتے تھے تو اُس دَور میں یہ دریا چھوٹا سمندر بن جاتا ہوگا۔ پاٹ بہت چوڑا تھا اس لیے دریا کے درمیان میں جنگلاتی جزیرے بن گئے تھے۔ بعض جزیرے خاصے وسیع تھے۔

*

تاریخ دان اُس تاریخ کے متعلّق خاموش ہیں جس دن یہ لڑائی شروع ہوئی تھی۔ سلطان محمود کا چودہ سَو کشتیوں کا بیڑہ ملتان سے روانہ ہُوا۔ فرشتہ نے لکھا ہے کہ غزنی والوں کی کشتیاں مضبوط تھیں اور اُن کے اطراف میں، سامنے اور پیچھے برچھیوں کی اَنیوں کی طرح لوہے کی بڑی بڑی نوکدار انیاں لگا دی گئی تھیں تاکہ دشمن کی کشتیاں ان سے ٹکرائیں تو ٹوٹ جائیں اور دشمن کے آدمی دریا میں اُتر کر کسی کشتی میں سوار نہ ہوسکیں۔ اس اہتمام کے علاوہ سلطان محمود نے پہلی بار آگ پھینکنے کا انتظام کیا تھا۔ جان برگس نے انہیں ہینڈ گرنیڈ کہا ہے لیکن فرشتہ نے انہیں آتش گیر سیال کے ڈبے یا مٹی کے چھوٹے چھوٹے برتن کہا ہے۔

غزنی والوں کا بیڑہ دریا کے بہاؤ کے ساتھ بہتا گیا۔ کشتیوں کو ایک دوسری سے دُور دُور رکھا گیا۔ سلطان محمود کی کشتی درمیان تھی۔ اس کے ساتھ تین کشتیاں قاصدوں کی تھیں جن کے چپّو زیادہ تھے۔

پنج ند سے آگے گئے تو جاٹوں کی کشتیاں نظر آنے لگیں۔ وہ نیم دائرے میں تھیں

اور اگلی کشتیوں کے پیچھے ایسے لگتا تھا جیسے وہاں دریا نہیں، کشتیوں کا جنگل ہے۔ سلطان محمود نے آگے پیچھے آنے والی کشتیوں کو ایک صف میں کر کے دریا کی چوڑائی میں کر لیا تاکہ جاٹوں کا نیم دائرہ گھیرے کی صورت اختیار نہ کر سکے۔ پہلے تیر جاٹوں کی طرف سے آئے۔ سلطان نے اپنی درمیان والی کشتیوں کو بھی دائیں اور بائیں ہو جانے اور جاٹوں کے پہلوؤں پر تیر برسانے کا حکم دیا۔ چونکہ غزنی والوں کی کشتیاں بہاؤ کے رُخ جا رہی تھیں اس لیے اُن کی رفتار تیز تھی اور ملاحوں کو چپّو مارنے کی ضرورت نہیں تھی۔

قریب جا کر سلطان محمود نے تیر چلانے کا حکم دیا۔ تیر جاٹوں کی پہلوؤں اپنی کناروں والی کشتیوں پر چلائے جا رہے تھے۔ جاٹوں کے تیر نہلک تھے۔ ان کی پچھلی کشتیوں سے بھی تیر آ رہے تھے۔ غزنی والوں کی کشتیاں جاٹوں کے پہلوؤں پر چلی گئیں۔ پیچھے جو کشتیاں آ رہی تھیں، انہیں جاٹوں کے درمیان چلے جانے کو کہا گیا۔ اللہ اکبر کے نعرے گرجنے لگے اور جاٹ اپنی مخصوص آوازیں گیدڑوں کی آوازیں نکال رہے تھے۔ وہ دلیر لڑاکے تھے۔

تھوڑی دیر بعد دونوں طرف کی کشتیاں ایک دوسری میں گڈمڈ ہو گئیں مسلمانوں نے جاٹوں کی کشتیوں پر آگ پھینکنی شروع کر دی۔ جاٹوں نے اس قدر دلیری کا مظاہرہ کیا کہ وہ جلتی ہوئی کشتیوں سے کود کر دریا میں اترے اور مسلمانوں کی کشتیوں پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگے، لیکن مسلمانوں کی کشتیوں کے کناروں پر جو نُکیاں لگی ہوئی تھی، وہ انہیں بری طرح زخمی کر رہی تھیں۔ اوپر سے مسلمانوں کی برچھیاں انہیں ختم کر رہی تھیں، لیکن جاٹوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اُن کی چار ہزار کشتیوں میں سلطان محمود کی ایک ہزار چار سو کشتیاں نظر نہیں آتی تھیں۔

مسلمانوں کو کشتیاں الٹنے کی ٹریننگ دی گئی تھی۔ ایک خاص زاویے سے کشتی کو کشتی سے ٹکر ماری جاتی تھی۔ اس طرح مسلمانوں نے جاٹوں کی کئی کشتیاں اُلٹ دیں لیکن جاٹ پانی کے کیڑے معلوم ہوتے تھے۔ وہ دریا میں کود جاتے اور مسلمانوں کی کشتیوں پر سوار ہونے کی کوشش کرتے تھے۔ مسلمانوں کا بھی نقصان ہو

رہا تھا۔ انہیں اُس لحاظ سے برتری حاصل تھی کہ ان کے پاس کشتیوں کو جلانے کا انتظام بھی تھا۔

جاٹوں نے ایک چال اور چلی۔ پیچھے کی کشتیوں میں جو جاٹ سوار تھے، وہ کشتیاں کناروں پر لے گئے اور خشکی پر چلے گئے۔ یوں پتہ چلتا تھا جیسے بھاگ گئے ہوں لیکن خشکی پر چھپتے چھپاتے غزنی والوں کے قریب کنارے سے اُن پر تیر اور برچھیاں برسانا چاہتے تھے لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ سلطان محمود نے یہ انتظام بھی کیا تھا کہ کناروں سے دُور جاٹوں کی نظروں سے اوجھل اپنی فوج کے دستے رکھے ہوئے تھے۔ یہاں تک یہ کشتیوں میں ہی آتے تھے۔ رات کو انہیں اُتار کر خشکی پر بھیج دیا گیا تھا۔ وہ کناروں سے دُور چلے گئے تھے۔ جاٹ سلطان کے اس اہتمام سے واقف نہیں تھے۔ جو جاٹ خشکی سے غزنی کی کشتیوں پر تیر چلانے گئے تھے وہ دوبارہ نظر نہ آتے۔ انہیں خشکی میں چھپے ہوئے غزنوی مجاہدوں نے ۔۔ وں سے ختم کر دیا۔ پھر جو جاٹ کنارے پر جاتا تھا، وہ زندہ واپس نہیں آتا تھا۔ سلطان محمود نے خشکی پر اپنی حفاظت کا یہ انتظام اتنا خفیہ رکھا تھا کہ جاٹ اس سے قبل از وقت باخبر نہ ہو سکے۔

جاٹوں کو سب سے زیادہ نقصان غزنی والوں کے آگ کے گولوں نے (یا یہ جس طریقے سے بھی آگ پھینکی جاتی تھی) بہت نقصان پہنچایا۔ غزنی کے ملاح اپنی کشتیوں کو جاٹوں کی کشتیوں کی طرف کر کے اُن کشتیوں کی طرف دھکیلتے تھے جو جل رہی ہوتی تھیں۔ کوئی انسان جل کر مرنا نہیں چاہتا۔ جاٹ جلتی کشتی سے دریا میں کود جاتے تھے تو مسلمان تیر انداز انہیں اُبھرنے نہیں دیتے تھے۔ لاشیں تیر تیر کر ڈوب رہی تھیں۔ جاٹ ملاحوں نے کشتیاں بہاؤ پر ڈال دی تھیں اور مسلمان اُن کا تعاقب کر رہے تھے۔ کناروں پر بھی اُن کا قتلِ عام ہو رہا تھا۔

دریائے سندھ کا پانی لال ہو گیا تھا۔ زخمی ڈوب رہے تھے۔ سلطان کی یہ چال جاٹوں کے لیے بہت مہلک ثابت ہوئی کہ سلطان نے اپنے ملاحوں سے کہا کہ وہ کشتیاں کناروں کے ساتھ رکھیں۔ اس طرح جاٹ بکھر کر لڑنے کی بجائے درمیان میں اکٹھے ہو گئے۔

کچھ ہی دیر بعد جاٹوں کی جارحیّت ختم ہوگئی۔ انہیں طریقے سے لڑانے والا کوئی نہ تھا۔ انہوں نے کشتیوں سے کودنا اور تیر کر خشکی پر جانا شروع کر دیا مگر وہاں موت اُن کی منتظر تھی۔ کشتیاں لڑتے لڑتے کسی جزیرے کے قریب سے گذرتی تھیں تو غزنی کے سپاہی آگ جزیرے پر بھی پھینک دیتے تھے۔ اس طرح دو ایسے بڑے جزیروں کے ایک دو جھونپڑوں کو آگ لگ گئی جن میں جاٹوں کے بیوی بچّے تھے۔ جھونپڑوں نے جنگل میں آگ لگا دی۔ جاٹوں کے اوسان خطا ہو گئے۔ ان کے لیے اب دریا میں بھی آگ تھی اور جزیروں میں بھی آگ۔

چند گھنٹوں میں یہ معرکہ ختم ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی جاٹ بھی ختم ہوگئے۔ اس کے بعد سلطان محمود نے خود جزیروں میں اُتر کر دیکھا۔ کوئی بھی جوان یا نوجوان جاٹ کہیں چھپا ہوا نظر آیا اُسے پکڑ کر کشتی میں ڈال لیا گیا۔ پیچھے عورتیں اور بچّے رہ گئے۔ جن جزیروں میں آگ لگی تھی وہاں سے عورتیں اور بچّے بھاگے اور دریا میں کُود گئے۔ انہیں بچانے والا کوئی نہ تھا۔ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی نسل ہی ختم ہوگئی۔ زندہ بچ رہنے والی عورتیں اِدھر اُدھر بکھر گئیں۔ اس کے بعد کسی نے نہ سنا کہ جاٹ بھی کوئی قوم ہُوا کرتی تھی۔

*

سلطان محمود جولائی ۱۰۲۷ء کے آخری دنوں میں واپس غزنی پہنچا۔ اب طبیب نے اُسے دیکھا تو وہ بہت پریشان ہُوا۔ سلطان کے چہرے پر اب کمزوری اور بیماری کے آثار تھے۔ سبطِ ابن الجوزی اور گردیزی نے لکھا ہے کہ سلطان جب جاٹوں کی سرکوبی کے لیے گیا تو جزیروں کے جنگل میں اُسے ایسے مچھروں نے کاٹا ہوگا جو ملیریا کے جراثیم کے حامل تھے۔ ان سے اُسے ملیریا ہوگیا۔ چونکہ سلطان بیماری کی پرواہ نہیں کیا کرتا تھا اس لیے اُس نے اُن طبیبوں کو جو اُس کے ساتھ گئے تھے، نہ بتایا کہ اُسے کوئی تکلیف ہے۔ یہ ملیریا بگڑ کر نمایاں طور پر دق کا مرض بن گیا، یا یہ کہا جا سکتا ہے کہ سِل یا دق کا جو عارضہ اُسے لاحق ہو چکا تھا وہ ملیریا کے بخار سے نمایاں ہوگیا۔ دوسرے مورخوں نے اسے انتڑیوں کا دِق لکھا ہے۔

یہ جو کچھ بھی تھا اس کا باعث یہ تھا کہ سلطان کی ۵۹ سالہ زندگی کے چالیس سال

میدانِ جنگ میں یا کوچ میں یا پڑاؤ میں گزرے تھے۔ اُس نے ۳۲ سال حکومت کی تھی۔ وہ جب اپنے گھر میں ہوتا تھا تو اُس کے ذہن اور اعصاب پر سوچوں کا بوجھ پڑا رہتا تھا۔

"سلطان نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں کسی کو نہیں بتاؤں گا کہ سلطان ایک مہلک مرض میں مبتلا ہو چکا ہے" ___ ایک روز سلطان کے طبیب شیخ الاسفند نے سالار ابوعبداللہ محمد الطائی، ارسلان جاذب، ابوالحسن اور وزیر سے کہا ___ "لیکن میں یہ راز آپ سے مزید پوشیدہ نہیں رکھ سکتا۔ سلطان محمود اپنی بیوی اور اپنی اولاد کا مسئلہ نہیں۔ وہ ملّتِ اسلامیہ کا گوہرِ نایاب ہے۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ محمد بن قاسم کے کتنے سَو سال بعد غزنی نے دوسرا محمد بن قاسم پیدا کیا مگر اُس وقت تک ہندوستان بُت خانہ بن چکا تھا اور محمد بن قاسم کی جلائی ہوئی شمع رسالت ٹمٹمانے لگی تھی۔ اس کا نور سمٹ گیا تھا۔ اب محمود ہاتھ سے جا رہا ہے۔ پھر کون جانے کب کوئی اور قاسم اور کب کوئی اور محمود اُٹھے۔ اُس وقت تک ہند کے بُت خانے اور مَے خانے پھر آباد ہو چکے ہوں گے اور اسلام پر کفر کا خوف و ہراس طاری ہو چکا ہو گا۔"

"کیا ہو گیا ہے سلطان کو؟" ___ وزیر نے پُوچھا۔

"دِق ..... سِل!" ___ طبیب نے کہا ___ "میں نے تشخیص اب نہیں کی۔ وہ کئی سالوں سے اس مرض کو اپنے اندر پال رہا ہے۔ ہمارے سلطان نے بڑے بڑے طاقتور دشمنوں کو ہی شکست نہیں دی۔ وہ موت کو بھی شکست دیتا چلا آ رہا ہے۔ وہ جتنے عرصے سے جس مرض کا مریض ہے، کوئی اور ہوتا تو کئی سال پہلے مر چکا ہوتا۔ اُس کا اعصابی نظام پہلے ہی تباہ ہو چکا تھا۔ جسم بیماریوں کے خلاف قوّتِ مدافعت کھو بیٹھا تھا۔ وہ روحانی قوّت سے لڑتا رہا ہے۔ سلطان نے ثابت کر دیا ہے کہ ارادہ مضبوط اور عزم بلند ہو، نیّت اور مقصد میں عظمت ہو تو رُوح کی قوّتیں بیدار ہو جاتی ہیں اور جسم کی کوئی اہمیّت نہیں رہتی۔ سلطان ان خداداد قوّتوں کے بل بوتے پر زندہ ہے۔ کیا آپ لوگ سلطان کو قائل کر سکتے ہیں کہ وہ اب ہر طرف سے توجہ ہٹا لیں اور صرف علاج پر توجہ مرکوز کریں؟ ..... یہ سلطان کے خاندان پر نہیں، عالمِ اسلام پر احسان

ہوگا۔ یہ ہندوستان کے مسلمانوں پر احسان ہوگا جنہوں نے صدیوں بعد فخر سے سر اُٹھایا ہے اور انہیں ہندوستان میں کھویا ہُوا وقار ملا ہے۔ سلطان اب اس حالت کو پہنچ گیا ہے کہ اسے بستر سے اُٹھنا نہیں چاہیئے"۔

•

سلطان محمود بستر کا قیدی نہ رہ سکا۔ اُس کا وزیر اور اُس کے سالار اُس کے ماتحت صرف حاکم نہیں تھے بلکہ اُس کے دوست تھے، اُس کے رازداں تھے، اس کے لنگوٹیے یار تھے۔ انہوں نے شانہ بشانہ تاریخ بنائی تھی۔ موت کو آنکھیں دکھائی تھیں۔ بڑے بڑے لمبے کوُنچ کیے تھے مگر بیماری کی بات ہوتی تو سلطان اُن کا قائل نہ ہُوا۔ اُس نے سب کو ہنس کر ٹال دیا۔ اُس نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ جو قوت مجھ میں ہے وہ تم میں بھی ہے۔ اسے بیدار کرو۔ عزم اور مقصد کو بلند رکھو۔ حکم صرف خدا سے لو، قرآن کو مشعلِ راہ بناؤ۔ روحانی قوتیں بیدار ہو جائیں گی۔

اُس کے گھر والے اور اس کے حکام جب اُس کی صحت کے متعلق تشویش میں تھے اُس وقت سلطان ایک اور جنگی مہم پر روانہ ہو گیا۔ یہ سلجوقیوں کے خلاف تھی۔ سلطان کی غیر حاضری میں سلجوقی ہندوستان کے جاٹوں کی طرح ایک قوت بن گئے اور سلطنتِ غزنی کو بھی للکارنے لگے تھے۔ ان کے خلاف اُس نے آخری جنگ لڑی اور ان کا دم خم توڑ کر اسفہان اور رے کو اپنی سلطنت میں لے لیا اور اپنے بیٹے مسعود کو وہاں کا امیر مقرر کر دیا۔

وہ آب وہوا کی تبدیلی کے لیے بلخ چلا گیا مگر آرام نہ کیا۔ اپنی تمام سلطنت کے دورے کرتا رہا۔ سلطنت کے امور اور مسائل سے الجھا رہا۔ اُس نے ۱۰۲۹ء کا موسم گرما اور سرما بلخ میں گزارا مگر وہاں کی آب وہوا اُس کو راس نہ آئی۔ راس آ بھی نہیں سکتی تھی۔ اب دنیا کی آب وہوا اُس کے لیے نہیں رہی تھی۔ اُس نے غزنی چلے جانے کا فیصلہ کیا۔

•

سلطان ۲۰ اپریل ۱۰۳۰ء کے روز غزنی آیا۔ آتے ہی اُس پر نیم غشی طاری ہوگئی۔

طبیب نے دیکھا تو اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اُس نے سلطان کے کان میں کہا ـــ "کچھ کہیے سلطان!" ـــ سلطان نے اپنا ایک ہاتھ اُٹھایا مگر ہاتھ سینے پر گر پڑا۔ اُس کی بیوی نے بلایا۔ بیٹوں نے بلایا۔ سلطان کی صرف سانسیں چل رہی تھیں۔

اُس کے پاس قرآن خواں بٹھا دیا گیا جو خوش الحان تھا۔ جب قرآن کی آواز سلطان کے کانوں میں پڑنے لگی تو اُس کے چہرے پر پیلاہٹ اور آخری وقت کی سفیدی کم ہو گئی۔ کسی کسی آیت پر اُس کا جسم تھرکتا تھا جس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ سُن رہا ہے، سمجھ رہا ہے مگر بڑے بڑے دہشت ناک دشمنوں کو گھٹنوں بٹھا دینے والا، پتھر کے "خداؤں" کو ریزہ ریزہ کر دینے والا اب بول نہیں سکتا تھا، ہِل نہیں سکتا تھا۔

۳۰ اپریل ۱۰۳۰ء (۲۳ ربیع الثانی ۴۲۱ھ) بروز جمعرات شام پانچ بجے سلطان محمود کے ہونٹوں پر تبسّم دیکھا گیا اور اس کے ساتھ ہی اُس نے آخری سانس لیا اور دنیا سے سرخروئی کا تبسّم لیے رخصت ہو گیا۔

طبیب دھاڑ مار کر رویا اور ببانگِ بلند کہا ـــ "اِس شخص نے موت سے بھی ہتھیار ڈلوا لیے تھے۔"

تاریخ اسلام کے بُت شکن اور ہندوستان میں احیائے اسلام کے علمبردار کو اُسی رات عشاء کی نماز کے بعد مشعلوں کی روشنی میں فیروزی باغ میں دفن کر دیا گیا۔ وہ زندہ تھا تو یہ باغ اُسے بہت پسند تھا۔ ذرا ستانے کے لیے اسی باغ میں بیٹھا کرتا تھا۔

اُس کے بیٹوں نے مقبرہ تعمیر کرایا۔ اس مقبرے کے ساتھ بہت بے انصافیاں اور زیادتیاں ہوئیں۔ لوگ عقیدت سے مقبرے پر جاتے تھے اور قبر سے مٹی اور دروازوں سے لکڑی کے ٹکڑے برکت کے طور پر تراش کر لے آتے تھے۔ سب سے بڑا ظلم ایک انگریز لارڈ ایلنبرو نے کیا کہ مقبرے کا بڑا دروازہ اکھاڑ کر اس غلط فہمی میں ہندوستان لے گیا کہ یہ سومنات کے مندر کا دروازہ تھا جو سلطان محمود اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ یہ مقبرہ اب اُجڑے ہوئے ایک خاموش کھنڈر کی طرح غزنی سے ڈیڑھ میل دُور کھڑا ہے۔

اگر مقبرے کا نشان مٹ جاتے تو بھی سلطان محمود غزنوی زندہ و پائندہ رہے گا۔ محمود ایک روایت کا نام ہے۔ اُس سے سومنات کے شِو دیو کے وہ ٹکڑے زندہ رکھے ہوتے ہیں جو آج بھی غزنی میں مکّہ معظمہ اور مدینہ منوّرہ میں پڑے ہوئے ہیں اور مسلمان ان پر پاؤں رکھ کر گزرتے ہیں۔

زندگی کی راہوں میں

- ثریا عروج